ناموسِ رسالت ﷺ
مغرب
اور
آزادیِ اظہار

اِسلام اور ناموسِ رِسالت ﷺ کے خِلاف مغرب کے تعصّب، دوہرے مِعیار اور بھیانک سازشوں پر مبنی تحقِیقی دستاویز

محمد متین خالد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ناموسِ رسالت ﷺ
مغرب اور آزادیٔ اظہار

حقوق انسانی کا راگ الاپنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ آزادی اظہار رائے نا صرف اخلاق و قانون اور امن و امان سے مشروط ہوتی ہے بلکہ اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ بے لگام ہو جائے تو معاشرے کا امن و سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ آزادی اور انارکی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی مقدس ترین ہستیوں کی توہین کر کے، دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کو شدید ترین ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا کہاں کی آزادی اظہار رائے ہے؟ اپنے متنازعہ ترین خیالات پیش کر کے دوسروں کے حقوق پامال کرنا کہاں کی حریت ہے؟ کسی کے جذبات و احساسات پر کچوکے لگا کر عارضی تسکین حاصل کرنا کہاں کا حق ہے؟ کیا نفرت، اشتعال، توہین اور تعصب کو کسی بھی طرح آزادی اظہار رائے کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ آزادی اظہار نہیں بلکہ آزادی آزار ہے جسے مغرب نے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

ناموسِ رسالت ﷺ
مغرب اور آزادیٔ اظہار

اسلام اور ناموسِ رسالت ﷺ کے خلاف مغرب کے تعصّب، دوہرے معیار اور بھیانک سازشوں پر مبنی تحقیقی دستاویز

ناقابل تردید حقائق، تہلکہ خیز واقعات، ہوش رُبا انکشافات

محمد متین خالد

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
37223584، 37232336، 37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers@hotmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

جملہ حقوق محفوظ

نام کتب	ناموسِ رسالت ﷺ مغرب اور آزادیِ اظہار
مصنف	محمد متین خالد
ناشر	عِلم وعرفان پبلشرز
مطبع	تایا پرنٹرز، لاہور
قانونی مشیر	محمد نوید شاہین ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
سرورق	حافظ طاہر سعید
کمپوزنگ	طاہر علی
سنِ اشاعت	2018ء
قیمت	-/600روپے

عِلم وعرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
37223584، 37232336، 37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers@hotmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

اِنتساب

شانزے، عیشال، شازین اور انابیہ

کے نام

جن کی معصومانہ شرارتیں مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتیں۔

مغربی آزادیٔ اظہار کے شاخسانے

جناب محمد متین خالد کی تازہ علمی تصنیف: ''ناموسِ رسالت ﷺ، مغرب اور آزادیٔ اظہار'' اشاعت سے قبل اس عاجز کی نظر سے گزری ہے، سو، ایک بے ساختہ تاثر ذہن میں ابھرا ہے بلکہ یہ کہنا انسب ہوگا کیف و سرور سے بھرپور اک لہر سی قلب سے اپنے آپ اُٹھی ہے، جو اظہار کے لیے بے قرار ہے۔ اس لیے کہ یہ گراں قدر فکری سرمایا یکجا ہو کر توانائی کا ایسا مخزن بن گیا ہے؛ جو سوچوں کی سمتوں کو راستی کے راستے پر گامزن کرسکتا ہے؛ جو اعتقاد کے صادق مرکزے تک رسائی کے لیے قبلہ نما کا، کام دے سکتا ہے۔ اپنے مربوط، مبسوط اور مضبوط بیانیے میں مصنف نے نیوکلیس کی صداقت کے ساتھ وابستہ رہ کر نادر تر نکات کی منور کہکشاں مزین کر ڈالی ہے۔ راقم دورانِ مطالعہ اس لطیف پہلو سے پیہم لطف اندوز ہوتا رہا کہ ہر تحریر اپنی داخلی توانائی کے سہارے مشترک قدر سے یوں جُڑی ہوئی ہے، جیسے شجر جڑ سے؛ مگر ہر باب اس طرح منفرد ہے؛ جیسے ہر پتہ اپنی جداگانہ اکائی بلکہ معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک مصدر سے پختہ استواری، ایک منبع سے کامل تعلق، ایک سرچشمہ سے نامیاتی ناتا، ایک اصل سے غیر مشروط لگاؤ............اور وحدت کسے کہتے ہیں!!!

حیف! ہمارے بعض چشم تنگ کے مالک دانشور، انتشار اور کثرت میں فرق نہ کرسکے۔ ایسے اصحاب کے لیے مصنف کا یہ علمی شاہکار، ایک نشان ہے، اگر:

"Good out of evil"

کے الفاظ استعمال کرنے میں، کوئی قباحت نہ ہو، تو کہا جاسکتا ہے کہ شاتمان رسولؐ نے اختلاف کو تحلیل کر کے اتفاق کے منطقے میں مفکرین دین کو جمع کردیا ہے۔ یہ امریکی اسکالرز، یہ مغربی اہل علم، جب بھی کرتے ہیں، خسارے کا سودا ہی کرتے ہیں۔ برسوں سوچ کر نیا ہتھکنڈا بروئے کار لاتے ہیں، قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے خلاف اپنے طور پر

نئے انداز سے دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی یہ مذموم حرکت بے عمل مسلمانوں کو خوابِ گراں سے دفعتاً جگا دیتی ہے۔ فروعی مسائل میں الجھے ہوئے علمائے امت کو ایک دم جھنجھوڑ کر مسمط کر دیتی ہے۔ اس طرح عالم اسلام اس لیزر بیم کی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کی متصورہ صورت سے کفر لرزہ براندام رہا ہے۔ ایسے سانحات دلخراش ہونے کے باوصف انبوہِ کثیر کو ملت بیضا سے بارِ دِگر معنون کر دیتے ہیں۔ یہ شورش، یہ ستیزہ کاری امت محمدیہؐ کو، اس کی زمینی و آسمانی ذمہ داریوں کا احساس دلا دیتی ہے۔ رگوں میں منجمد ہونے والا خون کھولتے ہوئے لہو میں تبدیل ہو کر، موجیں مارنے لگتا ہے۔

یہ ہنگامہ محض چوراہوں، بازاروں ہی میں برپا نہیں ہوتا، افکار کے قلب القلوب میں بھی ایک تلاطم کو ازسرِنو متحرک کر دیتا ہے۔ یورپ کا تھنک ٹینک اس حقیقت کو جانے کیوں بار بار فراموش کر دیتا ہے کہ طوفان کا جوہر سکون کے مرکز میں پنہاں ہوا کرتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ کی خاص ترکیب کو سمجھا ہی نہیں۔ صلیبی جنگ سے تہذیبی جنگ تک، جس یاقوتی ریزے کی مسلمان نے حفاظت کی ہے، وہ ہے، اپنے نبی ﷺ سے والہانہ لگاؤ، ایسی وابستگی، جس پر عاصی سے عاصی اُمتی بھی اپنا ہر اثاثہ داؤ پر لگا دینے کو ہمہ عنوان مستعد رہتا ہے۔ غالباً یہود و نصاریٰ کو یہی جستجو بے کل رکھتی ہے۔ جی ہاں! وہ دلِ مسلم کو گاہے بگاہے ٹٹول کر دیکھتے رہتے ہیں کہ عشق رسول ﷺ کی شمع ہنوز فروزاں ہے یا بجھ گئی ہے؟ افسوس! وہ مسلمانوں کی بے عملیوں سے ہر بار دھوکا کھا گئے۔ انہیں، نہیں خبر قدرت نے یہ چنگاری، خاکستر میں بھی روشن رکھنی ہے۔ آفتاب بے نور ہو سکتا ہے، چاند گہنا سکتا ہے، ستارے اپنی تنویروں سے دستبردار ہو سکتے ہیں لیکن حضور نبی کریم ﷺ کی محبت، وہ شرارہ نہیں، جو کبھی اپنی تابش سے کنارہ کر لے۔ آگ کا یہ پھول راکھ کی سفید تہہ میں وقتی طور پر اوجھل ہو سکتا ہے، مگر اس کی حِدت اور حرارت، بھلا کبھی روبہ زوال ہو سکتی ہے؟ ناممکن! ناممکن! ناممکن! اس لیے کہ یہ محض رمق نہیں، اُلوہی توانائی (Divine Energy) سے فیضیاب وہ چراغ ہے، جس کی لو، سدا قائم رہنی ہے۔ (کوئی غور کرے تو یہی ختم نبوت کا مفہوم ہے)!

علامہ اقبالؒ، جس رہبر فرزانہ کو یہ نکتہ سمجھا رہے تھے کہ یہ راہی بے ذوق نہیں، کم کوش ضرور ہیں، سو نومیدی کی، کوئی بات نہیں۔ اس قائد اعظمؒ نے مسلمان کے قلب سے جھلکنے والے ذوقِ محبت رسول ﷺ ہی کو تو دریافت کر کے، ایک علیحدہ ریاست کا ارمغان بخش دیا

تھا۔ یورپ اور امریکہ پر کپکپی اسی لیے تو طاری ہے، کہ اگر یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل بن گیا، تو قرآ نک سٹیٹ اس کے دل کی سلطنت کا روپ اختیار کر لے گی۔ ایسے میں طاغوت کے لیے کیا گنجائش رہ جائے گی؟......؟ چنانچہ یہ اس کی بقا کا مسئلہ ہے، مگر باقی تو اللہ نے رہنا ہے، اس سچے اللہ نے، جس کا وعدہ ہے، مآل کار غالب مومن ہی نے ہونا ہے، لہٰذا یہ جو کچھ ہوتا ہے، خاکے شائع کیے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں، فلم بنائے جاتے ہیں............ یہ سب اتنا سادہ نہیں ہے۔ البتہ ان جسارتوں میں ایک زاویہ قابل غور ہے کہ اسلامی تعلیمات، دینی معتقدات کو ہدفِ تنقید بنانے سے زیادہ نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبے میں کمی کی عمداً کاوش کی جاتی ہے۔ وجہ ظاہر و باہر ہے کہ کسی طرح مسلمان کے دل سے حضور ﷺ کی محبت مِٹ جائے، مِٹتی نہیں تو اس کا گراف ہی نیچے آ جائے! (خاکم بدہن)! اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو تعلیمات و معتقدات کیا ہوتے ہیں!......! وہ دیوار اپنے آپ مسمار ہو جائے گی! (معاذ اللہ)! اس لیے اہم فریضہ ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ ہے۔ آپ ﷺ ہیں، تو آپ ﷺ کا عطا فرمودہ دین بھی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ توہین رسالت ؐ کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں؟ ہمیں اس سوال میں چھپی ہوئی زہریلی عیاری کو پہچاننا چاہیے اور وہ یہ ہے، کیا آپ ﷺ کی توہین، جرم ہے یا نہیں؟ اگر مغربی اخلاقیات کے قواعد وضوابط سے یہ ثابت ہو جائے کہ عام فرد کی اہانت بھی دنیا کا سب سے قبیح جرم ہے، تو پھر وہ شخصیت جو اربوں انسانوں کے لیے مکرم ترین وجود ہیں، ان کی اہانت، خود سوچ لیں، کتنا بڑا جرم ہے! ایسا جرم، جس پر جتنی بھی سزا دی جائے، کم ہے!!

مکرم محمد متین خالد کی اس علمی کاوش کو، میں نے ان تناظرات میں دیکھا، تو مجھ پر کھلا کہ یہ سعی واجب نہیں، فرض تھی۔ انہوں نے عرق ریزی کے ساتھ متعلقہ مواد کو اخبارات و جرائد سے تلاش کیا ہے۔ ان اوراق کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد اصولی مباحث کو صداقت سے لبریز بیانیے میں منقلب کر کے ایک تاریخی دستاویز بنا کر، انہوں نے گویا فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ متین صاحب کے متعلق میرا ہمیشہ سے یہ تاثر رہا ہے **Has Broad Shoulders**، واقعتاً وہ غیر معمولی استعدادوں کے مالک ہیں، دست فطرت نے ان کو اعلیٰ سکت سے نوازا ہے، بڑی ذمہ داریوں کو اٹھا سکتے ہیں۔ سو ہزاروں صفحات کو **Synoptical** انداز میں پیش کر دینا ان ہی کا کمال ہے............ بلاشبہ پوری کتاب آخری سطر تک! سبحان

اللہ! برسوں کی فکری ریاضت اور قرنوں سے محبت رسول ﷺ کی حرارت سے تپیدہ قلب کا رشحہ و ماحصل ہے۔ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دینے والی یہ تصنیف عمر بھر کے مطالعے کا فشردہ ہے۔ دل وجد کی حالت میں ہے۔ یہ ایسی وقیع دستاویز ہے جو ہدایت کے طالب کی دنیا بدل کر رکھ سکتی ہے۔ ایک ایک لفظ نہایت ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جذبہ واحساس کے وفور کے باوصف معروضی ثروت مندی کی مظہر اس کتاب میں وہ تمام منطقات سمٹ آئے ہیں، جو عالمی سطح پر پھیلائے گئے مخصوص بلکہ مذموم موقف کا مکمل اور مسکت جواب ہیں۔

عہد رواں اسی طرز اور اسلوب کا متقاضی تھا کہ واقعہ یہی ہے؛ عصر حاضر میں خاص طور پر نیا علم کلام، اپنی جدید ساحری کے ساتھ موثر کر دیا گیا ہے۔ میڈیا کا طلسم حسب ضرورت 'مائنڈ سیٹ' کی تشکیل میں یوں اپنا کردار ادا کرتا ہے کہ اوسط ذہانت کا فرد اس عیاری کی تہ تک نہیں پہنچ پاتا۔

جناب محمد متین خالد دراک ذہن کے مالک ہیں، سو متذکرہ واردات ان کی عقابی نگاہ سے بھلا کہاں چھپ سکتی تھی! چنانچہ انہوں نے براہین کے بھیس میں در آنے والے موقف کی حقیقت کو شناخت کرنے میں ایک آن کا توقف اختیار نہیں کیا۔ ان کی فکر رسا نے اس عمیق چال کی جملہ جہتوں سے فوری آگہی حاصل کر کے یکسر غیر جذباتی انداز میں ایک ایک دلیل کو، دلیل کی معروضیت کے ساتھ رد کیا ہے۔

عام طور پر 'اپنی اپنی یارڈ سٹک' کے پرکشش الفاظ کے ذریعے اضافیت کو مطلقیت پر غالب کر دیا جاتا ہے لیکن متین صاحب نے اس کتاب میں مغربی 'یارڈ سٹک' ہی کو پیمانہ تسلیم کر کے ان کے دوہرے پن کو بے نقاب کر دیا ہے۔ لیکن یہ جادہ نہایت دشوار گزار تھا مگر اعلا دقیقہ رسی کی استعداد، خداداد **Acumen**، گہرے مطالعے اور معروضی تجزیے کی صلاحیت نے یہ مشکل ان کے لیے آسان کر دی۔ یوں بظاہر ایک سرد مہر، خنک، **Condensed**، **Concised**، غیر مبہم، قطعی، حتمی اور کامل غیر خطیبانہ اسلوب ان کے ہاتھ آ گیا ہے جو فریق مخالف کو طرفۃ العین میں عاجز کر کے رکھ دیتا ہے وگرنہ علمی مجادلہ بالعموم ابتدا میں پہاڑوں کے ٹکراؤ ایسا مہیب منظر نامہ تخلیق کر کے دلوں کو دہلا کے رکھ دیتا ہے لیکن آخر میں سب فانوس خیال میں یوں منقلب ہو جاتا ہے کہ تجزیوں کی مبارزت فریقین کے موقف کو تحلیل کر دیتی ہے ......یعنی ...... یہ بھی درست ...... وہ بھی غلط نہیں ......!!

جناب محمد متین خالد نے ہر Thesis کے Anti thesis کو ہر ساعت سامنے رکھا ہے اور اپنے Discourse کی حفاظت کا فریضہ پیہم ادا کیا ہے۔ اس طرح کہیں خلط مبحث کی فضا پیدا نہیں ہوئی، کہیں الجھاؤ نہیں آیا...... پھر انہوں نے محض جوابی کارروائی کو نہیں اپنایا کہ یہ بھی ایک طرح سے Defensive ہونے کے مترادف عمل ہے۔ اس محاذ پر ان کی کامیابی کی اساسی وجہ صداقت کی محکمیت بنی ہے۔ انہیں صرف ایمان کی ثروت ہی میسر نہیں، ایقان کی دولت بھی نصیب ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب اپنوں کی محفل ہو تو ایزادِ ایمان کے لیے دلائل کی خاص احتیاج نہیں ہوتی۔ جب مدمقابل عدو ہو تو پھر سچائی پہ یقین کام آتا ہے کہ اس عنصر پر طرفین متفق ہوتے ہیں۔ اہل مغرب نے آزادیٔ اظہار کے نام سے کہیں کہیں اپنے اکابر کو بھی گھاؤ لگائے ہیں۔ یوں اپنی Objectivity کو Above Board لانے کی ایسی مساعی کی ہیں کہ عامی شامی کو جواب نہیں سوجھتا، اب میمنہ میسرہ کے زخموں سے کیسے بچا جائے؟

جناب محمد متین خالد نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس پیچیدہ صورت حال کو بھی استدلال کے ساتھ بے اثر کیا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اہل مغرب کے ہاں شتر گربگی اور Dichotomy وتیرے کے طور پر موجود رہی ہے۔ جہاں انہیں تقدیس کا تحفظ مطلوب ہوتا ہے، وہاں یہ چرچ کے گنبدوں میں پناہوں کے طلبگار ہو جاتے ہیں اور جہاں 'غیر جانبداری' کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے، وہاں 'سیکولر ریاست' ان کی پاسبان بن جاتی ہے۔ یوں تضادات ان کی تقدیر ہیں۔......!! دین اسلام کا طغرائے امتیاز ہی یہ ہے کہ یہاں ریاست اور مسجد میں تفاوت نہیں ہے۔ یہاں معاملات اور عبادات ایک ہی رُخ کے آئینہ دار ہیں۔ اسی توحید نے اس نظریے کو آخری دین بنایا ہے۔

متذکرہ پس منظر میں نظریہ اور صاحب نظریہ یکساں احترام کے لائق سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بجا طور پر دو جدا جدا اکائیوں کا عنوان ہی نہیں ہے۔ محمد متین خالد صاحب نے اس کتاب کے نیرو تاباں منطقات میں دین اسلام کی حقانیت اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کو ایک مستقل تہذیبی قدر کے طور پر متعارف کیا ہے اور اس سچائی کو پوری قوت سے سامنے لے آئے ہیں کہ اس Permanent Value سے انحراف انسانیت کا سفر معکوس ہوگا۔

کیا کروں میرا دل اس گواہی کو چھپا نہیں سکتا کہ یہ ضخیم تصنیف ایک گل سرسید کی

مثال ہے، ایسے Gem کی نظیر ہے جس کی چکا چوندھ سدا کے لیے اپنے محاصرے میں محصور کر لینے والی ہے......!!

اللہ تعالیٰ ہی دنیا وعقبیٰ میں اس سعی پر مصنف کو اجر عطا فرمائیں گے! علمی دنیا میں یہ کتاب ایک مستقل اور مستند حوالہ بنے گی!!

جمیل احمد عدیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر
گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز
لاہور

دِل کی بات

دین اسلام اپنی آفاقی تعلیمات اور ہمہ گیر سچائیوں کے سبب پوری دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مغرب اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس کے مقابلہ میں بہتر خیالات ونظریات پیش کرتا، تاکہ موازنہ کرنے میں سب کو آسانی رہتی مگر اسلام کے مقابلہ میں وہ کوئی بھی ایسا نظریہ پیش نہیں کر سکے جسے انہیں اپنے معاشرے میں دائمی پذیرائی حاصل ہو بلکہ ان کے ہاں ایسے غیر فطری اور نا قابل عمل احکامات کثرت سے موجود ہیں جو کبھی نافذ العمل نہیں رہے۔ ایسے مافوق الفطرت نظریات ان کے ماتھے پر مستقل کلنک کا ٹیکا ہیں۔ انانیت کے غرور میں مبتلا وہ شدید طور پر دین اسلام سے الرجک ہیں، چنانچہ انہوں نے ایک عالمگیر پراپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کے اذہان میں دین اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میڈیا کی مدد سے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے انہیں رجعت پسند، بنیاد پرست اور دہشت گرد کا خطاب دیا مگر انہیں اپنے مذموم مقاصد میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی، پھر انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اقدس میں ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ قرآن مجید اور مساجد کی بے حرمتی کو اپنا معمول بنا لیا۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں سے تضحیک آمیز اور دل آزار سلوک ہونے لگا، حد تو یہ ہے کہ اپنے ان توہین آمیز اور غیر انسانی اقدامات کو قانونی شکل اور اخلاقی جواز دینے کے لیے مغرب نے 'آزادی اظہار' کا سہارا لیا اور اس پر نہایت بودا موقف اختیار کیا کہ ہر شخص کو آزادی اظہار رائے کا حق ہے جس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ حقوق انسانی کا راگ الاپنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ آزادی اظہار رائے نا صرف اخلاق و قانون اور امن و امان سے مشروط ہوتی ہے بلکہ اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ بے لگام ہو جائے تو معاشرے کا امن وسکون تباہ ہو

جاتا ہے۔ آزادی اور انارکی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی مقدس ترین ہستیوں کی توہین کر کے، دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کو شدید ترین ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا کہاں کی آزادی اظہار رائے ہے؟ اپنے متنازعہ ترین خیالات پیش کر کے دوسروں کے حقوق پامال کرنا کہاں کی حریت ہے؟ کسی کے جذبات و احساسات پر کچوکے لگا کر عارضی تسکین حاصل کرنا کہاں کا حق ہے؟ کیا نفرت، اشتعال، توہین اور تعصب کو کسی بھی طرح آزادی اظہار رائے کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ آزادی اظہار نہیں بلکہ آزادی آزار ہے جسے مغرب نے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ من حیث القوم مغرب بدترین منافقت کا شکار ہے۔ ان کے ہاں آزادی اظہار رائے کا دوہرا معیار ہے۔ ہٹلر کی تعریف یا ہولوکاسٹ کے بارے میں وہ ایک لفظ نہیں بول سکتے۔ کیا وہاں ان کی آزادی اظہار گھاس چرنے چلی جاتی ہے؟ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسا کرنے پر انہیں فوراً جیل جانا پڑے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین یا ملکہ کی شان میں گستاخی پر وہاں کا قانون معاً حرکت میں آ جاتا ہے۔ امریکی پرچم کو جلانے پر سنگین سزا متعین ہے۔ یہاں آزادی اظہار رائے کا اعلان کیوں نہیں ہوتا؟ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مغرب اسلام سے مذہبی تعصب میں اندھا ہو چکا ہے!!

یہ کتاب ایسے ہی ہوش ربا اور انکشافاتی حقائق و واقعات پر مبنی ہے جو نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی تنگ نظری، تاریک خیالی، اندھے تعصب اور دوہرے معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے بلکہ ان کی نام نہاد روشن خیالی، روا داری اور عدم برداشت کے دعووں کی قلعی بھی کھول رہی ہے۔ میں اپنی اس معمولی کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کریں گے۔ اہل علم حضرات سے گذارش ہے کہ کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی قیمتی آرا ضرور ارسال کریں۔ شکریہ!

محمد متین خالد

لاہور

mateenkh@gmail.com

چند ضروری گذارشات

- اس کتاب کو تیار کرتے وقت بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس لیے اس کی پروف ریڈنگ کو بہتر بنایا گیا ہے، پھر بھی غلطی کا امکان ہے۔ اگر کسی جگہ کسی قاری کو غلطی نظر آئے تو براہِ کرم مصنف کو ضرور مطلع کرے۔ ان شاء اللہ آئندہ کے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔
- اس کتاب کا آخری پروف نکالتے وقت اچانک ہارڈ ڈسک میں خرابی کی وجہ سے بہت سارا ڈیٹا ضائع ہو گیا۔ بڑی جانگسل محنت و کوشش کے بعد از سرِ نو مواد اکٹھا کیا گیا اور مکمل احتیاط کے بعد دوبارہ ترتیب دیا گیا۔ ممکن ہے کہیں حوالہ کے نقل و اخذ میں کوئی سہو ہو گیا ہو تو قارئین کرام ناصحانہ اور ہمدردانہ طور پر نشان دہی فرما دیں تا کہ اس کی تصحیح کر دی جائے۔ شکریہ!
- اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں کئی احباب نے اپنی بے پناہ محبتوں کا اظہار کیا، کتاب کی اشاعت کے بارے بار بار استفسار کرتے رہے۔ میں ان سب دوستوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

محمد متین خالد

ناموسِ رسالت ﷺ
مغرب اور آزادیِ اظہار

آزادیٔ اظہار رائے اور حقوق انسانی کا بہترین، مربوط اور جامع ترین تصور دین اسلام نے دیا جو زندگی کے تمام شعبہ جات کا احاطہ کرتا ہے۔ دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔اس کے اصول وضوابط کا تصور جامع اور کامل ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو آزادی اظہار رائے کا پورا حق دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں بے لگام نہیں ہونے دیتا اور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ معاشرے میں فساد پھیلائیں۔یعنی اسلامی معاشرے میں ہر شخص کو مکمل آزادی حاصل ہے جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ بقول شخصے: ''آزادی کے حوالے سے یہ بنیادی بات کبھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ جب تک حاصل نہ ہو انسان کا حق رہتی ہے، حاصل ہو جائے تو یہ آزادی سب سے بڑی ذمہ داری بن جاتی ہے۔آزادی انسان کی امتیازی صفت بھی ہے اور اس کی سب سے بڑی آزمائش بھی۔آزادی محض ایک لفظ نہیں ہے، زندگی کا ایک رجحان ہے۔غلامی میں طاقتور انسان کمزور پر پابندیاں لگاتا ہے، آزادی میں انسان خود اپنے اوپر پابندیاں لگاتا ہے۔اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انسان کی آزادی، اس کے شعور کی بیداری سے وابستہ ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر ختم نبوت کا اعلان اجتماعی طور پر پوری نسل انسانی کے باشعور ہونے کا اعلان بھی ہے۔اسلام نے انسانی شعور کو اعلیٰ انسانی اقدار سے مربوط کر دیا ہے اور انہی اقدار کی روشنی میں انسانی معاشرے میں فکر وعمل کی حدود کا تعین بھی ہوتا ہے۔ اسلام آزادی کا دین ہے، اس لیے آزاد انسانوں کا دین ہے۔ارشاد خداوندی ہے: ''بے شک ہم نے بنی آدم کو درجۂ تکریم عطا کیا ہے۔انہیں خشکی اور سمندر میں سواریاں عطا کی ہیں۔ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو نمایاں فوقیت بخشی'' (بنی اسرائیل:70) اسلام نے انسان کو تکریم کا رتبہ دیا ہے اور تکریم میں آزادی بہرحال شامل ہوتی ہے۔آزادی سے نسل انسانی کی وحدت کا شعور بھی وابستہ ہے۔خطبۂ حجۃ الوداع خود اپنی جگہ حقوق انسانی کا عالمگیر منشور ہونے کی وجہ سے اسلام اور آزادی کے باہمی ربط کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔معاشرتی زندگی میں آزادی کی حفاظت کے لیے اسلام میں حقوق سے زیادہ

فرائض پر زور دیا گیا ہے، فرائض ادا ہوتے رہیں تو حق تلفیوں کے امکانات اسی نسبت سے کم ہو جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی، آزادی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اسلامی نظام میں قانون کی مکمل بالادستی کا ثبوت اس آیہ مبارک میں موجود ہے جس میں رسول کریم ﷺ کی سیرت پاک کو بہترین نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ (الاحزاب:21) حیات مقدس میں اللہ کے ہر قانون کی عملی تفسیر موجود ہے۔ وہ اصول جنہیں ہم آزادی کے حوالے سے انسانی حقوق میں شامل کرتے ہیں، قرآن میں ان کو فرائض کی صورت میں احکامات بنایا گیا ہے۔ جان کا تحفظ، انصاف کا حصول، مساوات، معاشرتی نظام شرکت۔ نیکی میں باہمی تعاون، بدی کے کاموں میں عدم تعاون، جبر سے حفاظت، آزادی ضمیر اور آزادئ اظہار، عقیدے کی آزادی، عزت نفس اور نیک نامی کا تحفظ، تخلیے کا حق، محنت کے مطابق ملکیت اور محنت کا معاوضہ، اسلام میں معاشرتی آزادی کو ان فرائض کی ادائیگی سے مربوط کیا گیا ہے''۔

مدیر ماہنامہ ''تعمیر افکار کراچی'' لکھتے ہیں: ''آزادی بہت اہم ہے، فکری بھی شعوری بھی۔ یہ اگر پل ہے تو باریک تلوار سے زیادہ خطرناک اور اگر راستہ ہے تو دشوار تر۔ اس کے ثمرات حدود و قیود اور ضابطوں قاعدوں کے بغیر نہ نظر آ سکتے ہیں نہ میسر آ سکتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم دائرہ یہ ہے کہ فکری آزادی معلوم اور ثابت شدہ حقائق کی روشنی میں اور ان کی پابند رہ کر اپنا وظیفہ ادا کرے۔ مفروضوں، سنی سنائی باتوں، لایعنی قیاس اور آوارگی خیال پر اس کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، ایسی آزادی سے فتنہ و فساد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا............اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ سب سے پہلے اسلام نے انسان کو فکری آزادی عطا کی ہے اور اسے وہ ماحول فراہم کیا ہے جس میں وہ اپنے افکار و نظریات کی دنیا کو وسعت دے سکے۔ اسلام کی آمد سے پہلی بار یوں ہوا کہ انسان کے لیے اپنے افکار و نظریات رکھنا اور ان کا اظہار کرنا جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ پھر اس فکر و نظر کے دائرے کو مزید وسعت عطا کی گئی کہ اس کے لیے خاص لہجے، برہان، اسلوب، جغرافیائی، خاندانی، لسانی و علاقائی پس منظر کی بات کو شرط کے درجے میں نہیں رکھا گیا۔ اب ہر شخص جو علم و فضل کی دنیا کا شناور ہے، اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے۔ مگر کیا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے؟ یا اس کے ماسوا کچھ اور ہے؟ غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں آزادی اظہار اور حریت فکر کی صداؤں کے باوجود اصل حقیقت آزادی نہیں، پابندی ہے۔ کہیں کہنے کی پابندی ہے، کہیں سننے کی

پابندی ہے۔آزاد سے آزاد تر معاشرے میں بھی کچھ قاعدے اور ضابطے ہیں، کچھ شرائط ہیں، کچھ حدود و قیود ہیں۔تو مکمل آزادی پھر کسے کہا جائے گا؟ایسے میں ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ اصل اور ابدی حقیقت پابندی ہے، آزادی تو اس کا ثمرہ لطیف ہے، جس سے ہم کبھی متمتع نہیں ہوسکتے، اگر ہم پابندی سے آشنا نہ ہوں۔اس بنا پر اسلام آزادی نہیں پابندی کا درس دیتا ہے، ایسی پابندی کا جس کے کوکھ سے آزادی پھوٹتی ہے اور برگ و بار لاکر پورے معاشرے کو حریت فکر و عمل سے آشنا کرتی ہے''۔(ماہنامہ ''تعمیر افکار کراچی'' جنوری 2013ء)

آزادی اظہار رائے کا حق، انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے۔ یہ حق بین الاقوامی طور پر مسلمہ انسانی حقوق کی فہرست میں بھی شامل ہے۔دنیا کے ہر ملک کے دستور نے اس حق کی حفاظت کی ضمانت دی ہے خواہ عملی طور پر اس حق کی آزادی دی گئی ہو یا نہیں۔اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے اس حق کو تسلیم کیا اور ہر پیروکار پر لازم قرار دیا کہ وہ حق کی ترویج و اشاعت میں اپنا کردار ادا کرے۔حتیٰ کہ جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔تاریخ اسلام کے صفحات ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ مسلمانوں نے سچ اور حق بات کہنے میں کسی ظلم و جبر کی پروا نہیں کی، خواہ اس کے لیے انہیں جان و مال کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑی۔عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا دور، آزادی اظہار رائے کا مثالی دور رہا ہے، ایسا دور جب عام آدمی بھی خلیفہ وقت سے نہ صرف دل کی بات کہہ سکتا تھا بلکہ بھری مجلس میں اسے ٹوک سکتا تھا، احتساب کرسکتا تھا اور خلیفہ وقت کو اسی مجلس میں جواب بھی دینا ہوتا تھا۔آزادی اظہار رائے کا یہ روشن دور آئندہ آنے والی نسلوں، جمہوری اداروں اور ذرائع ابلاغ عامہ کے لیے تابندہ مثال ہے۔

سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں حق تنقید و اختلاف رائے کے اظہار کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ''میں بشر ہوں اور آپ لوگوں میں کسی ایک سے بھی بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا، مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔اگر آپ دیکھیں کہ میں ٹھیک کام کر رہا ہوں تو آپ میرے ساتھ چلیں اور اگر دیکھیں کہ میں بھٹک رہا ہوں تو مجھے ٹوک دیجیے''۔آپؓ نے فرمایا: تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں دوسروں سے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہے حتی کہ اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اور حکومت

کے مخالفین سے ہمیشہ نرمی اور عفوودرگزر سے کام لیا۔ آپ نے کبھی کسی کے ساتھ سختی یا زیادتی نہ ہونے دی۔ آپ کا دور حکومت شخصی آزادی اور حریت فکر کا سنہری دور تھا۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں آزادی اظہار رائے کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی راہ چلتے یا بھری محفل میں برسرمنبر جہاں چاہتا، آپ کو ٹوک سکتا تھا، آپ سے اپنی شکایت بیان کرسکتا تھا، آپ کا مواخذہ کرسکتا تھا اور آپ اظہار رائے کی اس روح کو بیدار رکھنے کے لیے ہمیشہ شکایت کنندہ کی بات پر پوری توجہ دیتے، اس کو کوئی دوسرا درمیان میں ٹوکتا تو آپ سخت ناراض ہوتے اور کہنے والے کو پوری بات کہنے کا موقع دیتے، اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اس کی شکایت پر فوری کارروائی عمل میں لاتے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور، اسلام کی عظمت و سطوت، دعوت وتبلیغ اور اظہار رائے کی آزادی کا روشن دور تھا۔ آپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ جب کسی کو کوئی ضرورت ہو یا ظلم کیا جائے یا میری کسی بات پر ناراض ہو تو مجھے اطلاع کرے، میں بھی تم ہی میں سے ایک فرد ہوں۔ آپ مسلمانوں کے درویش صفت خلیفہ تھے۔ اگرچہ آپ کی سخت مزاجی مشہور ہے مگر اختلاف رائے رکھنے والوں کی بات آپ ہمیشہ صبر وتحمل سے سنتے اور رائے قرآن وسنت کے مطابق ہوتی تو فوراً اس پر عمل درآمد کرتے اور یہ نہ دیکھتے کہ رائے دینے والا کوئی بڑا آدمی ہے یا چھوٹا، عورت ہے یا مرد۔ مثلاً سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حق مہر کو کم کرنے کا قانون بنایا اور منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اعلان کیا۔ ایک عورت جو اس مجمع عام میں موجود تھی، اس نے سوچا کہ اس قانون سے تو عورتوں کے حقوق متاثر ہوں گے۔ اس نے وہیں اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار کیا اور کہا، اے امیر المومنین! آپ کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ عورتوں کے حقوق میں کمی کریں۔ خدا کا تو یہ حکم ہے کہ اگر تم ایک بڑا خزانہ بھی حق مہر میں دے چکے ہو تو اسے واپس نہ لو۔ سیدنا عمر فاروقؓ اس خاتون کے اظہار رائے سے متاثر ہوئے اور سمجھے کہ ان کی رائے کے مقابلے میں اس عورت کی رائے صائب اور قرآن کی روح کے مطابق ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا بنایا ہوا قانون واپس لے لیا اور عورت کی رائے کے مطابق عمل کیا۔ تاریخ اسلامی میں سیدنا عمر فاروقؓ ایک سخت گیر اور انصاف پسند حکمران کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن آپ کی یہ سختی ظالموں کے لیے تھی۔ آپ ہر مظلوم کی دادرسی کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ہر خاص وعام کو جرات اظہار دے رکھی تھی۔ آپ کا دور خلافت آزادی رائے کے بے شمار قابل تقلید واقعات سے بھرا پڑا

ہے۔ایک دفعہ ایک شخص نے سیدنا عمرؓ جیسے جاہ وجلال اور شان وشوکت رکھنے والے خلیفہ کا خطبہ جمعہ مجمع عام میں منبر رسول پر سننے سے انکار کردیا تھا اور حق آزادی اظہار رائے کا استعمال کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ پہلے یہ بتایا جائے کہ آپ کے بدن پر جو نیا چغہ ہے، یہ کہاں سے آیا ہے؟ تمام مسلمانوں کو ایک ایک یمنی چادر حصے میں ملی ہے، ایک چادر سے آپ کے لمبے بدن پر اتنا چغہ پورا نہیں آ سکتا، آپ نے اضافی کپڑا کہاں سے لیا؟ سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو جواب دینے کو کہا جس نے بتایا کہ اس نے اپنے حصہ کا کپڑا اپنے بابا کو دے دیا تھا۔انہوں نے اپنے اور میرے حصہ سے یہ چغہ سلایا، اس سے بدو کو اطمینان ہوا اور سیدنا عمرؓ نے خطبہ جاری کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نہ سکیورٹی گارڈ نے روکا نہ مجمع نے ٹوکا اور نہ قانون توہین خلیفہ حرکت میں آیا مگر آزادی اظہار رائے کے ان جیسے واقعات نے معاشرے کو جو قوت استحکام، امن وسلامتی اور اخوت ومساوات کی لازوال دولت عطا کی، وہ انمول تھی۔ سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں مخالفتوں نے جنم لیا، مخالفین آپ کی نرم مزاجی کی وجہ سے سازشوں پر کمربستہ ہوگئے مگر آپ نے پھر بھی شخصی آزادیوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ آپ نے کبھی سخت رویہ اختیار نہ کیا، اگرچہ آپ کا عہد حکومت کم تھا مگر آپ نے کوشش کی کہ ہر مظلوم کی دادرسی ہو سکے۔ آپ نے ہمیشہ سیاسی اختلافات کو بات چیت سے طے کرنے کی کوشش کی۔ سیدنا حضرت عثمانؓ نے تو سیاسی اختلاف کے اظہار کی اتنی کھلی چھوٹ دی کہ مخالفین کو طاقت سے کچلنے یا ان کی زبان بندی کرنے پر اپنی جان دینے کو ترجیح دی۔ غرض آپ کا دور حکومت اختلافات اور اظہار رائے کی آزادی کا بے مثال دور تھا۔ آپ نے سب کی عزت نفس کا خیال رکھا، اختلافات کے باوجود اپنے مخالفین سے کوئی زیادتی نہ کی۔ آپ نے ہمیشہ دوسروں کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھا۔ سیدنا حضرت علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ کے عہد حکومت میں خارجی اعلانیہ آپ کو برا بھلا کہتے، قتل کی دھمکیاں دیتے اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے مگر آپ نے ان کے طرز عمل کا برا نہ مانا۔ آپ نے ان کی زبان بندی کی نہ انہیں گرفتار کیا اور نہ جیل کے اندھیرے دکھائے۔ ایک دفعہ ان باتوں پر جب مخالفین کو پکڑا گیا تو آپؓ نے انہیں چھوڑ دیا اور اپنی حکومت کے افسروں سے فرمایا کہ جب تک وہ باغیانہ کارروائیاں نہ کریں محض زبانی مخالفت اور دھمکیاں ایسی چیز نہیں جن کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔ اس سے زیادہ رواداری اور برداشت کا مظاہرہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ غرض تمام خلفائے راشدین

رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عوام کے حق تنقید اور آزادی اظہار کو مقدم رکھا اور کبھی عوام الناس پر بے جا پابندیوں اور ظلم و جبر سے کاروبار حکومت چلانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ کا دور خلافت نیکی و شرافت، ایثار و قربانی، آزادی رائے اور عدل و انصاف کا مثالی اور روشن دور ہے۔ یہ مثالیں صرف خلفائے راشدین کے دور تک محدود نہیں بلکہ ان کی جھلک ہمیں مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کی جنگ پر تھے، ایک جگہ پڑاؤ تھا کہ آپؓ کے خیمہ پر کبوتری نے انڈے دے دیئے، کوچ کا وقت آیا تو آپؓ نے فرمایا کہ خیمہ وہیں رہنے دیا جائے اور ایک سپاہی حفاظت پر مقرر فرما دیا، اسی جگہ ایک شہر بھی آباد ہوا جسے خیمے کی نسبت سے قسطاط کا نام دیا گیا، اس جگہ آج مصر کا دارالخلافہ، عرب اور افریقی دنیا کا سب سے بڑا اور جدید ترین شہر آباد ہے، جسے آج دنیا قاہرہ (Cairo) کے نام سے جانتی ہے۔ آج یورپ میں یہ قانون بن چکا ہے کہ جس عمارت پر پرندوں نے انڈے دیئے ہوئے ہوں، وہ عمارت گرائی نہیں جاسکتی یا ان پرندوں کو نقصان پہنچانا قانوناً جرم ہے۔ لیکن ہم میں سے اکثر نہیں جانتے کہ اس کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی۔ اس سے زیادہ حقوق انسانی کا احترام اور کیا ہوگا کہ ساری زمین مسجد ہے لیکن راستے پر نماز نہیں پڑھی جاسکتی یعنی جہاں آپ کی چھوٹی آزادی دوسرے کی بڑی آزادی یا بنیادی حق سلب کرنے لگے، وہاں اس چھوٹی آزادی کی آزادی محفوظ نہیں۔

مہتاب پیکر اعظمی اپنے مضمون ''مسلم شاہان ہند کی حکومتیں اور موجودہ جمہوری نظام'' میں لکھتے ہیں: ''مسلم شاہان ہند کے دور حکومت میں بے شمار مندر تعمیر ہوئے۔ مندروں کی تعمیر میں ہندو رعایا کو بادشاہ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ بہت سے مسلم بادشاہ اپنی بے تعصبی اور اکثریت کی دلجوئی میں مذہب اسلام کی حدوں میں بھی نہیں رہے۔ پھر بھی متعصب مورخین نے مسلم شاہان ہند پر مذہبی کٹر پن کا بے بنیاد الزام لگایا ہے حتی کہ شہنشاہ اکبر اعظم پر بھی مذہبی تعصب کا الزام عائد کرتے ہوئے نہیں ہچکچائے۔ تعصب پرست اور تنگ دل اہل قلم نے اپنی خود ساختہ کہانیوں میں سب سے زیادہ مذہبی تعصب کا الزام شہنشاہ اورنگ زیب پر لگایا ہے۔ لیکن تاریخ کا منصفانہ مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم شاہان ہند نے مذہبی بنیاد پر کبھی جنگ نہیں کی۔ اس کی روشن مثالیں اور دلیلیں موجود ہیں۔ ایک ہندو مبصر سر پی سی رائے نے حقیقت سے کتنی قریب تر بات کہی ہے کہ مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کی وبا کو موجودہ دور نے

جنم دیا ہے۔ مسلم شاہان ہند کے دور حکومت میں عملاً اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کی نظر میں مذہبی تعصب کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ سادھوؤں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد سلطنت میں اوپنشد بھگوت گیتا یوگا وستا کے تراجم فارسی زبان میں کیے گئے۔ دربار شاہ جہانی میں ہندو شعرا کو بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ مسلم شاہان ہند نے اپنی فوجوں میں بڑے بڑے عہدے اور سپہ سالاری ہندوؤں کو بخشتے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں محکمہ مال گزاری کا نظم نائب دیوان رگھوناتھ چھتری کے ہاتھ میں تھا۔ سر پی سی رائے رقم طراز ہیں کہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد سلطنت (1659ء تا 1707ء) میں ہندوؤں کو سلطنت میں اعلیٰ مرتبے تفویض کیے گئے۔

یہ تو مسلم شاہان ہند کی مذہبی رواداری اور حسن سلوک کی ادنیٰ سی جھلک تھی۔ اب آیئے موجودہ جمہوری حکومت کو جانچیں اور پرکھیں۔ آج کے موجودہ جمہوری نظام کے آئینے میں دیکھیں کہ آج مسلمان اقلیت کتنی مظلوم، کتنی غیر محفوظ اور ہندوستان میں کتنی محکوم ہے۔ جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو مذہبی آزادی ہوتی ہے، ان کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اقلیت کے مذہبی مقامات کا تحفظ جمہوری نظام میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن آج کے موجودہ جمہوری نظام میں بالخصوص مسلمانوں کے جان و مال خطرے میں ہیں۔ مذہبی تعصب جمہوریت کے رگ و پے میں رچ بس گیا ہے۔ مذہبی تعصب رکھنے والے فرقہ پرست عناصر کھلے عام آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو سے کھیل رہے ہیں۔ موجودہ جمہوریت میں مسلمانوں کو نہ تو فوج میں بڑے عہدے تفویض کیے جاتے ہیں نہ سرکاری ملازمتوں میں مناسب حقوق ملتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی تعصب برتا جاتا ہے۔ غرضیکہ مسلمانوں کو آج حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو ووٹ بینک سمجھا جاتا ہے اور الیکشن کے زمانے میں جمہوری شطرنج کے کھلاڑی مسلمانوں کو یاد فرما لیتے ہیں اور انھیں اپنے جھوٹے وعدوں سے مستقبل کا سنہرا خواب دکھا دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم اور معاشیات کو کمزور بنانا اور ان کو مظلوم اقلیت بنا کر اپنے تابع و محکوم رکھنا آج کے بھارتی جمہوری نظام کا بنیادی اصول بن چکا ہے۔ کبھی مسلمانوں کو پاکستانی کہہ کر ''ہندوستان چھوڑو، پاکستان جاؤ'' کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ کبھی فرقہ وارانہ فساد برپا کر کے عزت دار اور پردہ نشین مسلم خواتین کی آبرو سے کھیلا جاتا ہے اور انھیں ننگا کر کے ویڈیو

فلم بنائی جاتی ہے۔کبھی نمازوں اور اذانوں پر پابندی لگائی جاتی ہے اور جمہوری حکومت تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد بھی جمہوری حکومت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔فرقہ پرستوں کے نعرے اب بھی سنائی دیتے رہتے ہیں کہ کرشن جنم بھومی متھرا کی عیدگاہ اور کاشی وشوناتھ مندر بنارس اور گیان واپی بنارس کی مسجد ہندو تنظیم کو واپس کردی جائیں۔ یہ کیسی جمہوریت ہے، یہ کیسی مذہبی آزادی ہے جہاں مظلوم مسلمانوں کو دہشت گرد، آتنک واد اور ملک دشمن کہا جاتا ہو"۔(روزنامہ منصف حیدرآباد دکن، 18 جولائی 2013ء)

افغانستان میں روس کی عبرتناک شکست کے بعد امریکہ ایک سپر پاور کے طور پر دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔اس کے مدمقابل بظاہر کوئی ایسی قوت نہیں جو اس کی طاقت کے نشے میں بے لگام سرگرمیوں کے سامنے مزاحمت کر سکے۔اس لیے اس کی طرف سے پوری دنیا میں اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے"نیو ورلڈ آرڈر" (New World Order) کا اعلان کیا گیا۔اس نئے حکم کے بین السطور امریکہ نے پوری دنیا کو بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص دھمکی دی کہ وہ اس کے ہر حکم کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرلے، ورنہ وہ مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔حقیقت یہ ہے کہ مغرب آج بھی اسلام ہی کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتا ہے۔سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر (Henry Kissinger) نے کہا تھا کہ اگلی صدی عیسائیت اور اسلام کی باہمی چپقلش کی صدی ہے۔ 1987ء میں سابق امریکی صدر مسٹر رچرڈ نکسن (Richard Nixon) نے اس وقت کے امریکی صدر رونالڈ ریگن (Ronald Reagan) اور روسی قیادت کو ایک مشترکہ کھلا خط لکھا تھا کہ امریکہ اور روس آپس میں لڑنا چھوڑ دیں، ان کا اصل دشمن اسلام ہے۔ان کی لڑائی سے فائدہ اسلام کو پہنچے گا۔معروف امریکی مفکر سیموئل پی ہننگٹن (Samuel P. Huntington) نے بھی اپنے مشہور مقالے"تہذیبوں کا تصادم" (The Clash of Civilizations) میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ مستقبل میں مغربی تہذیب کا تصادم اسلام سے ہوگا کیونکہ اسلام امریکہ کے لیے خطرناک اور ناقابل برداشت ہے۔

نظریاتی جنگ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی کشمکش کی تاریخ پرانی ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ قومیں اور تہذیبیں ایک دوسرے کو فنا کرتی ہیں اور اس کے ملبے سے ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔اسلحہ کے زور پر تو صرف مسلح افواج کو مات دی جاتی ہے اور

علاقے قبضہ ہوتے ہیں لیکن کسی قوم اور تہذیب کی زندگی کے آثار یکسر مٹ جائیں اور اس کے نام لیوا ہی اس تہذیب کو بھلا بیٹھیں، اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے جس طلسمی طاقت کا وار کرنا ہوتا ہے، وہ نظریاتی جنگ ہے جس میں اتنی طاقت ہے کہ انسان تاریخ تو کیا، اپنا آپ ہی بھول جاتا ہے۔ جرمن فلسفی فریڈلک نطشے (Friedrich Nietzsche) نے کہا تھا: ''اگر کسی ملک کے لوگوں کی سوچ برباد کرنا ہو تو انہیں یہ ذہن نشین کروا دیں کہ وہ جو سوچتے ہیں، صرف وہی صحیح ہے اور صرف وہ لوگ قابل تعظیم ہیں جو ان کی طرح سوچتے ہیں، جن لوگوں کی سوچ ان سے مختلف ہے، وہ عزت کے لائق نہیں''، مجھے یوں لگتا ہے کہ مغرب کی اکثریت اسی سوچ کی حامل ہے۔

علامہ محمد اسد ''اسلام دوراہے پر'' میں لکھتے ہیں: ''یورپ کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں، دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ گہری اور تقریباً مجنونانہ نفرت پر مبنی ہے، یہ محض ذہنی نہیں ہے بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشٹ اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، مگر جیسے ہی وہ اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آ جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے یورپی مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانبداری کے مرتکب ہوئے ہیں اور وہاں ہمیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے''۔

مغربی میڈیا میں مسلمانوں کو جس طرح پیش کیا جاتا ہے، اس سے ایک تیر سے دو نشانے لگائے جاتے ہیں۔ ملک کے اندر استحصال اور ظلم کا جواز فراہم کرنا اور بیرون ملک استعماری انداز سے تباہی یقینی بنانا۔ مسلمانوں کو بدنام کرنے میں مغربی صحافیوں و دانشوروں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مغرب میں مرکزی دھارے کے میڈیا اور علمی حلقوں میں اسلام کے خلاف نظریات اور تصورات کو بہت نازک اور ڈھکے چھپے انداز سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کے خلاف غیر محسوس طور پر نفرت جنم لیتی رہے۔ برطانیہ میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ڈاکٹر نفیس مصدق احمد کہتے ہیں۔ ''گریٹر لندن اتھارٹی کی جانب سے رپورٹ 2007 میں ایک اسٹڈی کی گئی۔ ایک ہفتے کے دوران میڈیا میں اسلام سے متعلق شائع ہونے والے 352 مضامین کا جائزہ لیا گیا اور ان میں 91 فیصد

اسلام مخالف نکلے''۔ مغرب میں بہت مہارت سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فضا تیار کی گئی۔ برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ کے لیے 2008ء میں شائع ہونے والے مضمون "The Shameful Islamophobia at the Heart of Britian's Press" میں پیٹر بورن لکھتے ہیں۔''چند میڈیا آؤٹ لیٹس نے واضح طور پر جھکاؤ اور جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔مسلمانوں کے خلاف اگر کسی نے کوئی جملہ ادا کیا تو اس کی بھی رپورٹنگ ہوئی۔مقصود صرف یہ تھا کہ نفرت پروان چڑھے''۔

میڈیا کی طرف سے مذاہب کی کوریج پر ایک امریکی ریسرچ سکالر کا کہنا ہے کہ اسلام یا کسی اور مذہب پر رپورٹنگ کرنے والے اکثر مغربی صحافیوں کو ان مذاہب کے بارے میں بہت کم سوجھ بوجھ ہوتی ہے جس کے نتیجے میں صورتحال کی منفی تصویر پیش کی جاتی ہے اور کشیدگی بڑھتی ہے۔ 2015ء میں رنگون میں انٹرنیشنل پریس انسٹیٹیوٹ کی سالانہ عالمی کانگریس میں''بریکنگ نیوز کوریج میں مذہبی حساسیت'' کے موضوع پر پینل ڈسکشن کے دوران آدھے رپورٹرز نے تسلیم کیا کہ کوریج میں ان کو درپیش سب سے بڑا چیلنج مذہب کے بارے میں معلومات کا فقدان ہے۔ 2014ء میں برطانوی میڈیا میں شائع ہونے والے 300 مضامین کے تقابلی مطالعے کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ تحقیق سے پتہ چلا کہ 88 فیصد مضامین میں مسلمانوں یا اسلام کو منفی طور پر پیش کیا گیا جبکہ صرف 4 فیصد نے مثبت انداز اپنایا اور باقی 8 فیصد کسی نہ کسی طور پر غیر جانبدار تھے۔مختلف سرویز سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں مذہبی کوریج کرنے والے رپورٹرز کو بنیادی معلومات تک نہیں ہیں مثلاً کہ یہودیوں کا سبت کب شروع ہوتا ہے،عشائے ربانی سے متعلق رومن کیتھولک عیسائیوں کا عقیدہ کیا ہے،کس مذہب میں وشنو کی عقیدت ہے یا مسلمانوں کے لیے ہفتے میں متبرک دن یا عبادات کے اجتماعات کے اوقات کیا ہیں۔صورتحال ہاتھی اور اندھوں کی کہانی کے مصداق ہے۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جس امتحان میں ڈالا ہے، آزادی اس کی بنیادی اساس ہے۔اس آزادی کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے سے اتفاق، اختلاف کرتے رہتے ہیں۔اس حوالے سے مکالمے کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔مسئلہ تب ہوتا ہے جب لوگ ایک دوسرے پر اپنی آرا اور خیالات ٹھونسنا شروع کر دیں۔ان کے جوابی دلائل سننے اور سمجھنے کے بجائے یکطرفہ طور پر اپنے موقف پر قائم رہیں۔ دوسروں کی بات

سمجھنے اوران سے دلیل مانگنے کے بجائے اعتراض، الزام اورمہم جوئی کا طریقہ اختیار کرلیں۔ اس لیے اختلاف رائے ضرور کیجیے مگر شائستگی کے ساتھ اور دوسرے شخص کو بھی حق دیجیے کہ وہ آپ کے ساتھ اختلاف کرسکے۔ جس دعوی کے اثبات کے لیے آپ کے پاس ثبوت یا دلیل نہ ہو، اس کو اچھالنا تہمت والزام کے زمرے میں آتا ہے۔ بھلے آپ کو اس بات کی سچائی کا کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو۔

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تو اے مولائے یثرب (ﷺ) آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

صاحبان علم و دانش کا کہنا ہے کہ مغرب، دین اسلام کے حوالے سے احساسِ کمتری اورخوف کا شکار ہے۔ اپنی عالمگیر سچائیوں کی بدولت دین اسلام مغرب کے ہر گھر پر ہی نہیں، ہر درِ دل پر بھی دستک دے رہا ہے اور خوشبو کی طرح پھیلتا ہی چلا جارہا ہے۔ نومبر 2012ء میں ویٹی کن میں عالمی مجلس کلیسا کے ایک اہم اجلاس میں مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ نے دنیا بھر کے پادریوں کے ہوش اڑا دیے۔ تصدیق شدہ تجزیوں کی روشنی میں آئندہ چار دہائیوں کے بعد مغرب کے کئی ممالک میں دین اسلام اکثریت والا دین بن جائے گا۔ اپنے عقائد ونظریات کے دفاع کے لیے پڑھے لکھے مغرب کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ظاہر ہے جب آدمی دلیل و برہان کے میدان میں شکست کھا جاتا ہے تو ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مصداق جھوٹ اور سبّ وشتم پر اتر آتا ہے۔ یہ علمی اور نفسیاتی شکست خوردگی کی واضح علامت ہے۔ یاد رہے موجودہ عیسائیت کے بانی پولوس ساؤل نے اپنے مذہب کی اشاعت کی خاطر جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے۔ اس نے رومیوں کے نام ایک خط میں لکھا: ''اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی، اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر میں گنہگار کیسے ہوں؟ ہم برائی سے بھلائی پیدا کرتے ہیں''۔ (7:3) بقول شخصے: ''یہودیوں اور عیسائیوں نے جھوٹ بولنا صحیح سمجھ لیا تو اس جھوٹ کو آزادی رائے بتلایا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ شر سے کبھی بھی خیر حاصل نہیں ہوتا''۔ لہٰذا اب امریکی ومغربی حکام، دانشوروں، میڈیا اوران کے تھنک ٹینکس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ آزادیٔ

اظہار کے نام پر مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی توہین کریں گے، اسلامی شعائر اور تعلیمات کا تمسخر اُڑائیں گے، مقدس اسلامی مقامات کی تضحیک کریں گے، الہامی کتاب قرآن مجید کی بے حرمتی کریں گے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے ہودہ ولغو کتابیں منظر عام پر لائیں گے، نازیبا خاکے شائع کریں گے، شرمناک فلمیں بنائیں گے اور دنیا بھر میں مسلمانوں کو تیسرے درجے کا شہری قرار دلائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ان بزرجمہروں کو معلوم نہیں کہ ان گھٹیا حرکات سے دین اسلام کی جولانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس ان کا اپنا ہی خبث باطن دوسروں کے سامنے آشکار ہوجاتا ہے۔ ایسی گھٹیا اور مذموم حرکتیں دین اسلام کا راستہ نہیں روک سکتیں بلکہ یہ دین اپنی آفاقی سچائیوں کے سبب تیزی سے بلندی کی منازل طے کررہا ہے۔

بقول شخصے: ''مسلمانوں نے بائبل کی توہین کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں، ان کے اندر اہل کتاب کے جلیل القدر پیغمبروں کے بارے میں اہانت آمیز تو کیا، کسی قسم کا منفی خیال بھی نہیں آتا۔ خیر یہ تو ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب اور دینی شخصیات کا احترام کرکے کسی پر احسان نہیں کرتے۔ لیکن مہاتما بدھ تو ہمارے نزدیک خدا کے پیغمبر نہیں تھے، ایک بہت بڑے مصلح تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک انسانی تاریخ کی قابل قدر شخصیات میں سے ہیں، ان کی بات بھی چھوڑیے، ہندوؤں کے ساتھ ہم مسلمانانِ پاکستان کی پرانی بلکہ ہزار سالہ لڑائی ہے۔ کرشن جی اور رام چندر جی ان کے دیوتا ہیں۔ کیا کبھی کسی پاکستانی مسلمان نے، مذہبی یا غیر مذہبی بنیاد پر، ان کے بارے میں ایک ناگوار لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا ہے۔ 1947ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پنجاب کے شہروں میں وہ سکھ مسلمان فسادات ہوئے کہ اب تک ان کی تلخ یادیں باقی ہیں لیکن کبھی ایک پاکستانی مسلمان نے سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کی تضحیک میں ایک لفظ کہا ہوتو بتا دیجیے۔ سکھ گوروؤں کا نام پورے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم کے موقع پر سکھوں کے **Fire Brand** لیڈر ماسٹر تارا سنگھ جنہوں نے لاہور میں پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر کرپان لہرائی اور چیلنج دیا کہ ''راج کرے گا خالصہ باقی رہے نہ کو......'' 68 سال گزر گئے ہیں ماسٹر تارا سنگھ کے بارے میں شاید ہی کبھی کسی نے اہانت آمیز بات کہی ہو۔ اس حد تک برداشت کا عملی مظاہرہ کرنے والے مسلمانوں کو وہ لوگ اس کی تلقین

کر رہے ہیں جن کے پاس ہماری عظیم المرتبت ہستیوں کو گالی دینے کے سوا کچھ نہیں بچا''۔

اسلام رواداری، برداشت، امن اور محبت کا درس دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کی دہشت گردی کی سختی سے مذمت اور مخالفت کرتا ہے۔مغرب اسلام کی آفاقی تعلیمات کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ اب اس کی تمام تر توانائیاں محض اس بات پر صرف ہورہی ہیں کہ مسلمانوں کو پوری دنیا میں دہشت گرد قرار دے دیا جائے۔حالانکہ ان سے پوچھنا چاہیے! پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی؟ دوسری جنگ عظیم کس نے شروع کی؟ آسٹریلیا میں 2 کروڑ سے زائد قدیم قبائلی باشندوں **(Aborigines)** کا قتل کس نے کیا؟ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کس نے گرائے؟ 18 کروڑ سے زائد افریقیوں کو کس نے سالہا سال تک غلام بنائے رکھا جس میں سے 88 فیصد کو مر جانے کے بعد بحر اوقیانوس میں پھینک دیا گیا؟ کس نے شمالی امریکہ میں 10 کروڑ سے زائد انڈینز قتل کیے؟ کس نے جنوبی امریکہ میں 5 کروڑ انڈینز کو ہلاک کیا؟ کس نے ویت نام، عراق اور افغانستان پر بلاوجہ جنگ مسلط کی؟ مغرب کبھی ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔

مسلمانوں کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے وحشیانہ مظالم کسی سے مخفی نہیں ہیں۔امریکہ کی سابق وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ **(Madeleine Albright)** سے بی بی سی ورلڈ کے صحافی نے پوچھا،''عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی پابندیوں سے 10 لاکھ افراد ہلاک ہوئے، ہلاک ہونے والوں میں 5 لاکھ بچے شامل ہیں، آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟'' میڈیلین البرائٹ نے جواب دیا **"It is acceptable"** یعنی ان بچوں کی ہلاکت ہمارے لیے قابل قبول ہے۔

1776ء میں امریکی ریاست کے قیام سے لے کر آج تک سیکولر اور لبرل امریکہ نے 70 ملکوں پہ حملہ کیا ہے جس کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی تعداد ایک ارب 30 کروڑ ہے۔ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ اربوں انسانوں کو جمہوریت اور روشن خیالی کے نام پہ موت کی نیند سلا دیا گیا اور امریکہ کے لے پالک آج بھی امریکی انصاف کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ برطانوی حکومت کی قائم کردہ یہودی اسرائیلی ریاست کے قائم ہوتے ہی 7 لاکھ فلسطینیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ایک اندازے کے مطابق 1948 سے لے کر آج تک 53 لاکھ فلسطینیوں کو اسرائیلی فوج شہید کر چکی ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ بچ جانے والے

فلسطینیوں کو بیگار کیمپوں کی طرح کے علاقوں میں محصور کر دیا گیا ہے جہاں انہیں بنیادی انسانی ضروریات کی چیزیں بھی میسر نہیں۔ بھارتی فوج نے بزورِ جبر کشمیری مسلمانوں کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے اور اب تک ایک لاکھ سے زائد کشمیری مسلمانوں کو شہید اور ہزاروں خواتین کی بے حرمتی کر چکی ہے۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے باوجود آج تک کشمیریوں کو استصوابِ رائے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے اور ان کا قتل عام جاری ہے۔ سری لنکا میں حکومت اور تامل باغیوں کے درمیان لڑائی تین عشروں پہ محیط رہی جس میں تقریباً ایک لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا گیا۔ تامل باغیوں کو تربیت اور اسلحہ فراہم کرنے والا پرامن ہندو بھارت اور انہیں کچلنے والی سری لنکا کی بدھ حکومت تھی۔ یوں یہ قتل عام ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ یاد رہے کہ خودکش حملے تامل باغیوں کی ہی ایجاد ہیں جنہیں بھارت نے تربیت دی۔ 28 جون 1914ء کو پہلی جنگ عظیم کا آغاز تب ہوا جب ایک عیسائی گوریلو پرنسپ (Gravrilo Princip) نے آسٹریا کے عیسائی لیڈر فرینز فرڈینینڈ (Franz Ferdinand) کو قتل کیا، یوں پہلی عالمی جنگ کا آغاز عیسائیوں نے کیا، اس جنگ میں دو کروڑ انسان ہلاک ہوئے اور 3 کروڑ سے زائد زخمی ہوئے، جنگ میں بڑے پیمانے پر مشین گنوں، کیمیائی ہتھیاروں اور زہریلی گیسوں کا استعمال کیا گیا، لاکھوں لوگ بھوک، بیماریوں اور افلاس سے ہلاک ہوئے۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز عیسائی جرمن ریاست کے عیسائی پولینڈ پہ حملے سے ہوا۔ یوں دوسری جنگ عظیم کا سہرا بھی عیسائیوں کے سر جاتا ہے۔ اس جنگ میں تقریباً 6 کروڑ انسان جنگ اور 2 کروڑ سے زائد بیماریوں اور بھوک سے ہلاک ہوئے۔ ہٹلر پیدائشی طور پر عیسائی تھا جو بعد میں ملحد اور سوشلسٹ نظریات کی طرف راغب ہوگیا۔ ہٹلر نے اپنے دورِ حکومت میں ایک سے ڈیڑھ کروڑ انسانوں کا قتل عام کیا جن میں یہودی، جنگی قیدی، معذور اور سیاسی مخالفین شامل تھے۔ قتل کے لیے تشدد، بیگار اور زہریلے گیس چیمبرز کا استعمال کیا جاتا تھا۔ شاکا زولو (Shaka Zulu) اٹھارویں صدی میں جنوبی افریقہ کا عیسائی حکمران تھا۔ شاکا نہ صرف جنگ و جدل میں مہارت رکھتا تھا بلکہ دشمنوں کی آبادیوں کو مکمل طور پر ختم کرنے میں بھی بڑی شہرت کا حامل تھا۔ اس نے اپنے دور میں 20 لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا، قیدیوں، عورتوں، بچوں حتیٰ کہ جانوروں کو قتل عام کے حوالے سے بھی شاکا کو پہچانا جاتا ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا فتح کرنے والا سکندر سوئم (Sikandar-e-Azam

(Alexandar the Great) یونان کا عیسائی حکمران تھا۔ دنیا فتح کرنے کے جنون میں وہ ملکوں کو تاراج کرتا ہوا برصغیر تک آ پہنچا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنون میں سکندر نے تقریباً 10 لاکھ سے زائد انسانوں کا قتل عام کیا جس کی بنا پر اسے سکندر اعظم کہا جاتا ہے۔ اسٹالن (Joseph Stalin) روس کی کیمونسٹ پارٹی کا سربراہ تھا جو پیدائشی طور پر عیسائی اور بعد میں سوشلسٹ اور ملحد نظریات کی طرف مائل ہوگیا، اس کے دور حکومت میں تقریباً 6 کروڑ لوگوں کو قتل کیا گیا، جبری مشقت کے گلاگ کیمپوں میں بیس لاکھ مزدوروں کو قتل کیا گیا۔ حیرانی یہ ہے کہ 1945ء اور 1948ء میں اسے دو بار نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا۔ 1942ء میں سوشلسٹ اور ملحد اسٹالن کے حکم پر کریمیا کے ڈھائی لاکھ شہریوں کو زبردستی ان کے ملک سے نکال دیا گیا، ان لوگوں کو تیس منٹ کا وقت دیا گیا اور اس کے بعد انہیں ٹرینوں میں لاد کر کریمیا سے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں میں سے اکثریت کو کشتیوں میں لاد کر سمندر کے بیچ لے جا کر ڈبو دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق ملک بدر کیے گئے افراد میں سے بہت کم زندہ بچے۔ لینن (Vladimir Lenin) روس کا کیمونسٹ صدر اور مارکسٹ، سوشلسٹ اور ملحد نظریات کا حامل تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں 2 کروڑ انسانوں کا قتل عام کیا گیا، اس کے دور حکومت میں تمام زمینیں حکومت کی ملکیت میں لی گئیں جن پر کسانوں سے مزدوری لی جاتی تھی اور حکومت کی مرضی کی اجرت دی جاتی تھی۔ میڈیا پہ مکمل حکومتی کنٹرول قائم کیا گیا، کسانوں کی مزاحمت کو کچلنے کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال اور بے رحم قتل عام کیا گیا۔ جینرخ یگوڈا Genrikh Yagoda کیمونسٹ روس کی خفیہ پولیس کا چیف اور بدنام زمانہ گلاگ کیمپوں کا بانی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اندازاً دس لاکھ انسانوں کو گلاگ کیمپوں میں تشدد، بیگار اور اذیتیں دے کر قتل کیا۔ نپولین (Napoleon) فرانس سے تعلق رکھنے والا ایک عیسائی لیڈر تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں پورے یورپ پہ انقلابی جنگوں کا سایہ مسلط کیا جس میں اندازاً 50 لاکھ افراد لقمہ اجل بن گئے۔ چونکہ وہ ایک عیسائی تھا، اس لیے اس شخص کو نہ صرف بطور ہیرو تسلیم کیا گیا بلکہ اسے دنیا کا عظیم فاتح اور جرنیل مانا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں روسی عیسائی ریاست نے قفقاز روس کے رہنے والوں کو نشانہ بنایا۔ اندازاً پندرہ لاکھ مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پانچ لاکھ کو نقل مکانی پہ مجبور کر دیا۔ نقل مکانی کرنے والوں کی اکثریت بھوک، افلاس اور بیماریوں کا شکار ہو کر ختم ہوگئی، افسوس کہ آج ہم

ان مسلمانوں کے بارے میں جانتے تک نہیں۔ جنرل لوتھروون ٹروتھا (General Lothar Von Trotha) ایک جرمن عیسائی جرنیل تھا، اس نے نمیبیا کے علاقے ہیریرو (Herero) اور نما کا (Namaqua) میں ایک لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا، اس نے ہیرو رو قبائل کو قتل کرنے کے بعد بقیہ لوگوں کو صحرا میں دھکیل دیا جہاں شدید بھوک اور پیاس سے ان کی ہلاکت ہوئی۔ اس کا حکم تھا کہ ''ہیرورو جہاں نظر آئے، قتل کردو، چاہے وہ مرد ہو، عورت ہو یا بچہ ہو''۔ گیارہویں صدی میں عیسائی پوپ کی اجازت سے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز کیا گیا۔ ان جنگوں کے نتیجے میں تقریباً ڈھائی کروڑ انسانوں کو قتل کیا گیا اور کئی ملکوں کو تاراج کر کے تباہ کر دیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اتنے بڑے قتل عام کے بعد کوئی شرمندگی یا معذرت ہوتی مگر شاید مہذب کہلوانے والے ایسا نہیں کرتے! روانڈا (Rwanda) ایک عیسائی ملک ہے جہاں کی اکثریتی آبادی عیسائی اور 2 فیصد مسلمان ہیں۔ 1994ء میں اکثریتی ہوتو (Hutu) اور اقلیتی تتسی (Tutsi) قبائل کے درمیان نسلی فسادات پھوٹنے کی وجہ سے صرف 100 دن کے اندر دس لاکھ انسانوں کا قتل عام کر دیا گیا۔ تقریباً پانچ لاکھ خواتین کی عصمت دری کی گئی اور اکثر کو قتل کر دیا گیا۔ یہ ایک منظّم قتل عام تھا جو حکومت کے ایما پر کیا گیا اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نسل کشی کی گئی۔ سترھویں صدی کے آخر میں فرانسیسی حکمرانوں کے خلاف انقلاب کی لہر اُٹھی جس میں عیسائیوں نے حکمرانوں کا تختہ الٹا، انقلاب کا مقصد حکمرانوں سے نجات کے ساتھ ساتھ سیکولر، لبرل اور روشن خیال معاشرے کا قیام تھا۔ انقلاب کے دوران ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا گیا۔ عراق پہ امریکہ نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے شبہ میں حملہ کیا اور قریباً پندرہ لاکھ عراقیوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے بعد معذرت کر لی گئی کہ اطلاع غلط تھی۔ 1975ء میں ریاست کمبوڈیا میں سرخ کیمونسٹ انقلاب آیا جسے خمیر روگ (Khmir Rouge) کا نام دیا گیا۔ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے حقوق پہ اُٹھنے والی اس سرخ آندھی نے صرف چار سال کے دوران 20 لاکھ انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگین کیے۔ کالے مقامی امریکیوں کا رنگ کالا تھا اور وہ امریکہ کے مقامی باشندے تھے۔ نئے علاقوں کی تلاش میں یورپ سے عیسائی تاجر امریکہ آئے، کالے امریکیوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور یہی ان کی بڑی غلطی تھی۔ تاجروں نے ان کی زمینوں پہ قبضہ کیا، ان کے مال

مویشی لوٹے اور 10 کروڑ مقامی امریکیوں کو قتل کر دیا۔آج امریکہ میں کالے اقلیت میں اور عیسائی گورے امریکہ کے مالک ہیں۔ وہ ہر سال کالوں کی نسل کشی کی خوش میں یوم تشکر مناتے ہیں اور خود کو سکیولر اور لبرل قوم قرار دیتے ہیں۔ 1992ء میں بوسنیا میں بسنے والے مسلمانوں کی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نسل کشی کی گئی۔ سرب اور کروٹ عیسائیوں نے ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل، بیس لاکھ کو ملک بدر اور بیس ہزار سے زائد خواتین کی عصمت دری کی۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس دوران عالمی دنیا تماشا دیکھتی رہی۔ 1943ء میں برطانوی وزیراعظم چرچل کے حکم پر بنگالیوں پر ایک مصنوعی قحط مسلط کیا گیا۔ کھانے پینے کی اشیاء، خوراک اور خوردنی اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کی گی جس کے نتیجے میں 70 لاکھ بنگالی لقمہ اجل بن گئے۔ اس کی بنیادی وجہ جنگ عظیم دوئم کے بعد برطانیہ کا خوراک اور کھانے پینے کی اشیاء برطانیہ میں ذخیرہ کرنا تھا۔ افغانستان میں جب روس سرخ انقلاب ٹینکوں پہ بٹھا کر لایا تو مقامی سرخوں نے پرتپاک استقبال کیا۔ اس انقلاب میں 15 لاکھ افغانوں کا خون پیش کیا گیا اور پچاس لاکھ کو ملک بدر کر دیا پھر سیکولر امریکہ بہادر کو جوش آیا اور افغانستان پہ چڑھ دوڑا جس میں 4 لاکھ افغانوں کا قتل عام کیا گیا اور یہ خونریزی اب بھی جاری ہے۔

بودھوں کے ہاتھوں 184ء سے 205ء تک 60 تا 70 لاکھ انسانوں کا خون بہا۔ 755ء سے 763ء تک تین کروڑ تیس لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ 1340ء تا 1368ء تک ہونے والی جنگوں میں تین کروڑ لاشیں گریں۔ 1616ء تا 1662ء تک دو کروڑ پچاس لاکھ انسانوں کی گردنیں کاٹی گئیں۔ 1758ء میں مشرقی ترکستان سنکیانگ پر حملہ کر کے 12 لاکھ ترک مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ 1851ء تا 1864ء تک دس کروڑ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ 1864ء تا 1877ء کے دوران DUNGAN انقلاب نے ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کا خون بہایا۔ 1928ء تا 1937ء کی خانہ جنگی میں 50 لاکھ افراد کو قبروں میں پہنچا دیا گیا۔ مسیحی جرنیلوں اور صلیبی لشکروں نے بھی انسانیت کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ 1207ء تا 1472ء تک چنگیزی لشکر جس میں بڑی تعداد مسیحی جرنیلوں کی تھی، نے ایشیا کو تباہ کر ڈالا اور تین سے چھ کروڑ انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا ڈالے۔ 1864ء تا 1870ء کی پیرا گوآئن وار میں 12 لاکھ انسان لقمۂ اجل بنے۔ 1911ء تا 1922ء کے میکسیکن انقلاب میں بیس لاکھ افراد مار دیے گئے۔ 1939ء تا 1945ء کی

دوسری جنگ عظیم میں سات کروڑ انسان ہلاک ہوئے۔ 1955ء تا 1957ء کی ویتنام جنگ میں 60 لاکھ انسان ذبح ہوئے۔ 1998ء تا 2003ء کی دوسری کانگو وار میں 5 لاکھ انسانوں کی لاشیں گرائی گئیں۔ پھر عراق پر امریکی حملوں کے نتیجے میں بیس لاکھ افراد کا خون ناحق بہا۔ افغانستان پر روس کے حملے میں پندرہ لاکھ اور امریکہ کے حملے میں دو لاکھ افراد رزق خاک ہوئے۔

جارج ولیم فریڈرک (George William Frederick) کے نام سے برطانیہ کا ایک بادشاہ گزرا ہے، جو ''جارج سوئم'' (George III) کے طور پر مشہور تھا۔ اس نے سلطنت برطانیہ پر طویل حکمرانی کی۔ 25 اکتوبر 1760ء سے 29 جنوری 1820ء تک یعنی 59 سال 96 دن تاج وتخت برطانیہ اس کے حوالے رہا۔ ایک مرتبہ اس نے اعلان کیا کہ ''امریکہ میں رہنے والے ہر مرد ریڈ انڈین کی کھوپڑی لانے والے کو 40 پاؤنڈ اور ہر ریڈ انڈین عورت اور 12 سال سے کم عمر بچے کی کھوپڑی لانے والے کو 20 پاؤنڈ بطور انعام دیا جائے گا''۔ اس اعلان کے بعد بعض انگریزوں کے لیے ''روزگار'' کے مواقع پیدا ہو گئے اور انہوں نے ریڈ انڈین باشندوں کے کٹے ہوئے سروں کا کاروبار شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں تاج برطانیہ نے کھوپڑیاں لانے والوں کو لاکھوں پاؤنڈز ادا کیے۔ اس وقت یہ بات مشہور تھی کہ برطانوی باشندوں کو رقم کی یہ ادائیگی تاج برطانیہ کا ایک ''تحفہ'' ہے۔

1912ء میں مراکش کے صوبے مکناس کے شہر اکورائی میں مسلمانوں کی ایک بغاوت دبائی گئی۔ اس سلسلہ میں پندرہ مسلم باغیوں کے سر خاص طور پر اس مقصد کے لیے منتخب کیے گئے۔ ان کے سر اتار کر ان کی تصویر سے ایک ڈاک ٹکٹ بنائی گئی۔ اس ڈاک ٹکٹ کو بڑی دیر تک فرانس میں خطوط بھیجنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ سروں کو کاٹ کر اس کی تصویر ڈاک ٹکٹ پر شائع کرنے کی مثال 'مہذب' یورپ سے بڑھ کر کہیں نہیں پائی جائے گی۔

6 اگست 1945ء کو انسانی تاریخ کا ایک ہول ناک ترین دن تھا، جب دنیا میں ''قیام امن'' اور جنگ کے خاتمے کے لیے تقریباً ایک لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا ذکر ہے۔ اس جنگ میں امریکہ اور جاپان بھی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، جاپانی فوجیں، اتحادی فوجوں پر پے در پے حملے کر کے انہیں خاصا نقصان پہنچا چکی تھیں۔ امریکی فوجیں بھی جاپانیوں کی پیش قدمی سے خاصی بوکھلائی ہوئی تھیں کہ اچانک امریکہ نے ایک ایسا قدم اٹھایا جس سے جنگ ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ہمدردی،

برداشت، رواداری، حقوق انسانی، روشن خیالی، انسانیت اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ سے بھی لوگوں کا اعتماد ختم ہوگیا۔ 50 برس قبل جاپان کے شہر، ہیروشیما (Hiroshima) پر دنیا کا پہلا اٹیم بم گرایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا اور تقریباً ایک لاکھ ہنستے مسکراتے چہرے ابدی نیند سو گئے، 37 ہزار افراد زخمی اور 13 ہزار لاپتا ہو گئے۔ زندہ رہ جانے والوں کی حالت بھی ایسی تھی کہ ان کے لیے مرجانا بہتر تھا۔ ان کا کوئی علاج نہیں تھا، وہ تڑپ تڑپ کر مرتے رہے، ان کی کھال نے جسم چھوڑ دیا۔ اس قیامت کے بعد اس شہر میں نہ کوئی شور تھا نہ غل، نہ چیخیں تھیں، نہ کراہیں، یہ سب کے سب جھلسے ہوئے زندہ انسان، خود انسانوں کا شکار بن گئے تھے۔

جس طیارے سے بم گرایا گیا، اس کا نام ''انیولا گے (Enola Gay)'' تھا۔ یہ بی۔ 29 بمبار طیارہ تھا۔ امریکی صدر ٹرومین (Harry S.Truman) 3 اگست کو یہ بم گرانا چاہتے تھے، لیکن موسم ٹھیک نہ ہونے کی بنا پر انہیں یہ خطرناک مشن تین دن کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ مشن کو اس حد تک پوشیدہ رکھا گیا کہ طیارے کے اڑنے تک، طیارے کے پائلٹس کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کیا کرنے جارہے ہیں، جب طیارہ ہیروشیما کے قریب پہنچا تو پائلٹ نے اپنے تمام ساتھیوں کو بتایا کہ وہ تاریخ کا پہلا اٹیم بم گرانے جارہے ہیں، کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ بم کتنا تباہ کن ہوگا۔ ہوابازوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ اگر کسی وجہ سے ہیروشیما پر بم نہ گرایا جاسکے، تو اسے جاپان کے کسی دوسرے شہر ''کوکوراہ'' یا ''ناگاساکی'' پر گرادیا جائے اور اگر کہیں ممکن نہ ہوسکے تو سمندر ہی میں پھینک دیا جائے۔

6 اگست 1945ء کی صبح، ہیروشیما کے خوش وخرم لوگ اپنے انجام سے بے خبر اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر چہل پہل شروع ہوگئی تو نو بجے کے قریب فضا میں تین طیارے نمودار ہوئے، ان طیاروں کی آمد سے قبل خطرے کا سائرن بجایا گیا لیکن لوگوں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ جنگ کے دنوں میں ایسے سائرن تو روز کا معمول تھے۔ ان طیاروں میں سے دو نے پیراشوٹ نیچے پھینکے، یہ پیراشوٹ نہایت خوب صورتی سے تیرتے ہوئے آہستہ آہستہ زمین کی طرف آنے لگے۔ لوگ گھروں سے باہر نکل کر ابھی ان پیراشوٹس کو حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک خوف ناک دھماکا ہوا جس سے پورا جاپان لرز گیا، یکا یک ایک ایسی چمک پیدا ہوئی جس کے سامنے سورج کی روشنی بھی

ماند پڑ گئی، اس چمک سے سیکڑوں افراد اپنی بینائی سے محروم ہو گئے۔ دھماکہ کی ہیبت ناک آواز سے لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ گویا ایک قیامت کا منظر تھا۔ آگ اور دھوئیں کے بادل آسمان سے باتیں کر رہے تھے جیسے تمام جاپانیوں کی روحیں آسمان کی طرف جا رہی ہوں، سارا شہر آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دھواں اس انداز سے بادلوں کی شکل اختیار کر گیا تھا جیسے سیاہ گھٹا چھائی ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے زندگی سے بھرپور شہر، ہیروشیما راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے نقشے سے اس کا وجود ہی مٹ گیا۔ ہیروشیما کی زمین پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ آج تک وہاں کوئی فصل نہیں اگائی جا سکتی۔

اُن دنوں جرمنی تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا، لیکن جاپان مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا. تین روز بعد جاپان کے دوسرے شہر، ناگا ساکی **(Nagasaki)** پر دوسرا ایٹم بم گرایا گیا، جو ٹھیک نشانے پر نہ گرنے کی وجہ سے ہیروشیما جیسی تباہی نہ لا سکا۔ انسان طاقت کے نشے میں ذلت کی اُن پستیوں کو چھو لیتا ہے کہ شیطانیت بھی شرما جائے۔ نیرو، چنگیز خان اور اپٹیلا کی خون آشامی کا رونا رونے والے یہ ظلم دیکھ کر ماضی کی تمام داستانیں بھول گئے اور شاید اُن سب ظالموں کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی۔ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ایٹم بم دوسری جنگِ عظیم کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ''رحم دلی'' کی ایسی ہی مثال ہے، جیسے ایک شیر نے بکری کو کھانے کے بعد، یہ سوچ کر اس کے بچے کو بھی کھا لیا کہ بے چارہ ماں کے بغیر بھوکا مر جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہیروشیما پر بم گرا کر بھی تشفی نہ ہوئی تو **9** اگست **1945**ء کو ناگا ساکی پر دوسرا اٹیم بم گرا دیا گیا۔

نوبیل انعام کا نام سنتے ہی ہمارے ذہنوں میں انسانیت کی بہتری کے لیے کی جانے والی تحقیق کا خیال آتا ہے لیکن یہ اہم ایوارڈ ماضی میں ایسے سائنسدانوں کو بھی دیا جا چکا ہے جن کی تحقیقات نے آگے چل کر انسانیت کو نقصان پہنچایا۔ ایوارڈ یافتہ سائنسدانوں میں وہ بھی شامل ہیں جن کی تحقیق آگے چل کر کیمیائی اور ایٹمی حملے کا موجب بنیں۔ نوبیل انعام کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی سفارش پر ماضی میں غیر انسانی تحقیقات اور ضرر رساں دریافت پر بھی نوبیل ایوارڈ دیئے گئے جن کی وجہ سے انسانیت کا نقصان ہوا۔ **1918**ء میں کیمیائی جنگ کے بانی سمجھے جانے والے جرمن کیمیاء دان فرٹز ہیبر **(Fritz Haber)** کو کیمسٹری کے شعبے میں نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ انہوں نے امونیا کے ذریعے فرٹیلائزرز تیار کرنے کا طریقہ

دریافت کیا تھا جس کے استعمال سے پیداوار میں اضافہ ممکن ہوا لیکن ہیبر نے بعض ایسی زہریلی گیسز بھی دریافت کیں جن کا استعمال پہلی جنگ عظیم میں ہوا۔ 1945ء میں امریکہ کی جانب سے جاپان پر دو ایٹم بم گرائے جانے کے فوراً بعد جوہری انشقاق کے موجد جرمن سائنسدان اوٹوہان (Otto Haln) کو بھی نوبیل ایوارڈ سے نواز دیا گیا۔ انہوں نے 1938ء میں جوہری انشقاق کا نظریہ پیش کیا تھا جو آگے چل کر ایٹم بم کی تخلیق کا موجب بنا۔ 1912ء میں زہریلی گیس دریافت کرنے والے فرانسیسی کیمسٹ وکٹر گریگنارڈ (Paul Sabatier Victor Grignard) کو بھی نوبیل انعام دیا گیا تھا۔ اسی طرح نیورولوجسٹ ایگاس مونس (Egas Moniz) اور والٹر ہیز (Walter Hess) کو 1949ء میں طب کا نوبیل انعام دیا گیا۔ انہیں یہ انعام دماغ کی سرجری کا متنازع طریقہ متعارف کرانے پر دیا گیا جسے آج کل لوبوٹومی کہا جاتا ہے۔ نوبیل ریسرچ کمپنی نے ایسے سائنسدانوں کو بھی انعامات سے نوازا جن کی ماحولیات کے لیے کام کرنے والی تنظیموں نے مذمت کی۔ 1939ء اور 1948ء میں سوئس سائنسدان پال ملر (Paul Harmann Muller) کو ملیریا پھیلانے والے مچھر اور کیڑوں کو مارنے والی دوا ڈی ڈی ٹی ایجاد کرنے پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈی ڈی ٹی انسانوں اور جانوروں کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن مجال ہے یورپ میں کوئی ان کے خلاف آواز اٹھائے یا ان پر تنقید کرے۔ گویا انہیں انسانیت کے خلاف کام کرنے پر ''مقدس گائے'' کا مقام حاصل ہے۔

معروف کالم نگار یاسر پیرزادہ اپنے کالم ''غلامی'' میں لکھتے ہیں: ''اس دنیا میں ہر اُس شخص کی رہائی کا امکان موجود ہے جو کسی قید خانے میں بند ہے...... مگر اُس شخص کی رہائی کا کوئی امکان نہیں جسے یہ علم ہی نہیں کہ وہ قید میں ہے۔'' ایک زمانہ تھا جب امریکہ میں غلامی عام تھی، غلاموں کو مال اسباب کی طرح بیچا اور خریدا جا سکتا تھا۔ چونکہ گوروں کے نزدیک یہ انسان ہی نہیں تھے، سو ان کے حقوق کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، انہیں ذاتی جاگیر سمجھا جاتا تھا جو تاحیات تصرف میں رکھی جا سکتی تھی۔ اخبارات میں سیاہ فام غلام برائے فروخت کے اشتہار کچھ یوں شائع ہوتے کہ ''خوش خبری...... تندرست، توانا اور تنومند سیاہ فام غلام دستیاب ہیں...... جوان، عورتیں اور بچے...... اسٹاک محدود ہے، پہلے آیئے پہلے پایئے۔'' غلاموں کے

ساتھ بالکل جانوروں کا سا برتاؤ کیا جاتا، اُن کی بیویوں کو لونڈیاں بنا کر علیحدہ کر دیا جاتا، بچوں کو کسی دوسرے کے ہاتھ یوں فروخت کر دیا جاتا گویا وہ کوئی بے جان چیز ہے جس کا اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کام میں ذرا سی کوتاہی اور نافرمانی پر اذیت ناک سزائیں دی جاتیں اور اس مقصد کے لیے قوانین وضع کیے جاتے تاکہ ان سزاؤں کو قانون کا لبادہ پہنایا جا سکے۔ بازاروں میں سیاہ فام غلاموں کی بولیاں لگتیں۔ خاندان کے خاندان بچھڑ جاتے۔ 1860ء تک امریکہ میں دس لاکھوں غلاموں کا بیوپار ہوا۔ پھر کچھ لوگوں کے اندر کا انسان جاگا، احساس ہوا کہ یہ سیاہ فام لوگ بھی انسان ہیں، انہیں غلام رکھنا کچھ ٹھیک نہیں۔ سو غلامی کے خلاف تحریک چلی اور ایسی چلی کہ امریکہ میں خانہ جنگی چھیڑ گئی۔ ابراہیم لنکن منظرنامے پر ابھرا، اُس نے جنگ جیتی، فاتح ٹھہرا اور بالآخر امریکہ سے غلامی کا خاتمہ ہوا۔ پھر اگلا دور آیا جب امریکہ میں سیاہ فام افراد کو سرعام کسی جرم کا الزام عائد کر کے موقع پر سزا دے دی جاتی، اسے **Public Lynching** کہا جاتا ہے۔ یہ 1870ء سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک کا زمانہ ہے، یعنی جس زمانے میں اپنے ہاں آزادی کی تحریک شروع ہونے جا رہی تھی اُس وقت امریکہ میں سفید فاموں کا چلن یہ تھا کہ گروہ کی شکل میں کسی جیل پر حملہ آور ہوتے اور سیاہ فاموں کو نکال کو سرعام تشدد کا نشانہ بناتے، کسی درخت کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیتے، ہاتھ پیر توڑ ڈالتے یا پھر زندہ ہی جلا ڈالتے۔ سیاہ فام کو سزا دینے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اُس پر کوئی بھی الزام عائد کر دیا جائے۔ ایک مرتبہ ایک سیاہ فام کو جنونی گروہ نے محض اس لیے مار دیا کہ اُس نے ایک سفید فام پولیس افسر کو ''مسٹر'' کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ یہ 1940ء کے امریکہ کا احوال ہے۔ اُس زمانے میں ہونے والے مظالم کی تصاویر دیکھیں تو روح لرز اٹھتی ہے۔ پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس ظلم کے خلاف آواز بلند ہوئی، مزاحمت شروع ہوئی، قانون بنایا گیا اور اس جرم کی پہلی سزا 1946ء میں ایک شخص کو دی گئی جس نے ایک سیاہ فام کارکن کو قتل کیا تھا۔ سزا تھی ایک ہزار ڈالر جرمانہ اور ایک سال قید۔ اس ظلم کے خلاف مزید قانون سازی ہوئی، مؤثر اقدامات کیے گئے اور بالآخر اس لعنت کا خاتمہ ہوا۔ اسی طرح اگلا دور نسلی تعصب کا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں امریکہ کا نسلی تعصب اس نہج پر تھا کہ کالے اور گوروں کے سکول علیحدہ تھے، گورے کو کالے پر برتری حاصل تھی، بس میں اگر کوئی گورا سوار ہوتا تو کالے کو اُس کے لیے اپنی نشست چھوڑنی پڑتی تھی۔ یہ قانوناً لازم تھا، کلب

اور عوامی مقامات پر بھی نسلی تعصب کا یہی حال تھا۔......آج پیچھے مڑ کر دیکھیں تو یقین نہیں آتا کہ امریکہ جیسے ملک میں فقط ڈیڑھ سو سال پہلے تک غلامی اپنی بدترین شکل میں رائج تھی اور کسی کو احساس تک نہیں تھا کہ وہ انسانوں پر ایسا ظلم روا رکھ رہے ہیں۔ یہ کیسے ہوا کہ کروڑوں لوگ اس غلامی کو بالکل معمولی کی بات سمجھتے رہے اور انہیں پتہ ہی نہیں چلا! اسی طرح جب کالوں کو درختوں سے لٹکا پر پھانسی دی جاتی تھی یا انہیں فقط الزام لگا کر سر عام جلا دیا جاتا تھا تو اُس دور کے امریکی معاشرے نے کئی دہائیوں تک اس ظلم کو بالکل ''نارمل'' کیسے لیا، کیوں کسی کا ضمیر نہیں جاگا؟'' (روزنامہ جنگ لاہور، 20 ستمبر 2017ء)

بقول عبداللہ'' گجراتی کہاوت تو یہ ہے کہ کوّے ہر جگہ کالے ہوتے ہیں۔ مگر ایک ملک ایسا ہے جہاں کوّے سفید بھی ہوتے ہیں۔ بھئی ضرور ہوتے ہوں گے، اب امریکہ کو ہی دیکھیے جہاں کی ہر سیاہ شے بھی سفید ہے۔ امریکی ریاست فلوریڈا کی عدالت نے بالآخر سفید فام جارج زمرمین (George Michael Zimmerman) کو ایک سترہ سالہ سیاہ فام کے قتل کے مقدمے میں بے گناہ قرار دے دیا۔ زمرمین نے 26 فروری 2012 کی رات ٹریوون مارٹن (Trayvon Martin) کو محض اس کی رنگت کی بنا پر مشکوک سمجھتے ہوئے گولی ماردی تھی۔ اس عدالتی فیصلے کے خلاف فلاڈلفیا، سان فرانسسکو، شکاگو اور واشنگٹن ڈی سی سمیت امریکہ کے تقریباً ایک سو شہروں میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ بدترین نسلی تعصّب پر مبنی اس واقعے نے پورے امریکہ کو تاریخ کی عدالت میں برہنہ کھڑا کردیا۔ دنیا کے سب سے روشن خیال اور ترقی یافتہ ملک میں ایک مرتبہ پھر نسلی امتیاز، نظامِ انصاف اور ہتھیاروں کی نگرانی سے متعلق بہت سے سوالات بہ انداز دگر کھڑے ہو گئے ہیں۔

مغرب ایک مکمل دھوکا ہے اس کی تمام برتری دراصل اس کے نسلی تسلط کے مکروہ ذہن سے وابستہ ہے۔ یہ تعلیم اور ہمہ گیر ارفع انسانی خیالات ونظریات پر یقین کا معاملہ نہیں، جیسا کہ بعض روشن خیال دانشور یا پیٹ سے سوچنے والے مفکرین باور کراتے ہیں۔ امریکہ اور یورپی اقوام کی نام نہاد ترقی اور روشن خیالی دراصل ایک منظّم جبر کا تاریخی سلسلہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ نسلی برتری کا ایک حیرت انگیز جنون ہے۔ جس نے قوت کے ذریعے دنیا بھر کے وسائل کا ہی نہیں بلکہ علم کا بھی استحصال کیا۔ اگر چہ ابراہم لنکن نے ایک موقع پر کہا تھا: "Achievement has no color" مگر حقائق

کا ایک رنگ امریکہ میں ضرور ہوتا ہے۔ جس کا اظہار ادبیات میں نوبیل اور ناول میں پلٹزر پرائز پانے والی معروف سیاہ فام ٹونی موریسن (Morrison Toni) نے اِن الفاظ میں کیا تھا: "In this country American means white"

26 فروری 2012ء کو امریکہ میں ایک سیاہ فام امریکی طالب علم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ کسی اور کے نہیں خود امریکی صدر کے الفاظ ہیں، بارک اُوباما نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ٹریون مارٹن (Trayvon Martin) کو نشانہ بنایا گیا تو میں نے کہا تھا کہ یہ میں بھی ہوسکتا تھا۔ باالفاظ دیگر آج سے کچھ عرصہ پہلے میں خود بھی ٹریون مارٹن (Trayvon Martin) ہوسکتا تھا۔ اُوباما نے صرف اتنا ہی نہیں کہا بلکہ یہ بھی کہ معدودے چند ہی افریقی امریکی ہوں گے جنہیں نسلی امتیاز کا کوئی تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ اِن الفاظ میں ماضی اور حال کا امریکہ سمٹ آیا ہے۔ پوری دنیا میں حقوق انسانی اور مساوات کا درس دینے والے امریکہ کا یہ حال ہے کہ وہاں نسلی امتیاز معمول کی بات ہے۔ وہاں رہنے والے 15 فیصد سیاہ فام افراد کو ''شودر'' سمجھا جاتا ہے۔ اگر پولیس کے ہاتھوں کسی سیاہ فام کا ''اتفاقی قتل'' ہو جائے تو اسے قاتل، نشہ باز، چور یا ڈکیت قرار دے کر اس کی موت کو جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ سیاہ فام افراد کے ساتھ نسلی امتیاز طبقاتی کشمکش میں تبدیل ہو رہا ہے۔ وہاں کے غیر منصفانہ نظام عدل نے امریکہ کے اصل چہرے سے نقاب اُلٹ دیا ہے۔

امریکی تاریخ نسلی جنون میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی تاریخ ہے۔ اب تک کے اعداد و شمار میں یہ بتایا جاتا رہا کہ امریکا نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں 70 لاکھ ریڈ انڈین (سرخ ہندی) قتل کیے۔ لیکن مائیکل مین (Michael Mann) کی کتاب The Dark Side of Democracy نے اعداد و شمار کے ذریعے امریکی بہیمیت اور سفاکیت کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ مائیکل مین کے مطابق امریکیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے سرخ ہندیوں کی تعداد دس کروڑ ہے۔ مصنّف کے مطابق مہذب، روشن خیال اور انسانی حقوق کے علمبردار امریکہ کے کم از کم پانچ صدور کے جاری کردہ بہیمانہ فرامین کے نتیجے میں امریکہ کے اصل باشندوں کو ہلاک کیا جاتا رہا۔ اِن صدور میں جیفرسن، واشنگٹن، جیکسن، لنکن اور روزویلٹ شامل تھے۔ جارج واشنگٹن نے ریڈ انڈین کو بھیڑیئے قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ دونوں وحشی شکاریوں میں صرف شکلوں کا فرق ہے۔ اُس

نے اپنے جنرل اِروکوئس (Iroquois) کو قبیلے پر حملے کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا کہ اُن کی آبادیوں کو تباہ و برباد اور اُن کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں۔

تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) کے دورِ صدارت میں ریڈ انڈین کی دو لاکھ مربع میل زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ اُس کا حکم یہ تھا کہ دشمن قبائل کی جڑیں کاٹ دو اور انہیں مسی سپی سے پرے دھکیل دو۔ اِن وحشی قبائل کے مکمل خاتمے کے سوا کوئی بات اہم نہیں۔ ایک اور امریکی صدر اینڈریو جیکسن (Andrew Jackson) نے ریڈ انڈین کے خلاف اپنے زہریلے ارشادات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جیکسن نے بھی اِن قبائل کے خلاف جنگ جاری رکھی اور لنکن کا عہد بھی اِسی نوع کی بدترین نسل کشی کا رہا۔ قتل و غارت گری کے اِس وحشیانہ کھیل سے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں تک کو استثنٰی نہیں ملا۔ سرخ ہندیوں کی کتنی ہی ملالائیں کسی عالمی فورم پر تشنہ کلام ہی جانیں ہار بیٹھیں۔ ان کے مرثیے تک کسی نے نہیں پڑھے۔ محض نسلی امتیاز کی بنا پر ریڈ انڈین کی نسل کشی کے لیے اُنہیں اقساط میں موت دینے کا نہایت اذیت ناک کھیل کھیلا گیا۔ صرف کیلیفورنیا کی مثال کافی ہوگی جہاں نسل کشی کے بہیمانہ طریقوں نے انسانیت کا سر شرم سے ایسے جھکایا ہے جو اب کبھی بلند نہ ہو سکے گا۔ امریکی جمہوری درندوں نے سرخ ہندی عورتوں کو مردوں سے علیحدہ کر دیا تھا تاکہ اُن کی نسلی افزائش دائمی طور پر رُک جائے۔ اُن میں لواطت کو فروغ دینے کی پشت پر یہ مکروہ سوچ تھی کہ بیماریاں انہیں گھیر لیں۔ مردوں سے دور کی گئی عورتوں کو کسبیوں کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا گیا۔ صحت کی سہولتوں سے محروم یہ عورتیں متنوع بیماریوں کی جب پوٹلیاں بن گئیں تو اُنہیں پھر سُرخ ہندی مردوں کی طرف دھکیل دیا جاتا اور یوں جنسی بیماریاں، کمزور صحت اور تولیدی صلاحیتوں کے سلب کرنے کی محرک ثابت ہوئیں۔ آمریتیں بہت دور اور دیر تک دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں مگر جمہوری استبداد جب منظّم جبر کا روپ دھار لیں تو کیا کیا قیامتیں بپا کر سکتا ہے، اس کا اندازہ مائیکل مین کی کتاب پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ روشن خیالوں، سائنس پسندوں اور جمہوریت کے اِن علمبرداروں کے منظّم جمہوری جبر کا نتیجہ صرف کیلی فورنیا میں یہ نکلا کہ 1848 سے 1860 تک یہاں کی سرخ ہندی آبادی پندرہ لاکھ سے سکڑ کر صرف اکتیس ہزار تک رہ گئی۔ اِس کے بالکل برعکس اسی عرصے میں وہاں کی سفید فام آبادی 25 ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہو گئی۔ سرخ ہندی آبادی میں اِس تنزل کی اہم ترین وجہ عورتوں کی اپنے

مردوں سے بالجبر علیحدگی تسلیم کی گئی۔ یہ مظلوم عورتیں اپنے دشمنوں کے بچوں کو تو جنم دے سکتی تھیں مگر خود اپنے بچوں کو نہیں۔ ظلم کی اِس لہولہو تاریخ کا حامل امریکہ آج ملالاؤں کی رومانوی تکریم کا شاندار مشن اختیار کیے ہوئے ہے۔ مگر شرم تو اُن دانشوروں کو نہیں آتی جو امریکیوں کے پھونکے ہوئے منتروں کو ٹیپ کے بند کی طرح گاتے گنگناتے ہوئے خود امریکا کے اندر جھانکنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔

کیلی فورنیا کی اسی ریاست میں سترہ بڑے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب زبانیں اور بولیاں تھیں مگر امریکہ کی تعلیم پسندی، جمہوریت اور روشن خیالی نے اِن بولیوں اور زبانوں کو بھی منظّم طور پر قتل کر دیا۔ اب بنیادی حقوق کے علمبردار امریکہ نے اس ریاست میں صرف دو زبانوں کو باقی رہنے دیا ہے۔ وہاں کے اصل باشندوں کی زبانیں نوہاٹلا، موجاوے، نواجو، چوکٹو، پما، اور ہوپی کا کوئی نام ونشان تک باقی نہیں رہ گیا۔ امریکی تب اجتماعی طور پر خود کو حیران پاتے ہیں جب اُنہیں جارج زمرمین کی شکل میں خود کو تو لنے ٹٹولنے کا کوئی حیران کن لمحہ میسر آتا ہے۔ تب وہ سوچتے ہیں کہ بھلا ہم خود احتسابی کے قابل بھی ہو سکتے ہیں؟ وہ اپنے کوّوں کو کبھی کالا تسلیم نہیں کرتے مگر نسل کشی کی تاریخ کے یہ تمام کالے کوّے اُن کی روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی منڈیروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے رہیں گے"۔

بقول حافظ شفیق الرحمٰن: "امریکہ اور یورپ کو آخر کس چیز پر ناز ہے؟" بیس لاکھ سالانہ حرامی بچوں پر، پچیس لاکھ سالانہ بن بیاہی ماؤں پر، پندرہ لاکھ سالانہ مطلقہ عورتوں پر، ہیروشیما کے ویرانوں پر، ناگاساکی کے کھنڈرات پر، فلوجہ کے ویران گلی کوچوں پر، قندھار کے اجڑے در وبام پر، ویٹو کے امتیازی حق پر، ہائی سکولوں کی 86% ٹین ایجز حاملہ طالبات پر، عراق میں سویلین آبادی کو بطور جنگ فاقوں میں مبتلا کرنے پر، ویتنامیوں کے اجتماعی قتل پر، کمزور ملکوں کی بحری اور معاشی ناکہ بندی کرنے پر، لاکھوں شیر خوار بچوں کے منہ سے فیڈر چھین لینے پر، ماؤں کے پیٹوں میں پلنے والے معصوم بے گناہ بچوں کے خلاف بیالوجیکل وار شروع کرنے پر، چلی میں رات کے سناٹے میں بندوقوں کی چھاؤں تلے جمہوریت کی دیوی کی پرورش پر، کوریا اور ویتنام کی جنگوں میں اپنے چھ لاکھ فوجیوں کو ہلاک کروانے اور دو لاکھ کو لولا لنگڑا بنانے پر، لاس اینجلس میں پچھتر ہزار اور کیلی فورنیا میں پانچ لاکھ شہریوں کی اجتماعی خود کشی پر، کیا یہی تمدن ہے۔ یہی تہذیب ہے، یہی روشن خیالی ہے یہی ثقافتی عروج ہے۔ یہی

مکینکی مہارت ہے، یہی جمہوریت ہے؟ یہی آزادی اظہار ہے؟''

مسلمانوں سے بے پناہ نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کرنے والا برطانیہ اپنے جانوروں سے کس قدر محبت اور احترام کرتا ہے، اس کا اندازہ ذیل میں درج واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپریل 2014ء میں افغانستان میں جنگ کے دوران اپنے ''ہینڈلرز'' (Handles) کے ساتھ ہلاک ہونے والی برطانوی فوج کی ایک کتیا کو جانوروں کے اعلیٰ ترین عسکری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ چار سالہ ساشا Sasha نامی ایک زرد رنگ کی لیبراڈور Labrador کتیا تھی اور اس کو دھماکہ خیز مواد کا کھوج لگانے کی تربیت دی گئی تھی۔ ساشا کو پی ڈی ایس اے ڈکن میڈل دیا گیا جو جانوروں کے اعزازات میں اعلیٰ ترین فوجی اعزاز وکٹوریہ کراس کے برابر ہے۔ 1943ء میں اس ایوارڈ کے قیام کے بعد سے اب تک ساشا 65ویں ایسی جانور ہے جسے اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ ساشا کو سیکنڈ بٹالین کے ساتھ تعینات رائل آرمی ویٹرنری کور کے ہینڈلرز کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجا جاتا تھا اور وہ 2008ء میں لانس کورپورل کینتھ رو (Lance Corporal Kenneth Rowe) کے ہمراہ ایک حملے میں ہلاک ہوگئی تھی۔ ان کی ذمہ داریوں میں مختلف علاقوں میں فوجیوں کے ساتھ جا کر بارودی سرنگوں کا سراغ لگانا تھا تاکہ فوجیوں کے لیے محفوظ راستوں کا تعین کیا جا سکے۔ پی ڈی ایس اے کا کہنا ہے کہ ساشا کی حملوں کے باوجود آگے بڑھنے کی لگن فوجیوں کے جذبے کے لیے بہت مثبت تھی جو اپنی زندگیاں بچانے کے لیے اس کی اسلحہ سونگھنے کی صلاحیت پر اعتماد کرتے تھے۔

جون 2006ء میں ہسپانیہ میں سوشلسٹ ارکان پارلیمنٹ نے بن مانسوں کے لیے انسانوں جیسے حقوق کے لیے پارلیمنٹ میں بل پیش کیا۔ ان ارکانِ پارلیمنٹ کو توقع ہے کہ ہسپانوی پارلیمنٹ بن مانسوں کے لیے بھی انسانوں کے سے حقوق کی حمایت کر دے گی۔ بن مانسوں کے حقوق کی تحریک چلانے والے ارکان کا کہنا ہے کہ بن مانسوں میں جس طرح کی ذہانت اور خود آگاہی پائی جاتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی انسانوں جیسی زندگی اور آزادی کے علاوہ تشدد سے بچاؤ کے حق دار ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس معاملے پر تحریک پیش کرنے والے ایک گرین پارٹی کے رکن پارلیمنٹ فارنسیسکو گاریدو (Francisco Garrido) کا کہنا ہے کہ بن مانس 'انسانوں کے قریب ترین' ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں محض ایک شے یا تماشا تصور کیا جاتا ہے۔ اپنی ویب سائٹ پر ان کا کہنا ہے کہ بن مانسوں کو تشدد کا نشانہ بنایا

جاتا ہے، انہیں غلام بنا کر رکھا جاتا ہے، ان سے بدسلوکی کی جاتی ہے اور یہاں تک کہ انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان علاقوں میں بھی جہاں کبھی بن مانس کی کثرت ہوتی تھی، اب ان کا صفایا ہوتا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ تک نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ان کی نسلوں کو معدومی کا خطرہ لاحق ہے۔ ان کے ایک اور ساتھی رکنِ پارلیمنٹ ڈیوڈ ہیمر سٹین (David Hammerstein) نے بی بی سی کے پروگرام دی ورلڈ ٹوڈے (The World Today) میں شرکت کے دوران بتایا کہ بن مانسوں میں ذہانت پائی جاتی ہے اور ان میں آگہی بلکہ خود آگہی ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی ویسی ہی جذباتی اور سماجی ضروریات ہوتی ہیں جیسی کہ انسانوں میں معذوروں، چھوٹے بچوں، عمروں کے مختلف مراحل میں یا دماغی مسائل کے شکار افراد کی ہوتی ہیں۔ دسمبر 2013ء میں امریکہ میں جانوروں کے حقوق کے لیے سرگرم ایک تنظیم نے نیویارک کی ایک عدالت سے ایک چمپینزی (Chimpanzee) کو قانونی طور پر انسان کے برابر قرار دینے کی درخواست کی۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی ایسی درخواست تھی۔ نان ہیومن رائٹس پراجیکٹ نامی تنظیم چاہتی تھی کہ ٹامی نامی چمپینزی یا بن مانس کو 'قانونی طور پر انسان' قرار دیا جائے جس سے اسے 'اپنے جسم کے استعمال کی بنیادی آزادی' مل سکے گی۔ تنظیم کے بانی سٹیون وائز (Steven Wise) نے خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ 'ہم یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ بن مانس خود مختار ہیں یعنی کہ نہ صرف وہ خود فیصلہ کرنے کی قابلیت اور اپنے بارے میں آگاہی رکھتے ہیں بلکہ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتے ہیں'۔ سٹیون وائز کے مطابق 'جب ہم یہ ثابت کر لیں گے کہ بن مانس خود مختار ہوتے ہیں تو یہ انھیں قانونی طور پر انسان قرار دینے کے لیے کافی ہوگا اور کم از کم ان کے بنیادی حقوق انسانی حقوق کے تحت محفوظ ہو جائیں گے۔ تنظیم کے مطابق ٹامی کو نیویارک میں ایک گیراج میں رکھا گیا جبکہ گیراج کے مالک پیٹرک لیوری کا کہنا تھا کہ 'ٹامی کا پنجرہ کشادہ ہے جس میں درجنوں کھلونے بھی ہیں۔' ان کے مطابق انھوں نے ٹامی کو جہاں سے حاصل کیا، وہاں اس سے اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا تھا اور وہ اسے جانوروں کے لیے مخصوص عمارت میں اس لیے نہیں بھجوا سکے کیونکہ وہاں جگہ کی قلت تھی۔ پیٹرک لیوری نے امریکی اخبار نیویارک ٹائمز سے بات کرتے ہوئے کہا: 'اگر وہ (نان ہیومن رائٹس پراجیکٹ) وہ جگہ دیکھ لیتے جہاں اس بن مانس نے اپنی زندگی کے ابتدائی 30 برس گزارے ہیں تو وہ آج اس جگہ کو

دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے جہاں وہ اب رہتا ہے۔' نان ہیومن رائٹس پراجیکٹ نے یہ درخواست حبسِ بیجا کے قانون کے تحت دائر کی۔ حیرانی ہے کہ یورپ کے مختلف ممالک میں یہ قانون ہے کہ جس خالی پلاٹ پر پرندوں کے گھونسلے پائے جائیں، وہاں اس وقت تک پلاٹ پر بلڈنگ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی جب تک پرندوں کے بچے اُڑنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اسی طرح کسی پلاٹ پر تعمیر کے دوران درخت کاٹنے کی صورت میں میونسپل قوانین کے تحت انہیں اتنے ہی درخت دوبارہ لگانے پڑتے ہیں۔ لیکن افسوس! مسلمانوں کے بارے میں یورپ کا رویہ نہایت ظالمانہ، غیر منصفانہ اور غیر انسانی ہے۔ مئی 2006ء میں امریکہ میں زکریا موساوی (Zacarias Moussaovi) کو عمر قید کی سزا سنانے والی جج لیونی برنکما (Leonie Brinkema) نے موساوی کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت متعصب انداز میں کہا کہ 'تم گھٹ گھٹ کر مرو گے'۔اس نے مزید کہا کہ زکریا نے اپنے جرم پہ کسی قسم کے تاسف کا اظہار نہیں کیا اور وہ اپنی زندگی کے دن جیل میں پورے کریں گے اور شان وشوکت سے نہیں بلکہ ذلت کی موت مریں گے۔ جج نے موساوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ 'جب یہ کارروائی ختم ہو جائے گی، اس کمرے میں موجود سب لوگ سورج کو دیکھ سکیں گے، پرندوں کی چہچہاہٹ سن سکیں گے لیکن تم اپنی ساری باقی زندگی سپر میکس جیل میں گزارو گے۔ سینتیس سالہ موساوی امریکی ریاست کولاراڈو کی انتہائی سخت سکیورٹی والی جیل میں باقی زندگی قید تنہائی میں گزاریں گے۔ عدالت سے مخاطب ہوتے ہوئے موساوی نے کہا کہ انہیں دہشت گرد قرار دیا ہے حالانکہ انہوں نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ جج برنکما نے موساوی سے یہ بھی کہا کہ 'تمہیں سزا کے خلاف اپیل کرنے کا حق ہے لیکن یہ ایک فضول عمل ہوگا۔

اٹلی کا قدیم شہر پیسا (Pisa) دو وجہ سے مشہور ہے۔ پہلی وجہ اس کا ٹیڑھا مینار ہے۔ 180 فٹ بلند پیسا کا یہ مینار 1350ء میں تعمیر ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مینار ایک جانب جھکنا شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ نرم زمین اور بنیادوں کی کم گہرائی تھی ،لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مینار کی مکمل عمارت اس طرح جھکی ہوئی ہے کہ پوری عمارت میں کوئی دراڑ تک نمودار نہیں ہوئی نہ کوئی پتھر ہی اپنی جگہ سے ہلا ہے۔ پچھلی صدی کے آغاز میں پیسا کے اس مینار کو کافی کوششوں کے بعد اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ اس کے زمین بوس ہونے کا خطرہ بھی ٹل گیا اور اس کا ٹیڑھا پن بھی برقرار رہا۔ پیسا کی دوسری وجہ شہرت معروف اطالوی ماہر

فلکیات اور نامور سائنس دان ''گلیلیو گلیلی'' (Galileo Galilei) ہے۔اسے ماڈرن سائنس کا باپ کہا جاتا ہے۔گلیلیو نے سائنس کی تعلیم پیسا یونیورسٹی سے حاصل کی اور بعد ازاں وہیں استاذ مقرر رہوا۔گلیلیو نے اپنے مشاہدات، تجربات اور نظریات سے ہر طرف تہلکہ مچا دیا۔اس نے سب سے پہلے ارسطو کے اس خیال کو غلط ثابت کیا کہ اگر دو مختلف وزنوں والی اشیا بیک وقت زمین پر پھینکی جائیں تو بھاری چیز پہلے زمین پر گرے گی۔گلیلیو کا کہنا تھا دونوں اشیا بیک وقت زمین سے ٹکرائیں گی۔اس نے پیسا کے مینار پر چڑھ کر اس بات کو ثابت کر دیا۔گلیلیو کا ایک اور کارنامہ ایک ایسی دور بین کی ایجاد تھا جس کی مدد سے اس نے کہکشاؤں کا باریکی سے مشاہدہ کیا اور نئے ستارے دریافت کیے۔گلیلیو ہی وہ پہلا سائنس دان تھا جس نے اس نظریے کی بھر پور تائید کی کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں، سورج ہے۔زمین تو خود سورج کے گرد گھومتی ہے۔اس پر عیسائی پادری ہل کر رہ گئے۔یہ نظریہ اولاً کوپرنیکس (Nicolaus Cobermicus) نے پیش کیا تھا۔اس سے پہلے یہی سمجھا جاتا تھا زمین ساکن ہے اور کائنات کا مرکز ہے۔پادریوں نے ان نظریات کو انجیل کے خلاف قرار دیا اور ان کی تبلیغ پر پابندی عائد کر دی۔پادریوں کا عقیدہ تھا کہ زمین چپٹی اور ساکن ہے اور دوسرے تمام سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔گلیلیو کے اس انکشاف کے جرم میں پادریوں کی طرف سے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور گرفتار کرلیا گیا۔اس موقع پر گلیلیو نے اپنے الفاظ واپس لے لیے اور اپنے کہے پر ندامت کا اظہار کیا۔اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے عمر قید یا سزائے موت دے دی جاتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی باقی زندگی فلورس کے باہر پہاڑی علاقے میں اپنے گھر میں نظر بند رہا۔اس کے بعد والے دانشوروں اور سائنس دانوں نے اس کے نظریہ پر تحقیق جاری رکھی اور آج یہ مسئلہ نہ صرف ایک مسلمہ علمی حقیقت کے عنوان سے مقبول کیا جا چکا ہے بلکہ تجربات سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے۔ دراصل وہ یورپ کی جہالت اور جمود فکر کا دور تھا۔تعلیم و تحقیق پر کوتاہ فکر عیسائی رہنماؤں نے قفل چڑھا رکھے تھے۔ سائنس و فلسفہ شجر ممنوعہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ کوپرنیکس کے افکار کو تسلیم کرنے والوں کو سخت قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں حتیٰ کہ بعض کو زندہ جلا دیا گیا۔جب گلیلیو نے اپنے تجربات کے بعد کوپرنیکس کے خیالات کو درست پایا تو اس نے دوبارہ نظریہ گردش زمین کے حق میں بولنا اور لکھنا شروع کر دیا۔اب پادری صاحبان بپھر گئے اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔پوپ

نے گلیلیو کی زبان بندی کروا دی اور اسے حکم دیا کہ اپنے کافرانہ نظریات سے ''توبہ'' کرو۔ گلیلیو نے کچھ عرصہ کے لیے خاموشی اختیار کی، مگر کچھ رعایت ملنے پر ایک کتاب لکھ ڈالی جس میں اس نے دوبارہ کوپرنیکس کے تصورات پر بحث کی۔ چرچ کے لیے یہ ''جرم'' ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے گلیلیو کو گرفتار کیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ 1833ء میں اسے سزا سنا دی گئی۔ گلیلیو نے جان بخشی کے لیے دوبارہ ''توبہ'' کی، لیکن اسے نظر بند کر دیا گیا تا کہ آئندہ وہ ''کفریہ سائنس'' کی ترویج نہ کر سکے۔ نظر بندی کی اذیت ناک زندگی گزارنے کے دوران ہی اس نے 1842ء میں وفات پائی۔ پھر یہ واقعہ ایک عرصے تک زیر بحث رہا جب بھی کہیں یورپ کے تاریک دور اور چرچ کے متشدد نظریات کا ذکر ہوتا تو گلیلیو کی ذات ابھر کر سامنے آجاتی۔ وہ عیسائی رہنماؤں کے تعصب اور جہالت کو بیان کرنے والا استعارہ بن چکا تھا۔ صدیوں تک چرچ کو اس کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے مطعون کیا جاتا رہا۔ شاید اس اہانت سے تنگ آ کر یا پھر ''احساس جرم'' کے جاگنے پر گزشتہ صدی میں بڑے عیسائی رہنماؤں نے اپنے اجداد کے رویوں پر غور کیا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ماضی میں ان کے بڑوں سے غلطیاں ہوئی تھیں۔ گلیلیو کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد 1992ء کو آنجہانی پوپ جان پال دوم نے تسلیم کر لیا کہ گلیلیو کے ساتھ ناانصافی اور برا سلوک ہوا تھا۔ چرچ کا رویہ غلط تھا۔ ویٹی کن میں خطاب کرتے ہوئے پوپ جان پال نے اس سلوک پر معافی بھی مانگی اور یوں انہوں نے رسوائی کا وہ طوق اتار پھینکا جو صدیوں سے چرچ کے گلے میں پڑا جھول رہا تھا۔ چرچ نے اس معاملے سے تو جان چھڑا لی، لیکن اس کے نامہ اعمال میں اور بہت سی سیاہ کاریاں درج ہیں۔ چرچ کی تاریخ کتنے ہی بدنما داغوں سے بھری ہوئی ہے۔ صلیبی جنگوں کی مثال لیں۔ 1095ء میں اس وقت کے پوپ ''اربن دوم'' نے فرانس میں ایک جذباتی تقریر کی جس نے ہر طرف ہیجان برپا کر دیا۔ پوپ نے بے سروپا اور من گھڑت داستانیں سنا کر عوام کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور انہیں ارضِ مقدس پر قبضہ کرنے پر ابھارا۔ پوپ نے انہیں مسلم خطوں کی زرخیزی اور دولت کا لالچ دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ان خطوں کے حصول کے لیے جو شخص ''جہاد'' کرے گا تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا اور اسے اپنی خطاؤں سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ پھر پوپ اربن نے عیسائی یورپ کو اپنے وعظوں سے جنگ جوئی کے بخار میں مبتلا کر دیا۔ 1096ء میں ان کی فوجیں ایشیائے کوچک کو عبور کر کے شام و فلسطین

میں داخل ہو گئیں۔ مسلم ممالک پر قابض ہوتے ہی پادریوں کے حکم پر صلیبی لشکر نے بے دریغ قتل عام شروع کر دیا۔ ایک ایک شہر میں ہزاروں مسلمان عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ بیت المقدس کی مساجد میں پناہ گزین لوگ جب شہید کیے گئے تو ان کے خون کی بہتی ندیوں نے صلیبی افواج کے گھوڑوں کو گھٹنوں تک ڈبو دیا۔ صلیبی جنگیں دو سو سال تک جاری رہیں۔ حاصل کیا ہوا؟ عیسائی یورپ کے ذوق جنگ جوئی کی تسکین ہو گئی اور اس کے تکبر کے بت بھی پاش پاش ہو گئے۔ صلیب کے نام پر کیا جانے والا یہ ظلم عیسائیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ کیا اہل کلیسا اس کو محسوس کرتے ہیں؟ کیا وہ ان خون ریزیوں کی معافی نہیں مانگیں گے؟

Bruno Gioradno (برونو) نے جب یہ کہا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے تو غالباً اسے اندازہ نہیں تھا کہ پادریوں کو اس کی یہ بات اس قدر ناگوار گزرے گی کہ وہ اسے زندہ جلا ڈالیں گے۔ اس زمانے میں ریاست کے باغیوں، سرکش غلاموں، ہم جنس پرستوں، ملحدوں اور کالا جادو کرنے والوں کو عام طور پر یہی سزا دی جاتی تھی۔ سولہویں صدی میں پیدا ہونے والا یہ اطالوی فلسفی، ریاضی دان اور شاعر اس دور میں چرچ کا باغی تھا، ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے معاف کر دیا جاتا۔ برونو پر سات برس تک مقدمہ چلایا گیا اور اس دوران اسے قید میں رکھا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس کے نظریات کلیسا کی روایت سے متصادم ہیں، برونو نے اپنے دفاع میں کہا کہ وہ چرچ کے عقائد کا پیروکار ہے مگر ساتھ ہی اپنے فلسفیانہ افکار کی بنیاد سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ انکوائری پر مامور چیف پادری نے برونو سے کہا کہ اسے ایک ہی صورت میں معافی مل سکتی ہے کہ اگر وہ اپنے خیالات سے مکمل طور پر رجوع کر لے۔ برونو نے انکار کر دیا، اس جرم کی پاداش میں اسے روم کے مرکزی علاقے میں زندہ جلا دیا گیا اور اس کی راکھ دریا میں بہا دی گئی۔ روم میں جس جگہ برونو کو جلایا گیا، اس کا نام **Campo Fiori de** ہے اور آج وہاں اسی برنو کا مجسمہ ایستادہ ہے۔

آج یورپ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو خونیں تاریخ کی شکل میں پیش کر رہا ہے جبکہ خود ان کی اپنی تاریخ قتل و غارت گری، خون خرابہ اور بے گناہ معصوم جانوں کو تہ تیغ کرنے سے لبریز ہے۔ یورپ کی خانہ جنگیاں خصوصاً فرانس اور برطانیہ کی پچاس سالہ جنگیں اس کی بین دلیل ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے براعظموں میں نصرانیت کے فروغ و تبلیغ کی خاطر

وحشیانہ کارروائیاں کی گئیں جن میں لاکھوں انسان قتل کر دیے گئے۔ 1542ء میں ایک اسپینی پادری Bartolome de Delas Casas نے ''اصل امریکی باشندوں کا قتل عام'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اسپینی پادری نے اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے کہ اسپینیوں نے امریکی براعظم کے اصل باشندوں کا قتل عام کیا۔ مصنف نے لکھا ہے: ''جب اسپینیوں نے جزیرہ Hispaniola پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں کے باشندوں کی تعداد تین ملین تھی لیکن آج وہاں زندہ بچ جانے والوں کی تعداد صرف دو سو ہے۔ اسپینیوں کے چالیس سالہ دور ظلم و جارحیت میں 12 ملین انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ اسی طرح عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی خاطر کس قدر مظالم ڈھائے۔ خون کی ہولیاں کھیلیں۔ تاریخ ان کے مظالم سے بھری پڑی ہے جبکہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ عدل وانصاف، عفوودرگزر، امن وامان اور انسانیت کے احترام سے مزین ہے۔

انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے مغرب کے اپنے پیمانے اور دوہرے معیارات ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے نہایت متعصّبانہ رویہ رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی غیر مسلم غلط کام کرے تو اسے جرم (Crime) کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اگر وہی کام کسی مسلمان سے سرزد ہوجائے تو اسے دہشت گردی (Terrorism) سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جب ایک یہودی لمبی داڑھی رکھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے مذہب کا حصہ ہے، لیکن ایک باریش مسلمان کو انتہا پسند اور دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ کوئی سکھ پگڑی پہنے تو اسے تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان عمامہ پہنے تو اسے شدت پسندی کی علامت گردانا جاتا ہے۔ ایک عیسائی راہبہ (Nun) جب اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خداوند کے لیے وقف کر دیا ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان خاتون سکارف لیتی ہے تو مغرب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عیسائی مرد وعورت اگر صلیب (U) کا نشان گلے میں ڈال کر سرعام پھریں یا سینے پر کراس بنانے کے لیے انگلیاں گھمائیں تو اسے ہرگز ناروا نہیں سمجھا جاتا لیکن ایک مسلمان کو دینی وشرعی صورت اور اعمال پر معترضہ قرار دیا جاتا ہے۔ چرچ کی عمارت پر گھنٹیاں بجیں تو درست ہیں، مگر مسجد سے اذانوں کی آوازیں بلند کی جائیں تو اسے سماعت پر بوجھ اور نیندکش کہا جاتا ہے۔ جب ایک مغربی عورت ملازمت کرنے کے بجائے اپنے خاوند اور بچوں کی خاطر ایک گھریلو عورت کا کردار ادا کرتی ہے تو پورا معاشرہ

اس کی تحسین کرتا ہے کہ اس نے اپنے گھر کے لیے خارجی زندگی کی قربانی دی ہے مگر جب ایک مسلمان عورت ایسا کرتی ہے تو اس پر زبردست تنقید ہوتی ہے کہ اسے گھٹن کے ماحول سے باہر نکلنا چاہیے کیونکہ اسے آزادی کی ضرورت ہے۔ مغرب میں نوجوان لڑکی کو مکمل آزادی اور حقوق حاصل ہیں کہ وہ یونیورسٹی یا کالج میں اپنی مرضی کا لباس پہنے، چہرے اور بازوؤں پر نقش ونگار (Tattoo) بنوائے حتیٰ کہ وہ سمندر کے کنارے گھنٹوں برہنہ دھوپ سینکے، لیکن جب ایک مسلمان لڑکی حجاب پہن کر کالج جاتی ہے تو اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔''Free to bare but not to cover'' یعنی وہاں ننگا ہونے کی تو آزادی ہے لیکن پردے پر پابندی ہے۔ اسرائیل کا طالب علم اگر فوجی ٹریننگ لے تو یہ اُس کے ذاتی دفاع کی تیاری کہلواتا ہے، اس کے برعکس اگر کوئی مسلم طالب علم اپنی حفاظت کے لیے پتھر اٹھاتا ہے تو اُسے انتہا پسند کہا جاتا ہے۔ امریکہ، اسرائیل، نیٹو، بھارت اور برما کی ظالم حکومتیں روزانہ مسلمانوں کو موت کی نیند سُلا دیں تو یہ ''امن کی جنگ'' کہلواتی ہے، اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان اپنے جائز حق کی خاطر کفر کے سامنے ڈٹ جائے تو اُسے باغی قرار دے دیا جاتا ہے۔ مغرب میں جب ایک بچہ کسی خاص موضوع کے لیے خود کو مخصوص کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی ذہانت اور Potential کا بین ثبوت ہے لیکن جب ایک مسلمان بچہ خود کو اسلام کے لیے وقف کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل اور کیریر تباہ کر لیا ہے۔ عقل سے عاری کوئی ناکارہ پادری اسلام کے خلاف زہر آلود بیانات، تشدد آمیز رویوں اور اہانت آمیز گستاخانہ نظریات کا پرچار کرے تو اس کو آزادیٔ اظہار کے نام پر آئینی تحفظ کی دیوار کے پیچھے چھپا کر بچا لیا جاتا ہے لیکن جب ایک مسلمان امریکہ کی اسلام دشمن پالیسیوں پر محض زبانی تنقید کرتا ہے تو اسے نفرت پھیلانے کے جرم (Hate Crime) میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ امریکہ یا مغربی ممالک میں پادریوں کی طرف سے قرآن مجید نذرِ آتش کیا جائے تو یہ فردِ واحد کا فعل گردانا جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان پاکستان میں امریکی جھنڈا جلا دے تو امریکی میڈیا پورے پاکستان کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے، جب ایک یہودی کسی کو قتل کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل قرار دیا جاتا ہے، اس کے برعکس جب ایک مسلمان اپنے بچاؤ میں کسی کو مار ڈالتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایسا کیا ہے۔ جب کوئی یہودی کسی کی خاطر خود کو تیاگ دیتا ہے تو ہر شخص اس کے کردار کی تعریف کرتا ہے لیکن جب کوئی فلسطینی

مسلمان اسرائیلی فوج سے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے ایسا کرتا ہے تو اس کے بھائیوں کے بازو توڑ دیے جاتے ہیں، اس کی والدہ کی عزت لوٹ لی جاتی ہے، اس کے گھر کو تباہ کردیا جاتا ہے اور اسے دہشت گرد قرار دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹارچر سیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کو یہ زعم ہے کہ وہ انتہائی تہذیب یافتہ اور رواداری کا عالمی چیمپئن ہے۔ ان دوغلے اور دوہرے معیار اور سلوک کی نہ جانے کتنی مثالیں ہیں جو ان ملکوں میں نمایاں نظر آتی ہیں جو انسانی آزادی، انسانی حقوق اور آزادی اظہار کے علمبردار کہلاتے ہی نہیں، دعویدار بھی بنتے ہیں۔

پروپیگنڈوں کی قوتوں نے یہ عجیب و غریب فلسفہ ذہنوں پر مسلط کردیا ہے کہ اگر عورت اپنے گھر میں اپنے اور اپنے شوہر، اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اولاد کے لیے خانہ داری کا انتظام کرے تو یہ قید و ذلت ہے، لیکن وہی عورت اجنبی مردوں کے لیے کھانا پکائے، ان کے کمروں کی صفائی کرے، ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میزبانی کرے، دکانوں پر اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے اور دفاتر میں اپنے افسروں کی ناز برداری کرے تو یہ ”آزادی اور اعزاز“ ہے۔ سید قطب شہیدؒ نے کہا تھا: اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عورت سے انصاف کرتا ہے، اس کا احترام کرتا ہے اور اس کی ترقی کا ضامن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عورت انسان سازی کا کام چھوڑ کر اشیاء کی صناعت میں مصروف ہو جائے، کیونکہ اسلام کی نظر میں انسان کی قیمت اشیاء سے زیادہ ہے۔ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک ثقافت آشنا اور ماہر عورت اشیاء کی صنعت و پیداوار میں لگ جائے اور وہ اپنی اولاد کی پرورش کے لیے ایک ملازمہ رکھ لے، تاکہ یہ عورت اس کے بچوں کی نگرانی کرے اور وہ خود اشیاء کی نگرانی کرے۔

مغرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اگر کسی کالے شخص پر حملہ ہو تو اس کو نسل پرستی کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کسی یہودی کے خلاف سخت الفاظ کہے جائیں تو اسے یہود دشمنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی عورت پر حملہ ہو تو اسے جنسی امتیاز کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں ہم جنس پرستوں پر کوئی حملہ ہو تو اِسے عدمِ برداشت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مذہب کے ماننے والوں کو نشانہ بنایا جائے تو اِسے نفرت کی آگ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس یا مسلمانوں کی مقدس الہامی کتاب قرآن مجید پر حملہ کیا جائے تو اِسے آزادیٔ رائے کا نام دے کر غیر اہم قرار دے دیا جاتا ہے۔ پوچھنا چاہیے یہ آزادی اظہار ہے یا آزادی آزار؟

2011ء میں امریکی ریاست فلوریڈا (Florida) کے ایک چرچ میں ملعون امریکی پادری ٹیری جونز (Terry Jones) اور اس کے ساتھی پادری وائن ساپ نے 30 آدمیوں کی موجودگی میں قرآن کریم کی بے حرمتی کی اور اسے نذر آتش کر دیا۔ اس خبیث، بد فطرت اور مخبوط الحواس پادری نے گیارہ ستمبر 2010ء کو بھی قرآن کریم جلانے کا اعلان کیا تھا، اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا، جس کے بعد اس پادری نے مجرمانہ چپ سادھ لی تھی۔ لیکن 21 مارچ 2011ء کو اس نے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کرتے ہوئے (نعوذ باللہ) قرآن کریم کو شعلوں کے حوالے کر دیا۔ قرآن پاک کی شہادت کا انکشاف فرانسیسی خبر رساں ادارے نے اپنی رپورٹ میں کیا جس کے بعد یہ خبر درجنوں آن لائن اخبارات اور بالخصوص عرب ویب سائٹس پر شائع ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق فلوریڈا کے قصبے گینس ویل میں اتوار کو ملعون پادری ٹیری جونز نے قرآن پاک کی شان میں گستاخی کے لیے ایک نام نہاد عدالت لگائی جس کے بعد اس کے ساتھی ملعون پادری وائن ساپ نے قرآن پاک کے ایک نسخے کو آگ لگا دی۔ خبر رساں ادارے کے مطابق چرچ میں قرآن پاک کے خلاف ''مقدمہ'' چلایا گیا۔ ملعون ٹیری جونز نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کو (نعوذ باللہ) دہشت گردی اور دیگر جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کے بعد ''جیوری'' نے آٹھ منٹ تک غور و خوض کیا اور پھر ''سزا'' سنائی۔ اس دوران قرآن پاک کو ایک گھنٹے تک مٹی کے تیل میں ڈبوئے رکھا گیا۔ ملعون پادریوں نے شیطانی عدالتی کارروائی کے بعد قرآن کو نکال کر پیتل کی ایک ٹرے میں چرچ کے عین درمیان رکھا۔ معلون ٹیری جونز کی نگرانی میں ذہنی دیوالیہ پن کے شکار دوسرے پادری وائن ساپ نے قرآن پاک کے نسخے کو آگ لگا دی۔ اس موقع پر چند لوگوں نے جلتے قرآن مجید کے نسخے کے ہمراہ فوٹو بھی بنوائے۔ اطلاعات کے مطابق چرچ میں 30 کے قریب لوگ موجود تھے جن میں ایک خاتون سمیت اسلام سے مرتد ہونے والے 3 بد بخت بھی شامل تھے۔ ملعون ٹیری جونز کا کہنا تھا کہ میں نے ستمبر میں مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنی کتاب کی حفاظت کر لیں اور اس کا دفاع کریں لیکن مجھے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو میں نے سوچا کہ حقیقی سزا دیئے بغیر منصفانہ ٹرائل نہیں ہوسکتا، اس لیے میں نے قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) سزا دے دی۔ مبصرین کے مطابق اس واقعہ کے بعد امریکہ میں اسلام مخالف انتہا پسندوں کی حوصلہ افزائی ہوئی، کیونکہ پاکستان میں تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کی قانونی دفعات

کوحقوق انسانی کے خلاف قرار دینے والے امریکہ نے اپنے ملک کی مسلم اقلیت کے خلاف امتیازی سلوک کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔

ملعون پادری ٹیری جونز سے جب پوچھا گیا کہ کیا اس کا یہ اقدام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے؟ تو ملعون نے جواب دیا کہ اگر آج یسوع مسیح زندہ ہوتے تو میرے اس اقدام کی تعریف کرتے اور خود بھی قرآن مجید کو جلانے کا فتویٰ جاری کرتے۔ اس نے مزید کہا کہ امریکہ کا آئین اور قانون اسے اس اقدام کی اجازت دیتا ہے۔ یاد رہے ملعون ٹیری جونز پر ہم جنس پرستی کے الزامات بھی ہیں۔ اگست 2009ء میں اسے بچوں سے جنسی زیادتی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے اسلام دشمن جذبات کا اظہار ایک کتاب "Islam is of the Devil"، ''اسلام ایک شیطانی مذہب ہے!'' لکھ کر کیا (نعوذ باللہ) یہ کتاب انٹرنیٹ پر آج بھی موجود ہے۔ یاد رہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ سٹون (Gladstone) نے برطانوی پارلیمنٹ میں قرآن مجید کا نسخہ فضا میں لہراتے ہوئے کہا تھا: جب تک یہ کتاب موجود ہے، دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ (نعوذ باللہ) اسی طرح متحدہ ہندوستان میں یو پی کے گورنر سر ولیم میور (Sir William Muir) نے ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا تھا: دنیا میں انسانیت کی دشمن دو چیزیں ہیں ایک محمد (ﷺ) کی تلوار اور دوسرا اس کا قرآن۔ (معاذ اللہ)

ملعون و مبغوض امریکی عیسائی پادری اسلام، قرآن، نبی آخر الزمان ﷺ اور مسلمانوں کی دشمنی میں ایسے اندھے اور پاگل ہو چکے ہیں کہ ان کے دل و دماغ اور فکر و نظر سے صحیح اور غلط، حق اور باطل میں امتیاز مفقود اور رخصت ہو چکا ہے، اس لیے کہ جس کلام مقدس و مطہر نے حضرت بی بی مریم علیہا السلام کی پاکدامنی کی گواہی دی، جس عظیم کتاب نے یہودیت کی طرف سے بی بی مریم علیہا السلام پر لگائے جانے والے الزامات اور بہتانوں کا دفاع کیا، جس کلام الٰہی نے ان کو صدیقہ کے لقب سے نوازا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مکمل تفصیلات کو بیان کیا اور گہوارے میں ہوتے ہوئے ان کا اقرار (کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ نے کتاب دی، اللہ تعالیٰ نے مجھے منصب نبوت عطا کیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے بابرکت بنایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی۔ مریم: 30، 31) تفصیل سے ذکر کرکے دنیائے عیسائیت پر عظیم احسان کیا ہے، حیرت ہے عیسائی پادری اسی سچی کتاب پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کی والدہ محترمہ کی عفت، پاکدامنی اور پاکیزگی کی صفائی اور شہادت نہ دیتا تو عیسائی دنیا قیامت تک یہودیوں کے پروپیگنڈوں کے سامنے شرمندگی سے سر نہ اٹھا سکتی تھی اور نہ ان کے اتہامات اور الزامات کا دفاع کر سکتی تھی لیکن قرآن کریم نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اولی العزم اور برگزیدہ نبی ہونے کی تصدیق کی، بلکہ یہودیوں کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام پر لگائے جانے والے تمام اتہامات اور الزامات کا منہ توڑ جواب بھی دیا،لیکن یہ ملعون اور غلیظ و پلید پادری پھر بھی اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

ملعون پادری ٹیری جونز کا لوگوں کو اس شرمناک فعل اور مذموم حرکت میں شرکت کے لیے دعوت نامے تقسیم کرنا، امریکی مقامی انتظامیہ کا مجرمانہ خاموشی اختیار کرنا اوران ناپاک پادریوں کو اس گھناؤنی حرکت سے باز رکھنے کے لیے موثر اقدامات نہ کرنا، مسلمانوں کے بھرپور احتجاج پر یہ کہنا کہ یہاں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے اور اس کے بعد امریکی کانگریس کی کمیٹی کا مسلمانوں میں دہشت گردی کے رجحانات کے جائزے کے نام پر متعصّبانہ سماعت کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی تنگ نظری اور عدم برداشت کا طعنہ دینے والے خود تشدد پسند، برداشت سے عاری اور متعصب ہیں۔ ورنہ بتلایا جائے کہ جو امریکہ اور اس کے حواری پاکستان میں کسی خود ساختہ واقعے پر مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی مذمت کرتے دیر نہیں لگاتے، انہوں نے ان پادریوں کی اس ناپاک جسارت کو ابھی تک مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کیوں قرار نہیں دیا؟

بقول جمال عبداللہ عثمان: آج ایک بار پھر بدی کی قوتوں نے قرآن مجید اور حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے۔مسلمانوں کے دل چھلنی ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس توہین کے پیچھے مذہب کا لبادہ اوڑھنے والا عیسائی مذہبی رہنما ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی توہین وہ شخص کر رہا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ آسمانی مذہب کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے روحانی پیشوا ''پوپ بینی ڈکٹ'' خاموش ہیں۔ اس بنیاد پر مسلمانوں کا شکوہ بجا ہے کہ بدترین فعل کرنے والوں کو روحانی پیشوا کی پس پشت حمایت حاصل ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا، یقیناً روحانی پیشوا ویٹی کن سٹی کی بالکونی سے نمودار ہوتے۔ وہ دنیا کے کروڑوں عیسائیوں کو مخاطب کرتے اور کہتے: ''ہم تمام

آسمانی مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ اس کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ جو عیسائی پیغمبر اسلام کے خاکے بناتا ہے، جو ان کے توہین آمیز کارٹون بناتا ہے، چھاپتا ہے، اس کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے عیسائیت میں کوئی پناہ نہیں۔ اگر عیسائیوں کے روحانی پیشوا واقعی مخلص ہوتے، وہ ایسا عمل کرتے، کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ عیسائیوں کے روحانی پیشوا کو ایک بے عمل عیسائی بھی ''باپ'' کا درجہ دیتا ہے۔ امریکی صدر تک ان کے فرمان پر جان نچھاور کرتا ہے۔ ملعون پادری ٹیری جونز بھی اپنے روحانی پیشوا کے فرمان پر جان قربان کرتا ہے، مگر افسوس! پوپ نے اس حوالے سے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ ویٹی کن سٹی سے ایک بے ضرر سی پریس ریلیز جاری ہوئی جسے مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جس طرح بچہ پڑوس کے کسی بچے کی پٹائی کرے۔ پڑوس کا شخص گلہ کرے اور محض لوگوں کو دکھانے کے لیے بچے کا سرپرست ہلکی سی چپت رسید کرے اور بعد میں اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ ویٹی کن سٹی اور عیسائیوں کے روحانی پیشوا کا کردار اس وقت بالکل ایسا ہی ہے۔ انہوں نے چپ سادھ رکھی ہے۔ حالانکہ کئی ایسے مواقع آئے ہیں جب سیاسی معاملات میں بھی عیسائیوں کے روحانی پیشوا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مشرقی تیمور کے مسئلے میں سابق پوپ کا کردار کس سے ڈھکا چھپا ہے؟ افغانستان میں مرتد ہونے والے ''عبدالرحمٰن'' کو ویٹی کن سٹی میں پناہ کی پیشکش کس نے دی تھی اور سابق امریکی صدر کو فون کر کے مرتد کو صحیح سلامت پہنچانے کا حکم کس نے جاری کیا تھا؟ اسی طرح چند سال قبل ایران میں کچھ برطانوی سیلرز داخل ہوئے۔ ایران نے انہیں گرفتار کیا۔ جب عیسائیت کے روحانی پیشوا کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ایرانی صدر کے نام خط لکھا۔ اس خط میں درخواست کی کہ ہمارا مقدس تہوار ''ایسٹر'' قریب ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے ان برطانوی سیلرز کو رہا کر دیا جائے۔ یہ خط عیسائیوں کے روحانی پیشوا نے خود لکھا۔ اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے لیے کس قدر پریشان ہیں۔ جب چند سیلرز کی گرفتاری پر عیسائی دنیا کے روحانی پیشوا ایکشن لے سکتے ہیں، پھر سوا ارب سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے چند جملے کیوں نہیں ادا کر سکتے؟ (روزنامہ ''امت'' کراچی، **21** ستمبر **2012**ء)

2014ء میں سوڈان کی ایک عدالت نے اسلام سے مرتد ہو کر عیسائیت قبول

کرنے والی خاتون کو سزائے موت دینے کا حکم دیا۔ 27 سالہ خاتون اضراف الہادی محمد عبداللہ نامی خاتون نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کی جبکہ اس پر اکتفا کرنے کے بجائے خاتون نے ایک عیسائی شخص سے شادی کر کے اپنا سابقہ نام تبدیل کر کے مریم یحییٰ ابراہیم رکھ لیا۔سوڈانی دارالحکومت خرطوم میں واقع عدالت کے جج عباس محمد الخلیفہ نے فیصلہ محفوظ کرنے کے بعد خاتون کو بلا کر اسے تین دن کی مہلت دی اور اسے تلقین کر کے کہا کہ وہ واپس اسلام کی آغوش میں آجائے۔ تاہم ارتداد اختیار کرنے والی خاتون نے ضد اور ہٹ دھرمی برقرار رکھتے ہوئے عیسائیت سے تائب ہونے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے اسے عیسائی مرد سے تعلقات پر 100 کوڑے اور مرتد ہونے پر پھانسی کی سزا سنائی۔ اس پر مغربی ممالک میں کھلبلی مچ گئی۔ امریکی کانگریس کی جانب سے وزیر خارجہ جان کیری (John Karry) کو ارتداد کے باعث سوڈانی عدالت سے سزا پانے والی سوڈانی خاتون کی ہر ممکن مدد کرنے کی تاکید کی گئی۔ مرتد ہونے والی مریم کو بچانے اور اسے امریکی شہریت دلانے کی خاطر امریکی انتظامیہ نے سوڈانی حکومت پر دباؤ بڑھایا۔ واقعے کی آڑ میں امریکی حمایت یافتہ عیسائی مشنریوں نے شمالی سوڈان میں عیسائیت عام کرنے کے لیے سرگرمیاں تیز کر دیں۔امریکی وزارت خارجہ نے کہا کہ عیسائی مذہب قبول کرنے کے باعث سوڈانی عدالت سے پھانسی کی سزا پانے والی مرتد خاتون مریم کو بچانے کے لیے امریکی ادارہ حرکت میں آچکا ہے۔ مرتد خاتون کی جانب سے امریکہ میں پناہ کے لیے دی جانے والی درخواست پر فوری عملدرآمد کرانے کے لیے کانگریس کی جانب سے وزیر خارجہ جان کیری کو ہدایت کے بعد خرطوم میں واقع امریکی سفارتخانے نے اپنی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ کر دیا جس کی بھرپور کوششوں کے نتیجہ میں مرتدہ رہا ہوگئی۔ پھر وہ اطالوی حکومت کے ایک سرکاری طیارے میں روم پہنچی تو پاپائے روم پوپ فرانسس نے اس مرتدہ کو خصوصی شرف باریابی بخشا۔ ویٹی کن نے ایک بیان میں کہا کہ پوپ فرانسیس نے اپنی قیام گاہ پر 30 منٹ تک مریم یحییٰ ابراہیم اور اس کے خاوند سے ملاقات کی۔ قبل ازیں مریم یحییٰ ابراہیم کا روم پہنچنے پر کسی سربراہ مملکت کی طرح خود اطالوی وزیراعظم مایٹو رینزی (Matteo Renzi) اور ان کی اہلیہ نے استقبال کیا۔

اس سے پہلے مارچ 2013ء میں آزادی مذہب کے لیے اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی ہیز بیلی فیلڈ نے توہین مذہب اور مذہب تبدیل کرنے کے خلاف قوانین ختم کرنے کا

مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مذہبی عقائد یا شخصیات کی توہین روکنے یا پھر کسی مذہب یا عقیدے کو رد کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے بنائے جانے والے قانون خطرناک ہیں۔ یہ سفارش اقوام متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق میں پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں کی گئی۔ رپورٹ میں اقوام متحدہ کے ایلچی ہیز بیلی فیلڈ کا کہنا تھا کہ ایسے قوانین ریاستوں کو آزادی اظہار پر پابندی لگانے کا موقع دیتے ہیں۔

2013ء میں چرچ کی دنیا میں ایک عجیب وغریب واقع رونما ہوا۔ عیسائی عقیدے کے مطابق پوپ کو صرف خدا ہی منتخب کرتا ہے، اسے کوئی برطرف نہیں کرسکتا۔ یہ بات طے ہے کہ کوئی بھی پوپ، بیماری یا ذاتی وجہ کی بنیاد پر اس منصب سے دستبردار نہیں ہوتا۔ لیکن جنوری 2013ء میں عیسائی پوپ بینی ڈکٹ XVI نے اچانک اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کردیا جس سے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ کوئی اس خبر پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ''دی آرڈر آف دی نائٹس آف مالٹا'' کے ارکان سے ملاقات کی تھی اور اس کے بعد سے ان پر شدید تھکن کے آثار نمایاں ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس میٹنگ میں ایسا کیا ہوا جس کے باعث پوپ پر شدید تھکن سوار ہوئی اور انہوں نے مستعفی ہونے کا اعلان بھی کردیا۔ کیا ان سے یہ کہا گیا تھا کہ انہیں برطرف کیا جاسکتا ہے؟ ''دی آرڈر آف دی نائٹس آف مالٹا'' کیا ہے؟ یہ چند جنونی صلیبیوں کا گروپ ہے جو خفیہ سوسائٹی ''فری میسن'' (Free Mason) کی طرز پر کام کرتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پوپ نے مستعفی ہونے کا اعلان کیوں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ''دی نائٹس آف مالٹا'' نے ان پر اپنے ارادے ظاہر کیے ہوں اور اختلاف سامنے آیا ہو؟ کیا جنونی عیسائی اور صہیونی یہودی مل کر کوئی اور بڑی واردات کرنا چاہتے تھے؟ کیا پوپ پر یہ دباؤ تھا کہ ہم جنس پرستوں کی شادی کو درست قرار دے دیں؟ کیا ان پر پادریوں کے لیے ازدواجی زندگی کو رواج دینے سے متعلق دباؤ تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پوپ نے کہا ہو کہ یہ سب کچھ میرے دور میں نہیں ہوسکتا اور پھر جنونیوں نے ان کے دور ہی کو ختم کردیا؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''دی آرڈر آف نائٹس'' کے پاس پوپ کی بچوں اور ننوں کے ساتھ غیر اخلاقی سرگرمیوں کی ویڈیوز موجود تھیں جس پر انہوں نے پوپ کو بلیک میل کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کے آزاد میڈیا نے اس پر کوئی بات کیوں نہ بلند کی۔ ''مسلمانوں'' کی کوئی معمولی سی غیر اخلاقی

حرکت کو میڈیا بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، لیکن پوپ کے معاملے میں سب کو سانپ سونگھ گیا۔

دسمبر 2013ء میں اقوامِ متحدہ نے ویٹی کن (Vatican) سے پادریوں، راہباؤں اور بھکشوؤں کے ہاتھوں بچوں کے مبینہ جنسی استحصال کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کو کہا جس پر پوپ پال کے حکم پر ویٹی کن نے انکار کر دیا۔ ویٹی کن کا کہنا تھا کہ ان معاملات کی تحقیقات ان ممالک کے نظامِ قانون کی ذمہ داری ہے جہاں یہ پیش آئے تھے۔ برطانیہ کی قومی سیکولر سوسائٹی نے ویٹی کن پر قوانین کی آڑ میں چھپنے کا الزام عائد کیا۔ رواں برس مارچ میں اپنے انتخاب کے بعد پوپ فرانسس نے کہا تھا کہ جنسی استحصال کے معاملے سے نمٹنا کلیسا کی ساکھ کے لیے کلیدی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی کمیٹی برائے حقوقِ اطفال نے جولائی 2013ء میں رومن کیتھولک عیسائیوں کے روحانی مرکز ویٹی کن کے سفارتی ادارے 'ہولی سی (The Holy See)' کو ایک سوالنامہ ارسال کیا تھا جس میں 1995 سے اب تک ویٹی کن کے علم میں لائے جانے والے جنسی استحصال کے واقعات کی تفصیلات طلب کی گئی تھیں۔ اس سوالنامے میں شامل سوالات میں پوچھا گیا تھا کہ آیا جنسی زیادتیوں کے ملزم پادریوں، راہباؤں اور بھکشوؤں کو بچوں سے رابطے میں رہنے کی اجازت دی گئی اور یہ کہ ان افراد کے خلاف کیا قانونی کارروائی کی گئی؟ اپنے جواب میں 'ہولی سی' نے اصرار کیا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ سے 'الگ اور مختلف' ہیں اور وہ مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کے بارے میں صرف اسی صورت میں معلومات فراہم کرتے ہیں جب یہ ان ممالک کے حکام کی جانب سے طلب کی گئی ہوں جہاں وہ کام کر رہے ہیں۔ ادارے کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب پادریوں کے چناؤ کا طریق کار تبدیل کیا جا چکا ہے اور انھیں ضابطِ اخلاق کا پابند بنانے کے لیے کلیسا کے قانون پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔ برطانوی قومی سیکولر سوسائٹی نے اس جواب پر تنقید کی اور کہا کہ دنیا بھر میں گرجا گھروں پر 'ہولی سی' کا منظّم کنٹرول ہے۔

مئی 2014ء میں امریکہ میں کھلے عام ہم جنس پرست ہونے کا اعتراف اور شادی کرنے والے پادری نے اپنے خاوند کو طلاق دینے کا اعلان کیا۔ ریاست نیو ہمپشائر کے ایپکوپل چرچ کے بشپ جین رابنسن (Bishop Gene Robinson) نے مارک اینڈریو (Mark Andrew) سے 2010ء میں شادی کی تھی، جب ریاست میں ہم جنس پرستوں کی شادی کو قانونی قرار دیا گیا تھا۔ جین رابنسن 2013ء میں بشپ کے عہدے سے

ریٹائر ہو گئے تھے، اس سے قبل رابنسن کے بشپ منتخب ہونے پر بھی شدید تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے ''خاوند'' سے علیحدگی کا اعلان انہوں نے چرچ کے بڑے پادری کے نام اپنے خط اور اخبار میں اپنے ایک مضمون میں کیا۔ بشپ نے لکھا کہ علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود شادی پر ان کا یقین ختم نہیں ہوا۔ میرے مارک اینڈریو سے طلاق کی تفصیلات ایک نجی معاملہ رہیں گی۔ حقوق انسانی کی ایک تنظیم نے مارک اینڈریو سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے بشپ جین رابنسن کے خلاف مظاہرہ کیا جس میں بشپ کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی آزادی کا راگ الاپنے والوں کے نزدیک کیا بشپ کو یہ آزادی بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی ''بیوی'' کو طلاق دے دے۔ عیسائیوں کی رواداری تو یہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی کسی مطلقہ لڑکی سے شادی کرنا چاہے تو اس پر پابندی ہے۔ لکھا ہے: ''جو شخص اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے، وہ زنا کرتا ہے اور جو شخص شوہر کی چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے، وہ بھی زنا کرتا ہے۔ (لوقا 18:16)

الحمدللہ! مسلمان جس طرح تمام انبیا کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں، اس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی تعظیم و تکریم اور عزت و حرمت کو بھی فرض گردانتے ہیں۔ مسلمان جس طرح قرآن کریم کا ادب و احترام کرتے ہیں، اسی طرح تمام آسمانی کتب کا ادب کرنا بھی اپنے اوپر لازم، فرض اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک جس طرح حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ادنیٰ توہین یا تنقیص سے کفر لازم آتا ہے، اسی طرح کسی سچے نبی کے انکار، توہین یا تنقیص سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متعصب، متشدد اور مذہبی تنگ نظر مسلمان ہیں یا یہ یہود و نصاریٰ؟

ہالینڈ کے ممبر پارلیمنٹ اور انتہائی متعصب جنونی عیسائی گیرٹ وائلڈرز (Geert Wilders) نے 20 اپریل 2008ء کو ملعون پادریوں کے ایک گروہ کے تعاون سے قرآن مجید کے خلاف بنائی جانے والی دل آزار فلم ''فتنہ'' انٹرنیٹ پر ریلیز کی جس میں مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید کی تضحیک اور اس کی پاک تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے دہشت گردی کا منبع قرار دیا۔ پادریوں کی اس ناپاک جسارت سے ہر مسلمان خون کے آنسو روتا رہا۔ گیرٹ کی اس ناپاک جسارت کو تمام مغربی ممالک نے نہ صرف سراہا بلکہ اسے مکمل تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی۔ مسلمانوں کے احتجاج پر گیرٹ وائلڈرز نے ایک پریس

کانفرنس میں کہا کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید ایک دہشت گرد کتاب ہے جس کی تعلیمات تشدد پر اکساتی ہیں، اس لیے اس نے یہ فلم بنائی۔ فارسی کی ایک مشہور مثل ہے: تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ (یعنی انسان تدبیر کرتا ہے مگر تقدیر اس پر ہنس رہی ہوتی ہے)۔ قدرت کا کمال دیکھیے کہ اس فلم کے ریلیز ہونے سے اب تک 1200 کے قریب عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جن کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس فلم کو دیکھنے کے بعد قرآن مجید کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فلم ''فتنہ'' میں پیش کی جانے والی تمام باتیں نہ صرف غلط بلکہ اسلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہیں۔ 23 جون 2011ء کو ہالینڈ کی ایک عدالت نے گیرٹ وائلڈرز (Geert Wilders) کو مسلمانوں کے خلاف نفرت بھڑکانے کے مقدمے میں باعزت طور پر بری کر دیا۔ وائلڈرز کا اصرار تھا کہ اس کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا اور وہ صرف اسلام سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ گیرٹ وائلڈرز کے حامیوں نے عدالتی فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا۔ گیرٹ وائلڈرز نے عدالتی فیصلے پر اپنے ردعمل میں کہا کہ یہ فیصلہ ہالینڈ میں اظہار رائے کی آزادی کی جیت ہے۔ اب اسلام پر تنقید کرنا قانونی ہو گیا ہے اور یہی وہ چاہتے تھے۔

اکتوبر 2013ء میں گستاخانہ فلم ''فتنہ'' کے پروڈیوسر ارناوَڈ وین ڈورن (Arnoud Van Doorn) کو اپنی فتنہ انگیزی سے توبہ کر کے اسلام کے دامن میں پناہ لینے کی توفیق مل گئی اور وہ اسی سال حج کی سعادت سے مشرف ہوئے اور کعبہ کے سائے میں انہیں امن وسکون نصیب ہوا۔ اس کا کہنا تھا ''جب سے میں نے اسلام کے خلاف بننے والی فلم میں کام کیا، اس کے بعد سے مجھے کبھی روحانی سکون نہیں ملا۔ میں اندر ہی اندر تڑپتا رہا۔ راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ دن کا قرار چھن گیا۔ جس کے بعد میں نے اسلام کے بارے میں مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں میرے ایک دوست نے رہنمائی کی۔ وہ مجھے مفید مشورے اور اسلامی لٹریچر لا لا کر دیتا رہا۔ مسلسل غور وفکر اور گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت دنیا میں اگر کوئی مذہب برحق ہے تو وہ اسلام ہی ہے''۔ اپنی نفرت انگیز فلم 'فتنہ' کی تیاری میں حصہ لینے پر ارناوَنڈ کو بے حد افسوس تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے گناہوں کو دھونے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے آئے۔ ماضی کے گناہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فتنہ ایک مکمل غلط اور گمراہ کن فلم تھی جس نے بڑے پیمانے پر گمراہی اور غلط معلومات

پھیلانے کا کام کیا۔ اس فلم میں جو کچھ باتیں پیش کی گئی ہیں، ان کا عظیم پیغمبر (ﷺ) یا اسلام جیسے مقدس مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس موقع پر وہ آبدیدہ ہو گئے اور انہوں نے اسلام کی حقانیت پر فلم بنانے کا بھی اعلان کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ارناوُڈ کے بیٹے اسکندر امین (Iskandar Amin De Vrei) نے بھی 21 اپریل 2014ء کو دوبئی انٹرنیشنل امن کنونشن کے موقع پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اس تاریخی کنونشن میں دنیا بھر کے 37 قابل ذکر افراد نے اسلام قبول کیا۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، سپین، جرمنی، ہالینڈ اور دیگر ممالک کے ہزاروں فلم سٹار، سائنس دان، کھلاڑی، ڈاکٹر، انجینئر اور سیاستدان دائرہ اسلام میں داخل ہو کر دنیا کو پیغام دے رہے ہیں کہ ترقی یافتہ تہذیب و تمدن خیرہ کن سائنسی و سماجی ترقی اور عہد حاضر کے علمبردار امریکہ و یورپ کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ مذہبی تعصب، نسلی امتیاز اور اقتصادی و معاشی مفادات کا آئینہ دار ہے اور اس پھیلتے ہوئے مذہب کے خوف کا مظہر۔

مغربی ممالک میں غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ برطانیہ میں گذشتہ دو عشروں میں ایک لاکھ افراد اسلام قبول کر چکے ہیں جبکہ سالانہ تقریباً 5 ہزار برطانوی افراد حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، کچھ نومسلم اپنے خاندان اور دوستوں کے ردعمل کی وجہ سے تبدیلی مذہب کو خفیہ رکھتے ہیں۔ برطانوی جریدہ ''اکنامسٹ'' کی ایک رپورٹ کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت ہے جو کئی برسوں سے مسلمانوں کے ساتھ رابطے میں ہیں۔ برطانیہ میں خواتین کی دو تہائی اکثریت نے اس لیے اسلام قبول کیا کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ دیگر لوگ اس لیے اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں کہ وہ برطانوی معاشرے میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور فحاشی سے تنگ آ چکے ہیں جبکہ بہت سے کمیونٹی کے احساس کے حصول کی بات کرتے ہیں۔ جریدے کے مطابق اسلام قبول کرنے میں جیلیں مؤثر جگہیں ثابت ہو رہی ہیں جبکہ اس صورت حال سے مغربی حلقے تشویش کا شکار ہیں کہ جیل میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ بنیاد پرست ہیں۔ تاہم مسلمانوں سے متاثرہ حلقے کا مؤقف ہے کہ اسلام کا نظم و ضبط اور ساخت انہیں ذاتی زندگی کے مسائل سے نمٹنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ انگلینڈ اور ویلز میں مردم شماری کے دوران شہریوں سے ان کے ماضی کے مذہب کے بارے میں سوال نہیں کیا جاتا اور برطانوی مساجد بھی نومسلموں کا کوئی

ریکارڈ مرتب نہیں کرتیں۔ تاہم یونیورسٹی آف ویلز کے محقق کیون برائس کے مطابق ہر سال 5ہزار سے زائد برطانوی اسلام قبول کرتے ہیں اور اب تک ایک لاکھ سے زائد برطانوی اسلام قبول کر چکے ہیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی آبادی کے بڑھتے تناسب سے خوفزدہ یہودی ادارے، منظّم انداز میں یہودیوں کی تعداد بڑھانے کے لیے سرگرم ہیں۔ جرمنی میں جاری ''پیگیڈا'' (Pegida) نامی اسلام مخالف تحریک کو اسرائیلی ایجنسیاں چلا رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود زمینی حقائق کے پیش نظر جرمن حکومت نے گزشتہ سال اعتراف کیا کہ 2050ء تک جرمنی مسلم اکثریتی ملک بن جائے گا۔ امریکہ میں قائم پیو رریسرچ سینٹر نے اپنی نئی تحقیق میں کہا کہ 2070ء تک اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ امریکہ کے مستند اور باوثوق تجزیاتی ادارے کی جانب سے مذکورہ اعتراف دراصل ان چشم کشا حقائق کی ایک واضح دلیل ہے جن کا آج کی مادہ پرست اور ظاہر بین دنیا بچشم سر مشاہدہ کر رہی ہے۔ چنانچہ دنیا بھر میں بالعموم اور مغرب میں بالخصوص دینِ حق کی مقبولیت اور محبوبیت میں تیزی سے اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے اور اسلام کی امن پسند تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ سے متاثر ہو کر ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے افراد، مرد، عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یہ مقبولیت ان تمام تر طاغوتی ہتھکنڈوں اور شیطانی مکر و فریب کے علی الرغم ہے جو عالمی طاقتیں وقفے وقفے سے عالم انسانیت کو اسلام اور مسلمانوں سے بدنام کرنے کے لیے بروئے عمل لاتی ہیں۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آج بھی دنیا کو امن وسکون اور چین و آشتی کی حقیقی ضمانت صرف اور صرف اسلام دیتا ہے۔ باطل نورِ حق کو مٹانے کے لیے اپنے تئیں لاکھ کوشش کر لے، مگر عالم میں حق کا بول بالا بہر صورت ہو کر رہے گا۔

معروف کالم نگار اشتیاق بیگ اپنے مضمون ''مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی، مغرب کی پریشانی'' میں لکھتے ہیں: ''سابق فرانسیسی صدر فرانس متراں سے اُن کے دور حکومت میں ایک فرانسیسی صحافی نے سوال کیا ہے کہ ''فرانس میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ مستقبل میں فرانس اسلامی مملکت بن جائے، آپ اس

خطرے کو کسی طرح دیکھتے ہیں؟ ''فرانسیسی صدر نے کہا کہ ''اگر ایسا ہوا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا''۔ دنیا کو دکھانے کے لیے فرانسیسی صدر کا صحافی کو دیا گیا جواب یقیناً سیاسی تھا مگر فرانسیسی حکومت اندرونی طور پر ہر وہ اقدامات کر رہی ہے جن سے مسلمانوں کو بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جا سکے۔ سانحہ پیرس کے بعد فرانس میں ایمرجنسی کا نفاذ کیا جا چکا ہے اور اب فرانس ایسے قوانین وضع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے تحت فرانسیسی شہریت کے حامل کسی بھی مسلمان کی شہریت منسوخ کر کے اُسے کسی بھی وقت آبائی وطن ڈی پورٹ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کر کے انہیں ہراساں کیا جا رہا ہے تا کہ وہ خود فرانس چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح فرانس کو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے سے نجات مل جائے۔ واضح ہو کہ فرانس میں 50 لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں جو یورپ کے کسی بھی ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے۔

فرانس کی اوسطاً شرح پیدائش 1.8 فیصد ہے جبکہ فرانس میں مقیم مسلمانوں کی شرح پیدائش تقریباً 6 فیصد ہے جن میں اکثریت 20 سے 25 سال کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 2027ء میں فرانس کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہوگا اور آئندہ 39 سالوں میں فرانس اسلامی مملکت بن جائے گا۔ اسی طرح یورپی ملک برطانیہ میں گزشتہ 30 سالوں کے دوران مسلمانوں کی آبادی میں 30 گنا اضافہ ہوا ہے جو بڑھ کر اب 25 لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں مساجد کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ تحقیق کے مطابق اگر برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو 2020ء تک برطانیہ میں مسجدوں کی تعداد گرجا گھروں سے بھی تجاوز کر جائے گی اور اس طرح اسلام برطانیہ کا نمایاں مذہب بن جائے گا۔ مذکورہ تحقیق کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ 1997ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں صرف ایک پاکستانی نژاد مسلمان ممبر چوہدری محمد سرور تھے جنہوں نے قرآن پاک پر حلف اُٹھایا تھا لیکن 1997ء کے بعد ہونے والے ہر الیکشن میں مسلمان ممبر پارلیمنٹ کی تعداد میں دگنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے جن کی تعداد بڑھ کر اب 9 تک جا پہنچی ہے اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب برطانوی پارلیمنٹ میں مسلمان پارلیمنٹرین اکثریت میں ہوں گے۔ یورپ کے ایک اور اہم ملک بلجیم میں آبادی کا 25 فیصد مسلمان اور پیدا ہونے

والے بچوں میں 50 فیصد مسلمان ہیں جبکہ جرمن حکومت نے پہلی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جرمنی میں مقامی آبادی کی گرتی ہوئی شرح پیدائش اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر صورتحال یہی رہی تو 2050ء تک جرمنی مسلم اکثریتی ملک بن جائے گا۔ شاید انہی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیبیا کے رہنما معمر قذافی نے مسلمانوں کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ ''یورپ کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں کیونکہ یورپ کے 50 ملین سے زائد مسلمان صرف چند دہائیوں میں یورپ کو اسلامی خطے میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ دن دور نہیں جب مسلمان کسی جنگ وجدل کے بغیر یورپ میں اسلامی پرچم لہرائیں گے''۔ معمر قذافی کے مذکورہ دعوے کا یورپی ممالک نے سخت برا منایا اور بعد میں معمر قذافی کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ ایک تحقیق کے مطابق کسی قوم اور اس کے کلچر کو برقرار رکھنے کے لیے اُس قوم کا شرح پیدائش کم از کم 2.11 فیصد ہونا ضروری ہے لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں وہ قوم 25 سال میں ہی زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی معاشرہ 1.9 فیصد شرح پیدائش پر قائم نہیں رہ سکتا جبکہ 1.3 فیصد شرح پیدائش پر کسی بھی معاشرے کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی معاشی ماڈل نہیں جس کی معیشت 1.3 فیصد شرح پیدائش پر برقرار رہی ہو جس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ اگر کسی شادی شدہ دو جوڑے کے ہاں ایک ایک اولاد ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ نسل 4 کے بجائے 2 افراد کے خاندان کا صرف ایک پوتا یا پوتی ہوگی اور اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو آبادی میں مسلسل کمی ہوتی رہے گی جس کے نتیجے میں معاشرہ سکڑتا چلا جائے گا۔ اس وقت فرانس کا موجودہ شرح پیدائش 1.8 فیصد، انگلینڈ کا 1.6، یونان کا 1.3، جرمنی کا 1.3، اٹلی کا 1.2 اور اسپین کا 1.1 فیصد ہے۔ اس طرح یورپی یونین کے 31 ممبر ممالک کا اوسطاً شرح پیدائش 1.38 فیصد بنتا ہے۔ لیکن اگر یورپ کی شرح پیدائش 1.38 فیصد پر برقرار رہے تو مستقبل میں یورپی معاشرے کا وجود ناممکن ہو جائے مگر یورپ کی گرتی ہوئی شرح پیدائش کو مختلف ممالک سے آ کر یورپی ممالک میں رہائش اختیار کرنے والے مسلمانوں نے کافی حد تک سہارا دیا ہے جسے عام لفظوں میں ''اسلامک امیگریشن'' کہا جاتا ہے۔ یورپ میں مقامی آبادی کا تناسب کم ہونے کی وجہ مقامی لوگوں کا شادی نہ کرنا، ہم جنس سے شادی کا بڑھتا ہوا رجحان اور بچوں کی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق

2050ء تک یورپ کے کئی ممالک میں 60 سال سے زائد عمر کے مقامی افراد مجموعی آبادی کا 75 فیصد تک ہو جائیں گے۔ اس طرح بچوں اور نوجوان نسل کا تناسب کم ہو کر صرف 25 فیصد رہ جائے گا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا جن میں اکثریت نوجوانوں کی ہوگی۔ یورپ کے علاوہ کینیڈا کا شرح پیدائش بھی 1.6 فیصد ہے جو معاشرے کو برقرار رکھنے کی سطح سے 4 پوائنٹ کم ہے۔ اس لیے معاشرے کو برقرار رکھنے کے لیے کینیڈا کی شرح پیدائش 2.11 ہونا ضروری ہے۔ مذہب اسلام کینیڈا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق 2001ء سے 2006ء تک کینیڈا کی آبادی میں 1.6 ملین افراد کا اضافہ ہوا جن میں سے 1.2 ملین افراد مسلمان ہیں۔ اسی طرح امریکہ جس کی موجودہ شرح پیدائش 1.6 فیصد ہے، میں 1970ء تک صرف ایک لاکھ مسلمان آباد تھے مگر آج امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے جسے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ 30 سالوں میں مسلمانوں کی تعداد 5 کروڑ تک جا پہنچے گی۔ دنیا میں آبادی اور مذاہب پر نظر رکھنے والے امریکی ادارے پیو (PEW) نے اپنی حالیہ رپورٹ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دنیا کی مجموعی آبادی کا 23.5 (ایک ارب 60 کروڑ) تک پہنچ چکی ہے اور اگر مسلمانوں کی آبادی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو 2030ء تک مسلمانوں کی تعداد 26 فیصد اضافے سے 2 ارب 20 کروڑ تک جا پہنچے گی۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان انڈونیشیا میں آباد ہیں مگر آئندہ 20 سالوں میں یہ اعزاز پاکستان کو حاصل ہو جائے گا جبکہ بھارت مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جائے گا۔

قارئین! 9/11 کے بعد امریکی صدر بش کا یہ جملہ کہ ''9/11 دنیا کی تاریخ بدل دے گا'' آج درست ثابت ہو رہا ہے کیونکہ 9/11 کے بعد اسلام دنیا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے جبکہ قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن چکی ہے جس کی ایک وجہ 9/11 کے بعد غیر مسلموں میں یہ تجسس پیدا ہونا ہے کہ اسلام کیسا مذہب ہے کہ جس کے ماننے والے اس پر اپنی جان نچھاور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غیر مسلموں کا یہی تجسس انہیں قرآن پاک کے مطالعے کی طرف لے جا رہا ہے جس سے انہیں نہ صرف قلبی سکون حاصل ہو رہا ہے بلکہ اسلام کو قریب سے سمجھنے اور جاننے کا موقع بھی مل رہا ہے جبکہ اُن

کے ذہنوں سے اسلام کے بارے میں مغربی میڈیا کی پھیلائی گئی غلط فہمیاں بھی دور ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث یورپی باشندے گزشتہ ایک دہائی سے اسلام فوبیا کا شکار ہیں جن کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مذہب اسلام، یورپی قدروں کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں ہر ہفتے اسلام مخالف مظاہرے، سوئیڈن میں مساجد اور فرانس میں اسکارف اوڑھے مسلمان خواتین پر حملے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ مغرب کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اسلام کے سونامی کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو یہ مذہب ایک دن پورے مغرب کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا، اس لیے مغربی ممالک مسلمانوں کے خلاف امتیازی قوانین بنانے سمیت ہر وہ اقدامات کر رہے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی پیشرفت روکنے میں مددگار و معاون ثابت ہو سکے۔ مغربی ممالک کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو تفرقے کی بنیاد پر باہمی طور پر لڑوا کر کمزور کر دیا جائے، لیکن افسوس کہ مسلمان دشمنوں کی چال سمجھنے سے قاصر ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ کاش کہ امت مسلمہ دشمنوں کی چال سمجھتے ہوئے اپنے باہمی اختلافات بھول کر اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر متحد ہو جائے"۔ (روزنامہ جنگ لاہور 2 دسمبر 2015ء)

مارچ 2017ء میں امریکی تحقیقی ادارہ پیو ریسرچ سنٹر Pew Research Center کے اعداد و شمار کے مطابق دین اسلام دنیا کا سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور اگلے 33 برسوں میں یعنی 2050ء تک اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ اس ادارے کی غیر جانبدارانہ رپورٹ اور تحقیقی سروے سے اسلام دشمن طاقتیں ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کا خواب دیکھ رہے تھے، اب اس رپورٹ پر ان کے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔

"دنیا میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ لکھتے ہیں: گزشتہ چند سالوں میں اسلام دنیا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق 1990ء سے 2000ء کے دوران ایک کروڑ 25 لاکھ سے زائد افراد اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر چکے ہیں جبکہ 2001ء میں نائن الیون واقعہ کے بعد امریکہ سمیت دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد دگنی ہو چکی ہے اور قرآن پاک دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن چکی ہے۔ حال ہی میں سعودی عرب میں متعین

برطانوی سفیر سائمن کولینز کے قبول اسلام نے مغرب میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ عراق اور شام سمیت کئی اسلامی ممالک میں سفارتی خدمات انجام دینے والے سائمن کولینز وہ پہلے برطانوی سفارتکار ہیں جنہوں نے گزشتہ دنوں اسلام قبول کر کے اپنی شامی نژاد اہلیہ ہدیٰ مجارکیش کے ساتھ حج ادا کیا اور اس طرح وہ اسلام قبول کرنے والی مقبول شخصیت بن گئے۔ ان سے قبل سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی سالی لورین بوتھ نے اسلام قبول کر کے عالمی میڈیا کی توجہ حاصل کی تھی۔

دنیا میں جن سربراہان مملکت نے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا، اُن میں قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بائیوف اور گبون کے صدر عمر بونگو شامل ہیں۔ نذر بائیوف سوویت دور میں لادین رہے تاہم اسلام قبول کرنے کے بعد وہ راسخ العقیدہ مسلمان ثابت ہوئے اور انہوں نے حج بھی ادا کیا۔ تقریباً 42 سال (1967ء سے 2009ء) تک گبون کے صدر رہنے والے البرٹ برنارڈ بونگو نے 1973ء میں دورہ لیبیا کے موقع پر اسلام قبول کر کے اپنا نام عمر رکھا، اُن کے اسلام قبول کرنے سے گبون میں مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اسی طرح یوگینڈا کے سابق صدر عیدی امین نے کیتھولک عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ اس کے علاوہ اسلام قبول کرنے والی دیگر عالمی شخصیات میں 3 بار عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ چمپئن رہنے والے محمد علی کلے بھی شامل ہیں جنہوں نے 1964ء میں اسلام قبول کیا۔ اس سے قبل ان کے بھائی روڈی کلے نے 1961ء میں اسلام قبول کیا تھا جو محمد علی کے اسلام قبول کرنے کا سبب بنے۔ حال ہی میں محمد علی کی وفات کے بعد ان کی اسلامی طریقے سے تدفین کی گئی جس میں دنیا کے کئی سربراہان مملکت اور نامور شخصیات نے شرکت کی۔ محمد علی کے علاوہ عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ چمپئن مائیک ٹائی سن (ملک عبدالعزیز) بھی دوران قید اسلام قبول کر چکے تھے جنہوں نے بعد ازاں فریضہ حج بھی ادا کیا۔ اسی طرح اگر ماضی میں دیکھا جائے تو بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی دوسری اہلیہ رتن بائی نے پارسی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا جبکہ معروف پاکستانی شاعر فیض احمد فیض کی اہلیہ ایلس نے 1930ء کی دہائی میں فیض احمد فیض سے شادی کے بعد اسلام قبول کیا۔ عالمی شہرت یافتہ پاکستانی کرکٹر محمد یوسف (یوسف یوحنا) نے عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ جمائما خان نے 1995ء میں پاکستان کے سابق ٹیسٹ کرکٹر عمران خان سے شادی کے بعد اسلام قبول کیا۔ عالمی شہرت یافتہ

برطانوی خاتون صحافی یوون ریڈلے نے افغانستان میں طالبان کی قید سے رہائی کے بعد 2003ء میں اسلام قبول کیا۔ بھارتی اداکارہ دیویا بھارتی (ثناء) نے معروف بھارتی پروڈیوسر ساجد ناڈیاڈوالا سے شادی کے بعد اسلام قبول کیا تاہم ہندو انتہا پسندوں کی دھمکیوں کے باعث انہوں نے 1993ء میں صرف 19 سال کی عمر میں خودکشی کر لی۔مشہور بھارتی اداکارہ، شرمیلا ٹیگور (عائشہ سلطانہ) نے سابق بھارتی کرکٹر نواب منصور علی خان سے شادی کے بعد اسلام قبول کیا۔گلوکار کشور کمار نے 1960ء میں مدھوبالا سے شادی کے بعد اسلام قبول کر کے اپنا اسلامی نام عبدالکریم رکھا۔آسکر ایوارڈ یافتہ بھارتی موسیقار اے آر رحمٰن (اللہ رکھا رحمٰن) نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا جنہیں ''ٹائم میگزین'' 2009ء میں دنیا کی 100 اثر و رسوخ رکھنے والی بااثر ترین شخصیات میں شامل کر چکا ہے۔اس کے علاوہ سابق معروف امریکی باسکٹ بال کھلاڑی لیوالیسٹڈ (کریم عبدالجبار)،مشہور پاپ گلوکار مائیکل جیکسن کے بھائی جرمین جیکسن (محمد عبدالعزیز) اور بہن جینٹ جیکسن، معروف بھارتی اداکار اے ایس دلیپ کمار (یوسف خان)، اردن کی ملکہ نور بھی اسلام قبول کرنے والی دنیا کی معروف شخصیات میں شامل ہیں۔

برطانیہ اور فرانس میں گزشتہ دس سالوں کے دوران ایک لاکھ سے زائد افراد اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر چکے ہیں۔اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تر لوگ نسلی امتیاز اور اخلاقی اقدار کے فقدان کی وجہ سے اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً 7.5 ملین، فرانس میں 5 ملین اور جرمنی میں 4 ملین سے زائد مسلمان مقیم ہیں۔ان بڑے ممالک کے علاوہ اسپین، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، یونان وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے جن میں اکثریت پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ فرانس سے آزادی حاصل کرنے والے ممالک مراکش، الجیریا اور تیونس نژاد باشندوں کی بڑی تعداد فرانس میں مقیم ہے جن کی آبادی میں 6 فیصد شرح سے اضافہ ہو رہا ہے، ان میں اکثریت 20 سے 25 سال کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔فرانس میں مسلمان آبادی کی تیز گروتھ کے پیش نظر ایک اندازے کے مطابق 2027ء تک فرانس کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہوگا۔اسی طرح برطانیہ میں گزشتہ 30 سالوں میں مسلمانوں کی آبادی میں 30 گنا اضافہ ہوا ہے جو بڑھ کر 25 لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور اگر برطانیہ کی آبادی میں مسلمانوں

کی تعداد میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو 2020ء تک اسلام برطانیہ کا دوسرا بڑا مذہب بن جائے گا جس کا واضح ثبوت پاکستانی نژاد مسلمان صادق خان کا لندن میں میئر منتخب ہونا ہے۔ یورپی یونین کے ملک بلجیم کی آبادی کا 25 فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے جبکہ جرمنی میں گزشتہ ایک سال میں 4 ہزار سے زائد افراد اسلام قبول کر چکے ہیں اور جرمن حکومت نے پہلی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مسلمانوں کی تعداد میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو 2050ء تک جرمنی مسلم اکثریتی ملک بن جائے گا۔ ان اعداد وشمار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یورپی یونین کے 27 ممبر ممالک کی اوسط شرح پیدائش صرف 1.38 فیصد ہے مگر مختلف ممالک سے یورپی ممالک میں رہائش اختیار کرنے والے مسلمانوں نے یورپ کی گرتی ہوئی شرح پیدائش کو سہارا دے رکھا ہے۔

برطانوی جریدے ''اکنامسٹ'' کی رپورٹ کے مطابق یورپی ممالک اور امریکہ میں اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کئی سالوں سے مسلمانوں کے ساتھ رابطے میں ہیں اور ان کے اسلام کی طرف مائل ہونے کی بڑی وجہ مغربی معاشرے میں مسلسل پھیلتی ہوئی بے راہ روی اور فحاشی ہے جس سے وہ تنگ آ چکے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یورپی ممالک میں اسلام قبول کرنے والی غیر مسلم خواتین کی اکثریت نے صرف اس لیے اسلام قبول کیا کہ وہ کسی مسلمان بالخصوص پاکستانی مسلمان سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ دنیا میں مختلف مذاہب کی آبادی کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی 7 ارب 16 کروڑ سے زائد کی مجموعی آبادی تقریباً 31.4% (2 ارب 20 کروڑ) عیسائیوں اور 23.2% (ایک ارب 60 کروڑ) مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پیو ریسرچ سنٹر کی رپورٹ کے مطابق 2050ء تک اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا اور مسلمانوں کی آبادی بڑھ کر 2 ارب 76 کروڑ تک جا پہنچے گی جس میں شمالی افریقن اسلامی ممالک کی آبادی کی شرح گروتھ سب سے زیادہ ہوگی۔ دنیا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر یورپ اور امریکہ سمیت دیگر مغربی ممالک کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اسلام کے سونامی کو روکا نہ گیا تو وہ ایک دن پورے مغرب کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا، اس لیے یہ مغربی ممالک مسلمانوں کے خلاف ہر وہ اقدامات کر رہے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی پیشرفت روکنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں۔ ان مغربی ممالک کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کو تفرقے کی بنیاد

پر باہمی طور پر لڑوا کر کمزور کر دیا جائے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم امہ، دشمن طاقتوں کی آلہ کار بننے کے بجائے باہمی اختلافات بھول کر اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کرے"۔

(روزنامہ جنگ لاہور، 26 ستمبر 2016ء)

مغربی دنیا میں جہاں ایک جانب اسلام مخالف مہم زوروں پر ہے، وہاں یورپ کے مسلمانوں نے ایک نئی مہم شروع کی ہے جس کے تحت طویل عرصے سے بند گرجا گھروں کو خرید کر مساجد میں تبدیل کرنے کی ایک نئی مہم جاری ہے جبکہ مغرب میں اسلام کی طرف رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔عرب ٹی وی کے مطابق یورپی ملکوں میں ہزاروں گرجا گھر یا تو مقامی آبادی کی لاپرواہی کا شکار ہیں یا ان میں عیسائی شہریوں نے عبادت کرنا چھوڑ دی ہے۔ایسے تمام گرجا گھروں کو مساجد میں تبدیل کرنے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سالانہ 20 گرجا گھر بند کیے جا رہے ہیں۔ڈنمارک کی حکومت کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار میں بتایا گیا ہے کہ 2015ء کے بعد ایک سال میں 200 چرچ بند ہو چکے ہیں جب کہ جرمنی میں حالیہ چند برسوں کے دوران 515 گرجا گھروں کو تالے لگائے گئے۔ہالینڈ کے کیتھولک مسیحی فرقے کے رہنماؤں کا خیال ہے کہ اگلے 10 سال میں ان کے 1600 گرجا گھروں میں سے دو تہائی بند ہو جائیں گے جب کہ پروٹسٹنٹ کا کہنا ہے کہ چار برسوں میں 700 گرجا گھر بند کیے گئے ہیں۔

امریکہ کی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور خبث باطن کا اندازہ اس ویڈیو سے لگایا جا سکتا ہے جو آج بھی انٹرنیٹ یوٹیوب پر موجود ہے۔اس میں امریکی اور برطانوی فوجیوں کو مسلمانوں کی لاشوں پر پیشاب کرتے دکھایا گیا ہے۔گوانتانا موبے میں قید مسلمان قیدیوں کیساتھ جو سلوک کیا گیا، اس کو دیکھ کر انسانیت شرمسار ہو گئی۔دنیا کا کوئی بھی قانون قیدیوں سے ایسے ظلم وستم کی اجازت نہیں دیتا۔ان قیدیوں پہ کتے چھوڑے گئے، ان کے نازک اعضاء کو نوچا گیا، ان کو بجلی کے کرنٹ دیئے گئے۔ان کے سامنے اسلام کو برا بھلا کہہ کے ان کے جذبات مجروح کیے گئے۔امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ (The Washington Post) نے اپنی اشاعت 4 جون 2005ء میں انکشاف کیا کہ گوانتانا موبے جیل (Gawantana Mobay Jail) میں مسلمان قیدیوں سے تفتیش کے دوران انہیں ذہنی اذیت دیتے ہوئے ان کے سامنے قرآن مجید کے نسخوں پر نہ صرف پیشاب کیا گیا بلکہ ان

نسخوں کو پھاڑ کر ٹائلٹ میں بھی بہایا۔ اسی طرح بگرام افغانستان کے ٹارچر سیل سے بھی مصدقہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ یہاں قرآن مجید کے اوراق کو ٹائلٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا اور پھر اسے فلش میں بہا دیا جاتا ہے۔ بغداد کے نواحی قصبے رضوانیہ (Ridhvania) میں ایک ملعون فوجی آفیسر جس کا تعلق امریکہ کی 64ویں آرمڈ رجمنٹ سے تھا، اپنی نشانہ بازی کی مشق کے دوران اپنی رائفل کی گولیوں سے (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے نسخے کو ہدف بناتا۔ مسلمان قیدیوں سے تفتیش کے دوران تفتیشی آفیسر جوتوں سمیت قرآن مجید پر کھڑے رہتے، اسے اپنے بوٹوں سے ٹھوکریں مارتے رہتے۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ امریکی جنرل جے ڈبلیو ہڈ (Jay W Hood) کی ہدایت پر ہوتا رہا جو وہاں کا انچارج تھا۔

امریکی تنظیم نے سی آئی اے کے حراستی مراکز میں گرفتار شدگان پر غیر قانونی اور غیر انسانی سلوک کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اوپن سوسائٹی فاؤنڈیشن کا کہنا ہے کہ دنیا کے 54 ممالک انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث ہیں جنہوں نے امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کی مختلف طریقوں سے گرفتار شدگان پر دوران حراست تشدد اور غیر قانونی حوالگی میں مدد کی ہے۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق نیویارک میں قائم امریکی تنظیم اوپن سوسائٹی فاؤنڈیشن نے یہ دعویٰ اپنی رپورٹ میں کیا۔ اوپن سوسائٹی فاؤنڈیشن نے مطالبہ کیا کہ اس معاملے میں مزید احتساب کی ضرورت ہے جس میں الزام ہے کہ بش حکومت کے اہلکاران معاملات میں ملوث تھے جو اوپن سوسائٹی کے مطابق انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہیں۔ رپورٹ کے مطابق امریکی حکومت نے ملکی اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور اپنی اخلاقی اقدار اور اصولوں کے منافی کام کیا ہے جس کے نتیجے میں بین الاقوامی سطح پر موجود دہشت گردی کے خلاف حمایت ختم ہوئی۔ اوپن سوسائٹی کی یہ رپورٹ اب تک بنائی گئی سب سے مؤثر اور مکمل رپورٹ ہے جس میں اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی اور ان ممالک کی ایک فہرست تیار کی گئی جو سی آئی اے کے ساتھ ان غیر قانونی کاموں میں شامل رہے اور جنہوں نے مختلف افراد کو مختلف طریقوں سے سی آئی اے کے حوالے کیا۔ سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے غیر معمولی حالات میں حوالگی کی پالیسی کا اعلان کیا تھا جس کے تحت مختلف ممالک قانونی تقاضوں کو پورا کیے بغیر مختلف مطلوب افراد کو امریکہ یا مختلف ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر سکتے تھے جو ان افراد سے بعد میں تفتیش کر سکتی تھیں۔ اوپن سوسائٹی کا

کہنا ہے کہ انہیں اس بات کے ثبوت ملے ہیں کہ دنیا کے 54 مما لک نے مختلف طریقوں سے ان اقدامات کی حمایت کی تھی، جن میں سی آئی اے نے جیلیں بنائیں جن میں مشتبہ افرد سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی یا ایسی خفیہ پروازوں کی اجازت دی جاتی تھی جن میں خفیہ طور پر مشتبہ افراد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا تھا یا سی آئی اے کو خفیہ معلومات دی جاتی تھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اوپن سوسائٹی صدر اوباما پر بھی اس رپورٹ میں تنقید کرتی ہے جنہوں نے حوالگی کے قانون کو برقرار رکھا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق دوران حراست کچھ قیدیوں کو مصنوعی دیواروں میں دے مارا گیا، ان کو مختلف تکلیف دینے والے جسمانی کاموں میں لگایا گیا، انہیں برہنہ کیا گیا اور انہیں بری طرح ٹارچر کیا گیا۔ سی آئی اے کے سابق سربراہ جنرل مائیکل ہیڈن (Michael Hayden) نے ماضی میں اس بات کی تصدیق کی کہ امریکی تفتیش کاروں نے قیدیوں کو واٹر بورڈنگ کا نشانہ بنایا تھا جس میں انسان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ڈوب رہا ہے جب اس پر پانی ایک مخصوص طریقے سے پھینکا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ واٹر بورڈنگ کو تشدد ہی کی ایک قسم کہتے ہیں۔

جون 2005ء میں امریکی صدر جارج بش نے حقوقِ انسانی کی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی اس رپورٹ کو لغو اور فضول قرار دے کر مسترد کر دیا تھا جس میں گوانتاناموبے (Guantanamobay) میں قیدیوں کے ساتھ ناروا سلوک پر امریکہ کی مذمت کی گئی تھی۔ تاہم ایمنسٹی نے جواب میں کہا کہ لغو اور فضول بات یہ ہے کہ صدر بش اپنی انتظامیہ کی پالیسیوں سے انکار کررہے ہیں اور یہ کہ بش انتظامیہ نے اس سلسلے میں مکمل طور پر آزادانہ تحقیقات نہیں کرائی ہیں۔ تنظیم نے اپنی رپورٹ میں گوانتاناموبے کے قید خانے کو سوویت زمانے کے گولاگ (Gulag) یعنی جبری کیمپوں سے تشبیہ دی تھی اور واشنگٹن پر الزام لگایا تھا کہ دنیا بھر میں حقوق انسانی کی بگڑتی صورت حال کے لیے امریکہ سب سے زیادہ قابل الزام ہے۔ گوانتاناموبے کے قید خانے میں محافظوں پر یہ الزام بھی لگا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کی بے حرمتی کی تھی جس پر مسلمان دنیا نے بہت احتجاج کیا تھا۔

پروفیسر خباب احمد خان اپنے مضمون ''یونائیٹڈ اسٹیٹس آف ٹارچر...... یہ ذلت کم ہی ملتی ہے کسی کو'' میں لکھتے ہیں: ''فیڈ'' یعنی غذا اس راستے سے دی جائے جو قدرت نے وضع کیا

ہے یعنی منہ کے راستے سے، تو یہ انسان کی فطرت ہی نہیں مویشیوں، درندوں، چرندوں اور پرندوں کی بھی فطرت ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے کہ یہ سب منہ کے راستے اپنی خوراک حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو دیتے ہیں، مگر ''مہذب'' دنیا کے سرخیل امریکہ جسے آئے روز انسانی حقوق کے مروڑ اٹھتے رہتے ہیں، اپنے ان دشمنوں سے جن پر کوئی الزام ثابت بھی نہیں ہو، اس درجہ سفاکیت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ وحشت اور بہیمیت بھی شرما جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو مقعد کے راستے خوراک دیتا اور پانی پریشر کے ساتھ جسم کے پچھلے حصے سے داخل کرتا ہے۔ نازیوں کو بدنام کرنے والے اپنے مظالم پر نظر نہیں ڈالتے، بلکہ اسے ''تفتیشی ضرورت'' قرار دیتے ہیں۔ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کے لیے ''جنیوا کنونشن'' پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے ترقی پذیر، تیسری دنیا اور مسلمان ممالک کو احکامات دینے والے جنیوا کنونشن کے کسی آرٹیکل کے پابند نہیں، کیونکہ ''مخصوص حالات'' اور ''مخصوص صورت حال'' کے جواز کے تحت انہوں نے خود کو مستثنٰی قرار دے رکھا ہے۔ اگر یہ مجرم ہوتے تب بھی بین الاقوامی قوانین کے تحت انہیں ضروری سہولیات مہیا کرنا اس ریاست کے لیے ضروری ہوتا جو مجرم کو قید کرتی ہے، مگر چونکہ یہ مسلمان تھے، ان میں سے اکثریت معصوم اور بے گناہوں کی تھی، صرف الزام کی بنیاد پر ان کو بین الاقوامی قوانین کے تحت سہولتیں دینا تو درکنار، انہیں حیوان کے حقوق بھی نہیں دیئے گئے۔
یہ رپورٹ **485** صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اجزاء سے قبل بہت غور وخوض کیا گیا ہوگا اور سفاکیت کو کم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہوگی، اب بھی ان میں سے کئی صفحات کے بعض پیراگرافوں پر سیاہی پھیر کر اس رپورٹ کا اجراء کیا گیا۔ اس کے باوجود بھی جو کچھ سامنے لایا گیا، وہ ان کی فسطائیت پر مبنی ذہنیت کا عکاس ہے جو کچھ سامنے لانے سے گریز کیا گیا یقیناً وہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔ اسی لیے سی آئی اے نے اس رپورٹ کے اجراء کی مخالفت کی تھی کہ اس سے مسلم دنیا میں شدید ردعمل پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ سی آئی اے کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس کی ''کیرٹ اور اسٹک'' کی پالیسی اور عالم اسلام پر اپنے ڈھب کے حکمران مسلط کرنے کے بعد ایسا امکان فی الحال نہیں، کیوں کہ بے بسی اور بے حسی دونوں اس وقت عالم اسلام اور اس کے عوام کا طرہ امتیاز بن چکے ہیں۔

جنیوا کنونشن کے آرٹیکل **34**، **36** اور **71** میں بالترتیب قیدیوں کو کھانا، پینا اور دوسری ضروریات مہیا کرنا، انہیں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت دینا، خطوط لکھنا

اور کتابیں پڑھنے کی سہولت مہیا کرنا اس ملک کی ذمہ داری ہے، جہاں وہ محبوس ہوں۔ امریکہ کی سی آئی اے گوانتانا موبے میں کئی دنوں تک قیدیوں کو بھوکا پیاسا رکھا گیا اور کھانا کھلایا تو منہ کی بجائے اس کے لیے دوسری راہ اپنائی۔ عبادت کا حق دینا تو درکنار، انہیں ان کی مذہبی کتاب قرآن مجید پڑھنے کے لیے نہ دی گئی، اگر کسی نے کوشش کی تو ان کے سامنے قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی، اسے پاؤں تلے روندا گیا یا فلیش میں بہایا گیا، یوں ان کی دل آزاری کا سامان کیا گیا، تفتیش میں جو انسانیت سوز طریقے اختیار کیے گئے، ان میں کئی کئی دنوں نہیں بلکہ ہفتوں تک قیدیوں کو نیند سے محروم رکھنا، پانی میں مسلسل غوطے دینا، ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیاں توڑنا، الٹا لٹکانا، ڈبوں میں قضائے حاجت کے لیے مجبور کرنا، جنسی اذیت کے لیے لواطت کرنا، اس طرح لٹکایا جاتا کہ پیشاب کرنا ہو تو منہ پر گرے، شور سے اذیت دینا، گرمیوں میں دھوپ اور سردیوں میں یخ بستہ کمروں میں رکھنا، نازک اعضا داغنا، کرنٹ لگانا، ماؤں کے ساتھ قیدیوں کے سامنے زیادتی کی دھمکیاں دینا اور دوسرے مذموم ترین طریقے اختیار کیے گئے۔

سی آئی اے کے عقوبت خانے صرف کیوبا کے گوانتاناموبے تک محدود نہیں، افغانستان میں بگرام ایئربیس، چرخی پل جیل اور دوسرے عقوبت خانوں میں قیدیوں پر بے پناہ تشدد کیا گیا، جن میں ان کے تن سر سے جدا کر کے ان کے نرخروں میں پیٹرول بھر کر آگ لگائی گئی اور ''رقص بسمل'' سے امریکیوں نے دل بہلایا، ان کی لاشوں پر پیشاب کیا گیا، انہیں برہنہ کیا گیا، ان کے ناخن اکھاڑے گئے، عراق کی ابوغریب اور دوسری جیلوں میں ان کے اعضائے رئیسہ کے ساتھ کھلواڑ کی گئی، ان کو عریاں کر کے ان پر شکاری کتوں کو چھوڑا گیا۔ ذہنی اور جنسی تشدد کر کے رشتہ داروں کے سامنے ان کے بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کی بے حرمتی کی گئی۔ عافیہ صدیقی کے ساتھ جو ہوا، وہ ماضی قریب کی بات ہے، پولینڈ، جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ میں بھی سی آئی اے نے اپنے عقوبت خانے قائم کر رکھے ہیں، جہاں مقامی حکومتوں اور ان کے اہلکاروں کو رسائی تک حاصل نہیں۔

محض غلطیوں کے اعتراف کے نام پر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا امریکہ اور مغربی ممالک کا معمول ہے۔ امریکی سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کی سربراہ سینٹر ڈیان فائن اسٹائن نے ایک طرف یہ اعتراف کیا کہ ان مظالم کا اعتراف کر کے امریکہ پر لگنے والا داغ صاف نہیں کیا جا سکتا اور دوسری طرف یہ کہا کہ ہم امریکی عوام اور دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ امریکہ اپنی

غلطیوں کو تسلیم کرنے کی جرأت اور حوصلہ رکھتا ہے اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ساٹھ لاکھ صفحات میں سے صرف **485** صفحات شائع کر کے دنیا پر احسان جتلایا جا رہا ہے تا کہ اپنے عیب کو ہنر ثابت کیا جا سکے۔

امریکی صدر اوباما کا یہ کہنا کہ تفتیش کے نام پر روا رکھی گئی انسانیت سوز کارروائیاں امریکہ کی تاریخ اور اقدار پر بدنما داغ ہیں۔ کیا یہ پہلا داغ ہے؟ یقیناً نہیں، کیوں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی سے شروع ہونے والا سلسلہ ویتنام تک پہنچا اور پھر دنیا بھر میں امریکی اڈوں میں یہ سلسلہ خفیہ جاری رہا، وہاں سے عراق کی ابوغریب جیل سے گوانتاناموبے اور دوسرے عقوبت خانوں تک پہنچا۔ غالباً بش کے دور میں کہا گیا تھا کہ لوگ امریکہ سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ تو اس کا جواب ایسے انسانیت سوز ''حسن سلوک'' کے واقعات ہیں، جو اپنے ''دشمنوں'' اور ''محسنوں'' سب کے ساتھ امریکہ کرتا رہا۔ ان انسانیت سوز جرائم کی باقاعدہ صدر بش اور ڈک چینی منظوری اور ہدایت دیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ عالمی امن کے قیام کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا تو پھر اس کے بعد واویلا مچانا کیا معنی رکھتا ہے؟ خاص طور پر ایسے میں جب سی آئی اے کے سابق سربراہ مائیکل ہیڈن یہ کہیں کہ قیدیوں سے ایسے سلوک کو قانونی طور پر تشدد نہیں کہا جا سکتا، یہ سب کچھ معلومات کے حصول کے لیے تھا۔ ایسے میں سیاہ فام اوباما جو ایک سفید فام پولیس افسر سے ایک سیاہ فام پروفیسر کو رہا کرانے پر معافی مانگنے پر مجبور ہو جائے، کا کہا کیا حیثیت رکھتا ہے، پھر جسٹن ریمنڈو جیسے مغربی تجزیہ کار درست ہی کہتے ہیں: ہم ''یونائیٹڈ اسٹیٹس آف ٹارچر'' بن چکے ہیں''۔ (روزنامہ اسلام کراچی **17** دسمبر **2014**ء)

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید ملاحظہ کیجیے! دسمبر **2012**ء میں امریکی ریاست کنیکٹی کٹ **(Connecticut)** کے اسکول میں فائرنگ کرنے والے حملہ آور نے اسکول میں استانی اپنی ماں کو سب سے پہلے فائرنگ کر کے ہلاک کیا۔ امریکی پولیس کے مطابق حملہ آور **20** سالہ ایڈم لینزا **(Adam Lanza)** زیادہ سے زیادہ افراد کو ہلاک کرنے کے مشن کے ساتھ بھاری اسلحہ لے کر اسکول آیا تھا۔ اس نے حملے کا آغاز اپنی ماں کو اسکول کے قریب واقع اپنے گھر پر گولی مارنے سے کیا اور بعد میں اسکول میں آکر فائرنگ شروع کی جس سے **27** افراد ہلاک ہو گئے۔ امریکی صدر نے بچوں سمیت **27** افراد کی ہلاکت پر امریکہ بھر میں سوگ کا اعلان کرتے ہوئے قومی پرچم کو تین دن تک سرنگوں رکھنے کا

حکم دیا۔ امریکی صدر اوباما واقعہ پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کے واقعات کو روکنے کے لیے ہمیں نتیجہ خیز اقدامات کرنا ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ مذکورہ واقعہ انتہائی افسوسناک ہے جس کے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے ان کے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی میڈیا نے اس واقعے کو کیوں دہشت گردی قرار نہ دیا؟ حملہ آور کو انتہا پسند اور دہشت گرد کیوں نہیں کہا گیا؟ نوجوان قاتل کا تعلق عیسائیت سے تھا، لہٰذا عیسائی مذہب کو انتہا پسندی کا مذہب کیوں نہ قرار دیا گیا؟

اسی طرح ستمبر 2013ء میں امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں امریکی نیول ہیڈ کوارٹرز پر امریکی دہشت گردوں نے دھاوا بولا اور فائرنگ کر کے 12 افراد کو ہلاک جبکہ متعدد کو شدید زخمی کر دیا۔ جوابی کارروائی میں ایک حملہ آور مارا گیا۔ ذرائع کے مطابق مارا جانے والا ملزم امریکی بحریہ کا سابق ملازم تھا۔ جس کا نام ایرن ایلکس (Aaron Alexis) جبکہ وہ ٹیکساس کا رہائشی تھا۔ حملے سے پورا واشنگٹن مفلوج ہو کر رہ گیا جبکہ امریکہ کے شہری ایک بار پھر نائن الیون جیسی خوف کی کیفیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ عوام کو اس خوف کی کیفیت سے نکالنے کے لیے بحریہ کے ایمرجنسی اہلکار جائے وقوعہ پر پہنچے اور پولیس نے عمارت میں داخل ہو کر حملہ آوروں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لاؤڈ سپیکرز کے ذریعے عمارت کے اندر لوگوں سے کہا گیا وہ جہاں موجود ہیں، وہاں پناہ لے لیں۔ فائرنگ کے بعد بوئنگ فضائی اڈے بند کر دیئے گئے جس سے ریگن انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر جہازوں کی آمدورفت کا شیڈول متاثر ہوا اور ایئرپورٹ پر پروازوں کی روانگی روک دی گئی، صرف طیاروں کو اترنے کی اجازت دی گئی۔ حملہ آوروں کی گرفتاری کے لیے امریکی پولیس کے خصوصی دستے طلب کیے گئے۔ پولیس کی مدد کے لیے انسداد دہشت گردی ٹیم کے علاوہ ایف بی آئی نے بھی اس کارروائی میں حصہ لیا۔ بحریہ کے اڈے پر حملے کے چند گھنٹوں بعد وائٹ ہاؤس کو سکیورٹی خدشات کے باعث تالا لگا دیا گیا۔ سکیورٹی اہلکاروں نے وائٹ ہاؤس کے سامنے لیفٹی پارک (Lafayette Park) کو گھیرے میں لے لیا جو امریکی صدر کی رہائش گاہ دیکھنے والوں سے بھرا رہتا ہے۔ واضح رہے کہ حملہ واشنگٹن میں ''نیول سسٹمز کمانڈ'' کے کوارٹر کی عمارت میں کیا گیا، جو امریکی کانگریس کی عمارت ''کیپٹل ہل'' سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اس عمارت میں لگ بھگ تین ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ یہ ادارہ بحری جہازوں اور

آبدوزوں کی خریداری، تیاری اور دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کمپلیکس میں ایک ایسی رہائش گاہ بھی ہے جسے امریکی بحریہ کے سربراہ گھر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ امریکی نیوی کے مطابق واشنگٹن نیوی یارڈ بحریہ کا سب سے پرانا ساحلی ٹھکانا ہے۔ اسے پہلی بار 1974ء میں کھولا گیا تھا۔ جولائی 2012ء میں ایک امریکی جیمز ہومز نے ایک سینما گھر میں بیٹ مین سیریز کی فلم کے پریمیئر کے موقع پر فائرنگ کر کے 12 افراد کو ہلاک اور 70 افراد کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ وقوعہ کے بعد 24 سالہ ملزم جیمز کو سینما کی پارکنگ سے آلہ قتل سمیت گرفتار کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہاں کے میڈیا نے ان واقعات کو دہشت گردی سے کیوں نہ جوڑا؟ انہیں ملک بدر کیوں نہ کیا گیا؟ انہیں سزائے موت کیوں نہ دی گئی؟

جناب محبوب الحق عاجز اپنے مضمون ''انسانی حقوق کے دعویداروں کا اصل چہرہ'' میں لکھتے ہیں: ''مسلمان انتہاپسند ہیں، بنیاد پرست ہیں، جنونی ہیں، سب سے بڑھ کر یہ دہشت گرد ہیں جن سے انسانیت اور عالمی امن کو خطرہ ہے۔ اس قوم کے افسانوں سے بوئے خون آتی ہے۔ خون ریزی، قتل و غارت اور سفاکیت ان کے مزاج کا حصہ ہے، لہٰذا جیسے بھی ہو، ان کا راستہ روکو، بالخصوص سیاسی اسلام کو کسی صورت ابھرنے نہ دو، ورنہ مسلمان تہذیب کو غارت اور تمدن کو نابود کر دیں گے۔ اپنے علاوہ کسی کو بھی جینے نہ دیں گے اور دوسری قوموں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے''۔ یہ ہے وہ گمراہ کن پروپیگنڈا جو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ سے 1990ء کے بعد سے زور وشور سے کیا جا رہا ہے تا کہ سوویت یونین کے انہدام اور سوشلزم کی شکست و ریخت کے بعد اسلام کے خلاف صیہونی ورلڈ آرڈر کی علمبردار قوتوں کی جانب سے چھیڑی گئی جنگ کے لیے دنیا کو اپنا ہم نوا بنایا جا سکے۔ گوئبلز نے کہا تھا کہ جھوٹ بولو اور اس کثرت سے بولو کہ سچ دکھائی دینے لگے۔ ان لوگوں نے اس ''اصول'' کی خوب تعمیل اور پاسداری کی۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یہ جھوٹ اس کثرت سے بولا کہ کرۂ ارض پر آباد لوگوں کی ایک عظیم اکثریت ان کے جھوٹ کو سچ اور فسانے کو حقیقت سمجھنے لگی، چنانچہ مسلمان دہشت گرد ٹھہرے، ظالم اور فسادی قرار پائے۔ انسانی حقوق کے غاصب اور امن کے قاتل کہلائے۔

اسلام اور پیروان اسلام کے خلاف برسرپیکار مغربی سیکولر نظام کے یہ علمبردار خود اپنے آپ کو تہذیب یافتہ، متمدن اور انسانی حقوق کے محافظ قرار دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے

کہ ان کے نعرے جھوٹ اور ان کے دعوے مکر کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ جس تہذیب کی بات کرتے ہیں، اس میں اپنی ملکی حدود کے اندر قانون کے احترام کے سوا تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں، یہ انسانوں نہیں، حیوانوں کی تہذیب ہے، جو مادر پدر آزادی اور بے لگام جنسیت کی آزادی دیتی ہے۔ یہ مذہبی آزادی کی بات کرتے ہیں مگر ان کی مذہبی آزادی کے غبارے سے ہوا ایک مسلمان عورت کا حجاب ہی نکال دیتا ہے۔ یہ دنیا کو رواداری اور برداشت کا کلچر اپنانے کی تلقین کرتے ہیں، مگر ان کا حال یہ ہے کہ زمین پر ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی ﷺ کی شان میں گستاخیاں کر کے ان کے تن بدن میں آگ لگا دیتے ہیں۔ رہی بات احترام انسانیت کی، انسانی حقوق کی پاسداری کی تو اس کی ایک نمایاں مثال دنیا کے سب سے ''مہذب'' ملک امریکہ کی فوج کی جانب سے حال ہی میں منظرعام پر آئی ہے۔ غیرملکی خبررساں ایجنسی کے مطابق ٹی ایم زیڈ ویب سائٹ نے امریکی فوجیوں کی درندگی کو منظرعام پر لاتے ہوئے فلوجہ میں 2004ء میں عراقیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کی تصویری رپورٹ شائع کی ہے۔ تصاویر میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح امریکی فوجی عراقیوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا رہے ہیں۔ کچھ تصاویر میں دکھایا گیا ہے کہ امریکی فوجی عراقیوں کی لاشوں کو جلانے کے بعد ڈھانچے کو کوڑا کرکٹ میں ڈال دیتے ہیں۔ جگہ جگہ عراقیوں کی سوختہ لاشیں پڑی ہیں۔ بعض تصاویر میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ امریکی فوجیوں نے درجنوں عراقیوں کو قتل کرنے کے بعد لاشیں ویرانے میں پھینک دیں، جہاں کتے اور بلیاں ان لاشوں کو نوچتے رہے۔ رپورٹ میں عراقیوں کی 41 لاشوں کی بے حرمتی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جن میں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ امریکی فوجی عراقیوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرتے وقت خصوصی پوز سے تصاویر بھی بنا رہے ہیں۔ یہ ہے عصر جدید میں تہذیب کے دعویدار امریکہ کا اصل چہرہ جسے نام نہاد انسانی حقوق، رواداری اور برداشت کے غازے سے چھپایا گیا ہے۔

عراقیوں کی لاشوں کی بے حرمتی کا مذکورہ حوالہ تو محض ایک مثال ہے، ورنہ امریکہ اور نیٹو نے نائن الیون کے بعد جب سے اسلام کی نظریاتی اور مزاحمتی قوت کے خلاف پوری قوت سے جنگ چھیڑ رکھی ہے، اس قسم کی انسانیت سوز مثالیں آئے روز سامنے آتی رہی ہیں۔ فلوجہ سے کیوبا (گوانتاناموبے) اور ابوغریب سے بگرام تک مسلمان قیدیوں پر ناقابل تصور مظالم اور لرزہ طاری کر دینے والی زندگی کی داستانیں مہذب امریکہ اور متمدن یورپ کے حقیقی

چہرے کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ مسلمان قیدیوں کو کرنٹ دیئے جاتے رہے۔ واٹر بورڈنگ سے گزارا جاتا رہا۔ ان پر کتے چھوڑے گئے۔ ان کے سامنے قرآن حکیم کی بے حرمتی کی جاتی رہی۔ بہت سے مسلمان قیدی کنٹینروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے دوران بھوکے پیاسے اور دم گھٹنے سے شہید ہوئے۔ بعض مقامات پر ایسا بھی ہوا کہ امریکی فوجی مسلمانوں کی میتوں پر پیشاب کر رہے ہیں، کہیں ان کی کھوپڑیوں پر نشانہ بازی کی مشق کر رہے ہیں۔ امریکہ خود کو احترام انسانیت کا دعویدار اور حقوق انسانی کا چیمپیئن کہلواتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا احترام انسانیت اسی رویے کا نام ہے؟ کیا حقوق انسانی کا تحفظ اسی طرح ہوتا ہے؟ کیا جنگی اخلاقیات اور جنیوا کنونشن کوئی معنی بھی رکھتے ہیں؟ اگر امریکہ کے یہی رویے تہذیب اور انسانیت کا مظہر ہیں تو پھر وحشت اور حیوانیت کس بلا کا نام ہے؟ پھر درندگی اور سفاکیت کس شے کو کہیں گے؟

آج یہی وحشت، بہیمیت اور سفاکیت، وسطی افریقی جمہوریہ ''کار'' (CAR) میں ننگا ناچ رہی ہے۔ امریکہ کے ہم مذہب صلیبی فرانسیسی فوجی، افریقی مذاکرات کاروں کی نگرانی میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور امریکہ اور اس کے گماشتوں پر سکوت مرگ طاری ہے۔ ''کار'' میں محض چند ہفتوں میں 15 ہزار مسلمان قتل اور 25 ہزار سے زائد زخمی کر دیئے گئے۔ آل افریقہ ڈاٹ کام کی ایک دلخراش رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ عیسائی خون خوار قبائلی حملہ آور مسلمان مسافروں کو گاڑیوں سے اتار کر سڑکوں پر آگ میں زندہ بھون کر ان کا گوشت خود بھی کھا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی کھانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ کم و بیش اسی طرح کا منظر ہے جس کی پیشین گوئی ایک حدیث میں کی گئی ہے۔ ویڈیو میں عیسائی ملیشیا کے ایک مقامی کمانڈر کو، جن کا نام اس کے ساتھیوں نے پاگل کتا رکھا ہے، کئی مقامات پر مسلمانوں کے سوختہ جسموں سے گوشت کھاتے دکھایا گیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ایک نہیں، کئی پاگل کتوں کی آدم خوری کے یہ مناظر سینکڑوں لوگوں سمیت سکیورٹی فورسز کے اہلکار بھی دیکھتے رہے، مگر کسی کی انسانیت نہ جاگی کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کرتا، نہ انسانیت کے غم میں مبتلا امریکہ اور تہذیب یافتہ یورپ ہی نے اس پر لب کشائی کی۔

امریکہ اور اس کے حواریوں کی درندگی کے لیے امریکیوں کے اجداد کی ریڈ انڈینز کی نسل کشی اور جاپانیوں پر ایٹمی یلغار سے قطع نظر 2004ء اور 2014ء کے یہی دو واقعات

کافی ہیں، جو امریکہ اوراس کے یورپی اتحادیوں کی انسان دوستی، احترام انسانیت اورحقوق انسانی کی پاسداری کے دعوؤں کی حقیقت سے پردہ ہٹا دیتے ہیں، مگر خاطر جمع رکھیے، ہمارے مسلم دنیا کے لبرل فاشسٹ اب بھی نہ جاگیں گے۔ ان کا مسئلہ اسلام کے وفاداروں سے بغض ونفرت اور مغربی آقاؤں سے غیر مشروط محبت ہے، لہٰذا امریکہ اور دیگر صلیبی خواہ جنگی اخلاقیات کی کیسے ہی دھجیاں اڑائیں، ان کے نزدیک وہ مہذب اور متمدن ہی کہلائیں گے اور اسلام کے وفادار مسلمان مجاہدین اسلام کے عطا کردہ جنگی ضابطوں کا لاکھ احترام کرنے کے باوجود غیر مہذب، دہشت گرد اور انسانیت دشمن قرار پائیں گے''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 27 جنوری 2014ء)

اس وقت امت مسلمہ ذلت و رسوائی میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ اس امت کو گھن لگ چکا ہے جو اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا ہے۔ اندرونی و بیرونی دشمن امت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں مگن ہیں۔ ہر طرف مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ آزمائشوں اور مصائب کے بظاہر نہ ختم ہونے والے سلسلے جاری ہو چکے ہیں۔ جدھر بھی نگاہوں کا رخ اٹھتا ہے تو نظریں یہ مشاہدہ کرتی ہیں کہ مسلمان کٹ رہے ہیں، پٹ رہے ہیں، کفار کے ظلم وستم کا ہدف بنے نظر آتے ہیں۔ ان کے قرآن کو جلایا جا رہا ہے۔ ان کے نبی ﷺ کی توہین کی جا رہی ہے۔ ان کی مساجد کو گرایا جا رہا ہے۔ ان کے دین کی ہر نشانی کو مٹانے کی تگ و دو کی جا رہی ہے حالانکہ یہ وہی مسلمان ہیں کہ جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے ساری دنیا کو روندا تھا۔ یہ وہی مسلمان ہیں کہ جن کے رعب و دبدبے کے سامنے عالی شان محلات میں رہنے والے لرزہ براندام تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہزاروں سال سے باہم متصادم عیسائیوں کے دو بڑے فرقے کیتھولک اور آرتھوڈکس کے سربراہان آپس کے تمام تر اختلافات ختم کر کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔

ستمبر 2005ء میں ڈنمارک کے اخبار ''جے لینڈز پوسٹن'' "Jyllands Posten" نے (نعوذ باللہ) حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے توہین آمیز خاکے شائع کیے تو پورے عالم اسلام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی جس نے جلد ہی آتش فشاں کا روپ دھار لیا۔ اس نام نہاد مہذب ملک کی حکومت سے امید تھی کہ وہ اپنے ملک کے اخبار کی شرانگیزی پر عالم اسلام سے غیر مشروط معافی مانگ کر مجرموں کو سزا دے گی۔ لیکن خلاف توقع ڈنمارک کی حکومت کا کہنا تھا کہ ان کے ملک میں آزادی اظہار

رائے "Freedom of Expression" کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اخبار چاہے جو لکھیں، جو شائع کریں، حکومت اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتی۔ اس کے برعکس اس اخبار کا دوہرا اور دوغلا معیار ملاحظہ کیجیے کہ جب اس اخبار میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین پر مبنی کارٹون اشاعت کے لیے آئے تو انتظامیہ نے یہ کہہ کر اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ اس سے عیسائیوں میں اشتعال پھیل سکتا ہے۔ گویا یورپ کو آزادیٔ اظہار رائے اور آزادیٔ صحافت کے نام سے اسلام کو تختۂ مشق بنانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ 2008ء میں امریکی خاتون کارٹونسٹ مولی نورس (Molly Norris) نے ایک تنظیم Citizens Against Humor قائم کی جس نے مطالبہ کیا کہ آزادی اظہار کے سلسلہ میں ہر شخص کو مسلمانوں کے رسول (حضرت محمد ﷺ) کا گستاخانہ کارٹون بنانے کی مکمل اجازت اور آزادی ہونی چاہیے۔ آپ مغرب کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ جب اخبار Jyllands-Posten کے ایڈیٹر سے گستاخانہ خاکے شائع کرنے پر احتجاج کیا گیا تو اس نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا ''ہمیں خدا کا کارٹون بنانے اور مذاق اڑانے کا بھی حق حاصل ہے''۔ (نعوذ باللہ)

فرانس، اٹلی، جرمنی اور اسپین کے اخباروں نے حضور نبی کریم ﷺ کے ہی نہیں بلکہ اللہ کے بھی کارٹون شائع کر دیے اور کہا کہ یہ ڈنمارک کے اخبار سے اظہار یکجہتی ہے جس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ ایک سیکولر معاشرے میں مذہبی کٹر پن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آزادی اظہار رائے کی آڑ میں عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے دین اسلام سے جس قسم کی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عیسائی دنیا میں ان خاکوں کو کم از کم 75 اخباروں میں شائع اور 200 ٹی وی اسٹیشنوں سے نشر کر کے اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی توہین کی مذموم کوشش کی گئی۔ اس قسم کی کھلی دشمنی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ یا کسی کا انفرادی فعل نہیں ہے بلکہ اس کی کڑیاں قدیم صلیبی جنگوں سے ملائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ڈنمارک کے پینل کوڈ سیکشن 266-B کے مطابق کوئی شخص اگر کھلے عام یا اس نیت سے ایسے مواد کی تشہیر کرتا ہے یا ایسے بیانات دیتا ہے یا ایسی اطلاع فراہم کرتا ہے جس سے کسی دوسرے شخص یا گروہ کو اس کے رنگ ونسل، مذہب، عقیدے اور فرقے کی بنیاد پر دھمکی دینا یا توہین کرنا مقصود ہو تو ایسے شخص پر

جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے، عارضی طور پر حوالات میں بھیجا جا سکتا ہے یا اسے جیل میں قید کیا جا سکتا ہے جس کی مدت 2 سال ہے۔ اگر ڈنمارک کا پینل کوڈ ایسے جرم کے مرتکب لوگوں کو جیل بھیجنے کی اجازت دیتا ہے تو ابھی تک جائی لینڈ پوسٹن کے کلچر ایڈیٹر فلیمنگ روز (Flemming Rose) جو اس سازش کا مرکزی کردار ہے اور ایڈیٹر انچیف کارسٹین جوستے (Carsten Juste) کو جیل کیوں نہیں بھیجا گیا؟ انہیں حکومت نے تحفظ کیوں فراہم کیا؟ اس گھناؤنی حرکت کو اظہار رائے کی آزادی کا نام دے کر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس ناپاک سازش کے پیچھے وہ عناصر کام کر رہے ہیں جو دنیا کے امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ وہی سازشی لابی ہے جو عمداً چھ ماہ بعد یا ہر سال مسلمانوں کی دل آزاری پر مبنی واقعات دہراتی رہتی ہے تاکہ انہیں اشتعال دلا کر دنیا کا امن تباہ کیا جا سکے۔

مغرب کو اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کو مشتعل کرنا ہو تو ایسی گھٹیا حرکت کی جائے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی طرف سے بار بار اس گستاخی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے صحافی، اخلاقیات اور صحافتی اقدار سے بے خبر ہیں۔ مغرب میں کسی کی توہین اور دل آزاری کو بہت بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو سزائیں دینے کے لیے سخت قوانین موجود ہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ ایسی گھٹیا حرکتیں کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جاتا ہے۔ 14 فروری 2006ء کو ''اٹلی'' کے ایک منسٹر "Roberto Calderol" ایک ایسی "T.Shirt" پہنے جلوہ گر ہوئے جس پر (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کی فرضی تصویر تھی اور اس نے جو کہا، وہ ہم مسلمانوں کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں، اس نے کہا: ''میرے پاس یہ شرٹ موجود ہے اور میں آج سے اس کو پہننا شروع کروں گا جس نے پورے اسلام کو مضطرب کر دیا ہے، ہمیں اب اس کہانی کو ختم کرنا ہی ہوگا، مسلمانوں سے کہو کہ بس اب رک جاؤ، یہ ہمارا زمانہ ہے اور تمہارا قصہ پارینہ ہے''۔ حقیقت میں یہ لوگ انتہائی متعصب، تنگ دل، تنگ نظر اور مسلم دشمنی رسیا ہیں۔ بقول شخصے: کوئی مانے یا نہ مانے اہل یورپ کی مذہبی جنگی جنونیت دراصل صلیبی جنگوں کا احیاء ہے اور اپنی اس مذہبی جنگی جنونیت کو وہ آزادی اظہار کے نقاب میں چھپا رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یورپ کے صحافی، دانشور، مصور اور مذہبی راہنما ذہنی طور پر اتنے قلاش اور

علمی طور پر اتنے بانجھ ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس لکھنے یا کہنے کو کچھ نہیں رہا اور وہ گالی گلوچ، ہذیان اور سب وشتم پر اتر آئے۔ انہیں ذرا احساس نہیں کہ آزادی اظہار رائے لامحدود اور بے لگام نہیں اور نفرت، تضحیک، کردار کشی اور توہین ہر معاشرے میں جرم سمجھے جاتے ہیں۔

کارٹونوں کی اشاعت کا تنازعہ برطانوی اخبارات اور جرائد کا اہم موضوع ہے۔ اس بحث کا مرکز اداراتی صفحات ہیں۔ یہ بحث زیادہ تر اظہار رائے کی آزادی پر مرکوز ہے۔ قدامت پرست اخبار 'دی ٹائمز' کے سائمن جنکنز (Simon Jenkins) لکھتے ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی قطعی نہیں ہے۔ تہذیبوں کی کہانی دراصل اکٹھا رہنے کی خاطر اظہارِ رائے پر سمجھوتے کی کہانی ہے۔ ہمیں اس کی مطلق ضرورت نہیں کہ فلاسفر تھامس ہوبس (Thomas Hobbes) کو آ کر بتانا پڑے کہ مکمل آزادی رائے صرف وحشیوں کو حاصل ہے، باقیوں کے لیے مصلحت کوشی اور سمجھوتہ گری ہے۔ ڈنمارک کے اخبار کو کارٹونوں سے پرہیز کرنا چاہیے تھا۔ اگر اخبار شروع میں ہی معذرت کر لیتا تو یہ تنازعہ نہ ابھرتا۔ اخبارات کو روزانہ ایسے فیصلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں غیر ذمہ داری اور توازن کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ غیر متشدد آدمی کو آپ مکا مارے بغیر بھی تشدد کے نقصانات واضح کر سکتے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی کو برقرار رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی زیادتی سے باخبر رہا جائے اور فریقین کے نقطہ نظر کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔

دی گارڈین (The Guardian) کے کالم نگار گیری ینگ (Garey Young) کے مطابق کارٹونوں کی اشاعت آزادی رائے کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چند برس قبل برطانوی جریدے نیوسٹیٹس مین نے جب اسرائیلی حکومت پر ایک کارٹون شائع کیا تو ایسا کہرام برپا ہوا کہ مدیر کو معذرت کرنی پڑی۔

رابرٹ فسک نے لندن کے اخبار انڈی پنڈنٹ کے 13 ستمبر 2012ء کے شمارے میں نیوزی لینڈ کے ایک ایڈیٹر سے اپنی گفتگو نقل کی ہے، جس نے بڑے فخر سے دعویٰ کیا کہ اس نے حضرت محمد ﷺ کی توہین والے ڈینش کارٹون اپنے اخبار میں شائع کیے:

''جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ جب اسرائیل لبنان پر دوبارہ حملہ کرے گا تو کیا تم ایک اور کارٹون شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو جس میں ایک ربی (rabbi) کے سر میں بم لگا ہو، تو اس نے مجھ سے فوراً اتفاق کیا کہ یہ یہود مخالف ہوگا''۔

امریکی دستور کی پہلی ترمیم کی دہائی دینے والوں اور آزادیِ اظہار رائے کا دعویٰ کرنے والوں کا یہی تضاد ہے جس نے ان کی اصول پرستی اور جمہوریت پسندی کا پول کھول دیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے خبث باطن کو واشگاف کر دیا ہے۔

2014ء میں امریکی سرپرستی میں مصر کے سابق صدر ڈاکٹر محمد مرسی کے خلاف فوجی بغاوت کے نتیجہ میں جنرل عبدالفتاح السیسی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جنرل سیسی نے تمام اخبارات و جرائد پر پابندی عائد کر دی۔ بعدازاں صدارتی انتخاب میں حصہ لیا۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران جنرل سیسی نے مختلف مقامات پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ صدر منتخب ہونے کے بعد مصر سے اخوان المسلمون کا مکمل صفایا کر دیں گے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں اگر کسی نے اخوان المسلمون کے حق میں کوئی بات کی تو اسے فوری طور پر گرفتار کر لیا جائے گا۔ جنرل سیسی کے اس اعلان سے اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ دنیا بھر میں یہودیوں کی عبادت گاہوں میں سیسی کی کامیابی کے لیے دعائیہ تقریبات منعقد ہوئیں۔ آپ خود اندازہ لگا لیں کہ یہ اس ملک کا حال ہے جو آزادی اظہار کا علمبردار کہلواتا نہیں تھکتا۔ مصر کے معزول صدر مرسی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا: ''میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کہا تھا: جو ملک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرے گا، اسے عزت دی جائے گی اور جو ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے گا، اس سے دشمنی روا رکھی جائے گی''۔ مرسی کا یہ نعرہ مغرب کے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ امریکہ نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

سید محمد ریحان اپنے ایک مضمون ''انٹرنیٹ پر توہین رسالت کا ارتکاب اور مولی نورس سے مکالمہ'' میں لکھتے ہیں: ''ٹرے پارکر (Trey Parkar) اور میٹ اسٹون (Matt Stone) ایک کامیڈی کارٹون سیریز ''ساؤتھ پارک'' کے پروڈیوسرز ہیں اور 1997ء سے اب تک اس سیریز کی 200 قسطیں نشر ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ان لوگوں نے اپنی 201 ویں قسط میں نعوذ باللہ آپ ﷺ کو...... روپ میں پیش کیا اور اس توہین رسالتؐ پر انہیں کئی دھمکیاں موصول ہوئیں۔ پارکر اور اسٹون نے اس توہین رسالتؐ پر یہ جواز پیش کیا کہ انھوں نے اپنی کارٹون سیریز میں کئی اہم شخصیات کا مذاق اڑایا ہے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بدھا قابل ذکر ہیں۔ یہ اس

عمل کو آزادی اظہار رائے اور اپنا حق قرار دیتے ہیں۔ مولی نورس (Molly Norris) خود بھی ایک کارٹونسٹ ہیں اور ٹرے پارکر اور میٹ اسٹون کے دوست ہیں۔ نورس کو جب ٹرے پارکر اور میٹ اسٹون کو ملنے والی دھمکیوں کا پتہ چلا تو اس نے اس کے ردعمل میں اور آزادی اظہار کے حق میں ایک اور توہین آمیز کارٹون بنا ڈالا جس میں اس نے دنیا بھر کے لوگوں کو دعوت دی کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کے خاکے بنائیں اور ایسی دھمکیاں دینے والوں کے خلاف متحد ہو جائیں تاکہ جب لوگوں کی بڑی تعداد توہین رسالت کی مرتکب ہوگی تو کس کس کو ٹارگٹ بنایا جاسکے گا۔ اسی سلسلے میں ان توہین رسالت کرنے والوں کے ایک ہم ذہن نے انٹرنیٹ کی دنیا کی مشہور سوشل ویب سائٹ فیس بک (Face Book) پر توہین آمیز خاکے بنانے کا مقابلہ رکھا جس میں انہوں نے دنیا بھر کے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ توہین آمیز خاکے بنائیں اور اسلام دشمن عناصر نے اس دعوت کو نہ صرف بڑے جذبے سے قبول کیا بلکہ انٹرنیٹ پر موجود تمام تشہیری ذرائع کو بروئے کار لاکر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی دعوت دی۔ دوسری طرف عالم اسلام کو اس عمل نے شدید غصہ اور رنج میں مبتلا کر دیا اور ان کے جذبات واحساسات کو شدید ٹھیس پہنچی انہوں نے اس مقابلے کو روکنے کے لیے انٹرنیٹ پر موجود تشہیری ذرائع استعمال کیے، اس کے علاوہ موبائل ایس ایم ایس پمفلٹ اور دیگر ذرائع کے استعمال سے فیس بک کے اس پروگرام کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کو متحد کیا اور فیس بک (Face Book) سے اس توہین آمیز مقابلے کے پروگرام کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس موقعہ مغربی ممالک کے رہنماؤں نے مسلمانوں کو رواداری، برداشت اور تحمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

''مولی نورس'' کے اس واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے انٹرنیٹ پر ہونے والی توہین رسالت ﷺ کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ انٹرنیٹ کا استعمال ہر آنے والے دن میں کئی گنا زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اس واقعہ کو اہمیت نہ دی گئی اور کوئی مضبوط قانون سازی نہ کی گئی تو مستقبل میں اس قسم کے واقعات میں حد درجہ اضافے کا امکان ہے۔ تمام اسلامی ممالک کو مل کر ایک ایسا جامع قانون مرتب اور لاگو کرنے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ آئندہ ایسے واقعات وقوع پذیر نہ ہوں۔ جیسا کہ حال ہی میں برطانیہ میں پول چیمبرز (Paul Chambers) کو بارہ سو ڈالر کا جرمانہ عائد کیا گیا محض ٹوِٹر (Twitter) جو کہ فیس بک (Face Book) کے بعد دوسرے نمبر پر دنیا کی بڑی

سوشل ویب سائٹ ہے، پر مزاحاً ساؤتھ یارک شائر ائیر پورٹ کو اڑا دینے کا میسج لکھا۔ اگر ایک شخص کو محض مزاحاً ائیر پورٹ اڑا دینے کا میسج لکھنے پر جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے تو پوری امت مسلمہ کے انتہائی حساس موضوع کا مذاق اڑانے اور ان کی دل آزاری پر کوئی قانونی گرفت کیوں نہیں؟ مسلم ممالک کے عوام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ قانون کے دروازے پر دستک دیں، سپریم کورٹس میں انٹرنیٹ پر ہونے والی توہین رسالت ﷺ کے خلاف رٹ دائر کریں اور حکمرانوں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ موثر اقدامات کے ذریعہ انٹرنیٹ پر مسلمانوں کے خلاف توہین آمیز مواد رکھنے والی تمام ویب سائٹس پر پابندی عائد کریں اور آزادی اظہار رائے کی آڑ میں مسلمانوں کے جذبات اور احساسات سے کھیلنے کا سلسلہ بند ہو جائے''۔

جان گولڈ برگ کے مطابق مغرب کی حکمران اشرافیہ بظاہر تو مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ قرار دیتی ہے، لیکن درحقیقت یہ مذہب ہی کے نام پر لوگوں کا استحصال کرنے میں مصروف ہے۔ خود کو ترقی پسند اور انسانیت کا غم خوار کہنے والے درحقیقت زمانہ قدیم کے وحشیوں سے زیادہ تنگ نظر اور متعصب ہیں۔ 2005ء میں جب ایک بدبخت ڈینش کارٹونسٹ نے مسلمانوں کے لیے سب سے مقدس ہستی کا درجہ رکھنے والی شخصیت حضور اکرم ﷺ کے گستاخانہ خاکے بنائے تو امریکہ سمیت تقریباً تمام یورپی ممالک نے اسے آزادئ اظہار کا نام دے کر دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے، لیکن دوسری جانب وہی امریکہ و یورپ ہولوکاسٹ جیسے جھوٹ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ ہولوکاسٹ کو اگر دورِ جدید کا سب سے بڑا پروپیگنڈہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

پروفیسر خورشید احمد اپنے مضمون ''اظہار رائے کی آزادی اور مغرب'' میں لکھتے ہیں:

''آزادیِ اظہار رائے اور آزادیِ صحافت پر مغربی اقوام اپنی اجارہ داری کا کیسا ہی دعویٰ کریں، حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق ہمیشہ سے انسانی معاشرے اور تہذیب سے رہا ہے اور یہ ان کی ایجاد نہیں۔ آج بلاشبہ مغربی ممالک میں ان اقدار کا بالعموم اہتمام و احترام ہو رہا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہی ممالک میں ان آزادیوں کا خون نہ کیا جا رہا ہو۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں اپنے اپنے زمانے میں آزادی اظہار کا ایک مرکزی مقام رہا ہے۔ گو اس کے آداب اور اظہار کے طریقوں میں فرق رہا ہے۔ اسلام نے اوّل دن سے آزادی اظہار کو ایک بنیادی انسانی ضرورت اور قدر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی

دے کر پیدا کیا ہے اور وہ اس آزادی کو اس حد تک بھی لے جا سکتا ہے کہ خود اپنے خالق کا انکار کر دے۔ بلاشبہ اس انکار کے نتائج اس کو بھگتنے پڑیں گے مگر انکار کا حق اسے دیا گیا ہے۔ مغرب کو زعم ہے کہ روسو نے یہ کہا تھا کہ **Man is born free, but is everywhere in chains.** (انسان آزاد پیدا ہوا، لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے) لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی کا تصور وحی الٰہی پر مبنی ہے اور قرآن اس کا جامع بیان ہے۔ نیز نبی اکرم ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع (9ہجری) تاریخ کا پہلا چارٹر ہے اور سیدنا حضرت عمرؓ نے روسو سے بارہ سو سال پہلے فرمایا تھا کہ تم نے انسانوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

قولوا قولاً سدیدا کا حکم دے کر قرآن نے آزادی اظہار کا دستوری حق تمام انسانوں کو دیا۔ **لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** کے اصول میں مذہبی رواداری اور حقیقی تکثیریت (Genuine Plurality) کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔ **امرھم شوریٰ بینھم** کے ذریعے پورے اجتماعی نظام کو آزادی، مشاورت اور حقیقی جمہوریت سے روشناس کرایا گیا۔ حکمرانوں سے اختلاف کے حق کو **فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللّٰہ ورسولہ** کے فرمان کے ذریعے قانون کا مقام دے دیا گیا۔ آزادئ اظہار پر مغرب کی اجارہ داری کا دعویٰ تاریخ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

لیکن آزادی کے معنی مادر پدر آزادی نہیں، آزادی تو صرف اس وقت ہی ممکن ہو سکتی ہے جب اس کی حدود کا واضح تعین ہو اور ایک کی آزادی دوسروں کے لیے دست درازی اور غلامی کا طوق نہ بن جائے۔ جرمن مفکر ایمانویل کانٹ (Immanul Kant) نے بڑی پتے کی بات کہی ہے جب اس نے کہا:

"I am free to move my hand but the freedom of my hand ends where your nose begins."

میں اپنے ہاتھ کو حرکت دینے میں آزاد ہوں، لیکن جہاں سے تمہاری ناک شروع ہوتی ہے، میرے ہاتھ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آزادی اور انارکی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آزادی اگر حدود سے آزاد ہو جائے تو پھر انارکی بن جاتی ہے اور دوسروں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ آزادی

اور ذمہ داری اور حدود کی پاس داری لازم وملزوم ہیں۔آزادی اظہار کے نام پر نہ تو دوسروں کی آزادی اور حقوق کو پامال کیا جا سکتا ہے اور نہ آزادی اظہار کو دوسروں کی عزت سے کھیلنے اوران کے کردار کو مجروح کرنے کا ذریعہ بننے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر نظام میں آزادی کو قانونی،اخلاقی اور ملکی سلامتی کی حدود میں پابند کیا جاتا ہے"۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں جہاں آزادی اظہار رائے کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ "اپنے خیالات،معلومات اور آرا کو گورنمنٹ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اظہار کرنا اظہار رائے کہلائے گا"۔وہاں ساتھ ہی ہر اُس گفتگو یا رائے پر پابندی کی بات کی گئی ہے جو واضح اور حقیقی خطرے کی موجب ہو یعنی (1) کسی پر بہتان لگایا گیا ہو (2) فحاشی کی موجب ہو (3) کسی پر دباؤ ڈال کر مجبور کرنے کی کوشش ہو۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے آرٹیکل 29 کے پیراگراف 2 میں واضح درج ہے کہ آزادی اظہار کے حق کا اطلاق،دوسروں کے حقوق آزادی اور اخلاقی اقدار کے تحفظ کے ساتھ مشروط ہے۔

"In the exercise of his rights and freedoms, everyone shall be subject only to such limitations as are determined by law solely for the purpose of securing due recognition and respect for the rights and freedoms of others and of meeting the just requirements of morality, public order and the general welfare in a democratic society."

اسی طرح دنیا کے تمام ممالک کے منشور یا آئین میں یہ بات متفقہ طور پر درج ہے کہ ہر شخص کو اس وقت تک اپنے خیالات اور عقائد کے اظہار کا حق حاصل ہے جب تک وہ قانون میں بیان کردہ حدود میں رہے۔تاہم کوئی بھی شخص اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ جھوٹ کی اشاعت کرے یا ایسی اطلاعات پھیلائے جو عوامی مزاج کو مشتعل کریں یا تہمت تراشی کرے یا دوسرے لوگوں پر طعن و تشنیع کرے یا ان پر ہتک آمیز الزامات لگائے۔کوئی شخص دوسروں کے مذہبی عقائد کی توہین یا تضحیک نہیں کرے گا یا ان کے خلاف عوام میں عداوت یا نفرت نہیں پھیلائے گا۔ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام ہر شخص کا فرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے

خیالات، آرا اور عقائد کا حق حاصل ہے اور اسے ان کے اظہار کا حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک وہ قانون کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے آئین کی دفعہ 20 پاکستان کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب کو ماننے، عمل کرنے اور اشاعت کرنے کا حق دیتی ہے لیکن یہ حق قانون، امن عامہ اور اخلاق کے تابع ہے۔ اس کا بیان یوں ہوا ہے: ''قانون، امن عامہ اور اخلاق کے مطابق ہر شہری کو اپنا مذہب ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کی اشاعت کا حق حاصل ہوگا۔''

جہاں تک آزادی یا آزادئ اظہار رائے کا تعلق ہے تو دنیا کے کسی بھی دستور میں ''آزادی مطلق'' کا حق نہیں دیا گیا۔ مثلاً سب سے پہلے فرانس کو لے لیں جہاں کے اخبارات نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں اہانت آمیز خاکے شائع کیے اور اس کی آڑ میں ''آزادئ اظہار رائے'' کو اپنا حق قرار دیا، اس کے آرٹیکل نمبر 1 میں کہا گیا ہے۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد رہے گا اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے لیکن سماجی حیثیت کا تعلق مفاد عامہ کے پیش نظر کیا جائے گا''۔ آرٹیکل نمبر 4 میں کہا گیا ہے: ''آزادی کا حق اس حد تک تسلیم کیا جائے گا جب تک کہ اس سے کسی دوسرے شخص کا حق متاثر یا مجروح نہ ہو اور ان حقوق کا تعین بھی قانون کے ذریعہ کیا جائے گا''۔ جرمنی کے آئین کے آرٹیکل نمبر 5 میں کہا گیا ہے: ''ہر شخص کو تحریر، تقریر اور اظہار خیال کی آزادی کا حق حاصل ہے''۔ مگر اس کے ذیلی آرٹیکل نمبر 3 میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ حقوق شخصی عزت و تکریم کے دائروں میں رہتے ہوئے استعمال کیے جاسکیں گے۔ امریکی دستور میں بھی مطلق آزادی کا کوئی تصور نہیں، امریکن سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق دستور میں ایسی تحریر اور تقریر کی اجازت نہیں جو عوام میں اشتعال انگیزی یا امن عامہ میں خلل اندازی کا سبب بنے یا اس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہو، ریاست کو ایسی آزادی سلب کرنے کا اختیار ہے۔ اسی طرح آزادی مذہب کے نام پر توہین مسیح کے ارتکاب کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہی حال برطانیہ کا ہے، وہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا برطانوی ملکہ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کی اجازت نہیں۔ وہاں ہائیڈ پارک میں ''اسپیکر کارنر'' کے نام سے ایک گوشہ مختص ہے جہاں مخصوص اوقات میں ہر شخص کو جو جی میں آئے، کہنے اور یاوہ گوئی کی چھوٹ دی گئی ہے حتیٰ کہ خدا اور اس کے رسولوں کے بارے میں بھی ہرزہ سرائی کی کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن یاد رہے یہاں کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی توہین کرے یا ملکہ کی شان میں گستاخی کرے۔خلاف ورزی کی صورت میں برطانیہ کا قانون حرکت میں آ جائے گا اور آزادئ رائے ختم ہو جائے گی۔ جب خود ان قوموں کے دساتیر میں ''آزادئ اظہار رائے'' کومشروط کیا گیا کہ اس کی اسی وقت اجازت ہے جب وہ کسی کے حق اور جذبات مجروح کرنے کا ذریعہ نہ بنے، ایسے میں اس عمل کا جواز کیونکر ہوسکتا ہے کہ کائنات کی سب سے محترم اور مقدس ہستی کی توہین کی جائے، جو دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے اربوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے!! کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مغرب، اسلام سے مذہبی تعصب میں اندھا ہو چکا ہے۔''

دریں اثنا قانونی حلقوں نے اس بات کو بھی محل نظر قرار دیا ہے کہ امریکہ خود کو آزاد اور مکمل طور پر سیکولر ملک قرار دیتا ہے مگر اس کے ہاں صرف مسیحی افراد کو اپنے دین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے، جبکہ مسلمانوں کو ایسی آزادی حاصل نہیں۔اسلامی شعائر کے تحت وہاں زندگی نہیں گزاری جاسکتی جبکہ وہاں پر مذہب کو مکمل آزادی دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی انہی اسلام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے مسلمان اس سے نفرت بجا طور پر کرتے ہیں۔ امریکہ اظہار آزادی کے نام پر اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والوں کو قانون کی چھتری فراہم کرتا ہے۔لیکن جب مسلمانوں کے ردعمل سے اس کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو اسے قابل گردن زنی سمجھا جاتا ہے۔

جناب یاسر پیرزادہ اپنے کالم''نفرت کا پروپیگنڈا'' میں لکھتے ہیں: ہولوکاسٹ کے بعد یہودیوں نے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹیں، جگہ جگہ میوزیم بنائے گئے، اس پر بے شمار فلمیں بنائی گئیں، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور آج کوئی بھی شخص کہیں بھی یہودیوں کے خلاف کوئی بات کہہ دے یا لکھ دے تو اسے فٹ سے **anti semitic** کا لیبل لگا کر اس کی زندگی تنگ کر دی جاتی ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے ہاتھوں چینیوں کا بھی قتل عام ہوا اور اس میں مرنے والے چینیوں کی تعداد یہودیوں سے کہیں زیادہ تھی مگر آج دنیا میں واویلا صرف مرگ انبوہ کا ہے کیونکہ یہ مرگ انبوہ اب باقاعدہ ایک انڈسٹری کا روپ دھار چکی ہے۔ اس موضوع پر سن **2000**ء میں نورمن فنکلسٹائن نے **The Holocaust Industry** کے نام سے ایک کتاب لکھی جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا، اس کتاب کی اشاعت کی پاداش میں فنکلسٹائن کو کالج کی نوکری سے ہاتھ دھونا

پڑے اور بعد ازاں 2007ء میں اسے ایک یونیورسٹی نے اسی بنیاد پر ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔ کتاب پر سب سے زیادہ اعتراضات اس حصے پر ہوئے جس کا نام The Double Shakedown تھا، اس حصے میں فنکلسٹائین نے کہا تھا کہ ہولوکاسٹ انڈسٹری یورپی حکومتوں کو مرگ انبوہ کے ضرورت مند متاثرین کے نام پر بلیک میل کرتی ہے۔ یہ ہولوکاسٹ انڈسٹری نہ صرف لوگوں کے جذبات سے کھیل کر معاشی اور سیاسی فوائد حاصل کرتی ہے بلکہ اسرائیل کے مفادات کا بھی تحفظ کرتی ہے"۔(روزنامہ جنگ، لاہور 13 جنوری 2016ء)

مغرب کا فلسفہ، آزادئ اظہارِ رائے دراصل ایک پردہ ہے جسے وقتاً فوقتاً اُلٹا کر ایک مکروہ چہرہ دکھایا جاتا ہے۔ یاد رہے جب فرانس میں گستاخانہ خاکے شائع ہوئے تو اس کے ردعمل میں کسی اسلامی ملک میں فرانسیسی پرچم جلایا گیا تو فرانسیسی صدر فرانسوس اولاندے (Francois Hollande) کا کہنا تھا کہ جو لوگ فرانس کا پرچم جلاتے ہیں، انہوں نے آزادی کا مزہ ہی نہیں چکھا۔ عجیب بات ہے کہ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کی اجازت اور پرچم جلانے پر پابندی! اگر امریکہ میں واقعی آزادئ اظہارِ رائے ہے تو UNAMERICAN ACTIVITIES ایکٹ کیوں لاگو کیا گیا؟ SMITH ACT اور MCCARRAN ACT نافذ کر کے اشتراکی نظریات کے اظہار پر کیوں قدغن لگا دی گئی اور PATRIOT ACT کے تحت مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ، ان کی ٹیلی فون پر کی گئی گفتگو، ان کے ای میل، ان کی ڈاک، ان کے بینک کھاتوں کی چھان بین کیوں کی جاتی ہے جبکہ امریکی آئین کے BILL OF RIGHTS میں ان کی سخت ممانعت کی گئی ہے؟

"اصل پشت پناہ" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر عامر لیاقت حسین لکھتے ہیں:

"فرانس کے بے شرم صدر کی فرمائش ہے کہ "جہاں جہاں فرانسیسی پرچم جلائے گئے، وہ ممالک ہم سے معافی مانگیں"...... واہ صاحب! آپ نے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے دل جلا ڈالے لیکن معافی نہیں مانگی بلکہ اسے "اظہار رائے کی آزادی" سے تعبیر کیا تو پھر اگر کسی نے اسی "آزادی" کو استعمال کرتے ہوئے اگر آپ کے ملک کا پرچم نذرِ آتش کر دیا تو اس عمل پر اس قدر سیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟...... بھئی اظہارِ رائے کے اپنے اپنے طریقے ہیں، آپ کو گستاخانہ خاکے بنا کر سکون ملتا ہے تو عشاق کو پرچم جلا کر تسکین پہنچتی ہے...... پیچ و تاب کھا کر کیوں "اظہار رائے" کو بدنام کرتے ہیں...... اب اگر کل کوئی آپ کی تصویر پر غلاظت

ڈالے یا آپ کے ملک کے پرچم کے ٹشو پیپر بنوا کر اس سے گندگی صاف کرے تو بُرا نہ مانیے گا، آپ ہی تو کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر انسان کو اپنی مرضی سے جینے کا حق ہے اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس جینے کے اظہار کے لیے کسی کو اپنی مرضی کا پابند نہیں کیا جا سکتا تو پھر جینے دیجیے جناب! فرانس کی بدبودار تاریخ اور متعفن رہنماؤں کے قصے سنانے سے کسی کو نہ روکیے! بتانے دیجیے کہ آپ کو بھی ابھی تک اپنے والد کا نام نہیں معلوم ہے اور اس بارے میں متعدد بار آپ تاسف کا اظہار فرما چکے ہیں......نجی محافل میں اکثر آپ کے ''**Real Father**'' کا نام ہی نہیں بتایا ہے بلکہ وہ جسے آپ کا ''والدِ محترم'' کا درجہ دیتی ہیں بقول آپ کے ''آپ کا من نہیں کرتا کہ اُسے باپ کہوں''...... اور خیر اس میں اچنبھے کی کوئی بات بھی نہیں ہے، یہ تو فرانسیسی تہذیب کا ایک روشن اور شاندار عکس ہے، یہاں تو کئی بچے ''پیزا والے'' معاف کیجیے گا **Pitzza** والے کے ہیں، یا پھر کسی ٹیکسی ڈرائیور یا نائٹ کلب سے نکلے کسی بے نامی مدہوش کی ''جذبات میں بہتی غلطی'' کا نتیجہ!!......ویسے سنا ہے کہ ڈنمارک کی طرح فرانس میں بھی کسی بچے سے اُس کے والد کا نام پوچھنا ''معیوب'' سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ اُسے ''شرمندہ'' کرنے یا اُس کی ''دل آزاری'' کا سبب ہے اور یقیناً یہ دل دکھانا ہی تو ہے کہ آپ ایک انسان سے ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا جواب خود اسے نہیں معلوم......تصور کیجیے کہ آپ اُسے کس بوجھ تلے دبانے کا جرم کر رہے ہیں؟ وہ تو شاید ذہنی کرب اور نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہو جائے گا، عین ممکن ہے کہ وہ آپ کے سوال کا جواب جاننے کی کھوج میں کہیں اپنی جان سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھے......ایسے بے ہودہ و بے ہنگم سوالات کرنے سے پہلے کوئی فرانس کے صدر کی جگہ اپنے آپ کو محسوس کر کے سوچے......ایک اولاد کے لیے اس سے بڑا درد اور کیا ہوگا کہ جسے وہ باپ کہتا ہے، وہ باپ نہیں ہے اور جس کا وہ پاپ ہے وہ باپ بھی یہیں ہے لیکن ماں نام بتانے کو تیار نہیں......میرا خیال ہے کہ شاید اسی اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو کر فرانس کے صدر نے کہہ ڈالا کہ **je suis Charlie (I am Charlie)**......یعنی ''میں شاغلی ہوں''......

فرانسیسی لکھتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں اور یہیں سے ان کی دوزخی ظاہر ہو جاتی ہے، منافقت کا ایک عجیب پیمانہ ہے جسے انہوں نے از خود مرتب کیا ہے تاکہ ان کے بارے میں کسی کو بھی ''تحقیق کی زحمت'' نہ اُٹھانی پڑے کہ آیا یہ منافق ہیں یا نہیں؟ بھئی ظاہر ہے کہ مجھ یا آپ جیسوں کو اِس قدر مشقت میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے...... جو قوم لکھے کچھ اور

اپنے ہی لکھے کو بولے کچھ، اِن سے بڑا منافق اور کون ہوسکتا ہے؟ یہ تو باقاعدہ ''اعلانِ منافقت'' ہے کہ ''اے لوگو! ہماری زبان سے ہمیں پہچان لو! ہم پر کبھی بھروسہ نہ کرنا کیونکہ ہم کہتے شمال ہیں اور کرتے جنوب کی ہیں، یقین نہ آئے تو ہماری قومی زبان کی منافقت کو خود بول کر محسوس کرو کہ لکھتے ہم ''چارلی'' ہیں اور پڑھتے اسے ''شارلی'' یا ''شاغلی'' ہیں...... یعنی یہ ثابت ہوا کہ فرانس کے صدر کا یہ کہنا کہ ''میں شاغلی ہوں'' دراصل اپنی والدہ کو یہ پیغام دینا ہے کہ آپ یوں ہی مجھ سے ابو کا نام چھپاتی رہیں تو پھر اس گھٹیل، عامیانہ، پنچ، رذیل اور سفلے جریدے سے اپنی نسبت جوڑ کر آپ کو تڑپاؤں گا اور مسلسل کہے جاؤں گا کہ ''میں شاغلی ہوں'' تا کہ آپ تنگ آ کر مجھے ابے کا نام بتا دیں...... اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ لاکھوں فرانسیسی بھی میری آواز میں آواز ملا دیں گے جو مدتوں سے اپنے ''اصلی باپ'' کی تلاش میں ہیں......

لیجیے جناب! ہم اِس نعرے کو بے وجہ ہی مسلمانوں سے ''اظہارِ نفرت'' سمجھ رہے ہیں، یہ تو دراصل ان کا اپنے آپ نفرت کا انداز ہے، بے نامی لاکھوں بچے اپنے اپنے باپ کی تلاش میں سڑکوں پر نکل آئے...... شاید اس لیے بھی کہ اُن کی قیادت کرنے والوں میں وہ ''فلسطین کا قصائی'' بھی شامل تھا جس کی قوم نے ہمیشہ باپ کا نام پوچھنے کو ترجیح دی اور بلاشبہ یہ اس ہی کا حق ہے کہ یہ باپ کی کھوج میں نکلے شہوت ولواطت کے علمبرداروں کا پرچم تھام کر اُن کی رہنمائی کرے......!! انبیاء کے قاتلوں کی قوم سے تعلق رکھنے والے اس بدطینت کے اجداد نے ''اظہارِ برتری'' کے جنون میں پہلے صاحبِ انجیل مقدس کو تکالیف دیں اور اب صاحبِ قرآن کو اذیتیں دینے سے باز نہیں آتے اور اس کے لیے یہ انتخاب بھی ان ہی کا کرتے ہیں جو برسوں سے **Father's Name** کی ڈھونڈ ڈھانڈ میں لگے ہوئے ہیں...... ویسے تو ''شاغلی ایبڈو'' کے بانی 80 سالہ ہنری روسیل نے واصل جہنم ایڈیٹر اسٹیفن شار بونیئر کے بارے میں کھل کر ایک انٹرویو میں کہہ دیا ہے کہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا وہ خود ذمہ دار ہے کیونکہ اُسے متعدد بار منع کیا گیا کہ وہ پیغمبر اسلام کی (معاذ اللہ) توہین نہ کرے لیکن وہ مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کی اپنی ذلیل پالیسی سے باز نہیں آیا...... برطانوی جریدے ''ٹیلیگراف'' کے مطابق ہنری روسیل کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''اسٹیفن کے سر میں انسان نہیں، خنزیر کا دماغ تھا اور وہ اُسی سے سوچا کرتا تھا''...... ہنری روسیل نے مزید کہا کہ ''شار بونیئر ایک صہیونی اور اسلام فوبیا کا شکار تھا، وہ ہر وقت نفرت آمیز حرکتوں اور

اسلام مخالف کارروائیوں میں مصروف رہتا تھا اور اسی کا خمیازہ اُس کو اور اُس کے ساتھیوں کو بھگتنا پڑا''......اب اِسی انٹرویو سے آپ گتھیاں سلجھا لیجیے کہ ''اصل پشت پناہ'' کون ہے؟ کیسے 16 ہزار فرانسیسی یہودیوں کی ''نو آبادکاری کی آڑ'' لے کر اب سرحدوں کو مزید وسیع کرنے کی فکر درپیش ہوگی اور کون اب اسی سفلی عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے معصوم صفت فلسطینیوں اور اُن کے بچوں کے قتلِ عام کا نیا جواز تلاش کرے گا......کل تک اسی ملک میں یہودیوں کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے اور آج فرانس میں یہودیوں سے بڑا کوئی مظلوم ہی نہیں......!!! جب یہ شکار کی خاطر اپنے مقدس ترین دن ''سبت'' میں بدعہدی کر سکتے ہیں اور حیلہ تراش کر جمعے کے روز ہی جال بچھا سکتے ہیں، جب یہ کسی بھی قوم کے مذہب کی تضحیک کرنے سے کسی صورت باز نہیں آسکتے، جو من وسلویٰ سے اُکتا جائیں اور (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ سے بھی ٹھٹھا کرنے سے نہ لرزیں...... جب یہ موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہیں اور اُن کے طور پر جاتے ہی گوسالہ بنا کر اُس کی پوجا کر سکتے ہیں، جب یہ دیوارِ براق کو دیوارِ گریہ قرار دے کر اُس پر اپنا حق جتا سکتے ہیں، جب یہ اپنے آپ کو اشرف النسل قرار دے سکتے ہیں اور شجرہ نسب مرد کی طرف سے نہیں بلکہ عورت کی طرف سے چلا سکتے ہیں...... اور ان کی کتاب تالمود کے مطابق جب ان پر یہ عقیدہ غالب آسکتا ہے کہ اللہ نے یہ دنیا یہودیوں کے لیے بنائی ہے اور اس میں موجود سب چرند پرند یہودیوں کی ملکیت ہیں اور اس کائنات پر حکومت کرنے کا حق صرف اور صرف یہودیوں کا ہے جسے پانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنا عبادت ہے......اور جب یہ کوہِ صہیون کے نام پر ''تحریک صہیونیت'' قائم کر سکتے ہیں، تابوتِ سکینہ کی امانت میں خیانت کر سکتے ہیں......تو ہم پرستی اور وہم کو مذہب بنا کر اس کی عبادت کر سکتے ہیں اور جنہوں نے دنیا میں باقاعدہ دہشت گردی کا آغاز کیا ہو، انسانوں پر پہلا بارودی حملہ کیا ہو تو پھر ان سے کوئی توقع رکھنا مبالغہ نہیں بلکہ بالغ النظری کے سوا اور کچھ نہیں......!!!'' (روزنامہ جنگ لاہور، 19 جنوری 2015ء)

اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ کی کوڑھ زدہ ذہنی پسماندگی، جنون اور پاگل پن کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ 11 ستمبر 2012ء کو ایک اسرائیلی یہودی سام باسل **Sam Bacile** اور مصری عیسائی **Morris Sadek** نے مل کر توہین رسالت ﷺ پر مبنی نہایت دل آزار فلم **"Innocence of Muslims"**، ''مسلمانوں کی معصومیت''

کے عنوان سے ایک فلم تیار کی۔ بعد ازاں تحقیقات کے نتیجہ میں پتہ چلا کہ سام باسل تو ایک فرضی کردار ہے جبکہ یہ حرکت ایک عیسائی پادری نکولا باسلے نکولا Nakoula Basseley Nakoula کی ہے جو امریکی ریاست کیلیفورنیا میں ایک بینک فراڈ میں گرفتار ہو کر سزا پا چکا ہے۔ اسے 21 ماہ کی قید اور تقریباً 7 لاکھ ڈالر جرمانہ ہوا۔ اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی ہے کہ ملعون پادری ٹیری جونز نے اس فلم کی تشہیر کے لیے تمام وسائل مہیا کیے۔ اس متنازعہ اور گستاخانہ فلم کی نمائش کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر انہیں تشدد، توڑ پھوڑ اور قتل و غارت پر اکسایا جائے تاکہ بعدازاں دنیا کو باور کرایا جائے کہ مسلمان انتہا پسند ہیں اور اسلام تشدد، انتہا پسندی اور عدم برداشت کو فروغ دینے والا مذہب ہے۔

دنیا بھر کے ایک ارب 50 کروڑ سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری آخر کہاں کی آزادی رائے ہے؟ کیا اظہار کی آزادی اور دشنام طرازی میں کوئی فرق نہیں؟ افسوس! مسلمانوں کے احتجاج کو ناقابل برداشت اور ''مہذب'' دنیا کے اصولوں کے خلاف گردانا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس شیطانی اقدام اور فتنہ انگیز شرارت کو محض غلطی اور ایک فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ 30 لاکھ ڈالر سے تیار ہونے والی گستاخانہ فلم کے ڈانڈے یہود ونصاریٰ سے جا ملتے ہیں جنہوں نے مہینوں کی منصوبہ بندی اور مال کی فراہمی کر کے اسے ممکن بنایا۔ یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ اسلام کے خلاف یہ شر انگیز فلم بنانے والے فلمساز بل ماہر (Bill Maher) نے صدر اوباما کی انتخابی مہم کے لیے دس لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی صدر بارک اوبامہ نے تمام اسلامی ممالک کے گستاخانہ فلم پر پابندی کے متفقہ مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ گستاخانہ فلم پر پابندی اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کیونکہ امریکی آئین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکی صدر اوباما نے مزید کہا کہ مذہبی آزادی ہر ملک کا حق ہے، ہم مذہبی آزادی اور مذہبی تحفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم تحمل، برداشت اور مفاہمت کے رویوں کے حامی ہیں۔ چونکہ امریکی آئین آزادی اظہار کا تحفظ کرتا ہے، اس لیے ہم اس ویڈیو کو انٹرنیٹ سے نہیں ہٹا سکتے۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، قرآن مجید اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی آزادی اظہار رائے ہے؟ صدر اوباما کا یہ بیان اس بات کی بین دلیل ہے کہ امریکی حکومت بھی اس انتہائی قبیح حرکت میں برابر کی شریک ہے جو چاہتی ہے کہ دنیا میں تہذیبوں کے تصادم سے عالمی جنگ کا آغاز ہو۔ یاد رہے

امریکی صدر اوباما کو اس سال امن اور حقوق انسانی کے نوبیل پرائز کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے جس پر خود صدر اوباما حیران ہیں۔ مغرب نے بنیادی انسانی حقوق میں مکمل آزادئ اظہارِ رائے کو شامل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2005ء میں جب پہلی مرتبہ ڈنمارک سمیت دیگر مغربی اخبارات میں گستاخانہ خاکے شائع ہوئے تو اس وقت کے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل، کوفی عنان سے لے کر بُش اور کلنٹن تک سب اس بات پر متفق تھے کہ بنیادی انسانی حقوق کے تحت خاکوں کی مذمت نہیں کی جا سکتی اور عالم اسلام کا احتجاج غیر مہذب اور بنیادی انسانی حقوق کی نفی ہے۔ نیز، امتِ مسلمہ کو اپنا رویہ ''روشن خیالی'' سے قریب تر کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب محبوب الحق تنولی اپنے مضمون ''انتہا پسندی .... حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں'' میں لکھتے ہیں: ''اگر اظہار رائے کی آزادی ہر قید سے آزاد اور اتنی ہی مقدس ہے، جیسا کہ دانیانِ مغرب کا خیال ہے تو پھر ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ آزادی کو اس وقت لگام کیوں دی جاتی ہے جب اسامہ بن لادن کی تصویر الجزیرہ پر دکھائی جاتی ہے؟ اگر صلیبی، آزادی اظہار کے اتنے ہی متوالے ہیں تو امریکہ و یورپ کے مخالفین کی آواز کو میڈیا پر کیوں دبایا جاتا ہے؟ اظہار رائے کا حق اتنا ہی بے انتہا ہے تو ملکہ برطانیہ کی شان میں گستاخی کے ارتکاب پر برٹش قانون حرکت میں کیوں آ جاتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ برطانیہ کے ہائیڈ پارک میں بھی جہاں انسان جو منہ میں آئے کہہ سکتا ہے مگر ملکہ برطانیہ کے خلاف اسے ایک لفظ کہنے کی آزادی نہیں؟ اگر آزادی صحافت کی نیلم پری اتنی ہی دل ربا ہے تو یہودی راہب کے بارے میں توہین آمیز کارٹون چھاپنے کی جرأت کیوں نہیں کی جاتی؟ اظہار رائے کا حق اگر اتنا ہی مطلق اور بے قید ہے تو اسے اس وقت کیوں پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے جب کوئی صحافی ہٹلر کا دفاع کرتا ہے؟ جب 60 لاکھ یہودیوں کے قتل عام (ہولوکاسٹ) کے دیو مالائی نظریے کو جھٹلایا جاتا ہے۔ ڈیوڈ ارونگ آج بھی آسٹریا کی جیل میں کیوں گل سڑ رہا ہے؟ کیا اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے کہ وہ ہولوکاسٹ کو افسانہ کہتا ہے؟ یہ کیسی آزادی ہے کہ عیسائی اور یہودی صحافی، خدا اور اس کے برگزیدہ رسول کے خلاف جیسے چاہیں، دریدہ دہنی کریں اور اس کو شائع کریں، مگر یہودیوں اور ان کے گھڑے ہوئے افسانے بارے کچھ کہنے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک اونس عمل سوٹن وعظ پر بھاری ہوتا ہے۔ امت کے باشعور طبقات اور عام مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ آج مغرب جس مذہبی احترام اور رواداری کی بات کرتا ہے، اسلام اور

مسلمانوں کے تعلق سے اس کا عملی رویہ ان اصولوں کی نفی کرتا ہے۔آزادی اظہار رائے اور توہین اسلام کے رویوں میں واضح فرق کرتے ہوئے اسے ان اصولوں کا عملی ثبوت فراہم کرنا ہوگا''۔(روزنامہ اسلام کراچی، 7 مئی 2015ء)

مسلمانوں کے خلاف مغرب کا دہرا معیار وہاں کی پالیسیوں کے عین مطابق ہے۔ پوری دنیا میں حقوق انسانی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، مسلمانوں کے بارے میں اچانک رویہ بدل لیتے ہیں۔ جناب یوسف انور اپنے مضمون ''یکطرفہ کارروائی اور مذہبی انتہا پسندی'' میں لکھتے ہیں: ''چند سالوں سے امریکہ مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کی باتیں اور رواداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے، لیکن کام وہ ایسے کر رہا ہے جو اس میں اضافے کا سبب ہیں۔ ان کے ہاں ہر شخص کو مذہب کی آزادی ہے کہ وہ جیسے چاہے کرے لیکن جب ان ممالک میں رہائش پذیر مسلمان اپنے مذہبی شعائر کی پابندی کرتے ہیں تو ان کے خلاف نت نئے قوانین وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی موجودہ قانون مسلمانوں کے حق میں جاتا ہے تو اس میں ترمیم کی جاتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ معروف باکسر محمد علی کلے جب اسلام قبول کرتا ہے تو انہیں زبردستی فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے؟ جب صدر بش عیسائیت کی ترویج کے لیے وائٹ ہاؤس میں خصوصی ڈیپارٹمنٹ قائم کرتا ہے اور عیسائی مذہبی تنظیموں کو 40 ارب ڈالر دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو روادار کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی مال دار شخص کسی مدرسے کی سرپرستی کرے تو وہ رواداری کا دشمن! یہ تفریق کیوں؟ یاد رہے کہ 2003ء میں امریکہ کے صدر بش نے دنیا بھر میں عیسائیت کی ترویج کے لیے مشنری تنظیموں کو فنڈ فراہم کرنے کے لیے وائٹ ہاؤس میں ''Faith - Based and Community Initiatives'' نامی ڈیپارٹمنٹ قائم کیا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر ''جم ٹووی'' کو امریکی سوسائٹی کو کٹر عیسائی مذہبی معاشرے میں تبدیل کرنے کا ہدف سونپا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے 10 ہزار 5 سو 18 عیسائی تنظیموں کو ایک ارب 70 کروڑ ڈالرز فراہم کیے تھے۔ اب سوال یہ ہے کیا امریکہ اربوں ڈالر خرچ کر کے اپنے معاشرے کو مذہبی شدت پسند، تنگ نظر اور انتہا پسند بنانے کے لیے کوشاں نہیں؟ یہ کیسا فلسفہ ہے، اگر ایک کام صدر بش عیسائیت کی ترویج کے لیے کرے تو اچھا ہے لیکن اگر کوئی صاحب ثروت مسلمان، اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے کرے تو اس کا رشتہ ناطہ دہشت گردی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کیسی ناانصافی ہے اگر کوئی ''ہولوکاسٹ'' پر لکھے یا بولے

تو وہ قابل گرفت ہے لیکن اگر کوئی ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی معزز ترین ہستیوں کے بارے میں شرانگیزی کرے تو اس کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ 1988ء میں ''وائی کنگ پبلی کیشنز'' کے یہودی ادارے نے ''شیطانی آیات'' کے نام سے بدنام زمانہ کتاب چھاپی تو کچھ نہ ہوا، لیکن جب ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد نے دنیا کی صرف 0.23 فیصد آبادی والے یہودیوں کے بارے میں ذرا ایک لفظ کہا تو ان کو یورپ و امریکہ کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں اور ان کے خلاف میڈیا پر پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ یہی نہیں اگر عیسائی، عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک ارب کے قریب ویب سائٹس استعمال کرتے ہوں تو اچھا ہے لیکن اگر مسلمان چند ہزار ویب سائٹس اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کریں تو ان کو بین کر دیا جاتا ہے۔ عالمی طاقتوں کا یہی دوہرا معیار ہے جو ان کی رواداری کے دعووں کی قلعی کھول رہا ہے۔ دنیا کو تہذیب حاضر کا روشن چہرہ تو دکھائی دیتا ہے، لیکن امریکہ کا وہ مکروہ چہرہ جو خونِ مسلم سے تر ہے، نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے یورپ اور امریکہ میں دہشت گردی اور تشدد کا نیٹ ورک جتنا مستحکم، فعال اور مضبوط ہے، وہ کسی اور ملک میں نہیں۔ اگر عصبیت سے بالاتر ہو کر منصفانہ ذہن سے پوری دنیا میں تشدد اور دہشت گردی کا جائزہ لیا جائے تو امریکہ اور اسرائیل سرفہرست نظر آئیں گے۔ کئی دہشت گرد گروپ امریکہ کے خفیہ ادارے سی آئی اے کی زیر نگرانی مسلم ممالک میں قتل عام کر رہے ہیں''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 12 فروری 2015ء)

گستاخانِ رسول کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں یا یہ ان کا انفرادی عمل ہے، حقائق سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نائن الیون کے واقعہ کے بعد صدر بش اپنے خطاب میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کو کروسیڈ کا نام نہ دیتا۔ امریکی صدر بارک اوباما جس کو ابراہ ثانی بھی کہا جاتا ہے، اپنی انتخابی مہم میں مکہ اور مدینہ پر ایٹم بم برسانے کی ناپاک خواہش کا اظہار نہ کرتا جس کی بنیاد پر اسے امریکی عوام کی اکثریت نے ووٹ دیے۔ گستاخانہ فلم کے خلاف پرتشدد احتجاج کے دوران لیبیا میں امریکی سفیر کے مارے جانے پر بارک اوباما اور اس کی وزیر خارجہ نے مسلم ممالک کو دھمکی دی کہ اب اگر کہیں امریکی مفادات کو نقصان پہنچا تو امریکہ اس ملک میں اپنی فوج بھیج دے گا۔ کیا یہ دھمکی ملعون ٹیری جونز اور ملعون نکولا کی پشت پناہی نہیں جس میں امریکی صدر براہ راست کردار ادا کر رہا ہے۔ ستمبر 2012ء کو پاکستان اور افغانستان کے لیے امریکہ کے خصوصی ایلچی مارک گراس مین

(Marc Grassman) نے ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''گستاخانہ فلم فرد واحد کا فعل ہے، امریکی حکومت یا امریکی عوام کا اس سے کوئی تعلق نہیں''۔لیکن مجال ہے کہ انہوں نے اس سانحہ پر کوئی اظہار افسوس کیا ہو۔ان کا مطلب یہ تھا کہ فرد واحد کے جرم کی پاداش میں امریکی سفارت خانوں پر حملے نہیں ہونے چاہئیں۔ ہمارے خیال میں مارک گراسمین اور دیگر اعلیٰ امریکی حکام کا یہ موقف بالکل درست ہے۔لیکن پوچھنا چاہیے! کیا کسی فرد واحد کو''آزادی اظہار'' کے نام پر یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ دنیا کی مقدس ترین ہستی کی توہین و تذلیل کرتا پھرے اور امریکیوں کی جان خطرے میں ڈال دے۔ان تھنک ٹینکس کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسامہ بن لادن بھی ایک ''فرد واحد'' تھا جس کے کیے کی سزا امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک پوری دنیا کے مسلمانوں کو مسلسل دے رہے ہیں۔ صدام حسین بھی ''فرد واحد'' تھا جس کے فعل کی سزا عراقیوں کو دی گئی۔صدر قذافی بھی ''فرد واحد'' تھا جس کے کسی عمل کی سزا پورے لیبیا کی عوام کو دی گئی اور اب کسی امریکی فرد واحد کی ناپاک حرکت پر مسلمان، امریکہ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں تو یہ ''امریکی روایات'' اور ''مغربی تہذیب'' کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔اس پر اعتراض کیسا؟ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ قرآن سوزی اور گستاخانہ فلم بنانے کا معاملہ فرد واحد کا ہے اور اس کا حکومت یا عوام سے کوئی تعلق نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی فوج جو حکومت اور عوام کی نمائندہ ہوتی ہے، اس سے مسلمانوں کی دل آزاری کی مذموم حرکتیں کیوں سرزد ہوتی ہیں۔گوانتاناموبے اور بگرام کے عقوبت خانوں میں جس طرح قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی، مسلمانوں کی لاشوں پر پیشاب کیا گیا، ان کی داڑھیوں پر غلاظت ملی گئی............ کیا یہ فردِواحد کے کارنامے ہیں۔ کیا یہ انصاف کا پیمانہ اور مذہب کا احترام ہے، کیا یہ اظہار رائے کی آزادی کے نمونے ہیں؟

عالمی سطح پر بیسٹ سیلر شہرت کی حامل انگریزی کتاب ''لوگ امریکہ سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ (Why do people Hate America?)'' کا مطالعہ امریکی پالیسی سازوں اور حکام کو ضرور کرنا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ امریکہ کے بارے میں باقی دنیا کیا سوچتی ہے؟ کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ امریکہ کے دوہرے معیار، دوغلے پن اور منافقت کی وجہ سے دنیا امریکہ سے نفرت کرتی ہے۔

مغرب کو معلوم ہونا چاہیے کہ آزادی اظہار رائے مطلق نہیں، ورنہ ہر چیز کو مسترد کیا جا

سکتا ہے۔مثال کے طور پر جمہوریت کا اصول اکثریت ہے۔اگر کسی ملک کی اکثریت جمہوریت کو مسترد کر دے تو کیا اسے یہ حق دیا جا سکتا ہے؟ بلکہ فوری طور پر جمہوریت ''مقدس'' ہو جائے گی اور اکثریت کو جاہل قرار دے کر اس کی رائے کو مسترد کر دیا جائے گا۔اسی طرح امریکہ کی ''قومی سلامتی'' اتنی ''مقدس'' ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے محض ''مفروضے'' کی بنیاد پر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور لاکھوں لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔لیکن اگر مسلمان ایک ارب 50 کروڑ سے زائد انسانوں کی محبوب ترین ہستی رسول اکرم ﷺ کی توہین پر ذرا سے مشتعل بھی ہو جاتے ہیں تو امریکہ ''برا'' مانتا ہے اور اس کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن ''دھمکی'' دیتی ہے کہ ہم اپنے سفارت خانوں کے تحفظ کے لیے امریکہ کی فوجیں مسلم ممالک میں اتار سکتے ہیں۔اگر جمہوریت کو استثنا حاصل ہے تو مسلمانوں کی مقدس ترین ہستی کیوں تنقید سے مستثنیٰ نہیں۔

جناب محبوب الحق عاجز اپنے مضمون ''اظہار رائے کی آزادی بے لگام نہیں'' میں لکھتے ہیں:

''رائے کے اظہار کی بے مہار آزادی دینے کا مطلب نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی مناقشت اور جنگ وجدل کا بازار گرم کرنا اور معاشرے کو انتشار، لاقانونیت اور انارکی کی آگ میں جھونکنا ہے۔یورپ اور امریکہ میں ان کے دستور، اقتدار اعلیٰ اور خارجہ پالیسیوں پر کوئی کھل کر بات نہیں کر سکتا۔دستور یا اقتدار اعلیٰ کے متعلق باغیانہ اظہار رائے کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔مقدس مقامات، مقدس ہستیوں اور مقدس اشیا کی توہین پر سزا اکثر ممالک میں موجود ہے۔مغربی دنیا بے حیائی اور فحاشی وعریانی کی دلدل میں غرق ہے مگر وہاں بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فحش نگاری پر پابندی ہے۔قانونی طور پر مذہبی ونسلی منافرت پھیلانے والی تحریر وتقریر جرم ہے۔جرمنی، آسٹریا، سپین سمیت کئی ممالک میں گستاخانہ کلمات پر سزا اور اس کی حوصلہ شکنی کے لیے قوانین موجود ہیں۔کینیڈا میں عیسائیت کی تنقیص وتضحیک اور آئرلینڈ میں مذہب کے خلاف نفرت پھیلانا جرم ہے۔برطانیہ میں ایونجلیکل مسیحی فرقہ کی توہین جرم ہے۔اسی طرح توہین مسیح یا کتاب مقدس کی سچائی سے انکار **"Blasphemy"** (توہین مذہب) ہے، جس کی سزا تخت وتاج برطانیہ یا حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم کے مطابق عمر قید تک دی جا سکتی ہے۔یورپ وامریکہ کے علاوہ پوری دنیا میں ہتک عزت اور توہین عدالت کے قوانین موجود ہیں۔دنیا کے اکثر ممالک میں **Blasphemy** قانون پایا جاتا ہے۔چین میں جو لامذہب ریاست ہے، مہاتما بدھ کے مجسمے کی توہین فوجداری جرم ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا، رسول اور یوم سبت کی توہین جرم ہے۔ ہندومت میں ویدوں کی توہین کرنے والا ''ناستک'' (مذہب بیزار) ہوتا ہے اور اسے تباہ و برباد کرنے، قتل کرنے اور جلا دینے کا حکم ہے۔ دنیا کی کئی ریاستوں میں ریاست سے غداری کی سزا موت ہے۔ کہیں سربراہ مملکت کی توہین اور آئین کی توہین پر بھی سزائے موت رکھی گئی ہے۔ اظہار رائے کی آزادی اگر مطلق اور بے لگام ہوتی تو متذکرہ قواعد اور بندشیں کبھی نہ لگائی جاتیں۔ اس لیے کہ پھر ان قوانین کا بنانا آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوتا۔ اگر آزادی اظہار ہر قسم کی قیود سے آزادی کا نام ہے تو پھر ان قوانین کو ختم کر دینا چاہیے تاکہ جو جس کے جی میں آئے، بکتا جائے اور اسے کسی قانونی پابندی کا خوف نہ ہو۔ آزادی اظہار رائے کے وکیل کیا اس کی حمایت کریں گے؟

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی اگر ہر قسم کی قید اور ضابطے سے آزاد ہے تو پھر حال ہی میں آئرلینڈ کی ایک عدالت نے پرنس ہیری کی متنازعہ تصاویر کی اشاعت پر اخبار "The sun" کے ایڈیٹر کو کیوں معطل کیا؟ اخبار کو جرمانہ کیوں کیا؟ پھر 1993ء میں ایک عراقی خاتون کو محض اس لیے سزا کیوں دی گئی کہ اس نے ہوٹل کے فرش پر اس وقت کے امریکی صدر بش سینئر کا توہین آمیز کارٹون بنایا تھا جس پر سے گزر کر لوگ ہوٹل کے اندر جاتے تھے؟ آزادی اظہار رائے اگر اتنی ہی مقدس تھی تو پھر محمد علی (کلے) سے امریکہ کی ویت نام پالیسی پر تنقید کی وجہ سے عالمی چیمپئن کا اعزاز کیوں چھین لیا گیا؟ کیلی فورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کو جنھوں نے امریکہ میں اسرائیلی سفیر مائیکل اورن کے خطاب پر احتجاج کیا تھا، ایک سال کے لیے یونیورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا؟ الجزیرہ ٹی وی چینل کی طرف سے 6 امریکی فوجیوں کی لاشیں دکھانے پر کیوں احتجاج کیا گیا اور پھر کیوں اس کی پاداش میں اُس کے آفس پر حملہ کر کے عملے کے لوگوں کو شہید کیا گیا؟'' (روزنامہ پاکستان لاہور 9 اکتوبر 2012ء)

دکھ اور افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ فرانس، جہاں یورپ کے حوالے سے سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں، میں بھی بعض شیطان صفت صحافی اور جرائد نبی کریم ﷺ کے بارے میں توہین آمیز خاکے شائع کرنے سے باز نہیں آ رہے۔ اُن کی ناپاک جسارت دیکھیے کہ امریکی شہری نکولا بیسلے کی بنائی گئی گستاخانہ فلم کے خلاف جب یورپ سمیت ساری دنیا میں مظاہرے ہو رہے تھے، اُسی ہفتے فرانس کے ایک جریدے ''چارلی ہیبڈو'' (Charlie Hebdo) نے نہایت دل آزار اور گستاخانہ خاکے شائع کیے۔ یہ غلیظ حرکت دانستہ کی گئی لیکن

افسوس! فرانسیسی حکومت نے اس میگزین کو مارکیٹ میں فروخت کرنے سے منع نہ کیا حالانکہ اِن خاکوں کے بارے میں حکومتِ فرانس کو پہلے ہی سے معلوم ہو چکا تھا لیکن آزادیٔ صحافت کے نام نہاد قانون کا سہارا لے کر حکومت نے اس پر کوئی پابندی نہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہم اِسے فرانسیسی حکومت کا منافقانہ رویہ اور دوغلا پن کہیں گے۔ یاد رہے کہ ''چارلی ہیبڈو'' گزشتہ 52 برسوں سے شائع ہو رہا ہے لیکن درمیان میں تقریباً دس سال کے لیے یہ شائع نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے فرانسیسی صدر کے خلاف نہایت غیر اخلاقی اور واہیات قسم کے خاکے شائع کر دیے تھے۔ اس پر حکومتِ فرانس حرکت میں آئی اور ''چارلی ہیبڈو'' کو دس سال کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس پس منظر میں عالم اسلام خصوصاً فرانسیسی مسلمانوں نے بجا طور پر فرانسیسی صدر سے احتجاج کیا کہ اگر ماضی قریب میں فرانسیسی صدر کی بے حرمتی کرنے کی پاداش میں جریدہ مذکور پر پابندیاں عائد ہو سکتی تھیں تو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے پر اس جریدے پر پابندی کیوں نہیں لگائی جا سکتی؟ لیکن فرانسیسی حکومت نے اِس مطالبے پر کان دھرنے سے انکار کر دیا بلکہ فرانس کے صدر نے اعلان کیا: ''اوّل: ہم آزادیٔ اظہار کے قوانین کی موجودگی میں مذکورہ جریدے پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ دوم، پورے فرانس میں مسلمانوں کو توہین آمیز خاکوں کے خلاف جلسے جلوس نکالنے اور احتجاج کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔ سوم، جریدے کے ایڈیٹر کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ چہارم، جس کسی مسلمان کو اِن خاکوں کی اشاعت پر تکلیف ہے، وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ حکومتِ فرانس نے اِسی پر بس نہیں کی بلکہ چند روز بعد، 27 ستمبر 2012ء کو فرانسیسی وزیرِ داخلہ مینوئل والز (Manual Valls) نے فرانسیسی مسلمانوں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا: ''ہم ایسے لوگوں کو ملک بدر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائیں گے جو اسلام پر چلنے کا دعویٰ کریں اور ہمارے امن عامہ کے لیے خطرہ بن جائیں۔ جو مسلمان ہمارے قوانین اور اقدار کا احترام نہیں کرے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ فرانس میں نفرت کے پرستاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے''۔ یہ ہے مغرب کا منافقانہ اور انسانیت دشمن چہرہ! پوچھنا چاہیے کہ کیا کسی عظیم ہستی کو گالی دینا آزادی اظہار ہے یا بدتہذیبی؟ یہ آزادی رائے کی معراج ہے یا تذلیل؟ احتجاج کرنا جرم ہے تو ایک ارب 30 کروڑ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا کیسے جائز ہو گیا؟ واہ رے مغرب تیری کون سی کل سیدھی!

بعد ازاں ان گستاخانہ خاکوں کے خلاف فرانسیسی مسلمانوں کی تنظیم یونین آف فرنچ

اسلامک آرگنائزیشن نے عدالت کو درخواست دی۔ مسلمانوں کا موقف تھا کہ توہین آمیز کارٹونوں سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی ہے جبکہ تمام مذاہب کا یکساں احترام فرانسیسی دستور کا حصہ ہے۔ عدالت کے روبرو اپنے ایک تحریری بیان میں فرانسیسی صدر نے خاکوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ طنز ومزاح فرانسیسی ثقافت کا حصہ ہے اور مذہبی جذبات کے نام پر اظہار رائے کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت نے مسلمانوں کی درخواست مسترد کردی اور فیصلہ سنایا کہ یہ کارٹون محض طنز ومزاح ہیں اور اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے پہلے جب ڈنمارک کے رسالے جے لینڈ پوسٹن نے 2005ء اور 2006ء میں توہین آمیز خاکے شائع کیے تھے، اس وقت بھی ڈینش مسلمانوں نے عدالت سے رجوع کیا لیکن ڈنمارک کی عدالت نے اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس درخواست کو مسترد کردیا۔ دوسری طرف احتجاجی یادداشت لے کر اخبار کے دفتر جانے والے چار مسلمانوں کو اسلامی دہشت گرد قرار دے کر قید وجرمانے کی سزا سنادی گئی، یعنی مسلمانوں کو احتجاج اور ناراضی کے اظہار کی آزادی بھی حاصل نہیں۔ اس کے برعکس جنوری 2016ء میں امریکی ملحدوں کی ایک تنظیم نے امریکی وزارت خزانہ کے خلاف امریکی ریاست اوہائیو کے شہر اکرون کی ایک عدالت میں مقدمہ دائر کیا جس میں کہا گیا کہ امریکی ڈالر پر انگریزی زبان میں لکھی ہوئی عبارت **"We Trust in God"** (ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں) ان کے عقائد، فکر ونظر اور خیالات سے متصادم ہے جس سے ان کے احساسات مجروح ہورہے ہیں۔ ملحدوں کا دعویٰ ہے کہ انہیں امریکہ میں امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یادرہے گذشتہ برس انہی ملحدوں نے امریکہ میں کسی بھی اہم سرکاری عہدے کا حلف لیتے وقت استعمال ہونے والے الفاظ ''احکام الٰہی کے تحت'' **(under God)** پر اعتراض کیا تھا اور اسے ہٹانے کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر مجال ہے کہ کسی نے بھی ان پر کوئی اعتراض کیا ہو۔

''چارلی ابدو کی ریاکاری'' کے عنوان سے جناب سید عاصم محمود لکھتے ہیں: ''چالیس سالہ جم ہائنز **(Jims C. Hines)** امریکہ کا ممتاز ادیب ہے۔ یہ عموماً ماورائے عقل یا ''فینٹسی'' موضوعات پر ناول لکھتا ہے۔ اس نے 12 مارچ 2012ء کو اپنے بلاگ پر ''فریڈم آف اسپیچ 101'' نامی مضمون لکھا۔ یہ امریکی مصنف لکھتا ہے:

''میں آزادیٔ اظہار رائے کا بہت بڑا حامی ہوں۔ لیکن جو لوگ لغو باتیں اور بیہودہ عمل کرتے ہیں، آزادی رائے انہیں (بھیانک) نتائج سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ آزادی رائے

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان غیر ذمے دار ہو جائے اور کچھ بھی کرتا پھرے''۔

یوں جم ہائنز نے مختصر الفاظ میں آزادی اظہار رائے کی تشریح بیان کر دی۔ یعنی یہ حق کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ فضول اور مہمل کام انجام دیتا پھرے اور اسے کوئی سزا نہ ملے۔ اسے اپنے غلط عمل کی سزا خود ہی بھگتنا پڑے گی۔ چناں چہ فرانسیسی رسالے، شارلی یا چارلی ابدو کے ناعاقبت اندیش کارٹونسٹوں اور مدیروں نے مسلمانوں کی دل آزاری کی تو انہیں جذباتی اسلامیوں کے انتقام کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن دنیائے مغرب میں اکثریت کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ آزادی اظہار رائے اور ذمے داری ہم مترادف ہیں اور اس کی وجہ ان کی منافقت ہے۔ مغربی معاشروں میں جب کوئی شخص نسل، مذہب، جنس وغیرہ کے خلاف قابل نفرت باتیں (Hate Speech) کرے، تو وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فرانس سمیت کئی ممالک میں کوئی شخص یہود کے خلاف بات کرے تو اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ امریکہ یا برطانیہ میں کوئی عیسائی ہم جنسیت کے قبیح فعل کی مخالفت کرے، تو وہ ''انتہا پسند'' کہلاتا ہے۔ لیکن جب کوئی مغربی اخبار، رسالہ، صحافی یا مصنف اسلام کو بدنام کرے، نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ پر حملہ کرے، تو اسے ''آزادی اظہار رائے'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ منافقت کی انتہاء ہے۔

فرانس میں ہولوکاسٹ (Holocaust) کی مخالفت کرنا جرم ہے۔ مغربی مورخین کا دعویٰ ہے کہ نازی جرمنوں نے مختلف یورپی ممالک میں آباد یہود پہ بے انتہا مظالم ڈھائے۔ یہی عمل ہولوکاسٹ کہلاتا ہے۔ اس کو تسلیم نہ کرنے والے پر فرانس میں ''گائے سوٹ نامی قانون (Gayssot Act) کے تحت مقدمہ چلتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ گائے سوٹ قانون کی پہلی شق میں درج ہے: ''ہر وہ عمل ممنوع ہے جو کسی نسلی گروہ، قوم، نسل یا مذہب کے خلاف انجام پائے''۔ اس شق کی رو سے چارلی ابدو پر مقدمہ چلنا چاہیے کیونکہ وہ پچھلے کئی برس سے انتہائی گھٹیا خاکے چھاپ کر سوا ارب مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو شدید تکلیف پہنچاتا چلا آ رہا ہے لیکن اسے ''آزادی اظہار رائے'' کی آڑ لے کر کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلے اور ان کا مذاق اُڑائے۔ یہ کس قسم کی جمہوریت پسندی، عدل وانصاف اور انسانی حقوق کی ترویج ہے؟

اب فرانسیسیوں کی منافقت کا ایک اور روپ دیکھئے۔ 86 سالہ موریس سینہ (Mauice Sinet) فرانس کا مشہور کارٹون نگار ہے۔ جب الجزائری فرانسیسی حکومت

سے نبرد آزما تھے، تو سینہ نے ان کی حمایت کی تھی۔ اسی لیے وہ فرانسیسی حکومت کی نظر میں معتوب رہا اوراس پر مقدمے چلتے رہے۔ جب چارلی ابدو شائع ہونا شروع ہوا تو موریس سینہ اس سے وابستہ ہوگیا۔ یہ عام طور پر سیاسی کارٹون بناتا ہے۔ جولائی 2009ء میں تب کے فرانسیسی صدر، نکولاس سارکوزی کے بیٹے، جین سارکوزی اور جیسکا سیوئن کی منگنی ہوئی۔ جیسکا ایک بڑی الیکٹرونکس فرانسیسی کمپنی کی یہودی مالک کی بیٹی ہے۔ اس منگنی کے بعد موریس سینہ نے چارلی ابدو میں ایک کالم لکھا اور جین سارکوزی اور جیسکا کے کارٹون بھی بنائے۔ کالم میں موریس نے لکھا ''یہ لڑکا اب ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کرے گا''۔ اشارہ امیر کبیر یہودی سسر کی طرف تھا کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اپنے داماد کی جا بے جا حمایت کرنے لگے گا۔ جلد ہی موریس پر یہود دشمن ہونے کا الزام لگ گیا۔ تب فلپی وال، چارلی ابدو کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے 2006ء میں ''آزادی اظہار رائے'' کے نام پر ڈینش اخبار، جیلنڈز پوسٹن کے شائع کردہ توہین آمیز کارٹون دوبارہ چھاپے تھے۔ لیکن اس بار فلپی وال نے منافقت کا ثبوت دیا۔ دراصل اس پر بااثر فرانسیسی یہود کا دباؤ تھا کہ وہ کالم لکھنے پر موریس سینہ سے معذرت طلب کرے۔ چنانچہ کارٹون نگار سے کہا گیا کہ وہ معافی مانگے۔ موریس سینہ نے انکار کر ڈالا۔ نتیجتاً اسے چارلی ابدو سے نکال دیا گیا۔

فرانسیسی صحافی، اولیور سائران (Olivier Cyran) طویل عرصہ چارلی ابدو سے منسلک رہا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''واقعہ 9/11 کے بعد چارلی ابدو پہ اسلاموفوبیا سوار ہوگیا۔ وہ اکثر اسلام اور مسلمانوں پر حملے کرنے لگا جو فرانسیسی حکومت کے ایوانوں میں کوئی اثر ورسوخ نہیں رکھتے''۔ اب ڈنمارک کے بدنام زمانہ اخبار، جیلنڈز پوسٹن کی منافقت دیکھیے۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استہزائیہ کارٹون شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اخبار کو عوامی احتجاج کا خطرہ تھا۔ اسی طرح ایک بار سوال اٹھا کہ کیا جیلنڈز پوسٹن میں ہولوکاسٹ کا مذاق اُڑاتے خاکے چھپ سکتے ہیں؟ اخبار والوں نے جواب دیا ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہولوکاسٹ پر کارٹون شائع کیے جائیں''۔

کارلوس لطّوف برازیل کا عالمی شہرت یافتہ کارٹونسٹ ہے۔ وہ فلسطینیوں پر اسرائیلی حکومت کے ظلم وستم کو اپنے چشم کشا کارٹونوں سے آشکار کرتا ہے۔ اس نے چارلی ابدو کے خاکوں پر گفتگو کرتے ہوئے ملائیشیا کے مشہور اخبار، ڈیلی صباح کو بتایا: ''آزادی اظہار رائے

اورنفرت انگیز بات (Hate Speech) کے مابین کیا فرق ہے؟ اس پر دانش وروں کے مابین نہ ختم ہونے والی بحث جاری ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ بعض موضوعات پر بات کیوں نہیں ہوسکتی جبکہ دوسروں پر کرنے کی اجازت ہے؟ ہم بعض چیزوں کا مذاق اُڑا سکتے ہیں، بقیہ کا نہیں۔''مثال کے طور پر یورپ میں ہولوکاسٹ کا استہزا کرنا منع ہے۔ اسی طرح نسل پرستی پر بولنا یا لکھنا بھی ممنوع ہے۔ مگر مغربی اخبار و رسائل، اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی (نعوذباللہ) کھلے عام توہین کرتے ہیں''۔ سوال یہ ہے کہ مغربی میڈیا نے اسلام کو طنز و تشنیع کا نشانہ کیوں بنا رکھا ہے؟ جواب میں کارلوس لطّوف کہتا ہے: ''میں اس بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید مسلمانوں کے خلاف نفرت، آزادی اظہار رائے کی حدود جانچنے کی سعی یا محض تلذذ کی خاطر مسلمانوں کا مذاق اُڑانا! لیکن یہ حقیقت ہے، وہ (چارلی ابدو کا مقتول عملہ) کوئی شریفانہ مقصد انجام دیتے ہوئے ہلاک نہیں ہوا۔ ان کی یہی کوشش رہی کہ مسلمانوں کو اشتعال میں لایا اور اسلام کے خلاف زیادہ سے زیادہ نفرت بڑھائی جائے''۔

چارلس کلیب (1780ء۔ 1832ء) برطانیہ کا ممتاز پادری اور ادیب گزرا ہے۔ اس انگریز مدبر کا ایک قول ہے: ''ہم بعض انسانوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اسی نفرت کی وجہ سے کبھی ان کے بارے میں نہیں جان پاتے''۔ یہ قول اسلام اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے متعلق کچھ نہ جاننے والے اہل مغرب پر پورا اترتا ہے۔ وہ غلط فہمیوں کے باعث ساری عمر اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک مشہور امریکی ماہر بشریات، ٹیری گولیمئس کا قول ہے: ''نفرت کا جذبہ انسان کی ساری خوبیاں چوس کر اسے ناکارہ بنا ڈالتا ہے''۔ نجانے اسلام مخالف مغربی اس قول کی صداقت کب جانیں گے!'' (ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور فروری 2015ء)

آزادی اظہار کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ اس سے تعصب اور نفرت کے شعلوں کو ہوا ملے۔ مغرب، آزادی اظہار کے بنیادی تقاضوں اور ضروریات سے صرف نظر کر کے ایسے طریقے متعارف کروا رہا ہے جو انتہا پسندی، ہیجان خیزی، اشتعال انگیزی، مذہبی منافرت اور نسلی تعصب کو جنم دیتے ہیں۔ گستاخانہ خاکے شائع کرنے سے یورپی صحافیوں نے کون سا علمی انکشاف کیا؟ کون سی نادر تحقیق و دریافت کی راہ دکھائی، کون سی سیاسی، سماجی ناانصافی اجاگر کی، کیا اس سے دنیا کو زیادہ امن، آزادی اور محبت نصیب ہوئی؟ کسی کے مذہبی عقائد پر حملہ

کرنا یا ان کو مقدس شخصیات کی توہین کرنا کہاں کی روشن خیالی ہے؟ اپنی غلط سوچ کسی پر مسلط کرنا بھی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت پر جب مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور وہ پر امن احتجاج کرتے ہیں تو انہیں تنگ نظری کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ میگزین چارلی ہیبڈو کے قانونی مشیر کا کہنا تھا: ''ہمیں توہین کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور ہم کسی صورت اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے''۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا آزادی اظہار رائے اسی کا نام ہے کہ جو یا وہ گوئی منہ میں آئے، کہہ دی جائے اور کوئی قانون اس کو پوچھنے والا نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آزادی اظہار نہیں بلکہ آزادی بغض وعناد کی آڑ میں فکری دہشت گردی ہے جس سے عالمی امن وسکون سخت خطرے میں ہے۔

جنوری 2015ء میں فرانس کے دارالحکومت پیرس میں توہین آمیز خاکے شائع کرنے اور مسلم شخصیات کا مضحکہ اُڑانے والے جریدے چارلی ہیبڈو کے دفتر پر مسلح افراد کے حملے میں اخبار کے چیف ایڈیٹر، 4 کارٹونسٹوں اور 2 پولیس افسران سمیت 14 افراد ہلاک ہوئے۔ فائرنگ ایڈیٹوریل میٹنگ کے دوران کی گئی۔ یاد رہے کہ یہ ہفتہ وار فکاہیہ سیاسی جریدہ ماضی میں بھی مختلف سیاسی اور حالات حاضرہ کی خبروں پر اپنے طنزیہ تبصروں کی وجہ سے متنازع رہا ہے۔ اس فرانسیسی ہفت روزے نے 2013ء میں شان رسالت ﷺ میں توہین آمیز کارٹون شائع کیے تھے جس پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ یہ فکاہیہ وطنزیہ رسالہ ماضی میں متعدد مواقع پر آزادی اظہار کے نام پر نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ اس واقعے کی پرزور مذمت کرتے ہوئے مغربی ممالک کے حکمرانوں، دانشوروں اور عوام کو یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یورپی اخبارات کی جانب سے توہین رسالت پر مبنی شر انگیز اور اشتعال انگیز خاکوں اور مضامین کی اشاعت پر دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات واحساسات بھی اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ مجروح ہوئے تھے اور مسلسل ہو رہے ہیں جیسا کہ اس واقعے پر مغرب کو رنج ہوا ہے مگر یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مغربی ممالک اس معاملے پر عالم اسلام کے دکھ اور اذیت کو سمجھنے اور توہین آمیز مواد کی اشاعت روکنے یا کم از کم اس کی مذمت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے ایمان وعقیدت کے مرجع ومنبع حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیوں کو ''آزادئ اظہار'' قرار دے کر گستاخوں کو تحفظ فراہم کرنا، سلمان رشدی جیسے

انسان نما شیطانوں کو اعلیٰ اعزازات سے نوازنا اور دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کے جذبات و احساسات کو رتی برابر حیثیت نہ دینا مغرب کا ایک ایسا رویہ ہے جس کا عقل و دانش کے تقاضوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔

یورپ اپنے لبرل اقدار اور جمہوری اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر اسلام دشمن مہم کا سرخیل بن چکا ہے۔ مغربی میڈیا اور نام نہاد مذہبی لیڈر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ آزادی اظہار رائے ہے مگر جب مسلمان اپنے دفاع میں کوئی احتجاجی پروگرام کرتے ہیں تو انہیں اس کی اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ ان کے نزدیک یہ سکیورٹی رسک ہے۔

جناب ابرار بختیار اپنے مضمون ''اظہار کی آزادیٔ یا آوارگیٔ اظہار'' کے عنوان سے لکھتے ہیں: ''توہین مذہب کا قانون بھی معاشرے کو انتشار، بدامنی اور بے مہار آزادی سے روکنے کے لیے ہے جو مختلف ممالک میں رائج ہے۔ ان میں سے بیش تر اسلامی ممالک ہیں جب کہ امریکہ و یورپ کے کئی ممالک میں ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے مبینہ قتل عام ''ہولوکاسٹ'' سے انکار کرنا اور یہودیت کے خلاف تحریر وتقریر سنگین جرم ہے جس پر فرانس، جرمنی، برطانیہ، آسٹریا اور امریکہ سمیت کئی ممالک میں لوگوں کو سزائیں دی جا چکی ہیں، جب کہ توہین مذہب پر پاکستان سمیت دوسرے مسلم ممالک میں عموماً سزائیں نہیں دی گئیں اور اگر نچلی عدالتوں نے سزائیں دیں، تو اعلیٰ عدالتوں نے ختم کر دیں۔ پیرس واقعے کے بعد انسان دوستی کی دعوے دار تنظیم ''انٹرنیشنل ہیومنسٹ اینڈ اتھیکل یونین'' نے توہین مذہب کے قوانین ختم کرنے کے لیے عالمی مہم شروع کی مگر اس مہم میں یہودیت پر تنقید کو جرم قرار دینے والے قانون کا خاتمہ شامل نہیں۔ یونین کا دعویٰ ہے کہ چارلی ہیبڈو پر حملے کے بعد قانون توہین مذہب کے خاتمے کا یہ درست وقت ہے۔ یہ مہم چلانے والے کا مؤقف ہے کہ توہین مذہب قانون اظہار رائے کی آزادی پر قدغن لگاتا ہے۔ پاکستان میں مذکورہ قانون کے خاتمے کی مہم چلانے والوں کا دعویٰ ہے کہ قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے مگر ایسی کوئی مثال نہیں کہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ نے قانون توہین مذہب کے تحت کسی کو سزا دی ہو۔ غلط استعمال کی دلیل بے جا، بے جواز اور منطق سے اس لیے بھی عاری ہے کہ حال ہی میں امریکہ میں طبی سہولت کے غلط استعمال پر ایک ڈاکٹر پکڑا گیا، تو (ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے) اسے سزا ہوئی۔ اگر غلط استعمال پر

قانون کے خاتمے کا مطالبہ مان لیا جائے تو امریکہ میں میڈیکل کی سہولت ختم کر دینی چاہیے؟ بعض مقدمات میں کمزور شہادتوں کے باعث حقیقی مجرم رہا ہو جاتا ہے، کبھی بے گناہ کو سزا ہو جاتی ہے، کیا اس بنا پر عدالتیں ختم کر دی جانی چاہئیں؟ قانون توہین مذہب کے خاتمے کی دلیل یا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ آزادیٔ اظہار رائے کے منافی ہے...... بالکل ٹھیک جناب...... انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کا عقیدہ، مذہب، فرقہ، مسلک اختیار کرے، چاہے دہریہ ہو جائے۔ یقیناً اس میں کسی کو مداخلت، روکنے یا تبدیلی پر مجبور کرنے کا اختیار اور حق حاصل نہیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر عیسائی رہنماؤں کی پیش کش و اصرار کے باوجود گرجے میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ گرجا عیسائیوں کی عبادت گاہ ہے، وہاں ان کا حق ہے۔ یہ وہ بنیادی حق ہے جو ہر انسان کو ملنا چاہیے۔ جس طرح ایک شخص کو کسی دوسرے کے گھر میں بلا اجازت گھسنے، مداخلت کرنے کا حق نہیں، اسی طرح کسی دوسرے کے عقیدے میں مداخلت کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ جھگڑا تب شروع ہوتا ہے، جب آپ تضحیک کرنے اور تمسخر اُڑانے کو آزادی قرار دیتے ہیں، مگر متاثرہ فرد کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ دہریہ ہے، ہوا کرے، مگر دہریے کو کسی کے مذہب کا مذاق اُڑانے، تنقید کرنے یا بُرائی کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟ یہ کون سی منطق ہے، آپ گالیاں دیں، پگڑی اُچھالیں، یہ آپ کے اظہار رائے کی آزادی ہے۔ گالیاں کھانے والا پلٹ کر جواب دے تو یہ انتہا پسندی ہے۔ یہ کون سا اصول، کون سی منطق ہے۔ جب آپ کسی کے گھر میں گھسیں گے، تو وہ آپ کو ضرور واپس دھکیلے گا۔ جب کسی کے جذبات مجروح کریں گے، تو وہ جواب دے گا اور توہین مذہب کا قانون اس جواب کو درست دائرے اور قانون کے تحت لانے ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ ورنہ جذباتی شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ درحقیقت ایک قانون ہی اس کو روکتا ہے۔

پیرس واقعے کو مغربی میڈیا مسلمانوں اور اسلام سے جوڑ کر یورپ و امریکہ میں اسلام مخالف طوفان برپا کر رہا ہے۔ یہودیت کے زیر اثر مغربی میڈیا مسلمانوں سے متعلق ہر سچی، جھوٹی خبر حتیٰ کہ جانب دارانہ تبصروں کو بھی خوب اُجاگر کرتا، چھاپتا اور نشر کرتا ہے مگر داعش کے بارے میں اسرائیلی، امریکی ایجنٹ ہونے کی اطلاعات، خبروں اور پیرس واقعے کو صہیونی و مغربی خفیہ ایجنسیز کی کارروائی قرار دینے کے سینئر فرانسیسی رہنما کے بیان کا مکمل بلیک آؤٹ کرتا ہے تاکہ یورپی و امریکی باشندے خصوصاً اور دنیا عموماً حقیقت اور سچ نہ جان پائے۔

صحافتی اور ناظرین کو تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھنے دیتا اور اس پروپیگنڈے اور یہودی سازشوں کے باعث مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

گزشتہ دنوں امریکہ میں ایسے کم از کم تین واقعات پیش آئے، جب کہ کینیڈا میں سرکاری سطح پر مسلم مخالف اقدامات کیے گئے۔ مانٹریال میں مسجد و اسلامی سینٹر بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا اور انسداد دہشت گردی کا نیا قانون لایا گیا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق اس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف ممکنہ کارروائیاں ہیں۔ امریکی ریاست میں ٹیکساس کیپٹل کے باہر مسلمانوں کی تقریب پر شدت پسندوں نے حملہ کر دیا اور تقریب کو منتشر کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہ شدت پسند خود کو عیسائی قرار دے رہے تھے، مگر اسرائیلی پرچم اٹھائے ہوئے صہیونی ریاست کے حق میں نعرے لگا رہے تھے، جو ان کی وابستگی کا واضح اظہار تھا۔

امریکی مسلمانوں کی ہول لبرٹیز آرگنائزیشن، کاؤنسل آف امریکن اسلامی ریلیشنز (CAIR) کی ٹیکساس شاخ کے تحت 200 سے زیادہ مسلمان نمائندے ٹیکساس مسلم کیپٹل ڈے کی سالانہ تقریب میں شریک تھے، جو اپنے مسائل سے ریاستی قانون سازوں کو آگاہ کرنے، بچوں کی غیر دستاویزی تعلیم اور قانون نافذ کرنے والے اہل کاروں کے جسم پر کیمروں کی تنصیب پر قانون سازوں کی حمایت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہیں تمام جماعتوں کے ارکان پارلیمنٹ سے ملنا تھا۔ اس طرح کی تقاریب اور ملاقاتیں مسلمان نمائندے ہر برس کرتے ہیں اور یہ بطور ووٹرز اپنے منتخب نمائندوں کو مقامی برادری کے مسائل سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔ اس بار ایک شدت پسند صہیونی نواز خاتون قانون ساز مولی وائٹ کے فیس بک پر اسلام اور مسلمان دشمن اشتعال انگیز بیان نے آگ لگائی۔ مولی نے لکھا ''آج آسٹن میں ٹیکساس مسلم کیپٹل ڈے ہے۔ ایوان کا اجلاس پیر تک ملتوی ہو گیا ہے۔ مجھ سمیت بیشتر ارکان اپنے علاقوں میں واپس آ گئے ہیں۔ میں نے اپنے آفس کے استقبالیے پر اسرائیلی پرچم رکھ دیا ہے اور اسٹاف کو ہدایت کی ہے کہ مسلمان نمائندوں سے کہیں کہ اسلامی دہشت گرد گروہوں کی مذمت کریں اور امریکہ و امریکی قوانین سے کھلے عام وفاداری و اطاعت کا اعلان کریں۔ پھر میں دیکھتی ہوں، وہ کتنی دیر میرے دفتر میں ٹھہرتے ہیں''۔ اس ٹوئٹ کے بعد آسٹن میں ساتویں ٹیکساس مسلم کیپٹل ڈے کا آغاز ہوا جس میں 200 سے زائد مسلمان مرد و خواتین شریک تھے۔ اسٹیج کے سامنے تقریباً 30 شدت پسند جمع ہو گئے، جو خود

کو عیسائی بتا رہے تھے مگر انہوں نے اسرائیلی جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ مسلم کاؤنسل کی مقامی خاتون ترجمان، رتھ نصر اللہ نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے تقریر کا آغاز کیا ہی تھا کہ ایک انتہا پسند خاتون، کرسائن وک غنڈہ گردی کرتے ہوئے گھس آئی اور رتھ نصر اللہ سے مائیک چھین کر نعرے لگانے لگی۔ ''اسلام کو امریکہ پر مسلط نہیں ہونے دیں گے۔ اسلام ٹیکساس پر مسلط نہیں ہوگا''۔ پولیس اگرچہ اس موقعے پر موجود تھی مگر اس نے غنڈہ گردی کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی نہ شر پسندوں کے خلاف کارروائی کی اور اسے آزادی اظہار قرار دیا گیا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو مسلمان دہشت گرد قرار پاتے اور گرفتاریاں ہوتیں۔ بعد ازاں، ایک منتظم نے مائیک اس خاتون سے واپس لیا تو نصر اللہ نے تقریر کرتے ہوئے شرکا کو یاد دلایا کہ ''یہ اشتعال انگیزی بتاتی ہے کہ ہماری یہاں موجودگی کیوں ضروری تھی۔'' منتخب نمائندوں کی اکثریت اور ٹیکساس کے گورنر کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم پر خاموشی مسلمانوں کے خلاف بغض وعناد کا واضح اظہار ہے۔ اگر اس کے برعکس مظاہرین مسلمان ہوتے تو مغربی میڈیا، ارکان کانگریس اور انتظامیہ ہنگامہ برپا کر چکے ہوتے اور دو درجن مسلمانوں کے عمل پر دو ارب مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے چکے ہوتے''۔ (سنڈے میگزین روزنامہ جنگ لاہور، 15 فروری 2015ء)

فرانسیسی میگزین پر حملے سے جو چیز واضح ہوئی ہے، وہ مغربی معاشرے کا کھوکھلا پن ہے اور چارلی ہیبڈو رسالے کے اس فیصلے کے بعد کہ وہ دوبارہ گستاخانہ خاکے شائع کرے گا، مسلمانوں کے خلاف نظریہ عیاں ہو چکا ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کا مطلب مادر پدر آزادی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی چھتری تلے سب کو سب کچھ کہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مغرب اور مشرق کے نظریات میں اس آزادی کی نوعیت مختلف ہے بلکہ ان کی حدود و قیود بھی مختلف ہیں۔ مغرب میں جہاں شخصی آزادی اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہے، وہیں مسلمانوں کے لیے دوغلا معیار روا رکھا ہوا ہے۔ ڈیڑھ ارب سے زائد نفوس پر مشتمل ایک دین کے ماننے والوں کی دل آزاری کو بھی اظہار رائے کہہ دیا جاتا ہے جبکہ اپنے لیے اظہار رائے کے کچھ اور ہی معیار ہیں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت اور قرآن پاک کی بے حرمتی جیسے واقعات عام ہیں مگر ہولوکاسٹ کا انکار کرنے والے کو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ اگر ایک مذہب کے عقائد کو مجروح کرنا جرم ہے تو دوسرے مذاہب کی عزت و

تکریم بھی اتنی ہی لازم وملزوم ہونی چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگوں کو دلی تکلیف دی جائے اور پھر یہ توقع بھی رکھی جائے کہ وہ کسی ردعمل سے باز رہے گا۔ تشدد کی اجازت کسی صورت نہیں مگر جواز فراہم کرنے والے بھی بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ ہم آہنگی اور رواداری کی فضاء کو برقرار رکھنا اوراس کو فروغ دینا ہر شخص کی اولین ذمہ داریوں میں سے ایک ہے اوراس جانب پہلا قدم ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام ہے۔

دنیا میں انسان دوستی کے نام پر سرگرم تنظیموں کے ایک اتحاد نے توہین مذہب کے قوانین کے خلاف عالمی مہم شروع کر دی ہے۔ عالمی میڈیا کے مطابق انٹرنیشنل ہیومنسٹ اینڈ ایتھیکل یونین کا کہنا ہے کہ فرانس میں خاکے چھاپنے والے میگزین پر ہونے والے حملے کے بعد یہ توہین مذہب کے قوانین کے خاتمے کا درست وقت ہے۔ مغرب کے بعض شر پسند اور بدنہاد حلقے جس امر کو اظہار رائے کی آزادی قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت مقدس اور برگزیدہ شخصیات کی کھلی گستاخی، بے ادبی اور اسلامی دشمنی کا واضح اظہار ہے جس کی بہرحال کوئی ہوش مند انسان اجازت نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے باشعور اور سنجیدہ طبقات اظہار رائے کی آزادی کو مطلق قرار دینے کی نفی کر چکے ہیں اور اب مغربی اقوام میں یہ شعور بیدار ہونے لگا ہے کہ عالمی سیکولر لابی دنیا کے امن وامان کو تہ وبالا کرنے کے لیے ان کا کندھا استعمال کر رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی اقدار کا تحفظ بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو لبرل ازم کے دعویداروں کو انسانی حقوق کی مبہم اور مجہول تعریف سے دست بردار ہو جانا چاہیے کیونکہ عالمی صیہونی قوتوں اور ان کے آلہ کاروں کا یہی دوغلا پن دنیا میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی جڑ ہے اور جب تک اس کی بیخ کنی نہیں کی جائے تب تک دنیا میں امن کا قیام خواب رہے گا۔

بھارتی مسلمان صحافی جناب افتخار گیلانی اپنے مضمون ''اظہار رائے کی آزادی کا دہرا معیار'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''مسلح افراد کے حملے میں فرانسیسی رسالے 'چارلی ہیبڈو' کے 14 افراد کے مارے جانے اوراس کے بعد گستاخانہ خاکے ایک بار پھر شائع کرنے کے واقعہ نے مغرب نیز بھارت میں بھی اظہار رائے کی آزادی پر زوردار بحث چھیڑ دی ہے۔ حادثے کے بعد اس رسالے کے لیے ہمدردی اور یکجہتی کی ایک رو بھی چلی۔ بھارت کے مختلف شہروں میں بھی حملوں کے

خلاف ریلیاں نکالی جا رہی ہیں۔ بعض ٹی وی اینکر تو اتنے پُر جوش دکھائی دے رہے ہیں کہ انہوں نے ناموسِ رسالت ﷺ کے حق میں اور فرانسیسی رسالے کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل کو جمہوریت کے لیے خطرناک بتایا لیکن یہی نام نہاد دانشور، ادیب، مصنفین اور ٹی وی اینکر اپنے ملک کے اندر اظہار رائے کی آزادی کا گلا گھونٹے جانے کے متعدد واقعات پر اس طرح چپ سادھ لیتے ہیں، گویا انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ دو سال قبل فلم ساز نیشا جین، صحافی پرینکا بوریو جاری اور ستین باردولائی کو جب چھتیس گڑھ کے دانتے واڑہ میں گرفتار کیا گیا تو کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ قبائلیوں پر ہونے والے مظالم، نسلی اور نسل مخالف کارروائیوں کا جائزہ لینے گئے تھے۔ اظہار رائے کی آزادی کے یہ 'مجاہد' اس وقت بھی خاموش رہے جب 2010ء میں امریکی مصنف اور دانشور پروفیسر **Richard Shapiro** کو حکومت ہند نے کوئی وجہ بتائے بغیر ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ 2010ء میں ہی جب مشہور براڈ کاسٹر **David Barasmian** اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں بھارت پہنچے تو حکومت نے انہیں اندرا گاندھی انٹرنیشنل ہوائی اڈے سے بیرنگ واپس لوٹا دیا۔ دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر نندنی سندر کے بھی چھتیس گڑھ میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ 2011ء میں حقوق انسانی کے مشہور کارکن گوتم نولکھا کا واقعہ شاید لوگ ابھی نہیں بھول پائے ہوں گے۔ گوتم جب اپنی اہلیہ کے ساتھ چھٹیاں منانے گلمرگ جانا چاہ رہے تھے تو سری نگر ہوائی اڈہ پر انہیں رات بھر حراست میں رکھنے کے بعد دہلی لوٹنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ حال ہی میں بھارت میں ایک اور ادیب اور اس کا ناول موضوع بحث بن گیا ہے جبکہ ناول پر پابندی بھی لگا دی گئی ہے۔ یہ تامل زبان کے ناول نگار پرمل موروگن ہیں۔ ان کے ناول کے انگریزی ترجمے پر اس وجہ سے پابندی لگا دی گئی ہے کہ اس میں موروگن نے ہندو مذہب کی قدیم رسم ''نیوگ'' کے بارے میں لکھا ہے۔ ناول نگار نے اس رسم پر نکتہ چینی کی ہے۔ نیوگ رسم کے مطابق کوئی بے اولاد عورت بچہ پیدا کرنے کے لیے کسی غیر مرد یا پنڈت سے جنسی تعلقات قائم کر سکتی تھی اور اس رسم کو قدیم بھارت میں سماجی قبولیت حاصل تھی۔ موروگن نے اس ناول میں ذات پات پر مبنی طبقاتی کشمکش، ظلم اور معاشرے کی برائیوں پر نکتہ چینی کی ہے جس سے ایک خاندان بکھر جاتا ہے اور ان کی ازدواجی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ ان پر اتنی نکتہ چینی ہوئی اور ہوا اس قدر برہم ہوئی کہ انہوں نے نہ صرف آئندہ قلم نہ اُٹھانے کی قسم کھا لی

بلکہ ناول کے ناشرین کو اس کی تمام کتابیں جلانے کی استدعا بھی کر دی۔ یہ تو صرف چند واقعات ہیں جن کا ذکر برسبیل تذکرہ آ گیا ہے، ورنہ ایسے واقعات کی گنتی مشکل ہے۔

دنیا کے متعدد ممالک میں اس وقت مسلمانوں کو متعدد مسائل کا سامنا ہے لیکن فرانس میں حال ہی میں اسلام مخالف جذبات میں مزید تیزی آ گئی ہے۔ اس حوالے سے دو کتابوں کا شائع ہونا، ایک منفی اور حوصلہ شکن رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ پچھلے ہی سال سامنے آنے والی اِرک زمور (Eric Zemmour) کی کتاب 'فرانسیسی خودکشی' (Suicide French) میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ فرانس میں مسلمان طبقہ ایک طاقت بن کر ابھر رہا ہے جو کسی بھی وقت حکومت پر قبضہ کر سکتا ہے، وہیں میچل ہولبوک (Michel Howellebecq) کے ایک ناول Soumission میں 2022ء میں فرانس میں کسی مسلمان سیاسی جماعت کو فرانسیسی حکومت پر قبضہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہولبوک کا یہ ناول 'چارلی ہیبڈو' حادثے کے روز ہی شائع ہوا۔ تین سال پہلے ہولبوک نے بھی دین اسلام پر اس نوع کا جاہلانہ اور متعصّبانہ حملہ کیا تھا۔ ایسے حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان قابل نفرین واقعات سے فرانس میں دن بہ دن اسلام مخالف جذبات میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آزادی اظہار کے حق کے حوالے سے زیادہ دیر تک تعصب، منافرت اور دہرے معیار کی عینک نہیں لگائی جا سکتی۔ سب سے اول میڈیا کی آزادی کی حدود کا تعین کرنا لازمی امر ہے۔ صحافت کو محض اسلام کی تضحیک یا مسلم مخالف جنون کو مزید ہوا دینے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی سطح پر بقائے باہمی، کشادہ ذہنی، مذہبی روا داری اور ایک دوسرے کے بارے میں احترام کے جذبہ کو فروغ دیا جائے''۔ (روزنامہ منصف حیدرآباد، 3 مارچ 2015ء)

افسوس کی بات ہے کہ پیرس واقعہ سے سبق سیکھنے کے بجائے گستاخ جریدے ''چارلی ہیبڈو'' کی نئی انتظامیہ نے گستاخانہ خاکوں پر مشتمل 16 زبانوں میں خصوصی ایڈیشن شائع کیا جس میں ماضی میں شائع ہونے والے تمام توہین آمیز خاکے شامل کیے گئے۔ امریکی اور یورپی میڈیا نے دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے دریدہ دہن جریدے کے ساتھ بھرپور مالی تعاون کیا جبکہ فرانسیسی وزیراعظم نے بھی اخبار کو توہین آمیز شمارہ شائع کرنے کے لیے 10 لاکھ یورو کا فنڈ جاری کیا۔

روزنامہ ''اسلام'' اپنے مختلف اداریوں میں لکھتا ہے:

''فرانس کے دارالحکومت پیرس میں لاکھوں افراد نے توہین رسالت پر مبنی خاکے شائع کرنے والے جریدے ''چارلی ہیبڈو(Charlie Hebdo)'' پر گزشتہ ہفتے ہونے والے حملے کے خلاف اور میگزین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے مارچ کیا جس میں چالیس ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔ اس موقع پر مغربی سربراہان مملکت وحکومت نے بیک زباں ''آزادیٔ اظہار'' کے حق کا دفاع کرنے اور ''دہشت گردوں'' کے سامنے نہ جھکنے کے عزم کا اظہار کیا۔ مبصرین کے مطابق مغربی ممالک کے سربراہان کا یہ غیر معمولی اجتماع مغرب کی جانب سے اسلامی دنیا کو یہ واضح پیغام ہے کہ اسلامی دنیا کے تمام تر تحفظات اور شکایات کے باوجود مغربی حکومتیں اپنے میڈیا کی جانب سے ''آزادیٔ اظہار'' کے نام پر توہین رسالت ﷺ کا سلسلہ روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں اور مٹھی بھر یہودیوں کی خوشنودی کی خاطر ہولوکاسٹ کے صیہونی افسانے کو جھٹلانے کو قابل سزا جرم قرار دینے والے ممالک کو دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے مذہبی جذبات واحساسات اور ان کے ایمان وعقیدت کے مرکز کا احترام کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔

یہ مغرب کی جانب سے اپنے تضادات پر مبنی خود ساختہ نظریات دوسروں پر مسلط کرنے اور دوسروں کے جذبات واحساسات اور دلائل کی رتی برابر پروا نہ کرنے کی انتہائی نامعقول، پر نخوت اور ہٹ دھرمی پر مبنی سوچ کی ایک تازہ جھلک ہے اور جس انداز میں مغربی ممالک نے توہین رسالت کے مرتکب میگزین کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا ہے، اس نے عالم اسلام اور مغرب کے درمیان ایک نئی لکیر واضح کر دی ہے جس کے بعد دنیا میں تہذیبوں کے ہولناک تصادم کا خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔ مغربی ممالک کے سربراہان اگر فرانسیسی جریدے پر ہونے والے حملے کے ساتھ ساتھ اس میگزین اور دیگر مغربی اخبارات وجرائد کی جانب سے بار بار اور دیدہ دانستہ مسلمانوں کی دل آزاری کی بھی مذمت کرتے تو یہ کہنے کی گنجائش بن سکتی تھی کہ مغربی ممالک ہر قسم کے تشدد، انتہا پسندی اور اشتعال انگیزی کے خلاف ہیں۔ ان ممالک نے تو ثابت کر دیا ہے کہ وہ آزادیٔ اظہار کے نام پر دنیا میں نفرتیں پھیلانے والے عناصر کے ساتھ ہیں۔ اب اس کے بعد اس بات کی کہاں گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ صرف مسلمانوں کو ہر قسم کی اشتعال انگیزی ''برداشت'' کرنے کی تلقین کی جائے اور کسی ردعمل کی توقع نہ رکھی جائے۔

جہاں تک فخر موجودات، محسن انسانیت، سرکارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

عظمت جلالت قدر اور رفعت شان کے حوالے سے مسلمانوں کی عقیدت، محبت اور جذبات و احساسات کا تعلق ہے تو اس بابت دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اسلامی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے زوال کا شکار ہونے کے باوجود عشق نبوی ﷺ کی شمع آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں روشن ہے اور گاہے بگاہے وہ بھڑک کر مسلمانوں کے اجتماعی وجود کی زندگی کے اشارے دیتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی لحاظ سے کمزور سے کمزور مسلمان بھی عشق نبوی ﷺ کے معاملے پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتا اور عشق نبوی ﷺ کے تقاضے پر جب بھی کوئی آنچ آتی ہے، ایک مسلمان بے اختیار ہر قسم کی قربانی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مغرب بالخصوص امریکہ کے خلاف نفرت اور اشتعال کے اظہار کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے خیال میں امریکہ ان عناصر کی سرپرستی کر رہا ہے جو اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے وہ مسلمانوں کے عقیدت و محبت کے مرکز پر اوچھے حملے کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ امریکی صدر بارک اوباما کہتے رہے ہیں کہ امریکہ کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ دہشت گردی اور شدت پسندی کو شکست دینے کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں نبرد آزما ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ دنیا میں نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے کوشاں ہے اور ایک عالم گیر صہیونی حکومت کا راستہ ہموار کرنے کے لیے وہ اپنی تمام تر سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی اور ریاست کے دیگر وسائل کو خرچ کر رہا ہے۔ دنیا کے مختلف مذاہب چونکہ بذات خود کوئی نظام زندگی نہیں رکھتے اور وہ چند گنی چنی عبادات اور ظاہری اخلاقیات کے چند اسباق تک محدود ہیں، اس لیے نیو ورلڈ آرڈر یا عالمی صہیونی حکومت کے کار پردازوں کو نہ تو ان مذاہب سے کوئی خطرہ یا خدشہ ہے اور نہ ہی یہ مذاہب عالمگیریت کے نام پر برپا انسانیت کو یرغمال بنانے کی خاطر لڑی جانے والی تہذیبی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی جنگ میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل ہیں۔ ان مذاہب کے بالمقابل اسلام کے ایک مکمل سماجی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، معاشی اور زرعی نظام رکھتا ہے۔ اسلام ایک کامل طرزِ زندگی ہے جس میں قدیم دور کی طرح موجودہ بلکہ مستقبل میں انسانوں کو پیش آنے والے تمام مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ اسلام ایک پیرا ڈائم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کے اپنے تہذیبی اصول اور ان کے معاشرتی ثمرات اور نتائج ہیں جو انسانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں کامل تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ دلائل اور براہین کی جنگ میں اسلام کی فوقیت ماضی کے مانند آج بھی مسلمہ ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ اسلام مخالف عناصر خواہ وہ کسی بھی روپ میں ہوں، اسلام کے مقابلے کے لیے دلائل کی بجائے دیگر حربوں کا سہارا لیتے ہیں۔

حضور رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ مبارکہ میں گستاخی کا ارتکاب دراصل صہیونی اور شیطانی ذہنوں کی شکست ہے۔ اسلام کو سرطان قرار دینے والوں کا اپنا طرزِ عمل دنیا کے لیے یا انسانیت کے لیے کس بھلائی، خیر یا فلاح کا سبب بن رہا ہے؟ یہ بھی کسی ذی شعور سے مخفی نہیں۔ مغربی حکومتیں اگر ذرا بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں تو انہیں ایسے بدقماش عناصر کی پشت پناہی کرنے کی بجائے ان کی سرزنش کے لیے باقاعدہ قانون سازی کرنی چاہیے جو انتہائی منفی اور قابلِ ملامت ہتھکنڈوں کے ذریعے مسلمانوں کے جذبات اور احساسات سے کھیل رہے ہیں۔ انسانی روپ میں شیطنت کے ان نمائندوں کے لیے دلیل کی بجائے آہنی شکنجہ زیادہ سود مند ہے۔ مغربی ممالک اگر ایسے شیطانوں کو ان کی دریدہ ذہنی سے باز نہیں رکھ سکتے تو ان کے پاس یہ کہنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے کہ ان کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر مسلمانوں کو اعتدال میں رہنے کی تلقین کی جاتی ہے جبکہ محسنِ انسانیت حضور رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے بھیانک جرم کے بعد دنیا میں امن، بقائے باہمی اور صلح جوئی کے تمام تر تقاضے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ عالمی انصاف کے علمبرداروں کو یہ حقیقت اچھی طرح جان لینی چاہیے اور عالمی امن و استحکام کو خطرے میں ڈالنے والے اقدامات سے گریز کرنا چاہیے''۔

''آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر فرانسیسی جریدے کی جانب سے توہین آمیز اور گستاخانہ خاکوں کی مکرر اشاعت نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو شدید نفسیاتی کرب اور اذیت میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس اشتعال انگیز عمل کا ردِ عمل کب، کہاں اور کس شکل میں دنیا کے سامنے ظاہر ہوگا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ درست ہوا یا غلط، چارلی ہیبڈو کے دفتر پر ہونے والے حالیہ حملے کے پس پشت دراصل مذکورہ اخبار کی گستاخی اور مسلم دشمنی پر مبنی پالیسی کارفرما تھی۔ دنیا کے انصاف پسند حلقوں اور انسانی حقوق کے علم برداروں کو سنجیدگی کے ساتھ اس صورت حال کا جائزہ لے کر آئندہ کی پیش بندی میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تھا، مگر افسوس عالمی قوتوں نے واقعے کے صحیح نتائج تک پہنچنے کی بجائے اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف روایتی ضد، ہٹ دھرمی، عناد اور بغض کے جذبات و احساسات کے اظہار سمجھ کر ''ہم

سب چارلی‘‘ کا نعرہ بلند کر دیا جو مسلمانان عالم کے زخمی دلوں پر بے رحمانہ نمک پاشی کے مترادف ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ کرہ ارض اس وقت دو انتہاؤں میں منقسم نظر آ رہا ہے۔ ایک طرف وہ عالمی طاغوتی اور صہیونی قوتیں ہیں جو ایک مخصوص سوچ وفکر کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر حملہ آور ہیں تو دوسری جانب دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان ہیں جو ان گستاخانہ حرکات و واقعات سے براہ راست متاثر اور حزن آشنا ہیں۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ دنیا میں انسانی حقوق کی سربلندی، مکالمہ بین المذاہب کی ضرورت اور مختلف مذاہب اور ملتوں کے پیروکاروں کے درمیان رواداری، ہم آہنگی، برداشت، تحمل، امن اور بھائی چارے جیسے فلسفوں کو فروغ دینے کے لیے کوشاں قومیں اور ممالک ہی عدم برداشت، جذبات، سطحیت، غیر سنجیدگی اور ٹکراؤ پر مبنی رویوں اور جذبوں کی آبیاری کر رہے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عالمی برادری کی جانب سے انسان دوستی کے تمام تر دعوے نرے دعوے ہیں اور ان کا واقعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ افسوس ناک صورت حال انسانیت کے مجموعی امن و سکون کی بقا کے لیے کن خوفناک خطرات کا باعث بن سکتی ہے، اس بابت عالمی برادری کو از خود غور وفکر کر لینا چاہیے۔

وقتاً فوقتاً گستاخانہ مواد کی اشاعت اور اس کی پشت پناہی کو دراصل یورپ میں اسلام کی روز بہ روز بڑھتی مقبولیت کے تناظر میں دیکھا جانا بھی ضروری ہے۔ دین اسلام سے خائف کچھ شیطانی قوتیں اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے اس کا راستہ روکنا چاہتی ہیں، کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ اکیسویں صدی کے آخر تک اسلام یورپ کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ چنانچہ عالمی ذرائع ابلاغ اس امر کی تصدیق کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اس وقت مغرب میں اسلام کی روحانی اور آفاقی دعوت پر بڑی تعداد میں لوگ بالخصوص خواتین لبیک کہہ رہی ہیں اور روح کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے اسلام کے چشمہ صافی کی طرف رجوع عام ہو رہا ہے۔ زمینی حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ آخر وہ کون سا سبب ہے جس نے بین الاقوامی برادری کو دین حق کے خلاف برا فروختہ کر رکھا ہے اور اس ضمن میں وہ انسانی قدروں کے ادنیٰ ترین اظہار سے بھی گریزاں اور دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو پرکاہ جتنی اہمیت دینے کی بھی روادار نہیں ہے۔ اس نازک موقع پر مسلم امہ کی قیادت کے عمل کا جائزہ لیا جائے تو سوائے حسرت وندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وقتی

احتجاج، رسمی بیانات، مذمتی قرار داد اور احتجاجی جلسوں کی فرسودہ روایت نے مغرب کے کچھ شریر حلقوں کو اس قدر ہلا شیری دے دی ہے کہ وہ موقع بہ موقع مسلمانوں کے جذبات سے کھیلتے رہتے ہیں جس کے سبب مشتعل مسلم نوجوان اپنی قیادت کے کردار سے مایوس ہو کر انتہائی قدم اٹھانے پر خود کو مجبور پاتے ہیں جبکہ بین الاقوامی طاقتوں کو دہشت گردی کے انسداد کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلم دنیا کی قیادت اہل اسلام کی ترجمانی کے ضمن میں اپنے کردار و عمل کا جائزہ لے اور گستاخانہ خاکوں کے سدباب کی مؤثر تدبیر اختیار کرے، اسی طرح مسلم معاشروں میں پھیلتی ہوئی بے چینی کا خاتمہ ممکن بنایا جا سکتا ہے‘‘۔

’’استنبول میں منعقدہ اسلامی پارلیمانی کانفرنس میں پاکستان نے خاکوں کے خلاف اسلامی پارلیمانی کانفرنس میں قرارداد پیش کر دی۔ قرارداد کے متن میں کہا گیا کہ انبیاء کی حرمت پر حملہ انتہائی نفرت انگیز ذہنوں کی اختراع اور تشدد پر اکسانے کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ قرارداد پیش کرتے ہوئے سپیکر قومی اسمبلی سردار ایاز صادق نے تمام مسلم ممالک کی پارلیمانوں پر زور دیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے خلاف متفقہ لائحہ عمل اپنایا جائے۔ انہوں نے عالمی برادری سے بھی معاملے کا نوٹس لینے کا مطالبہ کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں پیش کی جانے والی قرارداد کا مسودہ 15 جنوری 2015ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں متفقہ طور پر منظور کی جانے والی قرارداد کے مطابق ہے۔ قرارداد میں اقوام متحدہ کے آرٹیکل 20 کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس قسم کے نفرت انگیز اور توہین آمیز مواد کی اشاعت، آزادی اظہار رائے کے بین الاقوامی تسلیم شدہ معیار کی بھی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ قرارداد میں یورپی یونین کے کنونشن کے آرٹیکل 10 کا بھی حوالہ دیا گیا جو انسانی حقوق سے متعلق ہے۔

پاکستان کو دیگر اسلامی ممالک کے ہمراہ مشترکہ طور پر اس حقیقت کو عالمی سطح پر اجاگر کرنا چاہیے کہ مذاہب اور مقدس شخصیات کی توہین اور رائے کی آزادی کا حق دو مختلف معاملات ہیں اور دنیا میں کسی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار کے ذریعے عالمی برادری کے دیگر افراد کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچائے۔ حکومت پاکستان کو بہرطور یہ معاملہ عالمی سطح پر اٹھانا چاہیے کہ محسن انسانیت، فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان جلالت مآب میں گستاخی ایک ایسا قبیح فعل ہے کہ جسے کوئی

مسلمان کسی بھی صورت برداشت کرسکتا ہے نہ ہی اس پر کسی سمجھوتے کی گنجائش دے سکتا ہے۔ مغرب اگر اظہار رائے کی آزادی کے نام پر دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری کرتا رہے گا تو عالم اسلام بھی تحفظ ناموس رسالت ﷺ کی جنگ لڑتا رہے گا۔ مغربی ممالک کی انسان دوستی، انسانی حقوق کے تحفظ سے ان کی دلچسپی، انصاف پرستی اور جمہوریت نوازی کے مظاہر پوری انسانیت عراق اور افغانستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے دوران دیکھ ہی چکی ہے۔ مغرب کو اپنے خودساختہ اور تضادات سے پر نظریات دوسروں پر مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کے معاشی وسیاسی استحصال کے بعد اب اسے ذہنی ونفسیاتی اذیت سے دوچار کرکے اور اس کے ایمان وعقیدے کی اساس پر حملے کرکے دنیا میں امن کا قیام دیوانے کا خواب ہی ہوسکتا ہے“۔ (روزنامہ اسلام کراچی 13، 17، 21 جنوری 2015ء)

شہرہ آفاق ہفت روزہ ”ضرب مومن“ اپنے اداریہ ”احترام مذاہب کے لیے قانون سازی کی جائے“ کے عنوان سے لکھتا ہے:

”یہ امر مسلم ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی کبھی بھی مطلق نہیں رہی۔ حال ہی میں فرانس میں احتجاجی ریلی کے اندر باپردہ مسلمان عورتوں اور راستے میں نماز ادا کرنے والے مردوں کو شرکت سے بزور بازو روکا گیا۔ اس کی تصویریں سوشل میڈیا پر وائرل ہو چکی ہیں۔ کم ازکم ان واقعات سے یہ تو ثابت ہے کہ مغربی اقوام کے یہاں اظہار رائے کے لیے نقاب یا نماز کی حالت مناسب نہیں۔ یہ بھی تو ایک حد بندی ہی ہے۔ پھر مغربی ممالک کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں ”اظہار رائے کی آزادی“ مطلق اور ہر قید سے آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوپ نے واضح طور پر کہا ہے: ”جب میرے قریبی دوست میری ماں کو گالی دیں گے تو وہ مکے کے لیے تیار رہیں“۔ امریکہ میں جہاں ہر امریکی کو اسلحہ رکھنے اور خریدنے کی عام اجازت ہے، وہیں اسے استعمال کرنے کے بارے میں یہ جملہ مشہور ہے: ”آپ کی حدود وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے“۔ کیا مغربی ممالک اپنے تمام فوجداری قوانین کو ختم کردیں گے، کیونکہ کم ازکم ملزمان کی رائے میں وہ ٹھیک نہیں ہوتے؟ کیا فرانس اپنی اقدار کی حفاظت کے زعم میں حجاب پر پابندی لگانے کی کوئی ایسی دلیل دے سکتا ہے جو اظہار رائے کی آزادی کے خلاف نہ ہو؟ کیا غزہ میں اظہار رائے کے ذریعے بننے والی حماس کی جمہوری حکومت کو مسترد کیے جانے کی کوئی معقول وجہ بیان کی جاسکتی ہے جو اس ضابطے کے مطلق ہونے

کے خلاف نہ ہو؟ دنیا بھر میں اپنی اقدار ٹھونسنے کے جذبے اور اظہار رائے کی آزادی میں کیا کھلا تضاد نہیں ہے؟ اگر آنکھیں کھلی اور دل بیدار ہو تو یہ بات بہت واضح ہے کہ اظہار رائے کی آزادی ہمیشہ سے ایک محدود چیز رہی ہے۔ مغربی ممالک ناسمجھی میں اسے مطلق Absolute سمجھ بیٹھے ہیں اور چارلی ہیبڈو جیسے رسالے اس ضابطے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یورپ کی موجودہ روش مسلمانوں کو برانگیختہ کرنے والی ہے۔ مسلمان ایک معتدل مذہب کے قائل ہیں اور ہر بات کو اصول کے تحت حل کرنے کے شوقین ہیں۔ اگر یورپ بات چیت کے ذریعے مسئلے کے حل کی کوشش کرے تو یہ زیادہ مہذبانہ طریقہ ہوگا۔ ورنہ اگر وہ چارلی ہیبڈو جیسے شدت پسندانہ نظریات کے اخبار کی سرپرستی جاری رکھے گا تو مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ علمائے کرام علمی انداز میں سمجھائیں گے۔ مسلم میڈیا معقول انداز میں قائل کرنے کی کوشش کرے گا اور پارلیمانی ارکان اور عوام ریلیاں نکالیں، لیکن اربوں کی آبادی میں کوئی بھی مسلح حملہ کرنے کی کوشش نہ کرے گا، اس کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اپنی اس ضد کی قیمت، یورپ آج بھی یومیہ کروڑوں کے اضافی اخراجات کی صورت میں دے رہا ہے۔ یورپ کو مذاکرات پر آ جانا چاہیے۔ آیئے! بیٹھیں مذہبی شخصیات کے تقدس کا ضابطہ قانون کا حصہ بنا دیں۔ اس سے دنیا میں بدامنی کا ایک بڑا راستہ بند ہو جائے گا۔ دنیا امن کی جانب بڑھے گی۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو یہ معاملہ مسلمانوں کی نظر میں سود و زیاں سوچنے کا نہیں ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی خاطر ہر مسلمان اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے''۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی 23 تا 29 جنوری 2015ء)

اسلام کے خلاف گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے دریدہ دہن فرانسیسی میگزین ''چارلی ہیبڈو'' کے دفتر پر حملے کے بعد پوری دنیا کے کافر متحد ہو گئے۔ اس حملے کو مسلمانوں کی بدنامی کے لیے استعمال کیا گیا۔ المیہ یہ ہے کہ گستاخانہ خاکوں کا دفاع، آزادی اظہار رائے کے نام پر کیا جارہا ہے۔ معروف صحافی اور اینکر پرسن جناب ڈاکٹر عامر لیاقت حسین اپنے گرانقدر مضمون ''تم سب چارلی......ہم سب مصطفائی!!'' میں لکھتے ہیں:

''اظہار رائے کی آزادی''...... کس قدر خوش نما اور دیدہ زیب فلسفۂ حیات ہے۔ البتہ اس کا اطلاق وقت، حالات، ضرورت اور نظریئے کی ''ناگہانی پیدائش'' کے سبب کہیں کچھ ہوتا ہے اور کہیں کچھ...... کائنات کی سب سے عظیم المرتبت ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے

معاملے میں اظہار رائے کی آزادی کے معنی تو یکسر ہی بدل جاتے ہیں ...... ویسے بھی میرے آقا و مولیٰ کا یہ معجزہ تو قابل دید ہی ہے کہ آپ کی ذاتِ عالی شان پر ''اتفاق'' ہمیشہ سو فیصد ہی رہا ہے...... یعنی پروانے و جاں نثار، مٹنے کے لیے سو فیصد تیار اور بدبودار بوجہلی نسلیں اپنی خباثت کے مظاہرے کے لیے سو فیصد تیار...... بے شک یہ آپ ہی کی شان ہے کہ کچھ ''چھپا'' نہیں رہتا بلکہ سب ''ظاہر'' ہو جاتا ہے...... عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا پیمانہ بھی کیا عجیب پیمانہ ہے کہ ''پیمانوں میں ڈوبے ہوئے'' مدہوش بھی یہیں ہوش میں آتے ہیں...... یہ محبت تو ''دائیں'' اور ''بائیں'' کا فرق تک مٹا ڈالتی ہے اور ''اتفاق کی چادر'' کے نیچے سب ہی یوں جمع ہو جاتے ہیں کہ جیسے کبھی جدا ہی نہ تھے...... بالکل اسی طرح میرے نبی سے (معاذاللہ) بغض اور عداوت بھی ہر بدذات، بدراہ، بدعمل، بدباطن، کم نسل، کج قلم، سفلے، فریبی، پلید، نجس، ناپاک اور دریدہ دہن کو جہنم کے حصول پر اکٹھا کر دیتی ہے...... کہ بالآخر ان سے بھی اپنی نسلوں کا پتہ بتائے بنا رہا نہیں جاتا......

کتوں اور سؤروں کے ساتھ منہ مارنے والوں کو تقدیس و تکریم کے اسباق نہیں پڑھائے جاتے، شہوت اور عیاشی کے رسیاؤں کو حدود و قیود کے ابواب نہیں دکھائے جاتے، ترجمانِ زنا و زانی اور مبتلائے لذاتِ نفسانی کو پند و نصائح کے ذریعے سدھارا یا سنوارا نہیں جاتا...... بس اُنہیں اُن ہی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق ''جس شخص میں حیا نہیں پھر وہ جو جی چاہے کرے''...... لہٰذا جو جی چاہیے کیجیے، برہنہ گھومیے یا نوٹوں کو خدا بنا کر انہیں دن رات چومیے، ہماری بلا سے...... مگر...... کچھ سر پھرے اگر اُبل پڑیں تو آبلوں کی شکایت نہ کیجیے...... برسوں کی برداشت کے ''نتائج'' ایسے ہی نکلتے ہیں، آپ اپنے چھل کپٹ سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تو پھر وہ کیسے رُک جائیں جن کے سینوں پر گستاخانہ خاکوں کی چھریاں چل رہی ہیں۔ میرا دین کسی کا خون بہانے کی ترغیب دیتا ہے، نہ اجازت! ہمیں نہیں معلوم کہ 14 افراد کے قاتل کون تھے؟ آیا ہم ہی میں سے تھے یا ''ہمارے جیسے'' بنا کر بھیجے گئے تھے...... اور نہ ہی ہم یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ اس واقعے کی تحقیقات کرنے والے تفتیشی افسر پولیس کمشنر ہیلرک فریڈو نے یکایک خودکشی کیوں کر لی؟ ہم نہیں جانتے کہ حملہ آوروں کے مقاصد کیا تھے؟ اُنہیں کس نے ''مشن'' پر روانہ کیا تھا اور فرار ہوتے ہوئے انہوں نے مسلمان اہلکار پر گولیاں کیوں برسائیں؟...... البتہ اس کے فوراً بعد دنیا بھر

میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی جو فصل کاشت کی گئی ہے، اُسے غلیظ مقاصد کے ہاتھوں سے کاٹنے والے ''اظہارِ یکجہتی'' کی آڑ میں جس طرح لبڑ سبڑ سب کے ساتھ سڑکوں پر نکلے ہیں، اُس سے کم از کم ایک بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ ''دماغ کے کیڑے کوئی نئی بو چھوڑ رہے ہیں''......

40 سربراہانِ مملکت ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کیا چلے کہ کمزور دل والے ہل کر ہی رہ گئے...... بے شک کسی مسلمان کو اُن ''مہلک خاکہ گیروں'' سے کوئی ہمدردی نہیں جنہوں نے انسانیت کے سب سے بڑے ہمدرد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شبیہ مقدس کی پہلے سوچ کر توہین کی اور پھر خاکہ بنا کر اُس خاک کو بھی شرمندہ کر دیا جس نے اُن کی تخلیق میں اپنا ایک حصہ ڈالا تھا...... مگر...... کوئی مسلمان اس امر کا بھی حامی نہیں کہ ایسے بدذاتوں کو قانون کی گرفت میں لائے بنا خود قانون بن کر سزا دی جائے...... پر کیا کیجیے کہ جب قانون دہشت گردی کا محافظ بن جائے اور دل آزاری کو آزادیٔ اظہار کا نام دے کر بین الاقوامی برادری آنکھیں موند لے تو پھر ایسے واقعات کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں !...... ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان ہلاکتوں کے بعد جہاں کارروائی کرنے والوں کے خلاف کارروائی میں مستعدی دکھائی گئی، وہیں دنیا کے پاس یہ ایک بہترین موقع تھا کہ وہ تمام مذاہب کی قابل احترام شخصیات کی ناموس کا ایک ''تین سطری'' بین الاقوامی قانون یہ کہہ کر بنا دیتی کہ ''آج کے بعد کسی بھی پیغمبر، رسول، شعائر، کتب آسمانی، مقدس مقامات اور عبادت گاہوں کی توہین یہاں تک کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کی دل آزاری، خواہ وہ تحریر، تقریر یا تصویر کی شکل میں ہو یا اپنے ذاتی نظریات کی اشاعت یا تشہیر کی صورت...... وہ ایک قابلِ گرفت جرم ہی نہیں ہوگا بلکہ اس کے مرتکب کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلا کر اُسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی تا کہ عالمی امن کو کوئی نقصان نہ پہنچے''...... مگر نہیں صاحب! یہاں تو چھاتی ٹھوک کر اور سینہ کھول کر وہ وہ ''ہستیاں'' میدان میں نکل آئیں جن کی ''استیاں'' شاید گنگا بھی قبول نہ کرے......

سوال یہ ہے کہ آپ نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اُس وقت مظاہرہ کیوں نہ کیا جب آپ ہی کی صفوں میں موجود بعض سربراہان کے اشاروں پر اُن کے یاروں نے عراق اور افغانستان میں دس لاکھ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا...... کیا آپ نے اُن کی یاد میں کبھی دس سیکنڈ کی بھی خاموشی اختیار کی ہے؟ ساٹھ کی دہائی میں خود فرانس نے 15 لاکھ الجزائری باشندوں کا صرف اس لیے قتل کیا کیونکہ وہ اُن پر تسلط قائم کرنا چاہتا تھا...... کیا

فرانسیسیوں نے اُن بے گناہ انسانوں کے قتل پر اسی طرح سڑکوں پر نکل کر مارچ کیا جس طرح اُنھوں نے فرانس کے مختلف شہروں کی شاہراؤں کو چارلی ہیڈ وکی خاطر اپنے وجود سے سمو دیا تھا؟...... زیادہ دور کیوں جاتے ہیں، ابھی حال ہی میں وسطی افریقہ میں ہزاروں مسلمانوں کو ذبح کیا گیا یہاں تک کہ انہیں زندہ آگ میں بھون کر کھایا بھی گیا...... لیکن یہ ''40 مہادیو'' مجھے دنیا کے کسی بھی ملک کی لمبی چوڑی سڑک پر اُن معصوم صفت مسلمانوں کی نسل کشی کے خلاف احتجاج کرتے نظر نہیں آئے...... غزہ کی پٹی پر ہزاروں فلسطینیوں کا صبح و شام شکار کیا جاتا ہے، رمضان المبارک اور عید الفطر کے تہوار اُن کے لیے ایام قتل بن چکے ہیں، ڈیڑھ اور دو سال کے بچوں کے سروں میں گولیاں ماری جاتی ہیں لیکن امن کے یہ پیامبر کبھی اُن بچوں کے لیے تو باہر نہیں نکلے جو موت کے خوف سے ماں کی گود سے بھی اب باہر نہیں نکلتے ہیں...... میانمار میں روہنگیا مسلمانوں کو تاک تاک کر بدھ مذہب کے ''پرامن'' بھکشوؤں نے شہید کیا اور اُن پر جینے کے لیے زمین تک تنگ کر ڈالی مگر وہ چالیس زبانیں خاموش رہیں جو پیرس میں قینچی کی طرح چل رہی تھیں...... مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج تقریباً ہر روز انسانیت کو پامال کرتی ہے، وعدہ خلافی کی ارتھیاں نکالتی ہے اور سفاکیت کی پوجا کرتی ہے تاہم اس ظلم کے خلاف بڑے چہروں کی چھوٹی زبانیں آج بھی گنگ ہیں...... کاش کہ آپ اسلام اور مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کے بجائے صرف ایک بار اپنے اندر جھانک کر دیکھ لیتے کہ آپ کے اصل دشمن ہم مسلمان نہیں بلکہ آپ کے اندر اسلام کے خلاف پلتا ہوا غصہ، مذہبی برتری کا غصہ، تیل کے کنوؤں پر قبضے کا لالچ اور پیغمبر اسلام سے (نعوذ باللہ) نفرت آپ کے سب سے بڑے دشمن ہیں......

اچھا کیا جو آپ سب نے اپنے آپ کو چارلی کہہ دیا، جذبات میں دل سے سچی بات نکل ہی گئی، غیر اِرادی طور پر آپ نے بہرحال اپنی کدورت کا اشتہار چھاپ ہی ڈالا کہ رسول اللہ ﷺ اور اسلام کا دشمن صرف چارلی ہیبڈو نامی عامیانہ اور گھٹیا جریدہ نہیں بلکہ ہم سب چارلی ہیں...... ہم سب برداشت کے بے رحم دشمن اور دل آزاری کے پرجوش حامی ہیں، آپ کو آپ کا یہ اصل روپ مبارک ہو لیکن اِس اہم اطلاع کے ساتھ کہ ''آپ تو دو دن پہلے ہی چارلی بنے ہیں، پر ہم کل بھی مصطفائی تھے، آج بھی مصطفائی ہیں اور انسانیت پر آقا ﷺ کے ایک ایک احسان کی قسم، ہم یونہی مصطفائی رہیں گے...... تو پھر طے ہوا کہ آج سے تم سب چارلی، ہم سب مصطفائی......!!!'' (روزنامہ جنگ لاہور، 16 جنوری 2015ء)

مغرب کی عجیب منطق ہے کہ وہ آئے دن آزادی اظہار رائے کو بنیاد بنا کر دنیا میں بسنے والے سوا ارب مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتا ہے۔ یہ اسلام دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟ پروفیسر شمیم اختر اپنے مضمون ''صلیبی جنگ: تہذیبوں کا تصادم'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''اب جبکہ یورپ اور امریکہ نے کھل کر اسلام دشمنی کا اعلان کر دیا ہے تو مسلم حکمرانوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ کسی کو کہنے کی جرأت نہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ مسلم امہ کی غیرت، حمیت، دین اور ایمان پر حملہ ہے جس کے خلاف 56 ریاستوں کے سربراہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہیں، اگر فرانس کے دارالحکومت پیرس میں چالیس ممالک کے حکمران شریک ہو سکتے ہیں تو مکہ معظّمہ، تہران، بغداد، قاہرہ، اسلام آباد، ڈھاکا، جاکرتا، ملیشیاء، برونائی اور کابل میں 56 ریاستوں کے سربراہان کیوں نہیں جمع ہو سکتے؟ اگر صلیبی ٹولہ اہانت رسول پر متحد ہو گیا ہے تو کیا مسلم حکمران اہانت رسول کے خلاف متحد نہیں ہو سکتے؟ ہمارا موقف کسی کی ذہانت نہیں بلکہ اہانت کے سدباب پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت اخلاقی ہے۔ ہم اسلام سمیت کسی بھی مذہب کے مقدس پیشوا کی اہانت کو قانونی اور اخلاقی جرم سمجھتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ بین الاقوامی میثاق برائے شہری و سیاسی حقوق کی ان شقوں پر سختی سے عملدرآمد کیا جائے جو نفرت، اشتعال انگیزی اور دل آزاری کو ممنوع قرار دیتی ہیں۔ کیا یہ مطالبہ درست اور معقول نہیں ہے؟ پھر اس پر عملدرآمد میں کیسی ہچکچاہٹ؟ کیا اسلامی ممالک کی تنظیم دوسرے تمام مذاہب کے پیشواؤں سے مل کر کوئی ایسا ضابطۂ اخلاق وضع نہیں کر سکتی جو ایک دوسرے کے عقائد اور پیغمبروں کے باہمی احترام پر مبنی ہو اور اس مسودے کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کیا جائے؟ یا غیر سرکاری سطح پر مختلف مذاہب کے رہنما مندرجہ بالا خطوط پر ایک عالمی ضابطۂ اخلاق مرتب کریں اور اپنی اپنی برادری کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کریں۔ اس ضمن میں ایک مشترکہ کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جو مختلف مذاہب کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور اس بات کو یقینی بنائے کہ کسی جانب سے کسی مذہب یا فرقے کے خلاف تضحیک، اشتعال و دل آزاری نہ کی جائے۔ نہ ہی میڈیا میں کوئی ایسا مواد شائع ہو جو دوسرے مذہب یا مسالک کے خلاف نفرت یا اشتعال پھیلائے۔

اگر ایسا نہیں ہوا اور شارلی والی ہرزہ سرائی جاری رہی تو اس کے ردعمل پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ یہ جریدہ نفرت اور اشتعال پھیلانے پر مصر ہے تو یاد رہے کہ جہاں جہاں یہ توہین

آمیز خاکے تقسیم یا فروخت کیے جائیں گے، وہاں امن وامان کا مسئلہ ضرور پیدا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علی بابا چالیس چور کی کہانی دہرائی جائے۔ یہ چالیس حکمران کہاں اور کب تک شارلی کا چالیسواں منائیں گے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز کارٹونوں کے جواب میں کارٹون شائع کرنے والوں کے دین، ان کے مذہبی پیشواؤں کے بھی ویسے ہی یا اس بھی زیادہ اہانت آمیز خاکے نہ شائع ہوں۔ ہم صلیبی صہیونی ٹولے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کے خاکے بنانے کے ان کے ناقابل برداشت جرم کے باوجود مسلم امہ کے کسی فرد سے یہ گناہ کبیرہ ہرگز سرزد نہیں ہوگا کہ وہ حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کے تضحیک آمیز خاکے بنائے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ سارے نبی ہمارے نبی بھی تو ہیں۔ ہم ان کی شان میں گستاخی کا تصور بھی گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ ہماری اس مجبوری کو سمجھتے ہیں، جبھی تو وہ سرکار دو جہاں ﷺ کی شان میں بار بار گستاخی کرتے ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمان اشتعال میں آکر شاتم رسول اور گستاخ نبی کی گردن زدنی تو کرسکتا ہے لیکن وہ ان کے (جو ہمارے بھی ہیں) نبیوں کے ناموس کی حفاظت کرتا رہے گا''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 15 جنوری 2015ء)

مغربی دنیا میں آزادی اظہار کے نام پر ہر تھوڑے دنوں بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت حضور نبی کریم ﷺ کے گستاخانہ خاکے شائع کر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے والی اشتعال انگیز کارروائیوں کا سلسلہ پچھلے کئی برسوں سے جاری ہے۔ مئی 2015ء میں امریکی ریاست ٹیکساس میں گستاخانہ خاکوں کی نمائش اور انعامی مقابلے کی شکل میں عمل میں لائی گئی۔ اس پر مقامی مسلمان آبادی میں فطری طور پر شدید غم وغصہ اور اشتعال پیدا ہوا۔ نمائش کے اختتام پر دو مسلح افراد نے شرکاء پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر محافظوں نے جوابی فائرنگ کر کے انہیں موقع پر ہی ختم کر دیا۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان کا تبصرہ اس واقعے پر یہ ہے کہ ''آزادی اظہار کے خلاف پرتشدد کارروائیوں کا کوئی جواز نہیں، آزادی اظہار کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیے حتیٰ کہ اگر وہ قابل اعتراض ہو تب بھی اس کے خلاف حملے کی گنجائش نہیں''۔ مسلمانوں کی دل آزاری پر مبنی کارروائیوں کے حوالے سے مغربی پالیسی سازوں کا عمومی طرز استدلال یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پالیسی سازوں نے ہر معاملے میں دہرے معیارات اپنا رکھے ہیں۔ دنیا کے ڈھائی ارب مسلمانوں کی مقدس ترین ہستی کے

معاملے میں وہ آزادی دشنام کو بھی آزادی اظہار قرار دیتے ہیں لیکن یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے افسانے یا ملکہ برطانیہ کے خلاف ایک لفظ بھی ان کے نزدیک شجر ممنوعہ ہے۔ یہ دہرے معیارات ہی عالم اسلام اور مغرب میں مسلسل فاصلے بڑھانے کا سبب بنے ہوئے ہیں جس کی بناء پر عالمی امن کا قیام مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

جناب ڈاکٹر حسین احمد پراچہ اپنے کالم ''صرف مسلم کا محمد ﷺ پہ اجارہ تو نہیں'' میں مغرب کے دوہرے معیار اور منافقت پر مبنی ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں:

''جناب ساقی فاروقی ایک ممتاز شاعر اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ وہ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں جس زمانے میں یورپ میں سلمان رشدی کی دل خراش کتاب ''شیطانی آیات'' کا چرچا تھا، اُن دنوں ساقی فاروقی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ ساقی فاروقی خود کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی کوتاہ عمل بلکہ بے عمل مسلمان ہیں مگر وہ سرکار دو جہاں مصطفیٰ ﷺ کے غلام ہیں۔ ساقی فاروقی لندن کے ایک جریدے کے زیر اہتمام انگریزی زبان کے ایک ادبی حلقے کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ایک روز ساقی فاروقی لندن کے اس انگریزی ادبی حلقے میں ان ادیبوں کے عقائد کے بارے میں ایک انتہائی گستاخانہ نظم برائے تنقید لکھ کر لائے۔ جب انہوں نے لبرل برطانوی شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں یہ نظم پڑھنا شروع کی تو اُن کی جبینیں شکن آلود ہو گئیں۔ انگریز سامعین سے کچھ نے اس نظم کو شر انگیز قرار دیا اور کچھ نے اسے انتہائی قابل مذمت گردانا اور بہت سے سامعین غصے میں لال پیلے ہو کر آداب محفل کو روندتے ہوئے مجلس سے واک آؤٹ کر گئے۔ مجلس کے اختتام کے بعد ساقی فاروقی نے جریدے کے مدیر کو تاکید کی کہ وہ فوری طور پر اسے اپنے رسالے میں شائع کرے۔ لبرل ایڈیٹر نے توہین والی اس نظم کو اپنے جریدے میں شائع کرنے سے معذرت کی اور کہا کہ ہم اپنے قارئین کے جذبات مجروح کرنے والی نظم شائع نہیں کر سکتے۔ ساقی فاروقی نے ایڈیٹر سے کہا کہ تم لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہم اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپ کے عقائد کی عزت و تکریم کرتے ہیں مگر تمہارے متعصب دوستوں کو بات سمجھانے کے لیے مجھے یہ افسوسناک حرکت کرنا پڑی۔ تم چند سو قارئین کے جذبات تو مجروح نہیں کرتے مگر کروڑوں مسلمانوں کے جذبات مجروح کرتے ہوئے تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی''۔ (روزنامہ جنگ لاہور، 22 جنوری 2015ء)

عالم اسلام پیرس کے واقعے پر مغرب کے رنج والم کے جذبات کو سمجھ سکتا ہے لیکن

سوال یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے ایک تواتر کے ساتھ پیغمبر اسلام رحمت دو عالم حضور احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات والا صفات کی شان میں گستاخی کر کے ایک ارب 50 کروڑ سے زائد مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کرنے اور ان کے جذبات مجروح کرنے کا سلسلہ کیوں جاری ہے اور مغرب اور امریکہ کی حکومتیں اس معاملے کو سنجیدگی سے حل کرنے پر توجہ کیوں نہیں دے رہیں؟ مغرب کو اس امر کا ادراک ہونا چاہیے کہ پیغمبر اسلام، محسن انسانیت، فخر موجودات، رہبر عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان جلالت مآب میں گستاخی ایک ایسا قبیح اور رزیل ترین فعل ہے جسے کوئی مسلمان کسی بھی صورت برداشت کر سکتا ہے نہ ہی اس پر کسی سمجھوتے کی گنجائش دے سکتا ہے۔ مسلمان گزشتہ 3 عشروں سے مختلف عالمی فورموں پر یہ مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ آزادئ اظہار کے نام پر فکری دہشت گردی کا سلسلہ روکا جائے اور تمام انبیاء کرام اور برگزیدہ ہستیوں کی توہین کو جرم قرار دے دیا جائے لیکن مٹھی بھر یہودیوں کی خوشنودی کی خاطر ''ہولوکاسٹ'' کے افسانے پر سوال اٹھانے کو جرم قرار دینے والے مغربی ممالک مسلمانوں کے اس جائز مطالبے پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہیں اور کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جب دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی خبیث الباطن شخص کی جانب سے کائنات کی سب سے مقدس ومحترم ہستی اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کی توہین کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو جبکہ دنیا کا کوئی قانون کسی کو کسی عام انسان کی بھی توہین وتنقیص کا حق نہیں دیتا۔ جب مسلمانوں کی جانب سے توہین رسالت کے مسلسل واقعات کی روک تھام کی بات کی جاتی ہے تو مغرب اور مغربی آلہ کار عناصر الٹا مسلمانوں کو برداشت، تحمل اور رواداری کا سبق پڑھانے لگتے ہیں اور خود انہیں مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کی زبانی کلامی مذمت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس حقیقت سے دنیا کا کوئی باشعور شخص ناواقف نہیں ہے کہ مذاہب اور مقدس شخصیات کی توہین اور رائے کی آزادی کا حق دو مختلف معاملات ہیں اور دنیا کے کسی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار کے ذریعے کسی کے جذبات واحساسات کو ٹھیس پہنچائے، ان کی حق تلفی کرے اور انہیں شدید غم وغصے کی کیفیات سے دوچار کر دے۔

''فرانس میں ملعون جریدے پر حملہ، گستاخانہ خاکوں کا ردعمل'' کے عنوان سے جناب اشتیاق بیگ لکھتے ہیں:

”یہ بات قابل ذکر ہے کہ پیرس میں ہونے والے واقعہ میں ملوث حملہ آور فرانس میں ہی پیدا ہوئے اور انہوں نے کسی مدرسے سے نہیں بلکہ فرانسیسی اسکولوں سے تعلیم حاصل کی جبکہ وہ حلیے سے بھی ماڈرن دکھائی دیتے تھے۔ فرانس میں پیش آنے والے واقعہ کی وجوہات جاننے کے لیے ہمیں فرانسیسی حکومت کی ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویئے پر نظر دوڑانا ہوگی جنہیں فرانس میں مذہبی آزادی حاصل نہیں۔ فرانس کی حکومت نے مسلمان لڑکیوں کے اسکارف اوڑھ کر سکول و کالج جانے اور مسلمان خواتین کے حجاب پر پابندی عائد کر رکھی ہے جس کی خلاف ورزی کی صورت میں انہیں گرفتار، جرمانہ اور ملازمت سے برطرفی کی سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ یورپی باشندے گزشتہ ایک دہائی سے اسلام فوبیا کا شکار ہیں جن کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ دین اسلام، یورپی قدروں کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں ہر ہفتے اسلام مخالف مظاہرے، سوئیڈن میں مساجد اور فرانس میں اسکارف اوڑھے مسلمان خواتین پر حملے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ مغرب کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اسلام کے سونامی کو نہ روکا گیا تو اس کے خلاف بند نہ باندھا گیا تو ایک دن یہ مذہب پورے مغرب کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا، اس لیے مغربی ممالک مسلمانوں کے خلاف امتیازی قوانین بنانے سمیت ہر وہ اقدامات کر رہے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی پیشرفت روکنے میں مددگار و معاون ثابت ہوسکیں۔ فرانس میں پیش آنے والا حالیہ واقعہ اپنی نوعیت کا نہ ہی پہلا اور نہ آخری واقعہ ہے، مغربی میڈیا جب بھی حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوگا، اس طرح کے واقعات پیش آتے رہیں گے کیونکہ کوئی بھی مسلمان خواہ وہ کتنا ہی لبرل کیوں نہ ہو، اپنے ماں باپ کی بے عزتی تو شاید برداشت کر لے مگر نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پیرس جیسے واقعات کے سدباب کے لیے مغربی ممالک بالخصوص فرانس، مسلمانوں کے خلاف اپنے رویئے پر نظر ثانی کرے اور ایسے قوانین وضع کرے جن کی رو سے کسی بھی مذہب یا پیغمبر کی توہین کو بین الاقوامی جرم قرار دیا جائے تاکہ کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کی دل آزاری نہ ہو اور ایسے اشتعال انگیز واقعات تہذیبوں کے مابین نفرت کا سبب نہ بن سکیں“۔ (روزنامہ جنگ لاہور، 14 جنوری 2015ء)

مغرب جو سب سے زیادہ مہذب اور انسانی حقوق کے چیمپیئن ہونے کا اعلان کرتا

ہے، اسے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا قطعاً شعور نہیں۔ اسے کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کرنے اوران کے جذبات مجروح کرنے میں لطف آتا ہے۔ اب وہ ان کی اخلاقی ودینی اقدار پر حملہ آور ہوکر فخر محسوس کر رہا ہے۔ معروف صحافی ودانشور جناب عابد محمود عزام اپنے گرانقدر مضمون ''ہالینڈ میں بھی حجاب پر پابندی!'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ہالینڈ میں عوامی مقامات پر حجاب پر لگائی گئی پابندی سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب دین اسلام کی تعلیمات کی اثر پذیری سے انتہائی خوفزدہ ہے۔ ہالینڈ حکومت کے نئے احکامات کے مطابق عوامی ٹرانسپورٹ، اسکولوں، اسپتالوں اور سرکاری دفاتر میں چہرہ ڈھانپنے پر پابندی ہوگی اور اس میں نقاب کے علاوہ اسکینگ کے لیے پہنے جانے والے ماسک اور ہیلمٹ بھی شامل ہوں گے۔ خلاف ورزی کرنے والی خواتین کو تین سو پاؤنڈ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ حجاب کرنا مسلم خواتین کا مذہبی معاملہ ہے جس کے دفاع کا ان کو مکمل حق حاصل ہے اور وہ اس پر کوئی سمجھوتا بھی نہیں کرسکتیں، یہ جانتے ہوئے بھی ہالینڈ کابینہ کا نقاب پر پابندی لگانے کی منظوری دینا اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے بوکھلاہٹ کا کھلا اظہار ہے۔ ہالینڈ کے وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ اس پابندی کا مقصد کسی مذہب سے امتیازی سلوک برتنا نہیں ہے لیکن یورپ میں مجموعی طور پر مسلم خواتین کے ساتھ روا رکھا جانے والا رویہ وزیر اعظم کے بیان کی توثیق نہیں کرتا۔ یورپ کے متعدد ممالک میں ایک عرصے سے حجاب پر پابندی کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں جبکہ بیلجیئم اور فرانس میں تو حجاب پر پابندی عائد بھی کی جا چکی ہے اور مغربی یورپ میں اٹلی اور سوئٹزر لینڈ میں بھی برقعہ پر پابندی کے حوالے سے بھرپور تحریک چلائی گئی ہے۔ یورپ کے متعدد ممالک میں وقتاً فوقتاً خواتین کے حجاب کو ٹارگٹ کیا جاتا ہے۔ یورپ خواتین کی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار بنا پھرتا ہے۔ لیکن اسلام دشمنی کے سمندر میں غرق حجاب کے مخالفین کو خواتین کی آزادی کے خود سے بنائے فارمولے بھی یاد نہیں رہے۔ نقاب پر پابندی عائد کر کے خواتین کو آزادی دینے کی بجائے معاشرتی زندگی سے ہی نکال کر دیا گیا ہے اور آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے ہی آزادی سلب کر لی ہے۔ ماضی میں ہالینڈ کی حکومت کی جانب سے حجاب پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کو ملک کے آئین میں مذہبی آزادی کی شقوں سے متصادم قرار دیا جا چکا ہے اور یہ پابندی یورپ کے انسانی حقوق کے معیارات اور خاص طور پر کسی کی نجی زندگی اور ذاتی شناخت کے احترام کے بھی منافی ہے لیکن اس کے

باوجود تعصب کی بھٹی میں جلنے والوں نے حجاب پر پابندی لگا کر اپنے ہی بنائے گئے تمام قوانین کو بری طرح روند ڈالا ہے۔

مغربی ممالک میں طویل عرصے سے اسلامی شعار کو تنقید کا نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ درحقیقت اسلام دشمنوں کی طرف سے اٹھائے گئے اسلام مخالف اقدامات مغرب میں اسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کا راستہ روکنے کی ناکام کوششیں ہیں۔ مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے جس سے اسلام دشمنوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں کی بڑھوتری کا یہی خوف، بیمار ذہنوں کو اسلام دشمنی پر اکساتا ہے لیکن دشمنوں کی تمام تر کوششیں ماضی میں بھی نامراد لوٹی ہیں اور مستقبل میں بھی انہیں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان یورپ میں اجنبی تھے لیکن آج اسلام پورے یورپ میں بڑے جوش وخروش سے پھیل رہا ہے، اسلامی لٹریچر تقسیم ہو رہا ہے اور لوگ قرآنی تعلیمات، حقائق، سچائی اور دلائل پر مبنی ریسرچ اور تحقیق کے بعد جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ نائن الیون کے بعد صرف برطانیہ میں لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ لوگ اپنا پرانا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور رپورٹ کے مطابق ہر سال تقریباً **5200** افراد دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ قابل ذکر وقت گزارا اور ان سے متاثر ہوئے۔

یورپ میں اچھی خاصی تعداد ان نومسلموں کی بھی ہے جو مسلمان تو ہو چکے ہیں مگر انگریزی رسم و رواج کی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے کیونکہ انگریزی سماج آج بھی اسلام قبول کرنے والوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انتہا پسند اور متعصب مغربی افراد کی سرپرستی میں میڈیا چند افراد کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتا نہیں تھکتا۔ مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا تعصب برتا جاتا ہے لیکن ان تمام سختیوں اور پروپیگنڈے کے باوجود اسلام یورپ میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنا راستہ بناتا جا رہا ہے۔ اسلام کی اس مقبولیت سے اہل مغرب خاصے پریشان دکھائی دیتے ہیں، اسی لیے آئے روز اسلام دشمن باولے لوگ یورپ میں اسلام کی توہین پر اتر آتے ہیں۔ کبھی نعوذ باللہ دنیا کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید کو آگ لگا کر اپنے بغض کا اظہار کیا جاتا ہے اور کبھی خانہ کعبہ و مدینہ منورہ پر حملے کی دھمکیاں

دی جاتی ہیں۔کبھی مساجد کے مینار گرانے، مساجد کو مسمار کرنے اور مساجد کی تعمیر پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور کبھی حجاب پر پابندی لگا کر مسلمانوں کو ستایا جاتا ہے۔مغربی ممالک میں مسلم برداری کے خلاف حملوں کا بڑھتا ہوا رجحان بھی یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔

اسلام امن وآشتی اور انسانیت کی بھلائی کا درس دیتا ہے، اسی عالمگیر سچائی کی جانچ پڑتال کے بعد یورپ میں اسلام کے دامن عافیت میں پناہ لینے والوں کی اکثریت مشہور و معروف اور پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ہے۔دو سال قبل اسلام قبول کرنے والے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے فلپائن کے شہرہ آفاق گلوکار فریڈی ایگوئکر، عرب ٹیلنٹ ایوارڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے والی امریکی پاپ گلوکارہ 23 سالہ جنیفر گراوٹ، جرمنی کی طرف سے تھائی لینڈ میں بطور سفیر کام کرنے والی یاسمین، فرانس کی معروف گلوکارہ میلنئی جارجیا دیس المعروف دیام، فتنہ فلم کے پروڈیوسر ارناوُڈ فانڈورن نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ اسلام کے مکمل مطالعہ کے بعد ہم نے اسلام قبول کیا۔ یورپ میں ہی باکسر محمد علی، ایوان ریڈلی مریم، محمد یوسف مبلغ یورپ، سمیرا نامی معروف عیسائی رہنما، ڈاکٹر ولیمز، برطانوی ماڈل کارلے والس اور معروف پاپ سنگر مائیکل جیکسن کے ایک بھائی اور بہن سمیت سیکڑوں معروف افراد نے مختلف ادوار میں اسلام کی ابدی صداقت اور حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کیا، لیکن پھر بھی یورپ کے عیار و شاطر قسم کے لوگ زبردستی اسلام قبول کروانے کا الزام لگا کر مختلف حیلوں سے مسلمانوں کو تنگ کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف قوانین منظور کروانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں، لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام دشمنوں کے مقدر میں ذلت لکھ دی گئی ہے۔ وہ جب اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر کے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تب تب قدرت لوگوں کو اسلام کے مزید قریب کر دیتی ہے"۔(روزنامہ اسلام کراچی 4 جون 2015ء)

جناب عبداللہ اپنے مضمون "حجاب کا پس منظر" میں لکھتے ہیں:

"عالم اسلام کے دانشور کہہ رہے ہیں کہ مغرب اور اس کے متعصب میڈیا کا یہی وہ دوغلا کردار ہے جس نے دہشت گردی کو جنم دیا ہے۔ یہی وہ ناانصافی ہے جو نوجوانوں کو ردعمل پر ابھارتی ہے۔مغرب کا یہی وہ رویہ ہے جو بین المذاہب رواداری کے دعووں کی قلعی کھول رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ بین المذاہب مکالمے کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے تو دوسری طرف وہ ایسے کام کر رہا ہے

جو رواداری کے منافی ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے لیے انصاف کے پیمانے الگ الگ ہیں۔

2007ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے ہرزہ سرائی کی تھی: ''مسلمان عورتوں کی طرف سے پہنا جانے والا نقاب باہمی تعلقات کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے''۔ جرمنی میں بھی حجاب سے متعلق ایک مہم جاری ہے۔ اس کی کئی ریاستوں میں پابندی لگ چکی ہے۔ جرمنی کی 9 ریاستوں میں مسلم استانیوں کو تعلیمی اور دیگر اداروں میں حجاب پہن کر آنے سے روک دیا گیا اور طالبات سے کہا گیا اگر وہ تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہیں تو اسکارف اتار کر سکول آیا کریں حالانکہ یہ وہی جرمنی ہے جس کے آئین کے مطابق جرمنی میں رہائش پذیر ہر فرد کو اس کے مذہبی شعائر کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کرنے کی پوری پوری اجازت ہے۔

آسٹریلیا نے بھی مسلمان عورتوں کے اسکارف اور پردے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اسے سکولوں میں طالبات کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ ناروے میں بھی حجاب پر پابندی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بلجیم میں پردے پر مخالفین کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جاپان وغیرہ میں اسکارف پر پابندیاں عائد کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ حاصل یہ کہ پوری دنیا میں مسلمان خواتین کے پردے اور حجاب پر مغربی دنیا سراپا احتجاج ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف ایک حجاب اور پردے پر قیامت کیوں ٹوٹ رہی ہے؟ ہر جگہ حجاب ہی موضوع کیوں ہے؟ تو قارئین! حجاب پر پابندی کے دو پہلو نمایاں ہیں۔ پہلا پہلو کاسمیٹکس انڈسٹری اور اس کے پیچھے سرمایہ دار یہودی سود خور طبقہ ہے۔ پوری دنیا میں زیب و زینت، آرائش حسن اور فیشن کے حوالے سے بہت بڑی انڈسٹری ہے جس کے کاریگر اور ماہرین کروڑوں کی تعداد میں اپنی مصنوعات بازار میں لے کر آتے ہیں۔ ہم یہاں صرف بالوں کے حوالے سے مصنوعات کا ذکر کریں گے۔ دنیا میں اس وقت لاکھوں کی تعداد میں بیوٹی پارلر اور سیلون کھلے ہوئے ہیں جہاں خواتین کے آرائش گیسو کا کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں یہ بیوٹی پارلر موجود نہ ہوں۔ ان پارلروں کی پشت پر ان مصنوعات پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہاں کون کون شخص مالا مال ہو رہا ہے۔ بالوں کو ریشمی، چمکدار اور خوشنما بنانے کے لیے ہزاروں طرح کے شیمپو ہیں جو مختلف فرمیں لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتی ہیں۔ بالوں کو مختلف قسم کے حسب خواہش رنگنے کے لیے بے شمار ہیئر کلر ہیں۔ یہ مستقل رنگنے کے لیے بھی ہیں، عارضی طور پر رنگنے کے لیے بھی۔ آپ کسی پارٹی میں کپڑوں

سے ملتا جلتا بالوں کا رنگ بنانا چاہیں تو آپ کو ایسے ہیئر اسپرے میسر آجائیں گے جو قیمتی بھی ہوں گے اور دھونے سے صاف بھی ہو جائیں گے۔

بال گھنگھریالے ہوں تو ان کو سیدھا کرنے کی مشینیں مختلف فیکٹریاں تیار کرتی ہیں اور سیدھے بالوں کو گھنگھریالا بنانے کے لیے الگ مشینیں ہیں۔ بالوں کو خشک کر کے ایک طرف اور ایک انداز میں موڑنے کے لیے، طرح طرح کے کنڈیشنر، **Gell** اور مختلف ساز و سامان ملتے ہیں۔ بے شمار قسم کی کریمیں جو اربوں ڈالر کما کر مغرب میں لگی ہوئی فرموں کے مالکان کی جیبیں بھرتی ہیں۔ اس وقت اس کے کاروبار سے **37** ارب ڈالر ہر سال کمائے جا رہے ہیں۔ مغرب کو یہ پردہ اور حجاب اس لیے ایک ایٹم بم کی طرح لگتا ہے کہ یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اب عورت نمائش نہیں بنے گی۔ اگر وہ نمائش نہ بنے گی تو ہزاروں بلکہ لاکھوں سرمایہ داروں کے ذریعہ آمدنی پر لات ماری جائے گی۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سب مل کر اس حجاب پہننے والی کو دہشت گرد نہ کہیں۔

یہ ایک پہلو ہے جبکہ حجاب پر پابندی کا دوسرا پہلو اسلامی ہے۔ وہ شعائر اسلام کی تضحیک کر کے مسلم نوجوان نسل کو ان کی سنہری روایات، تہذیب و ثقافت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی اصل تعلیمات بھول چکے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ہو جائیں۔ جس طرح مغرب میں ماں، بہن اور بیٹی کا تقدس پامال وہ چکا ہے، اسی طرح مسلم معاشرہ بھی ہو جائے۔ جس طرح مغرب میں حسب نسب ختم ہو چکا ہے، اسی طرح مسلمانوں کا خاندانی نظام کا بھی تیا پانچہ ہو جائے۔ جس طرح وہاں حلال وحرام میں تمیز اور جائز و ناجائز میں فرق نہیں رہا، اسی طرح مسلمان بھی یہ نہ پوچھیں کہ یہ حلال ہے یا حرام''؟
(ماہنامہ پولیٹکل سین مئی **2017**ء)

1930ء میں فرانس نے الجزائر پر اپنے قبضے کا سو سالہ جشن منایا اور ساری دنیا کے سامنے کہا کہ یہ جشن الجزائر میں ''اسلام کا جنازہ'' ہے۔ الجزئر کے لوگ اب فرانسیسی معاشرے میں ڈھل جانے کے قابل ہو گئے ہیں، اس کی دلیل کے طور پر فرانسیسی عہدہ داروں نے ایک ریلی کا اہتمام کیا اور اعلان کیا کہ الجزائری لڑکیاں مغربی لباس میں شریک ہوں گی اور اس کا خرچہ فرانس برداشت کرے گا۔ اس کام کے لیے فرانس کے ایک مذہبی پیشوا ''لاکوسٹ'' کو ذمہ داری سونپ دی گئی کہ وہ ان چند لڑکیوں کی تربیت کرے۔ اس ریلی میں اسلامی دنیا میں

یورپی استعمار کے کئی ایجنٹ بھی شریک ہوئے تاکہ دوسرے ممالک میں بھی الجزائر کے طرز پر مغربی تہذیب کو عام کیا جائے۔ یہ ریلی ایک تھیٹر سے شروع ہو رہی تھی جہاں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔لڑکیوں کو ریلی میں شامل کرنے کے لیے جب پردہ اٹھایا گیا تو شرکا خصوصا فرانسیسیوں پر بجلی گری جب انہوں نے یہ دیکھا کہ خلاف توقع وہ سب لڑکیاں حجاب پہن کر نکلیں!! اس سے فرانسیسی میڈیا میں ایک بحث شروع ہوگئی کہ ایک صدی تک فرانس، الجزائر میں کیا کرتا رہا؟! جب ''لاکوسٹ'' سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے یہ تاریخی جملہ کہا ''میں کیا کر سکتا ہوں، قرآن فرانس سے زیادہ طاقتور ہے''۔

دنیا میں سیکولرازم کے بڑے بڑے دعویدار ممالک کے جھنڈوں میں مذہبی علامت صلیب کی موجودگی سیکولرازم کی حقیقت واضح کرتی ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک میں فرد کی آزادیٔ اظہار محض ڈھونگ اور منافقانہ عمل ہے۔ اگر مغرب میں فرد کو ہر قسم کی بات کہنے کی آزادی ہے تو اِسی آزادی کے نام پر جب وہاں بسنے والی مسلمان خواتین اجتماعی طور پر یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم حجاب بھی کریں گی اور برقع بھی پہنیں گی تو مغرب انہیں یہ آزادی دینے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ برقع اور حجاب استعمال کرنے والی مسلمان مستورات کو ریاستی پولیس تنگ کیوں کرتی ہے؟ اُن کے خلاف مقدمے کیوں بنائے جاتے ہیں؟ جون 2015ء میں چاڈ کے وزیر اعظم کلویوبی فیمی ڈیوبیٹ (Kalzeube Pahimi Deubet) نے برقعے پر پابندی عائد کرتے ہوئے سیکیورٹی فورسز کو حکم دیا کہ مارکیٹوں سے برقعوں کو قبضے میں لیکر نذر آتش کر دیں۔ برقع پہننے پر پابندی کا اطلاق نہ صرف عوامی مقامات اور سکولوں پر بلکہ پورے ملک پر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے کسی بھی قسم کے لباس جو آنکھوں اور چہرے کو کیمو فلاج کر دے، کے استعمال پر مکمل پابندی ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو خاتون برقعے میں نظر آئے گی، اسے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگست 2013ء میں لندن کی ایک عدالت میں ایک برطانوی جج نے برقعہ پوش مسلم خاتون کو عدالت میں داخل ہونے اور اس کا مقدمہ سننے سے انکار کر دیا۔

پروفیسر سید اسرار بخاری لکھتے ہیں: ''برطانیہ کا بہت نام سنا تھا انصاف کے حوالے سے اور چرچل نے تو عدلیہ کو برطانیہ کی سلامتی کی ضمانت قرار دیا تھا، مگر یہ آج کیا ہوا کہ برطانوی کرسی انصاف پر بیٹھے جج نے ایک برقعہ پوش مسلم خاتون کو سرے سے عدالت میں گھسنے ہی نہیں دیا۔

مقدمہ کی سماعت تو دور کی بات ہے، جب منصف تک سائلہ کی آواز پہنچ سکتی تھی تو برقعے کا تو کوئی قصور نہ تھا، ویسے ہماری معلومات کے مطابق برطانوی قانون میں برقعہ پوش خاتون کا مقدمہ سننے کی ممانعت نہیں، پھر یہ برطانوی منصف نے کیوں ایک مسلم خاتون کو محض برقعے کے باعث انصاف سے محروم رکھا۔ اگر کوئی اسلامی ملک کسی برطانوی خاتون کا مقدمہ اس لیے نہ سنتا کہ اس نے سکرٹ کیوں پہنا ہوا ہے اور اسے عدالت میں داخل نہ ہونے دیتا تو کیا برطانیہ جیسا مہذب ملک اس کو کارِ خیر سمجھتا یا اس کو برداشت کرتا؟ ظاہر ہے نہ کرتا، دوہرا معیار کیا برطانوی پارلیمنٹ میں زیرِ بحث آئے گا؟ آیئے مل کر انتظار کرتے ہیں۔ (روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، 26 اگست 2013ء)

امن کا نوبیل پرائز 2011ء جیتنے والی یمن کی خاتون توکل کامران سے ایک صحافی نے حجاب کے بارے میں سوال کیا کہ آپ حجاب کیوں پہنتی ہیں جبکہ آپ باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اس پر انہوں نے خوبصورت جواب دیا: آغازِ کائنات میں انسان بالکل ننگا تھا اور جب شعور ملا تو اس نے لباس پہننا شروع کر دیا۔ میں آج جس مقام پہ ہوں اور جو پہنتی ہوں، وہ انسانی سوچ اور انسانی تہذیب کا اعلیٰ ترین مقام ہے، قدامت پسندی نہیں۔ اب پرانے وقتوں کی طرح انسان پھر سے کپڑے اتارنا شرع کر دے تو یہ قدامت پسندی ہے۔

مغرب کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی ایمانی حرارت جانچنے کے لیے ان کے جذبات پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ یہ بات بہرحال ثابت شدہ ہے کہ آزادیٔ اظہار یا آزادیٔ رائے کی اس سے بھونڈی شکل اور کوئی نہیں کہ آپ کسی انفرادی شخص کے یا کسی اجتماعی گروہ کے مذہبی جذبات مجروح کریں۔ اخلاقی گراوٹ کی یہ شاید سب سے بڑی انتہا ہے۔ اس کی تازہ مثال ملاحظہ کیجیے کہ فرانس میں مساجد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لٰہذا حکومت نے چرچ سے مل کر ایک سازش تیار کرتے ہوئے ہم جنس پرستوں کے لیے الگ مسجد کے قیام کا اعلان کیا۔ اس ''مسجد'' پر اٹھنے والے تمام اخراجات حکومت فرانس برداشت کرے گی۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم جنس پرست اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی جنسی خواہشات بھی یہیں پوری کریں گے۔ اس قبیح حرکت کا مقصد صرف اور صرف اسلام کو بدنام کرنا ہے۔ فروری 2014ء میں برطانوی سیاسی جماعت یو کے انڈیپنڈنٹ پارٹی کے رکن پارلیمنٹ گیرارڈ بیٹن نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ مسلمانوں کو برطانیہ میں مساجد تعمیر کرنے کی اجازت دینا غلطی تھی۔ گیرارڈ نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں سے اپنا یہ مطالبہ دہرایا کہ وہ قرآن پاک میں جہاد سے متعلق

آیات سے اظہار لاتعلقی کریں۔

فروری 2014ء میں مسلمانوں کے خلاف امریکی دشمنی کی ایک اور مثال سامنے آ گئی جس میں امریکی جج نے فیصلہ دیا کہ مسلمانوں کی جاسوسی امریکہ کے آئین کا حصہ ہے۔ اس طرح انسانی حقوق کے علمبردار امریکہ نے اسلام کے خلاف تعصب کا ایک اور ثبوت دے دیا۔ نیوجرسی میں رہنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے پولیس کی جانب سے بے بنیاد نگرانی کے خلاف عدالت میں درخواست دے رکھی تھی جہاں ڈسٹرکٹ جج ولیم مارٹینی William J. Martini نے درخواست پر فیصلہ سناتے ہوئے مسلمانوں کی جاسوسی کو آئین کے مطابق قرار دیا۔ فیڈرل جج نے کہا کہ مسلمانوں کی جاسوسی انسداد دہشت گردی کے پروگرام کی روشنی اور ملکی مفاد میں کی جاتی ہے۔ نیوجرسی کے مسلمان عدالتی فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مساجد، دینی مدارس، کاروباری مراکز اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی کڑی نگرانی سے ان کی ساکھ متاثر ہورہی ہے۔ مئی 2014ء میں نیویارک ٹائمز نے ایک تفصیلی خبر میں یہ انکشاف کیا کہ نیویارک پولیس نے مسلمانوں کی نگرانی اور مخبری کے لیے مسلمان کمیونٹی میں مخبروں کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے مسلمان کمیونٹی کو شکوک وشبہات، احتیاط، تشویش اور پریشانی میں مبتلا کر دیا کہ نجانے مسجد میں موجود نمازیوں میں کون سا شخص پولیس کا مخبر ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ پولیس اپنے تنخواہ یافتہ مخبروں کے ذریعے کسی بھی مسلمان کو ٹارگٹ کر کے اسے امتیازی سلوک کا نشانہ بنائے گی۔ مغرب کے دوہرے معیار کی ایک اور جھلک ملاحظہ کیجیے: لندن میں فنس بری پارک مسجد کے امام ابوحمزہ کو سات سال کی قید سنا دی گئی کہ جج کے خیال میں امام نے اپنے خطبے میں ایسی اشتعال انگیز زبان استعمال کی تھی جس سے سامعین مشتعل ہوکر امن وامان خراب کرنے کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ اس کے برعکس ایک برطانوی جج نے گروہی منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلائے جانے والے ایک ملزم گریفن جو کہ ایک بدنام زمانہ متعصب برطانوی شہری ہے، بغیر کسی سزا کے بری کر دیا۔ گریفن نے اسلام کو بدطینت اور فاسد ''Vicious & Wicked'' مذہب قرار دیا تھا۔

معروف دانشور جناب پروفیسر خباب احمد خان اپنے گرانقدر مضمون ''مسلم اقلیت اور مغرب......ساری دنیا رقیب ہے یارو!'' میں لکھتے ہیں:

''NO MORE MOSQUE'' یہ ایک کتبہ ہے، جو برطانیہ میں نئی مساجد

کی تعمیر کے خلاف کیے جانے والے مظاہرین میں سے ایک نوجوان نے ہاتھ میں اٹھا رکھا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ میں بسنے والے 24 لاکھ مسلمان کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں کا مسلمانوں کے ساتھ امتیازی رویہ اب کوئی راز نہیں رہا۔ مسلم ممالک میں اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کے اعلیٰ رویے کے باوجود مغربی ممالک ان سے امتیاری برتاؤ کا واویلا کرتے نہیں تھکتے، مگر مسلم اقلیت کے ساتھ ان کا جو رویہ ہے، وہ کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

مسلم ممالک میں چرچوں کی تعمیر اور ان کی زیبائش و آرائش کے لیے وافر مقدار میں فنڈنگ کی جاتی ہے اور حکمران الگ سے ان کے لیے فنڈز مختص کرتے ہیں۔ انہیں اپنی رسوم و روایات کے مطابق مذہبی افعال ادا کرنے کی کھلی آزادی ہے، یہاں تک کہ وہ ایسے ''شفائیہ اجتماعات'' بھی منعقد کرتے ہیں، جن میں ''مسیحائی'' کے کرتب دکھا کر مسلمانوں کو عیسائیت اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان کے مشنری ادارے امداد کے نام پر اہل اسلام کے ایمان پر ڈاکا ڈالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، خط و کتابت کورسز اور ریڈیو چینل بھی عیسائیت کی دعوت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے چرچوں پر صلیب کا باقاعدہ نشان لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہسپتالوں اور صحت کے مراکز میں بھی صلیبیت کا پرچار کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جہاں عیسائی اکثریت میں ہیں، وہاں مسلم اقلیت کو بھی اسی طرح کی آزادیاں فراہم کریں، مگر وہاں مسلم اقلیت کے خلاف نہ صرف نفرت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے بلکہ انہیں مذہبی عبادات کی ادائی پر طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو مسلمان نماز کے لیے مستقل طور پر مسجد کا رخ کرے، اس کی نگرانی شروع کر دی جاتی ہے اور شدت پسند ہونے کا شبہ ظاہر کر کے ان پر خفیہ ایجنسیوں کے مسلم ایجنٹوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی ''سرگرمیوں'' پر کڑی نگاہ رکھیں۔

یہ الزام نہیں حقیقت ہے، جس کا اعتراف برطانیہ کی خفیہ ایجنسی **MI5** کی سابق سربراہ **(Dame Eliza Mamningham Buller)** نے بی بی سی کے ایک پروگرام میں کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایجنٹ نہایت مہارت کے ساتھ ''دہشت گردوں'' کے منصوبوں کو ناکام کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ خاتون پانچ سال (**2002-07**ء) ''ایم آئی فائیو'' کی سربراہ رہیں۔ کیا مسلم ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کو اس بات کی اجازت دی

جاسکتی ہے کہ وہ چرچ میں لگا تار عبادت کے لیے جانے والوں کی نگرانی کر سکیں؟ اگر ایسے کسی سلسلے کا انکشاف ہو جائے تو مغربی ممالک آسمان سر پر اٹھا لیں اور ان کے تنخواہ دار افراد کو ہی نہیں، پورے ادارے کی ساکھ پر سوالیہ نشان لگا دیں۔ ہماری سیاسی قیادت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ توہین رسالت کرنے والے عیسائیوں کو بھی اپنے مغربی آقاؤں کے حکم پر ارجنٹ پاسپورٹ اور ویزے بنا کر اور بعض کو کاغذات کے بغیر ان کے حوالے کر دیتے ہے۔ سلمان تاثیر جو ایک بڑے صوبے پنجاب کا گورنر تھا، اس نے آسیہ مسیح کیس میں تمام حدیں پار کیں اور توہین رسالت کے قانون کو ''کالے قانون'' سے تعبیر کر ڈالا، جس کا خمیازہ ممتاز قادری جیسے عاشق رسول کے ہاتھوں اسے بھگتنا پڑا۔ ہمارے ایک نو آموز سیاسی لیڈر نے پاکستان میں مسیحی حکمران بنانے کی خواہش کا بھی اظہار کر دیا۔ کاش وہ اس کا آغاز اپنی پارٹی قیادت کسی مسیحی کو سونپ کر کرتے، وہ جن مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ کر رہے تھے، ان کا جائزہ لے لیتے کہ وہاں اب تک کتنے مسلم حکمران گزرے ہیں؟

بات دوسری طرف چلی جائے گی، اس لیے انسانی حقوق کے علمبرداروں کی طرف آتے ہیں جو ہر سال دسمبر کے پہلے عشرے کی آخری تاریخ کو انسانی حقوق کے عالمی دن کے طور پر مناتے ہیں اور پورا سال انسانی حقوق کو پامال کر کے انسانیت کی ''خدمت'' میں جتے رہتے ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواری برطانیہ، فرانس، ڈنمارک اور اسرائیل مسلمانوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں، اس سے انسانی حقوق کا منشور مزید ''مضبوط'' ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی شق نمبر 12 میں یہ بات درج ہے کہ:
''کسی شخص کی نجی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے سے مداخلت کی جائے گی اور نہ ہی ان کی نیک نامی اور عزت پر حملے کیے جائیں گے، ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے''۔

کیا مغربی حکومتیں مسلم اقلیت کی نجی، خانگی زندگی اور ان کے معمولات میں مداخلت نہیں کرتیں؟ ان کی خفیہ نگرانی، ان کے ٹیلیفون اور ای میلز چیک نہیں کی جاتیں؟ ان کی عام خط و کتابت کو بھی باقاعدہ چیک نہیں کیا جاتا؟ کیا ان کی نیک نامی پر انہیں دہشت گرد قرار دے کر حملہ نہیں کیا جاتا؟ کیا شدت پسندی کا الزام لگا کر ان کی عزت پر وار نہیں کیا جاتا؟ حجاب سے روک کر اور حجاب پہننے پر سزا دے کر من مانے طریقے سے ان کی زندگی میں

مداخلت نہیں کی جاتی؟ صرف شدت پسندی کے شبہے پر انہیں جیلوں میں ڈال کر ان سے امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا؟

معروف کالم نگار جناب سجاد وسیم راجہ اپنے مضمون ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' میں لکھتے ہیں: کیا انتہا پسندی صرف مسلمانوں میں ہی ہے؟ باقی تمام مذاہب کے پیروکار اس سے مبرا ہیں؟ میانمار میں بدھ مت کے پیروکار مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں، کیا وہ دہشت گردی نہیں؟ انڈیا میں مسلمانوں کو جس طرح امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے، کیا وہ سیکولرازم کا اصلی روپ ہے؟ کوئی ہندو، یہودی، عیسائی یا دوسرے کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی دہشت گردانہ کارروائی کرتا ہے تو اسے انفرادی فعل کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ مندر، چرچ اور دوسرے عبادت خانے بند کیوں نہیں کیے جاتے؟ ہندو ''گھر واپسی'' کی ارتدادی مہم چلا کر مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے سرگرم ہوں تو ان سے صرف نظر کیوں کیا جاتا ہے؟ عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالیں تو انہیں اس کی کھلی اجازت کیوں ہے؟ اگر کوئی ہندو یا عیسائی دائرۂ اسلام میں داخل ہو تو اس پر شور غوغا کیوں؟ کسی مسلم کی طرف کارروائی کی نسبت ہو جائے تو اسلام پر اس کا دشنام کیوں؟ اسے مسلمانوں کا ''مائنڈ سیٹ'' قرار دے کر مسلمانوں پر اجتماعی ذمہ داری کا بوجھ کیوں ڈال کر ان کے خلاف نفرت انگیز مہم شروع کر دی جاتی ہے''۔ (ہفت روزہ ضرب مومن، کراچی 11 تا 17 دسمبر 2015ء)

برطانیہ سے بات شروع ہوئی تھی، وہاں کی ایک تنظیم **TELL MAMA** کے مطابق مسلمانوں کے خلاف نفرت پر مبنی جرائم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال کے نو مہینوں (اپریل تا دسمبر) کی رپورٹ کے مطابق ایک ہزار سے زاید نسلی منافرت کے واقعات ہوئے۔ اس اضافے کی وجہ رپورٹ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جو برطانوی غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز جرائم میں ملوث ہوتے ہیں، انہیں سخت سزائیں نہیں دی جاتیں۔ مثال کے طور پر لوٹن کی ایک مسجد کے سامنے خنزیز کا کٹا ہوا سر رکھنے والے افراد کو ثبوت جرم کے بعد جو سزا دی گئی، وہ کمیونٹی سروس کی تھی کہ وہ اس علاقے میں چند روز تک ''صفائی'' کریں گے۔ ایسی نرم سزا کے بعد نفرت آمیز جرائم میں اضافہ نہ ہو تو کیا ہو؟ اس تنظیم کے مطابق اکثر اوقات ان نفرت آمیز جرائم کے مرتکبین کو صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ان منافرت آمیز جرائم کو بڑھانے میں مغربی میڈیا کا بہت بڑا کردار ہے۔ بات کا

بتنگڑ بنانا اور اس کی آڑ میں مسلمانوں کو بدنام کرنا اس کا وطیرہ ہے۔ اگر کسی مسلمان سے غلطی سرزد ہو جائے تو اسے اجتماعی مسلم سوچ کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے اور پھر اسلام اور اس کی تعلیمات پر حرف گیری کی جاتی ہے۔ مسلمان مساجد کے مینار بنائیں تو اس کے خلاف مظاہرے کیے جاتے ہیں اور ان عبادت گاہ کے ''شعائر'' پر قانوناً پابندی لگا دی جاتی ہے۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔ اب نئی مساجد کی تعمیر کے خلاف بھی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مسلمان یونیورسٹی میں ہوں یا کالج میں، بازار میں ہوں یا مسجد میں، ملازمت کر رہے ہوں یا کاروبار، انفرادی معمولات ادا کر رہے ہوں یا اجتماعی معمولات، خانگی فرائض ادا کر رہے ہوں یا مذہبی، ان کی ہر جگہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے نگرانی کی جارہی ہوتی ہے اور دوسری جانب انہیں اکثریت کی جانب سے نفرت آمیز جرائم کا بھی سامنا ہے۔ (روزنامہ اسلام کراچی 11 جنوری 2014ء)

حال ہی میں ایک اندوہناک خبر آئی کہ 2 سال کے بعد (اندلس) سپین کی تاریخی جامع مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے گا۔ چنانچہ اس کا انتظام و انصرام چرچ کے حوالے ہونے سے مسلمان کلی طور پر اس عظیم الشان مسجد سے بے دخل ہو جائیں گے۔ اس طرح پوری مسجد پر کلیسا کو گرجا کے قیام کا لائسنس حاصل ہو جائے گا۔ دنیا بھر میں گرجوں کی اخلاقی حالت سب کے سامنے ہے۔ 500 سے زائد چرچ تجارتی مراکز، شراب خانوں اور دیگر واہیات سرگرمیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ غیر اخلاقی سرگرمیاں چرچ کا لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ ان حالات میں تاریخی مسجد کو کلیسا کے حوالے کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ یاد رہے کہ اسپین میں مسلم عہد کی بے مثال تاریخی یادگار ''جامع مسجد قرطبہ'' صرف 30 یورو یعنی 4 ہزار 315 روپے میں کلیسا کو فروخت کی جارہی ہے۔

اس سلسلہ میں ''مسجد قرطبہ اور سکوت مرگ'' کے عنوان سے جناب پروفیسر خباب احمد خان لکھتے ہیں:

''اندلس (ANDALUSIA) بحراوقیانوس، آبنائے جبل الطارق اور بحیرۂ روم سے ملحق ہے جسے کبھی ہسپانیہ اور آج کل اسپین کہتے ہیں۔ آٹھویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں نے ادھر کا رخ کیا، جب بنوامیہ کا دور حکومت تھا۔ موسیٰ بن نصیر اس دور کے مشہور سپہ سالاروں میں سے ایک تھے۔ ولید بن عبدالملک کے عہد میں موسیٰ کو شمالی افریقہ کے مغربی حصوں کا والی

بنایا گیا۔ موسیٰ بن نصیر کے حکم پر طارق بن زیاد کی قیادت میں 5 ہزار مسلمان مجاہدین نے اندلس کا رخ کیا۔ ساحل اندلس پر پہنچتے ہی طارق نے کشتیاں جلا دیں اور مسلمان مجاہدین سے کہا، اب ایک ہی راستہ ہے کہ ہم آگے کی طرف بڑھیں۔ 26 جولائی 711ء کو مسلمانوں کو عیسائی حکمران راڈرک پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور پھر مسلمانوں نے یہاں 7 صدیوں تک حکومت کی۔ اندلس کی اسلامی ریاست ہی کے سبب یورپ ''ڈارک ایجز'' (تاریک دور) سے نکلا اور پھر مغرب کی ترقی کا منبع یہی اندلس بنا۔ اس دور کی عالی شان عمارتیں غرناطہ، الحمراء اور جامع مسجد قرطبہ جیسے عجائبات آج بھی مسلمانوں کی یادگار ہیں، وادی الکبیر کے کنارے امیر عبدالرحمٰن الداخل نے مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی اور امیر ہشام نے اس کی تکمیل کی۔ دو لاکھ اسی ہزار دینار ان دونوں نے اپنی جیب سے خرچ کیے۔ مسجد قرطبہ کے 21 دروازے اور 417 ستون ہیں۔ لمبائی ایک سو بیاسی اور چوڑائی 133 میٹر ہے۔ یہ مسجد اپنی خوبصورتی اور حسن میں بے نظیر ہے۔ 1236ء میں اس کے ایک حصے کو گرجے میں بدل دیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے اسے سولہویں صدی میں یہ ہیئت دی گئی۔ مسلمانوں کی حکمرانی کسی نہ کسی طرح 1492ء تک اسپین کے بعض حصوں پر رہی تا آنکہ غرناطہ کے حکمران ابوعبداللہ نے عیسائی حکمران سے معاہدے کے بعد غرناطہ اس کے حوالے کر دیا۔ تقریباً آٹھ صدیوں سے مسجد قرطبہ میں اللہ اکبر کی صدائیں گونجی اور نہ وہاں اجتماعی نماز کی ادائیگی کی مسلمانوں کو اجازت دی گئی۔ اسپین میں اس وقت بھی مسلمانوں کی آبادی آٹھ لاکھ سے متجاوز ہے اور ہر سال 14 لاکھ مسلمان مسجد قرطبہ کی زیارت کو آتے ہیں مگر انہیں اس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ صلیبی دنیا کے اس عمل سے نہ اس کی رواداری پر حرف آیا نہ مذہبی آزادیوں کی علمبرداری پر۔ مسجد قرطبہ اور اس کے مینار آج بھی مسلمانوں کی بے بسی پر نوحہ کناں ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کا بھاشن دینے والے مغرب اور اس کے ممدوحین اس صورت حال پر بھی خاموش ہیں۔ آج تک مسجد قرطبہ کی ویرانی کے متعلق کسی مسلم حکمران نے سوال نہیں کیا کہ اسپین کی مسلم اقلیت کے حقوق کہاں گئے؟ دنیا میں کسی جگہ کسی مندر، کلیسا، چرچ کے قریب سے مسلمان گزر جائیں تو پوری دنیا میں بھونچال آ جاتا ہے۔ امریکا، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا، اٹلی سمیت مغربی دنیا کے حکمران، انڈیا، اسرائیل اور دوسری غیر مسلم حکومتیں اور میڈیا وہ ہاہا کار مچاتا ہے کہ ہر طرف سے ایک ہی آواز آ رہی ہوتی ہے کہ شدت پسندی مسلم خمیر کا حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے نیٹو کے جنرلز

تک ظلم کی داستانیں بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ پاپائے روم سے لے کر بدھ مت اور ہندومت کے پیشواؤں تک مذہب دشمنی کا رونا روتے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بھاشن دیتے ہیں، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک تک دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں۔ انسانی حقوق کی مغربی تنظیمیں اور مغربی ایجنڈے کی حامل مسلم ریاستوں میں این جی اوز آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔

مسجد قرطبہ کو اب مکمل چرچ میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، مگر اتنے بڑے واقعے پر کوئی بریکنگ نیوز کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ سی این این، نہ فاکس نیوز، نہ این بی سی، نہ بی بی سی، نہ کوئی اور مغربی چینل، نہ ہی الجزیرہ اور دوسرے مسلم ممالک کے چینلز پر یہ ٹاپ اسٹوری، لیڈ اسٹوری تو کیا عام سی خبر بھی نہ بن سکی۔ ''آزادیٔ اظہار'' کہاں رہ گئی؟ زبانیں گنگ اور قلم خشک کیوں ہو گئے؟ انصاف کی دہائیاں دینے والے اس ناانصافی پر مہر بلب کیوں ہیں؟ اوباما سے کیمرون تک، ہیلری کلنٹن سے مشعل اوباما تک اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے پاپائے روم تک اقلیتوں سے امتیازی سلوک پر خاموش تماشائی کیوں ہیں؟ خادم حرمین سے لے کر 56 مسلم ممالک کے حکمرانوں تک کے لبوں پر تالے کیوں ہیں؟ بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری کا درس دینے والے کیوں منظر سے غائب ہیں؟ آدھے سچ کے ذریعے عدم برداشت کا مسلمانوں کو طعنہ دینے والے کیوں آنکھیں موندے ہوئے ہیں؟ چرچ کو مسجد بنایا جا رہا ہوتا تو کیا وہ اسی طرح چپ رہتے؟ اب تاریخی مسجد خطرے میں ہے اور صدیوں کی تاریخ کے انہدام پر وہ گونگے، بہرے اور اندھے کیوں بنے ہوئے ہیں؟ ان پر سکوت مرگ کیوں طاری ہے؟'' (روزنامہ اسلام کراچی 19 مئی 2014ء)

مغرب ایک جانب آزادی، حقوق، مساوات، محبت اور غیر جانبداریت کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ دوسری جانب تضاد بیانی کو اپنا اصول بنا کر مسلمانوں کو غلام بنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے تصور مساوات سے اس کا کھوکھلا پن پوری طرح عیاں ہے۔

معروف صحافی جناب منور مرزا اپنے تحقیقی مضمون ''مسجد قرطبہ: اسلامی فوبیا کی نئی صورت'' میں لکھتے ہیں: ''گزشتہ برس موسم سرما کے آغاز میں مسجد قرطبہ کے حوالے سے انٹرنیٹ کی دنیا میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ گوگل سرچ انجن کے نقشے گوگل ارتھ سے اچانک مسجد قرطبہ غائب ہوگئی۔ اگر کوئی سیاح یورپ میں اسلامی دنیا کے اس اہم ترین ورثے کو گوگل میپ پر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو جواب میں قرطبہ کا کلیسا لکھا ملتا۔ اسپین کے

باشندوں اور دنیا بھر سے آنے والے سیاحوں میں اس حوالے سے شدید بے چینی اور پریشانی پیدا ہوئی اور انہوں نے گوگل کے ایڈیٹر کے نام احتجاجی ای میلز بھیجیں، جن میں اس ناانصافی اور متعصّبانہ اقدام پر آواز بلند کی گئی۔ گزشتہ برس نومبر میں تین روز کے دوران گوگل کو اس حوالے سے **55,000** احتجاجی ای میلز موصول ہوئی، جن میں مطالبہ کیا گیا کہ اس عظیم اسلامی ورثے کو اس کے حقیقی نام یعنی ''مسجد قرطبہ'' سے منسوب کیا جائے، کیونکہ یہ صدیوں سے اس کی پہچان ہے۔ اس موقع پر قرطبہ کے بشپ اور چرچ انتظامیہ پر الزام عاید کیا گیا کہ ''وہ اس حرکت کے ذمے دار ہیں اور ان کی جانب سے مسجد پر قبضہ کرکے اس کی پہچان مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے''۔ شکایتی ای میلز کی بھرمار پر گوگل انتظامیہ نے خاموشی سے **25** نومبر **2014**ء کو گوگل ارتھ پر مسجد قرطبہ کا نام بحال کردیا۔ جب **1492**ء میں شاہ فرڈی نینڈس نے قرطبہ فتح کیا، تو اس نے مسجد قرطبہ کے احاطے میں ایک کلیسا کی تعمیر کا حکم دیا، جس پر فوری عمل کیا گیا۔ تب فرڈی نینڈس نے یہ توجیہہ پیش کی کہ جس مقام پر **785**ء میں مسجد تعمیر کی گئی تھی، وہاں پہلے وسگوتھ چرچ کی باقیات تھیں، لیکن آثارِ قدیمہ کے ماہرین اس قسم کے دعوے کو رد کرتے ہیں اور اسے ایک من گھڑت کہانی قرار دیتے ہیں۔ بعد ازاں، یہ چرچ مسجد کے احاطے میں منتقل کردیا گیا اور جب اس میں مسیحی عبادات کا سلسلہ شروع ہوا تو جواز پیش کیا گیا کہ مسجد قرطبہ اپنے عروج کے زمانے میں علوم وفنون کا مرکز تھی، لیکن اس بنیاد پر اس کے نام سے لفظ مسجد ہی ہٹا دینا کسی لحاظ سے درست نہیں۔ فرڈینڈس نے چرچ تعمیر کروانے کے فوراً بعد ہی اس کے نام میں کیتھڈرل کا اضافہ کردیا اور مسجد قرطبہ کو ''موسک کیتھڈرل آف کورڈوبا'' کے سرکاری نام سے مشہور کردیا گیا۔ آرٹ کی ایک عالمی شہرت یافتہ تاریخ داں کا، جو اس فن پر اتھارٹی بھی مانی جاتی ہیں، کہنا ہے کہ ''اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آٹھویں صدی میں اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، تو اس وقت وہاں کسی چرچ کے آثار موجود تھے''۔

مسجد قرطبہ کی نگرانی کا مکمل اختیار مقامی چرچ انتظامیہ کے سپرد ہے اور اس کی ایک عرصے سے یہ کوشش رہی ہے کہ اس کے نام میں سے لفظ، مسجد اور اس کی اہمیت کو ختم کردیا جائے۔ اس سلسلے میں اس بروشر کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے جس میں مرحلہ وار گزشتہ کئی عشروں سے اس اسلامی ورثے کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور سارا زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر ایک چرچ مسمار کرکے کی گئی۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ اسلامی دور میں یہ

مداخلت تھی۔ حتیٰ کہ مسجد کے احاطے میں کھدائی کر کے ایسی باقیات دکھانے کی کوشش بھی کی گئی کہ جس سے ان کا دعویٰ درست ثابت ہو سکے۔ یاد رہے کہ مسجد قرطبہ سے سیاحت کی مد میں حاصل ہونے والی تمام آمدنی چرچ انتظامیہ کے پاس جاتی ہے۔ مبصرین کے مطابق، چرچ انتظامیہ کی جانب سے مسجد قرطبہ پر مکمل تسلط رکھنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کو اس عمارت کے احاطے میں عبادت کی اجازت نہیں، جبکہ کلیسا کے حصے میں عیسائیوں کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں''۔ (روزنامہ جنگ لاہور، سنڈے میگزین، **24** اکتوبر **2015**ء)

''اپریل فول'' کے نام سے ڈاکٹر منور حسین بھٹہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے **19** جولائی **711**ء میں اسپین فتح کیا۔ جی ہاں! یہ وہی اندلس ہے جس کے ساحل پر طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اس خطے سے مسلمانوں کے عروج و زوال کی الم ناک داستان وابستہ ہے۔ مسلمانوں کو یہاں ایسا عروج ملا کہ کم ہی قوموں کو نصیب ہوتا ہے اور پھر زوال بھی وہ کہ جس پر آسمان بھی رو دے۔ عبدالرحمٰن سوم کے دور میں تعلیم اس قدر عام ہوئی کہ شرح خواندگی سو فیصد تک جا پہنچی۔ شہر میں **20** ہزار دکانیں، کتب فروشی اور اُس سے متعلقہ کاروبار کے لیے وقف تھیں، جب کہ پارچہ بافی کی پانچ ہزار مشینیں نصب تھیں تو گلیوں میں روشنی کا انتظام تھا۔ دوسری طرف، یورپ کے پیرس اور لندن جیسے بڑے شہروں کی گلیاں کیچڑ اور گندگی سے اَٹی ہوتی تھیں اور وہاں راتیں گھپ اندھیرے میں گزرتیں۔ اُس کے بعد، حکم ثانی کا دور آیا، جس کی لائبریری، اپنے دور میں دنیا کی سب سے بڑی لائبریری تھی، جہاں **6** لاکھ سے زائد کتب موجود تھیں۔ عیسائیوں نے اسپین پر حملوں کا آغاز کیا، تو شمالی افریقا سے یوسف بن تاشفین بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ مدد کو پہنچا اور الفانسو ششم کے **80** ہزار کے لشکر کو شکست دی۔ اس سے اسپین ایک طویل عرصے تک بیرونی خطرات سے محفوظ ہو گیا۔ **1214**ء میں الفانسو نہم نے بھرپور حملہ کیا، جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اُس کے بعد وہ کہیں بھی جم کر نہ لڑ سکے اور عیسائی افواج آگے ہی بڑھتی رہیں، البتہ غرناطہ کے خاندان، بنو نصر نے اپنے دور حکومت میں عیسائیوں کی یلغار کو روکے رکھا۔ سیاسی عدم استحکام اور صلیبی شورشوں کے باوجود، غرناطہ اُن دنوں اسپین کا سب سے بڑا علمی شہر بن کر اُبھرا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کو پس پشت ڈال دیا اور آپس کے اختلاف میں الجھ گئے، تو یہ خطہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یوں **2** جنوری **1492**ء کو عیسائیوں

نے اسپین پر قبضہ کرلیا، جس کے بعد ایک حکم نامہ جاری کیا گیا کہ مسلمان، عیسائی ہو جائیں یا پھر 50 ہزار سونے کے سکے دیں اور ایسا نہ کرنے والے کو سولی پر لٹکا دیا جاتا۔ اس قتل عام کی وجہ سے جو مسلمان جان بچا کر بھاگ سکتے تھے، وہ تو بھاگ نکلے، باقی اپنی شناخت چھپا کر وہیں رہنے لگے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو تلاش کرنے کے لیے حکومت نے ایک چال چلی، جس کے مطابق، بادشاہ فرڈی نینڈ نے اعلان کروایا کہ جو مسلمان، دیگر مسلم ممالک میں جانا چاہتے ہیں، وہ یکم اپریل تک غرناطہ میں جمع ہو جائیں، تاکہ اُن کے جانے کا بندوبست کیا جا سکے۔ مارچ کے پورے مہینے اسی طرح کے اعلانات ہوتے رہے۔ قصر الحمراء کے نزدیک خیمے نصب کر دیئے گئے اور سمندر میں جہاز لنگر انداز ہوتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر مسلمان خیال کرنے لگے کہ اب شاید امن ہو گیا ہے اور عیسائی افواج اس معاملے میں سنجیدہ ہیں، لہٰذا خود کو ظاہر کر دینے میں کوئی حرج نہیں اور مسلمان خفیہ مقامات سے نکل کر الحمراء کے قریب خیمہ زن ہو گئے۔ 31 مارچ کی رات اُن کی خوب خاطر مدارت کی گئی۔ دوسرے روز جرنیلوں نے اُنہیں الوداع کیا اور جہاز چل پڑے، ان جہازوں میں بچے، بوڑھے، خواتین سبھی سوار تھے۔ جہاز جب گہرے پانی میں پہنچا تو منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو ڈبو دیا گیا اور یہ الم ناک سانحہ یکم اپریل 1501ء کو پیش آیا۔ جہاز کے غرق آب ہونے کا بڑے پیمانے پر جشن منایا گیا۔ بعد ازاں اسے یورپ کا عظیم دن قرار دیا گیا اور اسے انگریزی میں First April Fool کا نام دیا گیا، یعنی یکم اپریل کے بے وقوف۔ آج بھی اس دن کو یورپی دنیا، اس فتح کی یاد میں پورے اہتمام سے مناتی ہے۔ گو کہ بہت سے لوگ اسے محض ایک مذاق کا دن سمجھتے ہیں لیکن اس کی بنیاد غرناطہ ہی کا واقعہ ہے، افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں بھی، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا پس منظر کیا ہے، یہ دن منایا جا رہا ہے۔ یعنی کہ مسلمان اپنی ہی تباہی اور بربادی پر خوشی کا دن مناتے ہیں‘‘......!!

اسلام کے خلاف مغرب کے شیطانی اقدام سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں خواہ کتنا ہی اشتعال کیوں نہ پھیلے، مغرب میں کوئی بھی مادر پدر آزاد ’’آزادیٔ اظہار‘‘ پر پابندی لگانے کے لیے تیار نہیں۔ آزادیٔ اظہار کے نام پر شعائر اسلامی کی توہین کی اجازت اور اس کے مرتکبین کو ’’قانون‘‘ کی چھتری فراہم کرنا بھی امت مسلمہ کے زخموں پر نمک پاشی کی ایک شرمناک اور قبیح حرکت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ دنیا کے کسی دوسرے

مذہب کے خلاف ایسا کیوں نہیں کرتے حالانکہ دنیا میں غیر آسمانی مذاہب اور اس کے ماننے والوں کی کمی نہیں؟ صبر، رواداری اور برداشت کا درس دینے والے عالمی چیمپئن امریکہ اور اس کے مغربی حواریوں کا خود یہ دوہرا معیار ہے کہ 26 ستمبر 2012ء کو جب ایرانی صدر نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب شروع کیا تو ان تمام ممالک نے اس خطاب کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ دسمبر 2008ء کو ایک پریس کانفرنس میں صدر جارج بش جب صحافیوں سے خطاب کر رہے تھے تو ایک عراقی صحافی منتظرالزیدی نے صدر بش پر اپنا جوتا اچھال دیا تھا جسے کیمرے کی آنکھ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔ دنیا بھر کے لوگوں نے دیکھا کہ اسی وقت امریکی ایجنسیوں کے اہلکاروں نے اس صحافی پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کردی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں صبر اور برداشت کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک اور اہم بات جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ستمبر 2001ء میں جب امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ ہوا تو امریکی خفیہ ایجنسی FBI نے پورے امریکہ سے ٹیلی فون کا ڈیٹا اکٹھا کیا اور جس مسلمان نے بھی اس واقعہ کی کسی دوسرے کو اطلاع دیتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا، اسے گرفتار کر کے مختلف عقوبت خانوں میں تفتیش کے جانگسل مراحل سے گزار کر جیل بھیج دیا گیا۔

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ 1991ء میں نیویارک کے معروف چوک میں جب ایک شخص نے صدر بش ہونے کا دعویٰ کیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا تھا۔ اسے آزادی اظہار رائے کی کوئی رعایت نہ دی گئی۔ یہ ہے وہ تضاد جو امریکی معاشرے کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ انہیں تو اپنے لیے اتنا بھی گوارا نہیں کہ کوئی مسخرہ جعلی طور پر ان کے صدر کا نام استعمال کرے، اس کا روپ دھارے یا خود کو صدر کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے لیکن ہمارے ہاں جب کوئی بدبخت جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرے، مسیح موعود ہونے کا اعلان کرے یا مہدی ہونے کا پرچار کرے تو امریکہ بہادر اس کی سرپرستی کرنے فوراً میدان میں آجاتا ہے اور ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس بہروپیے کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنے سے روک دیتا ہے۔ اگر بادل نخواستہ حکومت عوام کے احتجاج پر اسے گرفتار کرلیتی ہے تو مغربی میڈیا پاکستان کے خلاف شور مچانا شروع کردیتا ہے کہ پاکستان میں آزادی اظہار رائے پر قدغن ہے۔ چنانچہ اس کی آڑ میں پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد بند کردینے کی دھمکیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

مغرب مسلمانوں کو کرب میں مبتلا رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔اس کی مثال 1988ء میں بدنام زمانہ گستاخ رسول ملعون سلمان رشدی کے ناول Stanic Verses سے ملتی ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ کی بدترین توہین کی گئی۔اس نہایت غلیظ ناول کی اشاعت سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ملک اور ہر شہر میں اس کتاب کے مندرجات اور ملعون سلمان رشدی کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مغرب نے بجائے اس کتاب کی مذمت کرنے کے محض اسلام دشمنی میں ملعون سلمان رشدی کی سرپرستی شروع کر دی۔ برطانوی وزیر اعظم نے سلمان رشدی کو سخت سیکیورٹی مہیا کی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور برطانوی وزیر خارجہ نے مسلمانوں کے احتجاج کے جواب میں کہا کہ آزادی اظہار پر کسی کو دھمکی دینا بین الاقوامی رویے کے خلاف ہے۔آزادی اظہار ہماری بنیادی قدر ہے، ہم اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔کئی امریکی یونیورسٹیوں نے اس ''کارنامے'' پر رشدی کو اعزازی ڈگریاں دیں، امریکی صدر بل کلنٹن نے اسے خصوصی طور پر واشنگٹن وائٹ ہاؤس میں دعوت دی۔ نائٹ ہڈ کے خطاب سے نوازتے ہوئے برطانوی ملکہ الزبتھ نے 18 جون 2007ء کو اپنی سالگرہ کے موقع پر بکنگھم پیلس میں منعقدہ ایک تقریب میں سلمان رشدی کو شاہی مہمان کے طور پر مدعو کیا اور اسے ''سر'' کا خطاب دیا۔ پوچھنا چاہیے کہ یہ سارے اعزازت واکرامات کس ''خدمت عالیہ'' کا معاوضہ ہے؟ ظاہر ہے، توہین رسالت ﷺ، شعائر اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی دل آزاری مغرب کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور ایسا کرنے والا مغرب کا ''محبوب'' قرار پاتا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغرب کے تعصب اور دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر میں انسانی حقوق، انسانیت پر ہونے والی زیادتیوں اور حق تلفیوں کے تدارک کی کوشش کرنے والی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے 1994ء میں ملعون سلمان رشدی کی کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے والے سیکولر ملحد عزیز نشین کو اپنی تنظیم کی جانب سے امن وسلامتی کا ایوارڈ دیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا ملعون عزیز نشین کو امن وسلامتی کا ایوارڈ دینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ توہین رسالت ﷺ پر مبنی کتاب سلمان رشدی کا ذاتی فعل نہیں تھا، بلکہ یہ اقوام مغرب کی اسلام کے خلاف بھیانک سازش اور سوچی سمجھی پالیسی ہے جس کا مقصد اسلامی شعائر واقدار کی توہین وتضحیک اور مسلمانوں کے جذبات کو پامال کرنا ہے۔

یاد رہے مغرب نے یہی پذیرائی بنگلہ دیش کی ملعونہ تسلیمہ نسرین کو دی جس نے اپنی کتاب ''لجا'' (شرم)، انٹرویوز اور کالموں میں دین اسلام کی تعلیمات اور حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی۔ یورپی پارلیمنٹ نے اس ملعونہ کے حق میں ایک قرارداد منظور کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مغرب ہر اس شخص کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتا ہے جو اسلام کی تنقیص اور مسلمانوں کی دل آزاری کرتا ہے۔ حال ہی میں کینیڈا کی گستاخ عورت ارشاد مانجی (Irshad Manji)، جو دراصل سوڈانی النسل ہے، نے اسلام کے خلاف کتاب ''The Trouble With Islam Today'' لکھ کر نہ صرف اسلامی قوانین کا مذاق اڑایا بلکہ شریعت اسلامیہ کی بے حرمتی بھی کی۔ مسلمانوں کے احتجاج پر کینیڈین میڈیا نے مسلمانوں کو برداشت اور رواداری کی تلقین کرتے ہوئے انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنے کو کہا۔ جبکہ ان کے ہاں بیروزگاری، کساد بازاری اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف آئے روز احتجاج ہوتے رہتے ہیں جو بعض اوقات تشدد کا روپ دھار لیتے ہیں۔ حیرانی ہے کہ ان مظاہروں اور احتجاجی جلوسوں کو وہ آزادی اظہار کا نام دیتے ہیں۔ یہ ہے مغرب کا دوہرا معیار۔ مغرب خود معیار طے کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

بقول حافظ شفیق الرحمٰن: ''کہتے ہیں کہ یورپ کا مذہب ''آزادی'' ہے۔ ہوس کی آزادی، دشنام طرازی کی آزادی، الزام تراشی کی آزادی، غلام سازی کی آزادی، چھوٹے ملکوں میں جارحیت اور دہشت گردی کی آزادی، مشرقی اقدار کو پامال کرنے کی آزادی، اسلام کی انسانیت ساز تعلیمات کا مذاق اڑانے کی آزادی...... مغرب جب چاہے، جیسے چاہے، جب تک چاہے، کھل کھیلے...... کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کرے...... صیاد کو آزادی ہے کہ وہ آزاد پرندوں کو زیرِ دام لا کر ان کی آزادی سلب کرے اور ان کی شہ رگ، لبرل ازم کی چھری سے کاٹ کر رکھ دے، لیکن زخمی اور نیم بسمل پرندوں کو تڑپنے، پھڑکنے اور پھڑ پھڑانے کی بھی آزادی نہیں...... باؤلے کتوں کو شریف شہریوں پر بھونکنے اور معصوم راہگیروں کو کاٹ کھانے کی آزادی ہے لیکن باؤلے کتوں کو کچلہ دینے اور انہیں نمدا باندھنے کی آزادی نہیں۔ کیونکہ اس سے مذکورہ معزز کتوں کے کاٹ کھانے اور بھونکنے کے بنیادی اور پیدائشی ''حقوق'' پر زد پڑتی ہے۔

امریکہ اور مغربی حلقے توہین رسالتؐ کے جس قانون کی آڑ لے کر اتنا شور شرابہ پیدا کر رہے ہیں اور ہلا گلا مچا رہے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ اس قانون کے نفاذ سے تمھیں کیا تکلیف ہے؟ اس قانون کا نفاذ ایک ایسے ملک میں ہو رہا ہے جہاں 97 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ یہ ملک اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہ معاشی، سماجی اور جدلیاتی مسائل کا ناٹک تو 1970ء کے بعد رچایا گیا۔ روٹی تو ہندوستان کے مسلمان کو یوپی، سی پی، بہار، دکن، مشرقی پنجاب اور بنگال میں بھی مل رہی تھی...... پاکستان امریکہ کی طرح مہم جوؤں اور طائع آزماؤں کی حادثاتی دریافت نہیں۔ یہ تو بقول قائد اعظم یہاں کے مسلمانوں کا فطری مطالبہ تھا اور ہے۔ اس پر ''احتجاج'' اگر ملک کے اندر موجود چند جنونی مغرب پرست کر رہے ہیں تو ان کی تعداد انگلیوں کی پوروں سے بھی کم ہے۔

یہ تو بتائیے کہ جب سے یہ قانون منظر عام پر آیا ہے، سلمان رشدی اور راجپال کے کتنے پیروکاروں کی دریچوں پر صلیبیں آویزاں کی گئی ہیں؟ کتنے سلامت مسیحوں کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ہے؟ کتنے رشدی، نسرینیں اور راجپال آج جیلوں کی کال کوٹھڑیوں اور پھانسی گھاٹ کے ڈیتھ سیلوں میں روسو کے ''اعترافات'' لکھنے میں مصروف ہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مٹھی بھر مغرب پرستوں اور امریکی چنڈوخانے کے ان طاغوتی چوہوں کے نزدیک کسی بھی ''انسان کا سب سے بڑا بنیادی حق'' توہین رسالت کرنا ہے۔ توہین رسالتؐ ایکٹ کے وجہ سے ذہنی اور فکری عدم توازن کے شکار یہ دانشور اپنے اس بنیادی حقوق سے محروم ہو رہے ہیں، اس لیے وائٹ ہاؤس کے مندر میں براجمان آزادی کے مندر کے ''چیف پروہت'' کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں''۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ مغرب گستاخیِ رسولؐ کو آزادیٔ اظہار سے تعبیر کرتا ہے لیکن اس کے ہاں کسی شخص کو یہ جرأت نہیں کہ وہ ہولوکاسٹ (Holo Caust) پر ایک لفظ بھی ادا کر سکے۔ ہولوکاسٹ کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے دور اقتدار میں پولینڈ کے شہر شوئز میں بنائے گئے گیس چیمبرز میں تقریباً 60 لاکھ یہودیوں کو قتل کیا گیا۔ اس بنیاد پر یہودیوں کی نمائندہ تنظیم، ''نیشنل جیوش کانفرنس'' نے یورپی اقوام سے مطالبہ کیا کہ ''ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم کے دوران یہودیوں کا قتل عام کیا ہے، جس میں 60 لاکھ یہودی مارے گئے اور اب بہت تھوڑے سے یہودی باقی بچے ہیں جن کے پاس زمین کا کوئی ایسا خطہ موجود نہیں، جہاں وہ آزاد اور خود مختار حیثیت سے رہ سکیں،

لہٰذا انہیں دوبارہ زندگی کی شروعات کے لیے ایک علیحدہ ریاست دی جائے۔اس پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں اُن کو اسرائیلی ریاست الاٹ کردی گئی۔ بعد میں تحقیق ہوئی تو یہودیوں کا دعویٰ سراسر جھوٹا اور من گھڑت نکلا۔تب یہودیوں نے ایک قانون بنوا دیا کہ ہولوکاسٹ کی مبینہ صداقت کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص ہولوکوسٹ کے جھوٹ پر تحقیق کرے گا، وہ قابل گردن زدنی ہوگا۔ 19 جون 2004ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ نے حکومت کو یہ اختیار دیا کہ دنیا میں کبھی، کسی جگہ بھی اگر کوئی شخص 60 لاکھ کی تعداد کو کم بتانے کی کوشش کرے تو وہ اس پر مقدمہ چلاسکتی ہے اور اس ملک سے اسے نفرت پھیلانے کے جرم "Hate Criminal" کے طور پر مانگ سکتی ہے، گرفتار کرسکتی ہے اور سزا دے سکتی ہے۔جرمنی جیسا ملک سالانہ 50 ملین مارک آج تک اسرائیل کو ادا کر رہا ہے اور یہ جرمانہ 2030ء تک ادا کیا جائے گا۔اب وہاں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ کیا واقعی اُس وقت جرمنی میں 60 لاکھ کے قریب یہودی موجود تھے؟

جناب ضیاء الرحمٰن کشمیری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ہولوکاسٹ یہودی میڈیا کا گھڑا ہوا وہ سفید جھوٹ ہے جس نے مغرب کو مجبور کیا ہوا ہے کہ وہ یہودیوں سے ہمدردی رکھے اور ان کے ساتھ ہر طرح کا مالی، سیاسی، دفاعی اور سفارتی تعاون بھی جاری رکھے۔اب تک مغربی ممالک اس جھوٹ کے عوض یہودیوں کو ارض فلسطین کے علاوہ کھربوں ڈالر کی رقم بھی دے چکے ہیں لیکن یہودیوں کا پیٹ ہے کہ بھرنے میں ہی نہیں آ رہا۔مغربی ممالک یہودیوں کے ہمدرد بننے اور ان کی جائز و ناجائز حمایت کے ساتھ ساتھ انہیں ڈالر دینے پر کیوں مجبور چلے آ رہے ہیں، اس کے پیچھے یہی ''ہولوکاسٹ'' کی من گھڑت داستان کارفرما ہے۔ یہودیوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ایڈولف ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم کے دوران 60 لاکھ یہودیوں کا قتل عام کیا اور اس فرضی قتل عام کو انہیں ''ہولوکاسٹ'' کا نام دے دیا۔ ہولوکاسٹ (HOLO CAUST) یونانی زبان سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے ''آگ کے ذریعے ہونے والی عالمگیر تباہی''۔اس کا عبرانی زبان میں مترادف لفظ ''شواح'' ہے۔اسی لیے یہودی ''ہولوکاسٹ'' کی یاد میں ہر سال جنوری میں ''یوم شواح'' مناتے ہیں۔ یہودی اسکالر بن زیان و ینواز نے پہلی مرتبہ 1942ء میں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''شواح'' تاریخ کی عظیم ترین تباہی ہے۔''ہولوکاسٹ'' کا

پروپیگنڈہ یہودیوں نے اس قدر وسیع پیمانے پر کیا کہ اس مفروضے نے یورپی اقوام کو احساس جرم میں مبتلا کر دیا اور ان کے نزدیک یہودی دنیا کی مظلوم ترین مخلوق بن گئے۔

یہودیوں نے ''ہولوکاسٹ'' کا پروپیگنڈہ اس قدر منظّم منصوبہ بندی سے کیا کہ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت پر تحقیق کرنا جرم بن گیا اور ایسا کرنے والے پر ''نسل پرست'' ہونے کے الزامات عائد کیے جانے لگے۔ اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ ایڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) یہودی قوم سے بہت سخت نفرت کرتا تھا۔ اس نفرت کی وجہ یہودی قوم کا وہ سازشی کردار تھا جو وہ ان دنوں ادا کرتے تھے اور آج بھی دنیا بھر کا امن تباہ کرنے میں اسی مکار قوم کا پورا پورا ہاتھ ہے۔ 1933ء میں جب ہٹلر نے جرمنی کا اقتدار سنبھالا تو یہودیوں کی عادات بد اور قابل نفرت کردار نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان سے جلد از جلد چھٹکارا لے، اس سلسلے میں اس نے ایسی پالیسیاں اپنانا شروع کر دیں جن سے یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکا جا سکتا تھا۔ اس وقت جرمنی میں یہودی اقلیت میں ہونے کے باوجود ہر شعبہ ہائے زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ طب، تعلیم، تجارت، میڈیا الغرض ہر طرف انہی کا کنٹرول تھا اور یہ لوگ ایک منظّم ترین لابی کی صورت میں جرمنی کو اپنی مرضی سے چلا رہے تھے۔ ہٹلر نے 1935ء میں ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے کسی بھی غیر جرمن نسل کے فرد کو جرمنی میں ملازمت نہ دی جا سکتی تھی۔ اس قانون کا مقصد یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو سرکاری اداروں کے کلیدی عہدوں سے ہٹانا تھا جس میں ہٹلر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ہٹلر نے ایسی سرکاری پالیسیاں وضع کیں جن سے تجارت، میڈیا، طب اور دوسرے شعبوں سے بھی یہودیوں کو بے دخل ہونا پڑا۔ 1939ء تک بہت سے جرمن یہودی دوسرے ممالک میں منتقل ہو گئے تھے لیکن پھر بھی بہت سے ایسے تھے جو نامساعد حالات کے باوجود کسی نہ کسی طرح جرمنی ہی میں کاروبار چلانے میں کامیاب رہے۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو جرمنی میں موجود یہودیوں نے جرمنی سے غداری کرتے ہوئے اتحادیوں کے لیے جاسوسی کا فریضہ سنبھال لیا۔ اس غداری کی اطلاع جب ہٹلر کو ملی تو وہ غضبناک ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے یہودیوں سے متعلق یہ تاریخی الفاظ کہے: ''خدا نے تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے، انسان، حیوان اور یہودی۔ یہودیوں کے ہوتے ہوئے زمین پر انسان اور حیوان کبھی بھی امن و سکون سے زندہ نہیں رہ سکیں گے''۔ (یہ الفاظ ایک

حقیقت کا روپ دھارے آج ہمارے سامنے موجود ہیں)۔

ہٹلر نے غداری کے جرم میں جرمنی میں بسنے والے تمام یہودیوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ یہودیوں کو حراست میں لے کر انہیں مختلف کیمپوں میں رکھا گیا۔ ان کیمپوں کو اتحادی ممالک ''باڑے'' کہا کرتے تھے۔ یہی وہ کیمپ ہیں جن کی بنیاد پر یہودیوں کو ہولو کاسٹ کا افسانہ گھڑنے کا موقع ملا۔ یہودیوں نے دنیا بھر میں یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ان حراستی کیمپوں میں ہٹلر نے گیس چیمبرز بنوائے تھے جن میں یہودیوں کو گھسنے پر مجبور کیا جاتا اور پھر باہر سے تالا لگا کر ان کمروں میں زہریلی گیس چھوڑ دی جاتی، جس سے وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے تو بعد میں ان کی لاشوں کو برقی بھٹی میں ڈال کر جلا دیا جاتا۔ اس سلسلے میں یہودیوں کا کہنا ہے کہ صرف 1942ء میں ''آشو ونز کیمپ (Auschwitz Camp)'' میں 27 لاکھ یہودی قتل کیے گئے۔

اس ضمن میں بعض معروف محققین نے از سر نو تحقیقات کیں، جن کی رو سے یہ بات پایہ ثبوت کو جا پہنچی ہے کہ ہولو کاسٹ ایک فرضی داستان ہے۔ پہلی بات، یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ ایڈولف ہٹلر نے یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کیا ہو۔ ہٹلر ذہنی طور پر یہودیوں کے انتہائی خلاف ضرور تھا لیکن اس نے کسی منصوبہ بندی کے تحت ایسا کوئی کام نہیں کیا جسے ہولو کاسٹ قرار دیا جا سکے۔ دوسری بات بھی نہایت اہم ہے کہ یہودیوں کے پروپیگنڈے کے مطابق ہٹلر 60 لاکھ یہودیوں کا قتل عام کیا تھا، جبکہ تاریخی حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جرمنی کے مقبوضہ علاقوں میں اس وقت یہودیوں کی کل آبادی 20 لاکھ سے زائد نہ تھی۔ ایسی صورت میں ہٹلر پر 60 لاکھ یہودیوں کے قتل کا الزام 20ویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟

''ہولو کاسٹ'' کے متعلق شک و شبے کا اظہار کرنا بہت سے مغربی ممالک میں غیر قانونی ہے۔ دنیا کے 10 ممالک تو ایسے ہیں جہاں ہٹلر کے ہاتھوں مرنے والے یہودیوں کی تعداد پر رائے زنی کرنا بھی جرم ہے اور اس کی باقاعدہ سزا مقرر ہے۔ اس کے علاوہ بعض ممالک مثلاً امریکہ اور برطانیہ میں ''ہولو کاسٹ'' کے حوالے سے باقاعدہ قوانین تو موجود نہیں ہیں لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ہولو کاسٹ پر رائے زنی یا اعتراض کرنے والوں کو نسلی منافرت پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ وہی مغربی ممالک اور

ان کا متعصب میڈیا ہے جو چند سال پہلے ناروے کے ایک یہودی اخبار جلینڈز پوسٹن کی طرف سے پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے پر اس توہین رسالت ﷺ کے مرتکب اخبار کے لیے ڈھال بن گئے تھے۔ تعجب ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی پر (اگرچہ وہ چاند پر تھوکنے کے مترادف تھی) آزادئ اظہار رائے کی آڑ لینے والے، ہولو کاسٹ جیسی افسانوی داستان پر ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے اور اس پر علمی بحث مباحثہ بھی ناجائز اور خلاف قانون تصور کیا جاتا ہے۔ کیا اظہار رائے کی آزادی سے متعلق مغرب کا یہ دوغلا رویہ ثابت نہیں کر رہا کہ وہ خود نسل پرست اور تعصب کے تنگ وتاریک خول میں بند ہیں؟

چونکہ ''ہولو کاسٹ'' کے مفروضے کی وجہ سے ساری مغربی اقوام احساس جرم میں مبتلا تھیں (مغرب کے اس احساس جرم کو بھی فرضی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، جب کہ یہودیوں کے ساتھ تعاون و ہمدردی کی اصل وجہ اسلام کے خلاف ازلی دشمنی ہی تھی) لہٰذا انہوں نے اجتماعی تحریک چلائی جس کے نتیجے میں **14** مئی **1948**ء کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ارض فلسطین پر اسرائیل نام کی ناجائز ریاست وجود میں آئی۔ اس طرح یہودی ارض فلسطین پر ایک جھوٹ کے ذریعے اپنی ریاست بنانے میں کامیاب ہو گئے جس کا خواب وہ کئی صدیوں سے دیکھتے چلے آ رہے تھے، یہی ''ہولو کاسٹ'' کا ڈرامہ رچانے کا اصل مقصد تھا۔''

چند سال پیشتر معروف تاریخ دان ڈیوڈ ارونگ **(David John Cawdell Irving)** کو آسٹریلیا کی عدالت نے محض اس لیے تین سال کی سزا سنا ڈالی کہ اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہولو کاسٹ میں یہودیوں کے قتل کی تعداد اتنی نہیں جتنی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے۔ بعد میں اُس نے جیل جانے کے خوف سے عدالت میں بیان دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اور میں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ وہ آسٹریلیا کا شہری نہیں مگر اُسے آسٹریلیا میں سزا دی گئی کیونکہ یورپ میں باقاعدہ یہ قانون ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی شخص ہولو کاسٹ کو چیلنج نہیں کر سکتا، خلاف ورزی کی صورت میں اسرائیل کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے گرفتار یا اغوا کر کے لے آئے اور اُسے سزا دے۔

امریکہ کے سابق صدر نکسن نے ایک بار کہا تھا کہ پروپیگنڈہ پر خرچ کیا گیا ایک ڈالر، اسلحہ پر خرچ کیے گئے دس ڈالر سے بہتر ہے اور بلاشبہ یورپی دنیا نے اس کلیہ کا فراخ دلی

کے ساتھ استعمال کیا۔عجیب بات ہے کہ محض پروپیگنڈے کے زور پر دنیا کو یہ باور کرایا گیا کہ ہولوکاسٹ میں 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔ جہاں یہودیوں کی مظلومیت کی داستانیں گھڑی گئیں، وہیں ہٹلر کے جھوٹے اقوال پیش کر کے اس کی کردارکشی کی گئی اور اس کے وزیر اطلاعات گوئبلز کو جھوٹوں کا آئی جی بنا کر پیش کیا گیا۔آپ نے ہٹلر سے منسوب یہ بات بھی سنی ہوگی کہ جھوٹ اس تواتر کے ساتھ بولو کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگیں۔ یہ قول یہودیوں نے گھڑا اور انہیں پر صادق آتا ہے کہ جھوٹ کو اس قدر تواتر اور تیقن کے ساتھ بیان کرو کہ زمانہ سچ مان لے۔ ہولوکاسٹ کے ضمن میں انہوں نے نہ صرف یہی حکمت عملی اختیار کی بلکہ حقائق کا گلا گھونٹنے کے لیے ہولوکاسٹ پر بحث وتمحیص کے دروازے بھی بند کر دیئے۔ بیشتر ممالک میں ہولوکاسٹ کے انکار کو جرم قرار دلوایا اور پھر خود بھی یہ قانون بنایا کہ جو شخص ہولوکاسٹ پر سوال اٹھائے یا اس میں مرنے والے یہودیوں کی تعداد 60 لاکھ سے کم بتائے، اسے "Hate Criminal" قرار دیتے ہوئے نہ صرف مقدمہ چلا کر سزا دی جاسکتی ہے بلکہ اگر یہ جرم کسی اور ملک میں سرزد ہوا ہو تو مجرم کی حوالگی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔آج تک جس نے بھی ہولوکاسٹ پر سوالات اُٹھانے کی کوشش کی، اسے نشان عبرت بنا دیا گیا۔ Ernest Zundel جرمن محقق، مصنف اور پبلشر ہیں۔انہوں نے ایک کتابچہ شائع کیا ''کیا واقعی چھ ملین مارے گئے'' اس حق گوئی کی پاداش میں انہیں امریکی پولیس نے گرفتار کیا اور کینیڈا ڈی پورٹ کر دیا۔ وہاں دو سال تک زیر حراست رکھنے کے بعد انہیں جرمنی کے حوالے کر دیا گیا، جہاں اس کے خلاف مقدمے کا آغاز ہوا اور ہولوکاسٹ کا انکار کرنے کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ جین میری لی پین، راجر گراوڈی، یورگن گراف، گیر بارڈ فوسٹر، گیسٹن ارمانڈ، جرمار روڈ ولف، رابرٹ فائریسن، وولف گینگ فروچ، سلویا اسٹالس، ڈیرک زمرمین، رچرڈ ولیمسن، میلکم روس اور ڈوگ کولنز سمیت کتنے ہی تاریخ دان ہیں جنہوں نے حقائق سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی تو انہیں بھاری جرمانہ اور جیل کی ہوا کھانا پڑی۔آپ کسی سرچ انجن پر جا کر ٹائپ کریں Crime of Denying Holocaust اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی طویل فہرست سامنے آجائے گی۔ آسٹریا، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، چیک ری پبلک، رومانیہ، پرتگال اور اسپین سمیت بیسیوں ممالک میں آزادی اظہار کے اس دور میں بھی ہولوکاسٹ کا انکار کرنا یا اس سے متعلق سوالات اُٹھانا ناقابل معافی جرم ہے۔

اس سلسلہ میں حافظ عبدالواحد سجاد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ہولوکاسٹ'' کے اس پس منظر میں اگر کوئی مجرم بنتا تھا تو وہ ہٹلر تھا مگر پوری جرمن قوم پر فرد جرم عائد کی گئی اور 38 لاکھ یہودیوں نے خود کو قتل عام سے بچ جانے والے مظلوم ظاہر کر کے جرمنی سے تاوان کا مطالبہ کیا جو اب تک وہ پینشن کی صورت میں وصول کر رہے ہیں اور اسرائیل کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے وہ ''ہولوکاسٹ'' کے نسخہ کو استعمال کر کے فوراً جرمنی سے کام کروالیتا ہے۔

آئزن ہاور (Eisen Hower) (1890،1969ء) جو امریکہ کے 34 ویں صدر، ونسٹن چرچل (Winston Churchill) (1874،1965ء)، فرانس کے جنرل چارلس ڈیگال (1890ء، 1970ء) تینوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں جنگ کے تمام حالات و واقعات اور ذاتی مشاہدات بیان کیے مگر ان میں ''ہولوکاسٹ'' کا تذکرہ کہیں نظر نہیں آتا، خصوصاً چرچل کی کتاب جس پر اسے نوبیل ادبی انعام بھی ملا، 6 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چرچل نے جرمنی میں یہود کی تکالیف، مشکلات اور مصائب کی وجوہات کا جائزہ بھی لیا ہے مگر کسی گیس چیمبر کا ذکر ہے نہ یہود کے قتل عام کا، پھر جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی افواج کے تشکیل کردہ تحقیقاتی کمیشن نے 3 برس کی چھان پھٹک کے بعد 1948ء میں رپورٹ دی کہ جرمن کیمپوں میں کوئی شخص زہریلی گیس سے نہیں مرا۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر یہ افسانہ تھا تو پھر محققین نے سچ اور جھوٹ کو واضح کرنے کے لیے مندرجہ بالا حقائق دنیا کے سامنے کیوں نہیں رکھے؟ تو اس حوالے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ غیر جانبدار مصنفین اور مؤرخین نے اس ڈرامے کی حقیقت بیان کر دی مگر دباؤ، طاقت اور قتل و غارت کے ذریعے سچ کو سامنے نہیں آنے دیا گیا، جن لوگوں نے سچ سامنے لانے کی کوشش کی، انہیں راستے سے ہٹا دیا گیا یا یہ راستہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

پروفیسر فارلین اولین فرد تھے جنہوں نے گیس چیمبرز کے متعلق حقائق دنیا کے سامنے رکھے اور ثابت کیا کہ ''ہولوکاسٹ'' صرف ایک ڈراما ہے۔ اس کی پاداش میں پہلے وہ یونیورسٹی ملازمت سے فارغ اور بعد میں قتل کر دیے گئے۔ معروف فرانسیسی مؤرخ فرانکوس ڈیراٹ کو اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ انہوں نے ایک ایسا بروشر شائع کیا جس میں اس ڈرامے کا مقصد اسرائیل کے قیام کے لیے ہمدردیاں سمیٹنا بتایا گیا تھا۔ یہی بات ایک امریکی براڈ کاسٹر

ایڈگرا سٹیل نے کہی ہے۔

ہنری ریکیورز نے Holocaust پر مقالہ لکھا، اس کے دفاع اور انٹرویو میں کامیابی کے باوجود انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ دی گئی۔ ڈاکٹر سٹیگلش نے MYTH of Auschtwitz لکھی تو تین قاتلانہ حملے ہوئے اور ڈاکٹریٹ کا اعزاز بھی واپس لے لیا گیا۔ پھر پیری گویلم نے "Annales Dhistorie Revislonniste"" چھاپی تو حملوں اور بھاری جرمانوں کے ذریعے پبلشنگ کے شعبے سے نکال کر دم لیا۔ زینڈال نے "Did six Million Really Die" لکھ کر سزائے موت پائی۔ بٹز نے "The Mythos of Auschtwitz" تحریر کر کے مفروضوں کو براہین سے رد کیا تو اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔ راجر گیر نے The Founding myths of the Israel Policy میں گیس چیمبرز کے ڈرامے کو بے نقاب کیا تو مقدمات کا سامنا کرنا پڑا اور الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد کسے ہمت ہوتی کہ وہ اس افسانہ کی حقیقت بیان کرتا''۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی، 15 ستمبر 2014ء)

اس وقت 104 ممالک میں یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ 47 لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے 55 لاکھ اسرائیل میں رہتے ہیں۔ وہ چاہے دنیا کے کسی بھی ملک میں رہتے ہوں، اپنے ملک سے مخلص اور متحد ہیں، ان کا ایک ہی مقصد ہے: اسرائیل کا تحفظ۔ دنیا بھر کے یہودی اپنی آمدن میں سے سالانہ 7 ارب ڈالر اسرائیل کو عطیہ کرتے ہیں۔ حیرانی ہے کہ اس پدی برابر ملک نے امریکی اور مغربی ممالک کی عدالتوں بلکہ بین الاقوامی عدالت انصاف میں ایسا قانون بنوا دیا ہے کہ ''ہولوکاسٹ'' کے خلاف کوئی بولے یا نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کے کوائف اور اعداد و شمار کو چیلنج کرے یا اختلاف کرے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اسرائیل کے اس مطالبہ اور مغرب کی ہولوکاسٹ کے خلاف قانون سازی کو اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کر لیا ہے جبکہ دوسری طرف عیسائیت کے بعد دنیا کے سب سے پہلے اور بڑے دین اسلام کے مقتدا و پیشوا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلاف جو بھی بدزبانی اور سوقیانہ پن اختیار کیا جائے، اسے آزادیٔ صحافت، آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کی آڑ میں جائز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مغربی تہذیب جس کا چہرہ بظاہر روشن لیکن اندروں چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ اس کے مقابلہ میں 56 اسلامی ممالک میں ایک ارب 50 کروڑ سے زائد مسلمان

رہتے ہیں۔ ان ممالک کی اپنی تنظیم OIC او آئی سی ہے۔ کیا یہ سب ممالک سفارتی سطح پر اقوام متحدہ پر زور نہیں دے سکتے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس پر ایک عالمی قانون بنایا جائے کہ کوئی شخص خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو، اگر مسلمانوں کے رسول اعظم حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کرے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہودیوں کی دل جوئی کے لیے اقوام متحدہ کی سطح پر قانون سازی کی جاسکتی ہے تو عصمت انبیا بالخصوص حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس کے لیے قانون سازی کیوں نہیں ہوسکتی؟ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے اسلامی حکمران دینی غیرت وحمیت سے سرشار ہوں ورنہ مغرب کے در پر سجدہ ریز ہونے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔

معروف شاعر اور ادیب جناب منصور آفاق اپنے مضمون ''آزادی اظہار کا دوہرا معیار'' میں لکھتے ہیں:

''ٹرین پر برمنگھم سے لندن جاتے ہوئے میری ملاقات آسٹریا کے ایک یہودی شاعر سے ہوئی، اس نے مجھے ہولوکاسٹ کے موضوع پر اپنی یہ خوبصورت نظم سنائی۔

''ہولوکاسٹ...... ایک ہیری کہن
وقت پر بجتا ہوا پیانو کا خاموش نوٹ
ہولوکاسٹ...... لاکھوں لوگوں کا سفر
اپنے مرے ہوئے دوستوں کی روحوں کی تلاش میں
ہولوکاسٹ...... گندے نالے میں گرتے ہوئے پانی تشدد آمیز زوردار آواز صرف

ایک سانس کے لیے ہولوکاسٹ...... ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کے گھاس پر بکھرے ہوئے سیکڑوں ٹکڑے جنہیں جوڑا نہیں جاسکتا ہولوکاسٹ...... کالے جنگلوں میں کبھی نہ ختم ہونے والا سفر سورج کو چھپانے والا...... ایک کالا بادل گرم پتھروں کی آگ پر ننگے پاؤں چلنے کا عمل ہولوکاسٹ...... ایسے سایوں کے درمیان چل رہا ہے جو کبھی نہ دیکھے گئے ہیں اور نہ سنے گئے ہیں مگر موجود ہیں۔ ہولوکاسٹ...... ہنگامہ بھری سرگوشیوں سے ٹوٹی ہوئی خاموشی'' ...... میں نے نظم سن کر اس سے کہا کہ ''نظم بہت اچھی ہے مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہولوکاسٹ محض ایک افسانہ ہے'' کہنے لگا ''ہولوکاسٹ...... یہودیت پر ظلم کی وہ آخری انتہا ہے جس کی پیشگوئی تورات میں موجود ہے۔ تورات کے مطابق بنی اسرائیل اپنے گناہوں کے کفارے کے طور

پر جلتی ہوئی بھٹیوں میں 60 لاکھ جانوں کی قربانی دیں گے تو ارض مقدس پر ان کی مراجعت ان کے نصیب میں لکھی جائے گی۔ اگر تمہیں یقین نہیں تو میرے ساتھ آسٹریا آؤ...... سچائی تمہارے سامنے آ جائے گی''۔

میں نے کہا ''کسی انگریز نے لکھا ہے کہ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیت کی اتنی بڑی تباہی نہیں ہوئی تھی کہ اسے ہولوکاسٹ کہا جائے'' اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا ور کہا اعداد و شمار کے مطابق اس ہولوکاسٹ میں تقریباً 1.5 ملین بچے قتل ہوئے، یہودیوں کے علاوہ پانچ ملین سے زائد دوسرے لوگ مارے گئے جن کا تعلق پولینڈ اور کیتھولک مذہب سے تھا، جہاں تک یہودیوں کے قتل عام کے اعداد و شمار کا تعلق ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تقریباً چھ ملین یہودی ہلاک کیے گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ہولوکاسٹ کے دوران یورپ کی دو تہائی یہودی آبادی ختم کر دی گئی اور اگر اسے دنیا کی آبادی پر منطبق کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں رہنے والے ایک تہائی یہودیوں کو ہلاک کر دیا۔ لیکن تمہیں تب یقین آئے جب تم میرے ساتھ آسٹریا جاؤ گے۔ تم وہاں میرے مہمان ہوگے''۔ میں نے اس کی دعوت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا ''ہولوکاسٹ پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ جیوئش انسائیکلو پیڈیا نے جنگ عظیم سے قبل کے ایڈیشن میں یہودیت کی عالمی آبادی ایک کروڑ پچاس لاکھ لکھی تھی۔ اگر 60 لاکھ یہودی ہٹلر کے قتل گاہوں کی نذر ہوگئے تو 1945ء کے اعداد شمار میں ان کی تعداد 90 لاکھ ہونی چاہیے تھی مگر اس وقت کی جیوئش انسائیکلو پیڈیا کہتی ہے کہ کمی نہیں ہوئی بلکہ آبادی بڑھ کر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہوگئی ہے''۔ کہنے لگا ''یہ کوئی اعداد و شمار کی غلطی لگتی ہے، ممکن ہے پرنٹنگ کے وقت ان کی پروف ریڈنگ ٹھیک طرح نہ ہوسکی ہو۔ لیکن ان سب سوالوں کے جواب تمہیں آسٹریا میں مل سکتے ہیں۔ آسٹریا نہیں تو میرے ساتھ یورپ کے کسی اور ملک میں چلے چلو، وہاں بھی ان سوالوں کے جواب موجود ہیں''۔

میں نے وہاں جانے سے معذرت کرتے ہوئے ایک سوال اور داغ دیا کہ ''یہ بھی ایک اعتراض ہے ہولوکاسٹ کے حوالے سے کہ مجموعی طور پر جنگ کے بعد 38 لاکھ یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس ہولوکاسٹ سے بچ جانے والے مظلوم ہیں۔ 60 لاکھ یہودی ہٹلر نے مار دیئے تھے۔ یوں ان تمام یہودیوں کی تعداد 98 لاکھ ہو جاتی ہے مگر اس وقت اعداد و شمار کے مطابق یورپ کا جو علاقہ جرمنی کے قبضے میں آیا تھا، اس میں کل یہودی آبادی 24 لاکھ

تھی‘‘۔ اب اس کے ماتھے کی لکیریں گہری ہونے لگی تھیں، کہنے لگا ’’سب اعداد و شمار کی غلطیاں ہیں۔ انسانی قربانی کی اس بڑی حقیقت کو اعداد و شمار کے رجسٹر سامنے رکھ کر نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ تم میرے ساتھ یورپ چلو تو سہی، دیکھو تم بالکل مطمئن ہو جاؤ گے‘‘۔

میں نے پھر اس کی دعوت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ ’’ہولوکاسٹ کے خلاف لکھی جانے والی کتاب میں لکھا گیا ہے کہ اس دور کے بڑے بڑے لوگوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ہولوکاسٹ کا کہیں ذکر موجود نہیں، خاص طور پر جنرل ڈوائٹ ڈی آئزن جو امریکہ کے 24ویں صدر تھے، ان کی سرگزشت میں اس دور کے باقی تمام حالات تو درج ہیں مگر ہولوکاسٹ کہیں نہیں ہے۔ انہوں نے کہیں گیس چیمبروں کا ذکر نہیں کیا۔ جنگ عظیم دوم کے دنوں میں برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل نے چھ جلدوں پر مشتمل جنگ کے پس منظر، واقعات اور نتائج کی تاریخ قلمبند کی ہے مگر اس میں بھی ہولوکاسٹ کا کہیں ذکر موجود نہیں‘‘۔

(www.hamariweb.com)

اب وہ مسکرا دیا اور کہنے لگا، دراصل تاریخ لکھنے والا جتنا ہی غیر جانبدار کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ اس کی پسند و ناپسند کا بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری باتیں آسٹریا میں کریں گے۔ تم مجھے بہت پسند آئے ہو، تم کہو تو میں لندن سے آسٹریا تک تمہارا ائیر ٹکٹ خریدنے پر بھی تیار ہوں‘‘ میں نے ائیر ٹکٹ کی آفر پر کہا ’’ہاں اب آسٹریا جانے کا سوچا جاسکتا ہے مگر میں نے یہ بھی کہیں پڑھا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد اتحادی طاقتوں نے جو تحقیقاتی کمیشن قائم کیا تھا، اس نے تین برس کی چھان بین کے بعد جو رپورٹ دی تھی، اس میں بھی لکھا گیا کہ جرمنی کے نظر بندی کے کیمپوں میں کوئی شخص زہریلی گیس سے نہیں مرا‘‘۔ کہنے لگا ’’یہ سب باتیں تفصیل سے کریں گے، آسٹریا جا کر...... تمہیں آج میرے ساتھ آنے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے نا‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’نہیں کوئی پرابلم تو نہیں سوائے اس کے کہ وہاں جا کر اس موضوع پر بات نہیں کر سکتا...... مجھے علم ہے کہ ہولوکاسٹ کو جھٹلانے کی یورپ میں کم سے کم سزا تین سال ہے‘‘۔

آزادئ اظہار کے علم بردارو! ہولوکاسٹ پر گفتگو کرنا جرم ہے، اگر ہولوکاسٹ واقعی سچ ہے تو اسے جھٹلانا جرم ہونا چاہیے کیونکہ اس سے یہودیوں کو تکلیف ہوتی ہے مگر یورپ، پیغمبر انسانیت، چارہ ساز بیکساں حضرت محمد ﷺ کے بارے میں بکواس کرنے پر پابندی کیوں نہیں

لگاتا۔ یہ تو اس سے کہیں بڑا جرم ہے، اس سے دنیا کی ایک ارب سے زیادہ آبادی کو تکلیف ہوتی ہے۔ اب یہ دنیا میں دوہرا معیار زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ یاد رہے مغرب خصوصاً امریکہ میں ہٹلر کا نشان سواسٹیکا Swastika بنانے، لہرانے، شائع کرنے، پینٹ کرنے یا کسی بھی طرح استعمال کرنے پر سخت پابندی اور قابل جرم ہے۔ خلاف ورزی پر قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ امریکہ میں کوئی شخص اس نشان کی شرٹ پہن کر آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا بلکہ ایسی شرٹس کی خرید وفروخت بھی جرم ہے۔ ہٹلر کے اس امن نازی نشان سے یہودی چڑتے ہیں۔ انہیں اس نشان میں اپنی اصلیت نظر آنے لگتی ہے۔ امریکی حکومت ایسے معاملات کو نظرانداز نہیں کرتی بلکہ اس کا قانون آنکھیں بدل لیتا ہے۔ آزادی اظہار کے علمبردار امریکہ سمیت پورے یورپ میں کسی صحافی کی جرأت نہیں کہ وہ کسی اخبار، رسالے، کتاب یا اپنی تقریر میں ہٹلر کا یہ تاریخی قول دہرا دے۔ ’’میں چاہتا تو دنیا کے تمام یہودیوں کو ختم کرسکتا تھا مگر کچھ یہودی میں نے اس لیے چھوڑ دیئے تاکہ دنیا کو پتا چل سکے کہ میں نے یہودیوں کو کیوں قتل کیا؟‘‘ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے ان پر اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں۔ مغرب میں یہودی مخالف ہونا جرم ہے، اس پر سزا اور جرمانہ ہے۔ جبکہ وہاں اسلام دشمن ہونا ہر آزاد شہری کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت، آئین اور قانون اسے مکمل تحفظ اور سرپرستی فراہم کرتے ہیں۔ 2006ء میں ایک معروف بھارتی سرمایہ کار ستیش سبھلوک نے ممبئی بھارت میں ایک جدید ترین ریسٹورنٹ بنایا جسے ہٹلر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس پر دنیا بھر کے یہودیوں نے بھرپور احتجاج کیا جس پر ریسٹورنٹ کے مالک نے یہودیوں سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ریسٹورنٹ کا نام تبدیل کر دے گا۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے کہا کہ ہماری طرف سے اپنایا گیا نام غیر مناسب تھا اور اس کا مقصد کسی طور پر ہٹلر کے نظریات اور عزائم کو پیش کرنا نہیں تھا اور اس نام کے استعمال سے جو اشتعال پھیلا، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مغرب کی آزادئ اظہار کہاں چلی جاتی ہے؟ کینیڈا میں 2003ء میں ڈیوڈ اھانیکے کے خلاف الزام لگایا گیا کہ اس نے یہودیوں کے خلاف ایک رپورٹر کے سامنے چند جملے کہے تھے۔ 2005ء میں اسے مجرم قرار دے کر ایک ہزار ڈالر جرمانہ کردیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے پیرس، فرانس میں دنیا کے سب سے بڑے فیشن ڈیزائنر جان گیلیانو (John Galliano) نے ایک تقریب میں صرف اتنا کہا

تھا ”میں ہٹلر کو پسند کرتا ہوں!“ اس پر پولیس نے فوراً ڈیزائنر کو گرفتار کرلیا، فرنچ کمپنی نے اسے ملازمت سے فارغ کردیا اور حکومت نے اس سے فرانس کا سب سے بڑا سول ایوارڈ بھی واپس لے لیا۔ یہ بات بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث بنے گی کہ انٹرنیٹ پر ہر شخص کو بولنے اور لکھنے کی مکمل آزادی ہے مگر یہاں آپ ہولوکاسٹ کے خلاف کوئی لفظ نہیں بول سکتے۔ کوئی فلم اپ لوڈ نہیں کرسکتے، فیس بک اور ٹویٹر وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کی گفتگو یا تحریر فوری ختم کردی جائے گی اور آپ کا انٹرنیٹ پر داخلہ ممنوع ہوجائے گا۔ لیکن افسوس! یہاں اسلام کے خلاف سب کہنے اور بولنے کی پوری آزادی ہے۔

جناب سلیم شیخ اپنے مضمون ”مغرب کا اصل چہرہ“ میں لکھتے ہیں:

”ہالینڈ کی عدالت نے ایک مسلم گروپ پر ایک کارٹون شائع کرنے کی وجہ سے 3200 ڈالر کا جرمانہ عائد کیا کیونکہ اس کارٹون میں یہ دکھایا گیا تھا کہ یہودیوں کے قتل عام (ہولوکاسٹ) کے واقعات من گھڑت تھے۔ سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے گروپ پر الزام کو برقرار رکھا۔ عدالت کا کہنا تھا کہ عرب یورپی لیگ (AEL) کی ویب سائٹ پر شائع ہونے والا کارٹون غیر ضروری طور پر دکھایا گیا“۔

غور کریں کہ گستاخانہ خاکے اظہار رائے کی آزادی لیکن ہولوکاسٹ کے کارٹون غیر ضروری ہیں۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ یورپی عدالت برائے انسانی حقوق جو آزادی رائے کو بہت اہمیت دیتی ہے اور اس کا بے حد دفاع اور احترام کرتی ہے مگر وہ جنگ عظیم سوئم کے دوران یہودیوں کے قتل عام (ہولوکاسٹ) سے انکار کو برداشت نہیں کرسکتی۔ ہالینڈ کے اس مسلم گروپ کا کہنا ہے کہ اس کا ارادہ ہولوکاسٹ سے انکار کرنا نہیں بلکہ لوگوں کو دکھانا تھا کہ آزادی رائے میں کس طرح دوہرے پیمانے اختیار کیے جاتے ہیں اور کس طرح اس میں تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ AEL گروپ نے یہ کارٹون اس وقت شائع کیا تھا جب ڈنمارک کے اخبار نے پیغمبر اسلام ﷺ کا کارٹون شائع کیا تھا۔ اب سوچیں اور غور کریں کہ ڈنمارک میں توہین آمیز خاکے دکھانا آزادی اظہار رائے ہے لیکن ہولوکاسٹ کے خلاف کارٹون دکھانا ناقابل برداشت ہے۔ کیا اس بات پر کوئی غور کرنے کو تیار ہے؟ کہاں ہے ہمارا وہ نام نہاد آزاد میڈیا جو کہ فیس بک اور یوٹیوب کی بندش پر تو مسلمانوں کی تنگ نظری اور قدامت پرستی کا رونا روتا رہتا ہے لیکن اس دہرے معیار پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی اور آپ

لوگوں نے کسی ایک چینل پر بھی اس بارے میں کوئی مذاکرہ تو کیا،کوئی خبر بھی نہیں سنی ہوگی۔کیا یہ دوہرا معیار نہیں ہے؟ دوسری جانب مغرب میں شخصی آزادی کا بڑا نام ہے۔لوگ مثال دیتے ہیں کہ جناب اہل مغرب فرد کی ذاتی رائے اور آزادی کا بڑا احترام کرتے ہیں، شاید ہم بھی اس بات پر یقین کر لیتے لیکن افسوس ہم اس بات کو جھوٹ کہتے ہیں اور ثابت بھی کر سکتے ہیں''۔(روزنامہ جسارت کراچی 13 دسمبر 2013ء)

فلسطین میں اسرائیل کی جارحیت سے اس کا مکروہ چہرہ پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہوگیا ہے۔فلسطین میں مظلوم اور نہتے مسلمانوں بالخصوص بچوں اور عورتوں پر ظلم کے خلاف آنکھیں بند رکھنا مغرب کا دہرا معیار بھی آشکار ہو چکا ہے۔''آزادی اظہار اور''آئی سی سی'' کی حیثیت'' کے عنوان سے جناب سید راشد احد لکھتے ہیں:

''حال ہی میں ایک حیرت انگیز انکشاف سامنے آیا ہے کہ نیویارک کے قریب واقع گرین وچ ویلیج میں موساد نے اپنا ایک محفوظ ٹھکانہ بنایا ہوا ہے اور یہیں سے وہ سینڈی ہک جیسے دہشت گردانہ واقعہ میں ملوث ہونے کے الزام کی نفی کی کوشش میں مصروف ہے جو کہ اسرائیل کے لیے ہلاکت خیز بدنامی کا سبب ہوا ہے۔اب جب کہ فلسطین اس پوزیشن میں ہے کہ وہ ہیگ کی انٹرنیشنل کریمنل کورٹ میں اسرائیلی جرائم سے پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرے، تو اسرائیل بھی اس فکر میں ہے کہ کسی طرح اس کے خلاف بلند ہونے والی ہر صدائے احتجاج کو خاموش کردے خواہ وہ فلسطینیوں کی جانب سے ہو یا کسی اور کی جانب سے۔اسرائیل نے پہلے ہی یورپ اور دوسرے علاقوں میں پریس ٹی وی کو بند کرانے کی کوشش کی ہے تاکہ اس طرح غزہ میں ہونے والی شکست کے نقصانات اور سینڈی ہک میں ملوث ہونے کی بدنامی کا سدباب کیا جاسکے۔ یورپی ممالک بالخصوص جرمنی، آسٹریا، فرانس، نیدر لینڈ، سوئٹزرلینڈ اور کینیڈا حتیٰ کہ امریکہ میں اسرائیل نے پریس سے متعلق نئے قوانین پاس کرانے کی کوششوں میں مدد دی ہے تاکہ مستقبل میں اسرائیل کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات کو ناکام بنایا جاسکے۔مثلاً جرمنی اس بات کے لیے آمادہ ہے کہ وہ ہر ایک کے خلاف خواہ وہ قانون دان ہو، سفارت کار ہو، صحافی ہو یا پروفیسر ہو، قانونی کارروائی کرے گا، اگر اس نے ایسا کوئی بیان دیا ہو یا ایسی کسی معلومات کی اشاعت کی ہو جو اسرائیل کے مفاد اور اس کی سلامتی کے خلاف ہو۔

جرمنی میں اب یہ جرم ہے کہ کوئی ایسی دستاویز تیار کی جائے، خواہ اقوام متحدہ یا انٹرنیشنل کریمنل کورٹ میں پیش کرنے کی غرض سے ہی سہی، جس میں اسرائیلی جرائم کے خلاف ثبوت وشواہد موجود ہوں۔ وہ قانونی ماہرین جو فلسطینی اتھارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں اور جنہیں فلسطینی ریاست کی خودمختاری اور بالخصوص بین الاقوامی طور سے اب تسلیم شدہ فلسطین میں ''نیتن یاہوکی یہودی آبادکاری کی نئی منصوبہ بندی'' کے حوالے سے اسرائیل کی حالیہ خلاف ورزیوں کے خلاف مقدمہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس وقت اسرائیل کی جانب سے اُنہیں قید و بند کا سامنا ہے۔ایسی رپورٹیں سامنے آئیں ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اخبار کے مدیران، مترجمین اور مصنفین حتیٰ کہ کمپیوٹر ماہرین کے خلاف بھی مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ اس معاملے میں عدالتی چارہ جوئی سے اقوام متحدہ اور انٹرنیشل کریمنل کورٹ کے ملازمین بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی ایک طویل تاریخ ہے جنہوں نے ہولوکاسٹ کی تاریخی روداد کو چیلنج کیا ہے۔

سیکڑوں دانشوروں اور ان کے مقدمے کی وکالت کرنے والے قانونی ماہرین حتیٰ کہ صحافی حضرات کو بھی محض اس بنا پر کہ انہوں نے یہودیوں سے متعلق مسائل میں قربانی کا بکرا بننے کے فلسفے (Victimization Dogma) کی پیروی نہیں کی۔ 15 سالوں پر محیط طویل قید و بند کی سزا کاٹی ہے۔ مزید برآں ہزاروں اساتذہ کو اس جرم میں معلّمی کے فرائض سے سبکدوش کیا جاچکا ہے اور بہتیرے صحافیوں کو اخبارات اور میڈیا چینلز سے برطرف کیا گیا ہے۔ اسی طرح بہتوں پر سفر کی پابندی عائد کی گئی ہے اور مذکوہ بالا مما لک ان حضرات کے لیے پولیس اسٹیٹ ثابت ہوئے ہیں جہاں ان کی سرگرمیوں کی کڑی نگہداشت کی جاتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ تاریخی روداد پر کسی نظرثانی کی بات کرنے والوں کو ہراساں کیا جاتا ہے، قید و بند کی سزائیں دی جاتی ہیں حتیٰ کہ انہیں شکنجے بھی دیے جاتے ہیں۔ یہ خیال بعید از امکان نہیں ہے کہ اسرائیلی پالیسیوں کے بہت سارے ناقدین کی غیر متوقع اور مشکوک اموات آزادیٔ اظہار رائے کا گلا گھونٹ دینے کی مہم کا حصہ ہوں''۔ (پندرہ روزہ ''معارف فیچر'' کراچی، یکم فروری 2012ء)

ٹوئٹر (Twitter) دنیا کے مقبول ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس میں ایک ہے۔ اس سائٹ نے جرمن حکومت کی سفارش پر نازی نظریے کے حامی جرمن صارفین کے اکاؤنٹس بلاک کر دیے ہیں۔ ٹوئٹر کے اس فیصلہ کے بعد صرف جرمنی میں اس سائٹ کے صارفین،

نازی نظریہ کے حامیوں کے ٹوئٹس تک رسائی حاصل نہیں کر پائیں گے لیکن باقی پوری دنیا کے صارفین ان ٹوئٹس کو دیکھ سکیں گے۔ واضح رہے کہ یہ پہلی بار ہے جب ٹوئٹر نے اپنی مقامی سنسرشپ سے متعلق پالیسی کا نفاذ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس کی پالیسی جنوری 2012ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس پالیسی کے تحت اگر ٹوئٹر پر شائع ہوئے پیغام یا ٹوئیٹس کسی ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو انہیں مقامی طور پر بلاک کر دیا جاتا ہے اور اسی پالیسی کے تحت جرمنی میں نازی نظریہ رکھنے والے صارفین کے ٹوئٹس بلاک کر دیے گئے ہیں۔ کمپنی کے جنرل کاؤنسل الیکس میگریولی (Alex Macgillivray) نے سائٹ پر وہ خط بھی شائع کیا ہے جو جرمنی کی پولیس نے انہیں بھیجا تھا۔ جرمن پولیس نے اس خط کے ذریعے ٹوئٹر سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے ملک میں ان لوگوں کے ٹوئٹس بلاک کر دے جو نازی نظریہ رکھتے ہیں۔

دسمبر 2015ء میں عالمی شہرت یافتہ سرچ انجن ''گوگل'' (Google) اور اسرائیل کے درمیان فلسطین مخالف سمجھوتے کا انکشاف ہوا۔ معاہدے کے تحت اسرائیل کو ویڈیو شیرنگ ویب سائٹ ''یوٹیوب'' (Youtube) پر فلسطینیوں کی جانب سے اسرائیل کے خلاف پوسٹ کردہ مواد کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق اسرائیل کے نائب وزیر خارجہ سمیت کئی دوسرے عہدیداروں نے اعتراف کیا کہ گوگل اور اسرائیل کے درمیان باہمی تعاون کا معاہدہ نیویارک میں طے پایا تھا۔ اسرائیلی وزارت خارجہ نے اس خبر کی تصدیق کی اور کہا کہ اس کے اور گوگل کے درمیان یوٹیوب سے متعلق مواد کی مانیٹرنگ کے حوالے سے ایک معاہدہ طے پا چکا ہے۔

17 ستمبر 2012ء کے گلف نیوز میں معروف خاتون تجزیہ کار لینڈا ایس ہیرڈے نے ''آزادئ رائے کا نامعقول اظہار'' کے عنوان سے لکھا:

''آزادئ رائے اور اپنی آواز بلند کرنے کی آزادی دونوں جمہوریت کے ستون ہیں جن کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اسلام کے متعلق یہ شرمناک اور اشتعال انگیز اقدام اسلام سے نفرت کرنے والے اس دھوکہ باز شخص نے کیا جو 21 ماہ جیل میں رہ چکا ہے۔ اگر حکومت اس مواد کو قانون شکن آزادی کے اصولوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کنٹرول نہیں کر سکتی تھی تب بھی غلط زبان کو روکا جا سکتا تھا۔ یقیناً قانونی نظام میں کہیں خرابی ضرور ہے جو بار بار زہر افشانی کرنے والے لوگوں سے معاشرے کو محفوظ رکھنے میں ناکام ہے۔ 65

سالہ فلم ساز نکولا بیسلے سے پولیس نے تفتیش کی لیکن اسے گرفتاری کا کوئی خوف نہیں کیونکہ بقول اس کے اس نے قانون کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ کیا اس امریکہ کو مہذب و متمدن ملک سمجھا جائے گا جہاں انتہائی بنیادی ضرورت کا قانون نہیں۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہونگے کہ امریکی کانگرس نے 2004ء میں عالمی سامی مخالف ریویو ایکٹ منظور کیا تھا جس میں سامی مخالف کی تعریف یوں کی گئی کہ اس سے مراد اسرائیلی مخالف تند جذبات، سابقہ اور موجودہ اسرائیلی رہنماؤں پر مخاصمانہ تنقید ہے۔ اس میں بعض حقائق کا حوالہ دیا گیا تھا کہ یہ رویہ کسی نہ کسی طرح 60 لاکھ یہودیوں کے ہندسے کو آہستہ آہستہ ختم کر دے گا جو ہولوکاسٹ کا نشانہ بنے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہودی مذہب یا اس کے مذہبی رہنماؤں پر تنقید بھی اسی ایکٹ کی زد میں آئے گی۔ یہ خلافِ آئین تھا یا نہیں، اس ایکٹ کی منظوری پر زیادہ ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔ اس صورت حال میں کیوں نہ اس قانون کو توسیع دی جائے تاکہ مسلمانوں سمیت دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے احساسات و جذبات کا احترام کیا جا سکے"۔

2004ء میں ہالینڈ کے قومی ٹیلی ویژن نے چند خبیثوں کے تعاون سے اسلام کے خلاف نہایت بے ہودہ فلم Submission بنائی جس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان تمام واقعات کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کی دل آزاری کرنا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی ناپاک حرکات ایسے ممالک کے ذمہ داران کر رہے ہیں جنہیں زعم ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے مہذب، دانشور، حقوق انسانی کے علمبردار اور آزادی اظہار کے رکھوالے ہیں۔

6 اکتوبر 2002ء کو معروف امریکی پادری جیری فال ویل نے امریکی ٹیلی ویژن سی بی ایس (CBS) کے ایک پروگرام سکسٹی منٹس (Sixty Minutes) کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے حضور شفیع المرسلین حضرت محمد ﷺ کی شان میں بدترین گستاخی کا ارتکاب کیا۔ مغرب پوری دنیا میں آزادی افکار، آزادئ ضمیر اور آزادی اظہار کا ڈھنڈوا پیٹتا ہے۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ذہنی اذیت اور روحانی کرب میں مبتلا کرنا آزادی اظہار ہے؟ کیا مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دینا آزادی ضمیر ہے؟ دنیا کا کوئی قانون یا آئین اس کی اجازت دیتا ہے؟ کیا یہی اخلاقیات ہیں جن پر مغرب کو فخر ہے؟

گیارہ ستمبر 2001ء کے حملوں کے بعد مسلمانوں کو زبانی اور بعض اوقات مار پیٹ

کی صورت میں بھی سختیاں اٹھانی پڑی ہیں۔ چنانچہ حکومت سے مطالبہ ہوا کہ جس طرح نسلی منافرت کے خلاف قانون 1970ء کی دہائی میں بنایا گیا تھا، اسی طرح مذہبی منافرت کے خلاف بھی ایک قانون بنایا جائے۔حکومت نے 'منظّم جرائم اور پولیس کے مجوزہ قانون' میں ایک شق ڈال دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا افراد کو ان کے مذہبی عقائد یا عدم عقائد کی وجہ سے گالی گلوچ یا توہین کا نشانہ بنایا جائے گا تو یہ بات قابلِ دست اندازی پولیس ہوگی یعنی پولیس کو کارروائی کرنے کا اختیار ہوگا۔ یہ قانون پارلیمنٹ کے ایوان بالا 'دار الامرا' میں جب پیش ہوا تو ملک کے 'لبرل' حلقوں میں کھلبلی مچ گئی تھی کہ یہ قانون آزادی اظہار اور آزادی رائے پر سخت پابندیاں عائد کردے گا۔ بڑے بڑے نامور 'کامیڈین' اٹھ کھڑے ہوئے کہ مذہب کے بارے میں مذاق کرنا معاشرے کی بنیادی آزادی ہے جسے نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ کسی نے کہا کہ ایک معمولی سی اقلیت کو یہ حق کیوں دیا جارہا ہے کہ ہمارے بنیادی قوانین میں رد و بدل کرادے۔ ایک اور مشہور ادیبہ جِل پیٹن واش (Jill Paton Walsh) نے یہ منظر پیش کیا ہے کہ برطانیہ کے قید خانے ان ادیبوں، صحافیوں اور مقرروں سے بھر جائیں گے جو عزت کے نام پر قتل، عورتوں کو سر سے پاؤں تک کالے کمبل میں لپیٹنے، اسقاط حمل کے کلینک پر اعتراض کرنے کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔

مسلمانوں سے امریکی تعصب کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے کہ نیویارک کی ایک شاہراہ پر ایک کتا بچے پر جھپٹا۔ اس سے قبل کہ کتا اپنا کام کر دکھاتا، ایک راہگیر نے کتے کی گردن دبوچ لی اور اس وقت اسے چھوڑا جب کتا مر گیا۔ نیویارک ٹائمز کا ایک رپورٹر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے راہگیر کی تصویر بناتے ہوئے کہا: ''صبح نیویارک ٹائمز کے صفحہ اوّل پر ایک تصویر اور ایک خبر شائع ہوگی جس کی سرخی یہ ہوگی......ایک نیویارکر نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر ایک بچے کی جان بچائی''۔

''سرخی تو خوب ہے مگر میں نیویارکر نہیں ہوں''۔ راہگیر نے کہا۔ ''تو پھر سرخی یہ ہوئی، ایک امریکی نے جان پر کھیل کر بچے کو بچالیا''۔ رپورٹر بولا۔

''یہ سرخی بھی عمدہ ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں امریکی بھی نہیں''۔

''تو پھر تم کون ہو؟'' رپورٹر نے پوچھا۔

''میں ایک مسلمان ہوں''۔ جواب ملا۔

اگلے روز نیویارک ٹائمز کے صفحہ اوّل پر شائع ہونے والی خبر کی سرخی یہ تھی:
''ایک بنیاد پرست مسلمان نے پالتو کتے کی گردن مروڑ ڈالی''۔

6 اپریل 2017ء کو برطانیہ کے معروف اخبار دی ٹیلی گراف (The Telegraph) نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ روس میں صدر ولادیمیر پیوٹن (Vladimir Putin) کو ہم جنس پرست جوکر بنا کر پیش کرنے والی تصاویر پر پابندی عائد کر دی گئی جس کے بعد میڈیا ادارے پریشان ہیں کہ وہ کس طرح عوام کو بتائیں کہ پابندی کس طرح کی تصویر کی اشاعت پر عائد کی گئی ہے۔ تاہم، گزشتہ ہفتے حکومت کی جاری کردہ فہرست میں پیوٹن کی متنازع تصویر بھی شامل کر دی گئی اور اسے دہشت گردی کے الزامات میں شامل کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ یہ تصویر 2013ء میں اس وقت مقبول ہوئی تھی جب ہم جنس پرستوں کے حق میں مظاہرے ہوئے تھے۔

31 مئی 2017ء کو امریکی ٹی وی چینل سی این این نے اپنی ایک خاتون ملازم کامیڈین کیتھی گریفن (Kathy Greffin) کو ڈونلڈ ٹرمپ کی سر بریدہ تصویر پوسٹ کرنے پر سال نو کی مناسبت سے اپنے پروگرام 'نیو ایئر' سے نکال دیا۔ چینل نے اس سے متعلق اپنی ایک ٹویٹ میں لکھا کہ 'سی این این' نے سال نو کی مناسبت سے اپنے پروگرام نیو ایئر کے تعلق سے کیتھی گریفن کے ساتھ اپنے معاہدے کو ختم کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ گریفن صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی سخت ترین ناقد رہی ہیں۔ انہوں نے مسٹر ٹرمپ سے متعلق مذکورہ تصویر ایک ٹویٹ میں پوسٹ کی تھی۔

نومبر 2016ء میں برطانیہ میں یہودی خاتون گاہک کو پارسل کے ساتھ نازی آمر ایڈولف ہٹلر کے نام کی پرچی بھیجنے پر ایمزون (Amazon) کے ملازم کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ مذکورہ خاتون برطانیہ میں یہودی اور غیر یہودی افراد کی فلاح و بہبود کا کام کرتی تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کے لیے کھلونوں کا آرڈر دیا تھا تاہم جب اسے ایمزون کی جانب سے پارسل موصول ہوا تو اس میں الگ سے ایک پرچی بھی موجود تھی جس پر ''انکل ایڈولف کی طرف سے سلام'' تحریر تھا۔

جناب اشتیاق بیگ اپنے مضمون ''امریکی یہودی لابی کا آزادی اظہار کے منہ پر طمانچہ!'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ماضی میں جب بھی میں امریکی صدور کی پریس کانفرنس دیکھتا تھا تو اکثر ایک بوڑھی عورت کی شخصیت مجھے اپنی جانب متوجہ کرتی تھی جو اگلی صفوں میں بیٹھی ہوتی تھی اور اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بھرپور اعتماد دکھائی دیتا تھا۔ پریس کانفرنس میں امریکی صدر سب سے پہلے اس خاتون کو سوال کرنے کا موقع دیتے اور اس کے پوچھے گئے چبھتے ہوئے سوالات کا برا نہیں مناتے تھے اور بڑی خندہ پیشانی سے اس کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیتے۔ اس بوڑھی عورت کا چہرہ میرے لیے اتنا شناسا ہوگیا کہ ٹیلیوژن پر دکھائی جانے والی امریکی صدر کی پریس کانفرنس میں اس عورت کو تلاش کرتا تھا۔ میرے دل میں اکثر اس بوڑھی خاتون کے متعلق تجسس پیدا ہوتا اور اس کے متعلق تفصیلات جاننے کی خواہش پیدا ہوتی، لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر میں اس کے متعلق تفصیلات حاصل نہ کرسکا۔ گزشتہ دنوں یہ بوڑھی خاتون دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ کا مرکز بنی جب اس کے اسرائیل کے خلاف ایک تیز و تند بیان دینے پر اسے امریکہ میں یہودی لابی کی سخت تنقید اور مخالفت کا نشانہ بننا پڑا اور اپنے خلاف شدید پروپیگنڈہ کے باعث اسے ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ 89 سالہ خاتون کا نام ''ہیلن تھامس (Helen Thomas)'' تھا جو پیشے کے اعتبار سے جرنلسٹ تھی جس نے صحافت کا آغاز 1943ء میں کیا۔

ہیلن تھامس نے وائٹ ہاؤس کی نامہ نگار کی حیثیت سے 75 سال وائٹ ہاؤس میں خدمات سرانجام دیں۔ ان کا شمار امریکہ کی نہایت تجربہ کار، محنتی اور نمایاں جرنلسٹوں میں ہوتا تھا اور ان کا درجہ صحافیوں کے ڈین کی طرح تھا۔ ان کی نگاہوں نے امریکی وائٹ ہاؤس کے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ وہ کئی ''کہی ان کہی داستانوں'' کی چشم دید گواہ تھیں۔ انہوں نے صدر جان ایف کینیڈی کے دور سے وائٹ ہاؤس میں ایک طویل عرصے تک یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل کے اہم رکن کی حیثیت سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ہیلن نے امریکہ کے مختلف صدور کے ساتھ دنیا بھر کا سفر کیا جن میں صدر نکسن، فورڈ، جمی کارٹر، رونالڈ ریگن، جارج بش اور کلنٹن نمایاں ہیں۔ 1972ء میں صدر نکسن کے چین کے خفیہ دورے کے موقع پر وہ واحد جرنلسٹ تھیں جو صدر کے ہمراہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ اہم رازوں کی امین بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کے دوران کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کے شاندار کیریئر، وسیع تجربے اور علم کی وجہ سے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حالیہ دنوں میں انہوں نے صدر اوبامہ سے

بڑے دوٹوک الفاظ میں افغانستان میں جاری جنگ کے دوران مارے جانے والے امریکی فوجیوں کے بارے میں سخت سوالات کیے تھے۔

ہیلن تھامس کا 75 سالہ طویل اور شاندار کیریئر اس وقت اچانک ختم ہوگیا جب 27 مئی 2010ء کو ''یہودی وراثت'' کے یوم پر ایک یہودی صحافی نے ان سے اسرائیل کے بارے ان کی رائے جاننا چاہی۔ ہیلن تھامس نے اسرائیل پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''یاد رکھیں ان لوگوں (اسرائیلی یہودیوں) نے فلسطین پر قبضہ کیا ہے، یہ ان کی اپنی سرزمین نہیں ہے، اسرائیلیوں کو فلسطین سے نکل جانا چاہیے، انہیں پولینڈ، جرمنی، امریکہ یا کہیں اور جانا چاہیے''۔ ہیلن کے یہ الفاظ امریکی یہودی لابی اور اسرائیل پر ایٹم بم بن کر گرے۔ آزادی اظہار رائے کے چمپئن، ہیلن کے خلاف غلیظ اور گھٹیا الفاظ استعمال کرنے لگے۔ ان کے خلاف انٹرنیٹ پر درجنوں ویب سائٹس اور بلاگس پر شدید تنقیدی اور طعن وتشنیع پر مبنی کلمات شائع کیے گئے۔ ہیلن کو ''بوڑھی بدصورت عورت'' اور ''پاگل خبطی'' جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ ایک یہودی نے لکھا کہ ''اس بوڑھی کو جو سٹھیا گئی ہے بہت پہلے ریٹائر ہوجانا چاہیے تھا''۔ یہودیوں کے شدید دباؤ کے نتیجے میں ہیلن نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے کیریئر کو نہیں بچاسکی۔

ہیلن تھامس کے ساتھ پیش آنے والا یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں سے ابھی محو نہیں ہوا تھا کہ گزشتہ دنوں اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ امریکہ میں پیش آیا۔ اوکتافیا نصر (Octavia Nasr) چند روز قبل تک امریکہ کے سب سے بڑے ٹیلی وژن نیٹ ورک سی این این سے 20 سال سے وابستہ تھیں، بیروت میں پیدا ہونے والی اوکتافیا کا چہرہ ناظرین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ وہ اس قدر باصلاحیت تھیں کہ خود سی این این کی مینجمنٹ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی تھی۔ ان کی ملازمت چینل سے اس وجہ سے ختم کردی گئی کہ انہوں نے سوشل ویب سائٹ ٹیوٹر پر اپنے ذاتی بلاگ میں 4 جولائی 2010ء کو انتقال کر جانے والے حزب اللہ کے قائد محمد حسین فضل اللہ کی وفات پر ان کی تعزیت میں چند کلمات میں یہ تحریر کیا کہ ''انہیں انتقال کی خبر سن کر صدمہ پہنچا ہے، وہ حزب اللہ کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک تھے اور میں ان کا بہت احترام کرتی تھی''۔ اوکتافیا نصر کا بیان ان کی جانب سے کسی سیاسی خیال کا اظہار نہیں، بلکہ محض تعزیت کا اظہار تھا۔ ان کے لکھے گئے صرف اس جملے سے سی این این میں موجود یہودی لابی سیخ پا ہوگئی اور اوکتافیا نصر کو اس قدر شدید تنقید کا نشانہ بنایا کہ سی این این

نے ان سے کوئی وضاحت طلب کیے بغیر ان کو عہدے سے برطرف کر دیا اور کہا کہ وہ سی این این کے معیار پر پوری نہیں اترتیں‘‘۔

ہیلن تھامس کی جبری ریٹائرمنٹ اور اوکتا فیا نصر کی برطرفی امریکی معاشرے کے تضاد اور دوغلی پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ مغرب میں آزادی اظہار رائے کا مطلب ان کے خیالات ،نظریات، تہذیب وثقافت سے متفق ہونا ہے۔ وہ چاہے آزادی اظہار کے رائے کے نام پر انبیائے کرام کی توہین کریں، انہیں کچھ نہ کہا جائے لیکن اگر ان کے نظریات کے خلاف کسی نے اظہار کر دیا تو پھر اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ مسلمان جب حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس کے خلاف شائع ہونے والے توہین آمیز خاکوں فیس بک پر کارٹون مقابلوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو امریکہ اور مغربی مما لک اسے ’’آزادی اظہار رائے‘‘ پر حملہ قرار دیتے ہیں، لیکن جب دوسری جانب اسی معاشرے میں کبھی اسرائیل یا یہودیوں پر ذرا سی بھی تنقید ہوتی ہے تو یہ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں اور یہ تنقید انہیں برداشت نہیں ہوتی۔

حال ہی میں پیش آنے والے یہ دو واقعات ثابت کرتے ہیں امریکہ کس قدر روشن خیال ، وسیع النظر اور وسیع القلب ہے اور اس میں تحمل اور برداشت کا مادہ کس قدر ہے۔ ہیلن تھامس اور اوکتا فیا نصر اگر خود اپنے کیریئر سے ریٹائر ہو جاتیں تو شاید دینا بھر میں انہیں اس قدر مقبولیت اور پذیرائی نہ ملتی۔ آج یہ خواتین تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور انہیں نے اپنا نام تاریخ میں درج کرا لیا ہے۔ آنے والی امریکی نسلوں سے دنیا بھر کے لوگ یہ سوال ضرور کریں گے کہ جب امریکہ میں رائے کے اظہار کی مکمل آزادی تھی تو پھر ان دو نامور خاتون صحافیوں کو ان کے حق سے محروم کیوں کیا گیا؟‘‘ (روزنامہ جنگ لاہور 5 اگست 2010ء)

خان احمد علی لکھتے ہیں: ڈنمارک کے ایک اخبار نے نازیبا کارٹون شائع کر کے دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلمانوں کے جذبات جو مجروح کیے تھے، اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اخبار کا ادارہ معافی مانگ لیتا اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا لیکن آزادی اظہار کی ’انتہا پسندی‘ آڑے آ گئی۔ اب اظہار کی آزادی کا میں بھی بہت بڑا پرستار ہوں اور اس کے لیے اپنے بہت سارے ساتھیوں سمیت جیل بھی گیا ہوں اور بے روزگاری کا عذاب بھی سہا ہے لیکن میں نے اسے مارشل لاء کے ضابطوں کی خلاف ورزی اور سنسر کی پابندیوں کو توڑنے کے لیے تو استعمال کیا ہے کسی فرد یا فرقے کی دل آزاری کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میری ناقص رائے میں

آزادی اظہار کا مطلب بھی یہی ہے کہ اسے جابر اور استحصالی قوتوں اور معاشرے کی بے انصافیوں کے خلاف استعمال کیا جائے نہ کہ لوگوں کی دل آزاری کے لیے۔ ادھر یورپی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوئی صورت نکالنے کے بجائے مسلمانوں کے ردعمل کو مختلف ثقافتوں کے درمیان تصادم سے تعبیر کیا ہے۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں یا کیے جارہے ہیں، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی انتہائی اقدامات کے ذریعے معاملات کو طے کرنا چاہتی ہیں۔ مثلاً سننے میں آیا ہے کہ جرمنی نے وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کے لیے ایک سوال نامہ تیار کیا ہے جس میں ایسے سوال بھی دریافت کیے گئے ہیں کہ اگر آپ کا بیٹا یہ کہے کہ ''میں ہم جنس پرست ہوں اور فلاں مرد کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں'' تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

اب میں نہیں جانتا کہ دوسرے کیا جواب دیں گے لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو پہلے میرا بیٹا اگر ہم جنس پرست ہے تو وہ اپنے اس 'وصف' کو میرے علم میں آنے ہی نہیں دے گا، اس لیے کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اور اگر اس کی 'سعادتمندی' نے اس کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تو اسی صورت میں کرے گا جب وہ 'فاعل' ہو اور اگر وہ فاعل ہوا تو ہم بھی ہلکی پھلکی سرزنش کے بعد معاملے کو رفع دفع کردیں گے اور اگر 'مفعول' نکلا تو اس سے ہاتھ جوڑ کے درخواست کریں گے کہ جس مرد کے ساتھ دل چاہے رہو لیکن خدا کے لیے یہ مت کہنا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ ممکن ہے یہ مختلف ثقافتوں کے درمیان تصادم ہو لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے میں اپنی ثقافتی قدروں کو محض کسی ملک کی شہریت کے حصول کے لیے اتنی آسانی سے تو فراموش نہیں کرسکتا۔

ادھر برطانوی پارلیمینٹ نے ایک قانون کی منظوری دی ہے جس میں دہشت گردی کی تعریف اور توضیح کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ پہلے تو دہشت گردی کی ایک ایسی تعریف کی جانی چاہیے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ پھر یہ طے کرنا مناسب ہوگا کہ اس کی تعریف کی جائے یا مذمت؟ اس لیے کہ ہر قوم کے اپنے 'دہشت گرد' ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے قومی ہیرو کا درجہ دیتی ہیں۔ اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں ایسے لوگوں کی تعریف نہ کروں جنہیں ہندوستان پر برطانوی تسلط کے دوران دہشت گردی کے الزام میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا تو یہ مجھ سے شاید نہ ہو''۔ (ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ جون 2013ء)

جناب طارق انور اپنے مضمون ''مغرب کا آزادی اظہار کا دوغلا پن'' میں لکھتے ہیں:

''نسلی مساوات کے چیئرمین سرٹریور فلپس (Sir Trevor Phillips) نے دنیا بھر میں توہین آمیز خاکوں کے خلاف جاری مظاہروں پر آئی ٹی وی کے ایک پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اختلاف رائے کا حق برطانوی شناخت کا ایک قیمتی حصہ ہے جس پر سودے بازی ممکن نہیں، لہٰذا جو مسلمان شریعت کے قوانین کے تحت رہنا پسند کرتے ہیں وہ ملک چھوڑ دیں۔ برطانیہ میں رہنے والوں کو برطانوی ہونے کا پاس کرنا چاہیے۔ جسے یہاں رہنا ہے وہ ہماری طرح رہے یا پھر کہیں اور جا بسے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جن بنیادی باتوں پر یقین رکھتے ہیں، وہ اقلیتوں کو بھی ماننی چاہئیں، جیسے ہمارا باہمی رویہ اور سلوک کیسا ہے، ہمیں جمہوریت کے ساتھ لگاؤ ہے، ہم ووٹنگ کے ذریعے مسائل حل کرتے ہیں۔ نہ تو تشدد کے ذریعے اور نہ ہی ڈرا دھمکا کر اور جو چیزیں ہمیں پسند نہیں، وہ برداشت کرتے ہیں۔ آزادی اظہار کے تحت ہم جنس پرستی کی مخالفت مسلمان اماموں اور مبلغین کا حق ہے، جس کا غیر مسلموں کو برا نہیں ماننا چاہیے۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے! مسلمانوں کو اختلاف رائے اور تنقید کا حق دینا بھی ایک ایسی لعنت پر جا رہا ہے جس سے برطانوی عوام کی اکثریت خود بھی متنفر ہے۔ شرم وحیا سے عاری معاشروں کے ترجمان اور دانشور اسی طرح فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ''شیطانی خرافات'' جیسے گھٹیا، اخلاق سے گرے ہوئے اور تیسرے درجے کے ناول کو انگریزی ادب میں شامل کرنے اور اس کے مصنف شیطان رشدی کو پناہ دینے والے یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی تضحیک اور توہین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور دل آزار آزادی اظہار اپنا جمہوری حق سمجھتے ہیں۔ اسی جمہوری برطانوی معاشرے میں ایک غیر منتخب پینل یہ حق رکھتا ہے کہ ووٹوں کے ذریعے منتخب شدہ ایک عوامی نمائندے کو معطل کر دے جس نے چند روز قبل لندن کے ایوننگ سٹینڈرڈ کے یہودی رپورٹر فائن گولڈ (Finegold) کو تنگ آ کر نازی گارڈ جیسا کہہ دیا تھا۔ خبروں کے مطابق جیوئش بورڈ آف ڈپٹیز نے میئر لیونگسٹن (Kenneth Robert "Ken" Livingstone) کی اس ''بے حسی'' کی شکایت سہ رکنی ایڈجوڈیکیشن پینل آف دی سٹینڈرڈ بورڈ فار انگلینڈ سے کر دی، جس نے میئر کی یکم مارچ سے چار ہفتے کے لیے معطلی کا فیصلہ صادر کر دیا۔ لندن کے میئر کین لیونگسٹن جو گزشتہ ہفتے ٹریفالگر سکوائر میں مسلمانوں کے ایک بڑے احتجاجی مظاہرے میں شریک تھے، نے غیر منتخب افراد کی جانب سے اپنی معطلی کی شدید مذمت کرتے ہوئے اس فیصلے کو جمہوریت

کے سینے میں خنجر قرار دیا ہے۔ وہ معطلی کے فیصلے پر متعجب ہیں اور اس کے خلاف اپیل دائر کرنے کے لیے ہائیکورٹ سے معطلی موقوف کرنے کی درخواست کی ہے۔

آیئے اب آسٹریلیا چلتے ہیں جہاں مسلمان تارکین وطن اسلام اور مسلمانوں پر وزیراعظم جان ہاورڈ (John Howard) کی تنقید سے ناخوش ہیں۔ خبروں کے مطابق فیڈرل ٹریژر، پیٹر کاسٹیلو (Federal Treasurer Peter Howard Costello) نے کہا ہے کہ مسلمان اگر آسٹریلوی اقدار کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں تو وہ واپس جاسکتے ہیں۔ اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے خواہشمند سعودی عرب یا پھر ایران چلے جائیں۔ سڈنی انسٹیٹیوٹ کے ایک تھنک ٹینک سے خطاب کرتے ہوئے کاسٹیلو نے کہا کہ جمہوری سول قوانین کی برتری تسلیم نہ کرنے والے شہریت حاصل کرنے کی ابتدائی شرائط پوری نہیں کرتے۔ آسٹریلوی شہریت کے لیے یہ حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ آسٹریلیا اور اس کے عوام کا وفادار رہے گا، ان کے جمہوری عقائد میں شریک رہے گا، ان کے حقوق اور آزادیوں کا احترام کرے گا اور ان کے قوانین کی پابندی کرے گا۔ لہٰذا جو مسلمان یہاں آنا چاہتا ہے، وہ پہلے ہماری اقدار پر غور کرے۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے احتراماً جوتے اتارنے پڑتے ہیں۔ جوتے پہنے رکھنا ہے تو پھر مسجد نہ جائیں۔ اگر آپ آسٹریلوی اقدار پر معترض ہیں تو پھر آسٹریلیا مت آئیں۔

کاسٹیلو جو دو سال بعد موجودہ وزیراعظم کے متوقع جانشین ہیں، نے مزید کہا کہ جمہوری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنے قانون پر عمل کے خواہشمند دوسروں کے حقوق اور شہری آزادی کے لیے خطرے کا باعث ہیں۔ جن لوگوں نے ''دیانت'' کے ساتھ شہریت کا عہد نہیں کیا اور کوئی دوسری شہریت بھی رکھتے ہیں تو ان کی آسٹریلوی قومیت ختم کردی جائے۔ ہزاروں میل کے درمیانی فاصلے کے باوجود برطانیہ اور آسٹریلیا کے ترقی یافتہ اور روشن خیال جمہوریت پسندوں کا لب و لہجہ اور ایک جیسے بیانات مسلمانوں کے خلاف ملک در ملک ایک نئے محاذ کی خبر دیتے ہیں۔ اب جمہوری اقدار کے نام پر مسلمان تارکین وطن کی خبر لی جائے گی۔ وضع وقطع، بودو باش اور تمدن تو بدل لیا ہے، اندر کا مسلمان نہیں بدلا اور زندہ ہے، لہٰذا ہم کیسے تم پر بھروسہ کرلیں۔ یہاں تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ مختصر یہ کہ ہمیں احتجاج کا حق بھی نہیں''۔ (ماہنامہ پولیٹیکل سین، جولائی 2015ء)

مغرب جو آزادی اظہار، آزادی رائے، آزادی تقریر و تحریر، حقوق انسانی، امن و آشتی، روشن خیالی، علم و شعور، وسعت نظر، تحمل، برداشت، عدم تشدد، مذہبی رواداری، شہری آزادی، فہم و تدبر، جمہوریت، حقوق نسواں اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا پرچارک اور بلاشرکت غیرے چیمپین بننے کا دعویدار ہے۔ یہاں ہر رنگ، ہر نسل، ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد رہتے ہیں جنہیں یکساں حقوق حاصل ہیں مگر مسلمانوں کے ساتھ اسلام دشمنی کی آڑ میں نفرت انگیز اور متعصّبانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، مغرب میں شراب خانوں کو مدینہ اور نائٹ کلبوں کو مکہ کا نام دیا جاتا ہے، کبھی جوتیوں پر قرآنی آیات منقش کر دی جاتی ہیں، کبھی زیر جامہ اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والی تحریریں لکھ دی جاتی ہیں، مسلمانوں کی مسجدوں پر حملے اور ان کی بے حرمتی معمول کی بات ہے، گنبد اور مینار بنانے پر پابندی ہے۔ برقع اور سکارف کو اپنی تہذیب کے خلاف قرار دے کر پابندی لگا دیتے ہیں۔ راہ چلتی برقع پہنے خواتین پر تھوکا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں مردوں اور عورتوں کے سرعام ننگے ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ داڑھی اور پگڑی کو نفرت کی علامت بنا دیا گیا ہے، ایسے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہیں۔ مسلمان راہنماؤں کی داڑھی اور پگڑی والی تصویریں جوتوں اور انڈر ویئر پر شائع کر کے فروخت کی جاتی ہیں۔ خواتین کے ملبوسات پر مقدس قرآنی آیات چھاپنا، پھر ان ملبوسات کی نمائش کے لیے خواتین کی کیٹ واک کرنا، شراب کی بوتلوں کے ڈھکنوں، کوکا کولا کے کین، فٹ بال اور جوتوں پر کلمہ طیبہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لکھنا، اسلام کی مقدس شخصیات کے کرداروں پر فلمیں بنانا، مسجد اقصیٰ میں سور کا سر رکھنے کے شر انگیز واقعات، پرنٹ میڈیا میں اسلامی مقدس شخصیات کی خیالی تصاویر شائع کرنا اور ان کے خیالی مجسمے بنانا، اسم محمد کو انگریزی میں بگاڑ کر لکھنا، رسائل و جرائد اور کتابوں میں توہین کرنا، انٹرنیٹ پر قرآنی آیات میں تحریف کرنا، فرشتوں، پیغمبروں، رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی فرضی تصاویر اور غلط فرضی معلومات فراہم کرنا تو مغرب کا روزہ مرہ کا معمول ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ آزادی مذہب اور آزادیٔ اظہار کے نام پر کیا جاتا ہے۔

اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نسلی حملے عام بات ہیں، لیکن امریکی حکمرانوں کی پالیسیوں اور میڈیا نے مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے ذہنوں میں اتنا زہر گھول دیا ہے کہ ہر داڑھی رکھنے والے کو نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اب سے کوئی تیس سال پہلے ایک لڑکے گردیپ سنگھ چگر کو مسلمان سمجھ کر ساؤتھ ہال کے ایک سینما کے باہر کچھ گورے لڑکوں نے چھرا گھونپ کے ماردیا تھا۔ اس پر ایک انتہا پسند پارٹی کے لیڈر کنگسلے ریڈ (Kingsley Red) نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا 'ایک گرا ہے، دس لاکھ باقی ہیں'۔ گویا ان لوگوں کی ہمت افزائی کی جارہی تھی جن کے دلوں میں نفرت پرورش پا رہی ہے اور اس بنا پر قتل سے بھی باز نہیں رہنا چاہتے۔ 23 ستمبر 2013ء کو امریکہ میں نسلی تعصب کا شکار بننے والے کولمبیا یونیورسٹی کے ایک سکھ پروفیسر ڈاکٹر پربھجوت سنگھ ہیں جن پر صرف اس لیے جان لیوا حملہ کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر پربھجوت کا کہنا ہے کہ شام کو جب وہ چہل قدمی کر رہے تھے تو تقریباً ایک درجن سائیکل سوار نوجوانوں نے 'اسامہ کو پکڑو' 'دہشتگرد کو پکڑو' کہتے ہوئے ان پر حملہ کر دیا۔ ڈاکٹر پربھجوت سنگھ نے بتایا کہ ایک حملہ آور نے ان کی داڑھی نوچی اور منہ پر مکے مارے۔ میں نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا لیکن حملہ آوروں نے میرا پیچھا جاری رکھا اور پھر میں زمین پر گر گیا۔ ڈاکٹر پربھجوت نے کہا کہ اگر راہ گیروں نے ان کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ ہلاک ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر پربھجوت کو میٹ سینائی ہسپتال میں داخل کروایا گیا جہاں ان کے ٹوٹے جبڑے کی سرجری کی گئی۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے دانتوں کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ سکھ ڈاکٹر نے این بی سی فور نیویارک کو بتایا کہ انہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پر حملہ متعصّبانہ تھا۔ ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ مجھے اب اپنے ایک سالہ بیٹے کے بارے میں پریشانی لاحق ہے جو بڑا ہو کر میری طرح ایک سکھ نظر آئے گا اور اس کو ایسے ہی نفرت انگیز حملوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

2 دسمبر 2015ء کو امریکی ریاست پنسلوانیا (Pennsylvania) میں مراکش سے تعلق رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور کو صرف اس بنیاد پر قتل کر دیا گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ ایک عینی شاہد کے مطابق مسافر نے حملہ کرنے سے پہلے اسلام اور اس کی مقدس شخصیات کے خلاف نہایت نازیبا کلمات ادا کیے۔ روزنامہ اسلام اپنے ایک اداریہ بعنوان ''مغرب میں

پھیلتا ہوا اسلاموفوبیا'' میں لکھتا ہے: ''یہ افسوس ناک واقعہ پیرس حملوں کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑنے کے پروپیگنڈے کا اثر ہے، جس میں مغربی ذرائع ابلاغ پیش پیش ہیں۔ اس حادثے کے بعد سانحہ یہ ہوا کہ قتل کی ایک ایک واردات بالخصوص مسلم دنیا میں کسی مذہبی اقلیت سے تعلق رکھنے والے فرد کے مارے جانے پر چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھانے والے مغربی میڈیا اور اس کے زیر اثر دین اسلام کو بدنام کرنے میں پیش پیش رہنے والی مختلف لابیوں نے چپ سادھ لی ہے۔ کسی بھی انسان کا بے گنا مارا جانا قابل افسوس امر ہے۔ ایک انسان کے قتل کو سانحہ بنانا اور دوسرے کی موت کو کوئی اہمیت نہ دینا بجائے خود احترام آدمیت کے تقاضوں کے منافی ہے، جس کے اس وقت سب سے زیادہ شکار آج اس کا سب سے بڑھ چڑھ کر ڈھول پیٹنے والے ہیں۔ مغرب کو اپنے معاشروں میں پھیلتے ہوئے اسلاموفوبیا کے نفسیاتی مرض پر قابو پانا ہوگا، بہ صورت دیگر اس سے پیدا ہونے والی بے چینی کی آگ خود اس کے مستقبل کو بھی دامن گیر ہو سکتی ہے!'' (روزنامہ اسلام کراچی 3 دسمبر 2015ء)

معروف دانشور شاہنواز فاروقی اپنے مضمون ''مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور مغربی دنیا'' میں لکھتے ہیں:

''اس وقت یورپ میں مسلمانوں کی آبادی ساڑھے تین کروڑ ہے۔ یہ آبادی ڈھائی سے تین فیصد کی شرح سے بڑھ رہی ہے، چنانچہ 2020ء میں یہ آبادی پانچ کروڑ اور 2050ء میں دس کروڑ سے متجاوز ہوگی۔ اتنی بڑی آبادی اہل مغرب کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گئی ہے۔ یعنی اہل مغرب نہ مسلمانوں کو نگل پا رہے ہیں نہ اگل پا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مسلمانوں پر تقریباً ٹوٹ پڑے ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ اسلام اور دہشت گردی کو ہم معنی قرار دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو انتہا پسند، جنونی اور دہشت پسند باور کرایا جا رہا ہے۔ فرانس سمیت یورپ کے کئی ملکوں میں پردے کو غیر قانونی قرار دے کر ''جرم'' بنا دیا گیا ہے۔ پردہ کرنے والی خواتین، یہاں تک کہ اسکارف اوڑھنے والی خواتین کو نوکریوں سے نکالا جا رہا ہے۔ وہ بازاروں میں نکلتی ہیں تو ان پر تھوکا جاتا ہے، ان پر تحقیر آمیز فقرے اچھالے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مسلم خواتین پر حملے کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی دنیا کے کئی ملکوں میں مساجد غیر محفوظ ہوگئی ہیں۔ ان پر تواتر کے ساتھ حملے ہو رہے ہیں، انہیں نذرِ آتش کیا جا رہا ہے، ان میں خنزیر کا گوشت پھینکا جا رہا ہے، مسلمانوں کو مساجد تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی

جارہی ہے، کہا جارہا ہے کہ پہلے ہی بہت مساجد موجود ہیں۔ اگر مساجد بن رہی ہیں تو ان کے مینار اونچے کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ مساجد کے بلند میناروں سے سیکولر ملکوں کا ''افق'' مشرف بہ اسلام یا "Islamize" ہوتا نظر آتا ہے۔ تقریباً تمام مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ مغرب کے خفیہ ادارے مسلمانوں کو اپنا ایجنٹ بننے اور دوسرے مسلمانوں کی جاسوسی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ٹیلی فونز اور کمپیوٹرز کی نگرانی کی جارہی ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی آبادی مجموعی آبادی کا دس فیصد ہے مگر اس آبادی میں بے روزگاری کی شرح قومی شرح سے دوگنی ہے۔ فرانس کے تعلیم یافتہ مسلمان نوکری کے لیے درخواست دیتے ہیں لیکن ان کے نام کے ساتھ اسلام لگا دیکھتے ہی ان کی درخواست ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہے۔ مسلمان فرانس کے بڑے شہروں کے "Posh" علاقوں میں مکانات نہیں خرید سکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت شہروں کے مضافات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد ہے مگر ملک کے سیاسی نظام میں ان کی نمائندگی اعشاریہ ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ یورپ کے کم و بیش تمام ملکوں میں دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور یورپ کے تمام ملکوں میں سامنے آنے والے رائے عامہ کے جائزے بتا رہے ہیں کہ یورپی ملکوں کی اکثریت یورپ میں مسلمانوں کی موجودگی کو ایک خطرہ سمجھتی ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں نے ڈیڑھ سو سال تک یورپ کی طاقتوں کے تسلط کا بوجھ اٹھایا۔ گزشتہ ساٹھ ستر سال سے وہ مغرب کی سیاسی، معاشی، عسکری اور تہذیبی بالادستی کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ مگر یورپ اور امریکہ کی آبادی کو جمع کرلیا جائے تو مغرب کی اسی کروڑ آبادی چار ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں مسلمانوں کی حالت زار ہمیں مغرب کے بارے میں کیا بتا رہی ہے؟

مغربی دنیا خود کو سیکولر کہتی ہے اور سیکولرز کی تعریف ہی یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتی ہے۔ مگر پوری مغربی دنیا میں ریاست مذہبی معاملات میں ''جانب دار'' بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مسلم خواتین کے مذہبی تشخص اور مساجد کے ڈیزائن تک پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ سیکولر رویہ ہے نہ عیسائیت کی تعلیم ایسا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل مغرب نہ عیسائی ہیں نہ حقیقی معنوں میں سیکولر ہیں، بلکہ وہ

صرف نسل پرست، طاقت پرست اور اسلام دشمن ہیں۔

مغربی دنیا خود کو تکثیر پسند یا Pluralist کہتی ہے اور اس کا اصرار ہے کہ انسانی معاشروں کو زیادہ سے زیادہ کثیر الثقافت یا Multicultural ہونا چاہیے۔ مغربی دنیا اس سلسلے میں آئے دن عالم اسلام کو لیکچر پلانے میں لگی رہتی ہے مگر وہ اپنے درمیان اسلامی ثقافت اور اس کے مظاہر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مغرب حقیقی معنوں میں تکثیر پسند اور ثقافتوں کے گلدستے کو سراہنے والا بھی نہیں ہے۔

مغربی ممالک ساری دنیا کو برداشت یا Tolerance کا درس دیتے رہتے ہیں لیکن اہل مغرب مسلمانوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ عدم برداشت یا Intolerance تو کسی میں بھی نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ عدم برداشت اس حال میں سامنے آ رہی ہے کہ مغرب تہذیبی، معاشی، سیاسی اور عسکری طور پر بالا دست ہے۔ طاقت اور عروج کے زمانے میں مغرب کی عدم برداشت کا یہ عالم ہے تو نہ جانے کمزوری اور زوال کے عہد میں اس کی عدم برداشت کا کیا عالم ہوگا!

مغربی دنیا آزادی اور مساوات کی بڑی علمبردار ہے، مگر وہ اپنے یہاں موجود مسلمانوں کو بتا رہی ہے کہ وہ صرف اس کے غلام بن کر رہنے میں آزاد ہیں۔ وہ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی تاریخ، اپنے تصورِ انسان، اپنے تصورِ زندگی اور اپنی اقدار پر اصرار کریں گے تو مغرب ان کو باغی سمجھے گا اور اپنے معاشروں میں ان کا رہنا دوبھر کر دے گا۔ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تو مغرب نے مسلمانوں کے سلسلے میں برابری کیا عدم برابری کی بھی کوئی حد تک مقرر نہیں کی ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کو ایک عجیب و غریب نتیجے تک پہنچا رہی ہے اور وہ یہ کہ مغرب خود کو طاقت ور کہتا ہے اور بظاہر وہ طاقت ور نظر بھی آتا ہے، مگر مسلمانوں کے سلسلے میں اس کے رویے سے اس کی طاقت نہیں بلکہ کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کمزوری کی نوعیت اخلاقی بھی ہے، تہذیبی بھی...... سیاسی بھی ہے اور ذہنی و نفسیاتی بھی۔ اس کے برعکس مسلمان بظاہر کمزور ہیں مگر مغرب ان کے سلسلے میں جتنے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اس سے مسلمانوں کی طاقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ طاقت مذہبی بھی ہے، اخلاقی بھی...... تہذیبی بھی ہے اور سماجی بھی...... نفسیاتی بھی ہے اور ذہنی و جسمانی بھی‘‘۔

(ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی، 9 تا 15 جنوری 2015ء)

جناب یاسر پیرزادہ اپنے کالم ''**مغرب کی جپھی**'' میں لکھتے ہیں:

''ہم امریکہ اور مغرب کی نقالی میں بہت سی اصطلاحات اپنے ہاں رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان میں سے چند ایک ایسی ہیں جو اسلام سے مستعار لی گئی ہیں اور جنہیں اپنانا لازم ہے جیسے عورتوں کے برابر حقوق، رنگ نسل، زبان یا عقیدے کی بنیاد پر تعصب نہ برتنا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ کچھ اصطلاحات ایسی ہیں جنہیں رائج تو ضرور کرنا چاہیے مگر اس ضمن میں مغرب کی تشریح کو جپھی ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں، مثلاً آزادیٔ اظہار کی آزادی۔ بہت اچھی بات ہے، تقریر، تحریر اور اظہار کی مکمل آزادی ہونی چاہیے، محض اس لیے نہیں کہ یہ انسان کا بنیادی حق ہے بلکہ اس لیے کہ یہ انسان کا بنیادی حق ہے بلکہ اس لیے کہ جب آپ معاشرے کے ہر طبقے، گروہ یا فرد، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا عقیدے سے ہو، کے ہر قسم کے نظریات کو پنپنے کی اجازت دیتے ہیں تو لوگ دلائل سے اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں بالآخر سچ اور حقائق تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن امریکہ اور مغربی ممالک اس آزادی کی تشریح ویسے کرتے ہیں جیسے انہیں سوٹ کرتا ہے اور پورا عالم اسلام ہونقوں کی طرح منہ اُٹھائے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ امریکہ کے نزدیک مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی رسول اللہ ﷺ کا مضحکہ اُڑانے کی فلم آزادیٔ اظہار کے ضمن میں آتی ہے لیکن اگر اسی آزادی کے تحت امریکی میڈیا حکومت سے اسامہ بن لادن کی لاش کی تصاویر مانگے تو اسے ''قومی سلامتی'' کی اصطلاح کے تحت جاری کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ فرانس میں چارلی ہیڈو اگر رسول اللہ ﷺ کے خاکے شائع کرے تو اظہار رائے کی آزادی کا ٹھپہ لگا کر پورا یورپ اس کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر اسی یورپ میں بیشتر ممالک ایسے ہیں جہاں ہولوکاسٹ (مرگ انبوہ) کے انکار یا اس کی حمایت کو جرم سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی ذہنی افلاس کا مارا شخص ہی مرگ انبوہ کا انکار کرے گا مگر آزادیٔ اظہار کا جو معیار خود مغرب نے مقرر کر رکھا ہے، اس کے تحت تو ہولوکاسٹ کی حمایت کی بھی آزادی ہونی چاہیے مگر یہاں مغربی اصطلاح ایک نیا روپ دھار کر ہمارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق آزادیٔ اظہار کی آزادی پر تب بھی قدغن نہیں لگائی جا سکتی اگر بظاہر اس سے تشدد پر اکسائے جانے کا اندیشہ ہو۔ پابندی اسی صورت میں لگائی جا سکتی ہے اگر تشدد کا فوری اور یقینی خطرہ درپیش ہو۔ یعنی پوری مسلم دنیا میں اس مکروہ فلم سے آگ

لگ گئی مگر چونکہ یہ آگ امریکہ میں نہیں بھڑکی تھی اور اس کی زد میں کوئی امریکی گورا نہیں آیا تھا، لہٰذا اسے بھی آزادیٔ اظہار کا لبادہ اوڑھا دیا گیا مگر یہی آزادیٔ اظہار اس وقت گھاس چرنے چلی جاتی ہے جب اسرائیل یا یہودیوں کے خلاف کچھ اظہار خیال کیا جائے، اس وقت آزادیٔ اظہار کے غیر محدود حق کو نفرت پر مبنی بیان (Hate Speech) کی چادر اوڑھا کر محدود کر دیا جاتا ہے۔ نفرت پر مبنی بیان کی اجازت کسی بھی مہذب ملک میں نہیں مگر اس بات کا تعین بھی یہ مغربی ممالک ہی کرتے ہیں کہ کون سا بیان نفرت پر مبنی تصور ہوگا اور کون سا آزادیٔ اظہار میں چھپایا جائے گا۔ مسلمان ملک لاکھ سر پیٹتے رہیں کہ ان کے پیغمبر ﷺ کا مذاق اُڑانا، کارٹون بنانا آزادیٔ اظہار نہیں بلکہ اشتعال انگیزی کے زمرے میں آتا ہے مگر چونکہ یہ اصطلاحات مغرب نے ایجاد کی ہیں، اس لیے ان کی من مانی تشریح بھی وہی کرتے ہیں اور ہمارے اعتراضات کا ویسا ہی جواب دیتے ہیں جیسا پارن انڈسٹری والے سوال کے ضمن میں دیا جاتا ہے۔

ایک خوش کن تصور شخصی آزادی کا بھی ہے، اس کے مطابق ہر انسان کو غیر محدود آزادی حاصل ہے بشرطیکہ وہ دوسرے انسان کی آزادی میں مخل نہ ہو، گویا آپ کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے۔ بہت عمدہ تصور ہے، خاص طور سے ہمارے جیسے ممالک کے لیے جہاں ہر کسی کو دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اُڑانے کا شوق ہے، یقیناً ہر شخص کو اپنے زندگی مکمل آزادی سے گزارنے کا حق ہونا چاہیے مگر یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص چاہے وہ اپنی ہی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کرے اور کوئی دوسرا ان سے متاثر نہ ہو۔

ایک بیٹی جو اٹھارہ برس کی عمر کے بعد اپنے والدین کو چھوڑ کر علیحدہ رہنے کا فیصلہ کرتی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ اس فیصلے کا اثر اس کے ماں باپ پر نہ ہو؟ تھائی لینڈ میں ایک جاپانی کاروباری شخص نے سروگیٹ ماں کے ذریعے سولہ بچے پیدا کروائے، بظاہر اس نے شخصی آزادی کا استعمال کیا مگر سوال یہ ہے کہ ان بن ماں کے بچوں کا کیا قصور! آئے دن لوگ شادیاں کرتے ہیں، طلاقیں دیتے ہیں، پھر شادیاں کرتے ہیں، اپنی شخصی آزادی کا مکمل استعمال کرتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی اولاد بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک میں جہاں شخصی آزادی کا تصور عروج پر ہے، ان کا سماج خاندان بکھرنے کی صورت میں اس کی بھاری قیمت چکا رہا ہے، سو محض یہ کہہ دینا کہ اِٹس مائی لائف، آسان ہے مگر ہر انسان کی زندگی دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔

ان دلائل سے قطعاً یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ شخصی آزادی کا تصور ہی غلط ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ مغرب کی ایسی تمام اصطلاحات کی تشریح ہم ویسے ماننے کے پابند نہیں جیسے مغربی ممالک چاہتے ہیں۔ آزادیٔ اظہار، Hate Speech یا شخصی آزادی ایسے تمام تصورات پر مغرب کی اجارہ داری محض اس لیے قبول نہیں کی جا سکتی کہ یہ اصطلاحات وہاں سے آئی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ہمارے پیغمبر ﷺ کا مذاق اُڑانا (معاذاللہ) آزادیٔ اظہار میں کور ہو جاتا ہے جبکہ یہودیوں کے خلاف بیان بازی anti semitic کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ نیتن یاہو کی بمباری جائز ہے، فلسطینیوں کا اسرائیلی ٹینکوں پر پتھراؤ کرنا دہشت گردی ہے''۔ (روزنامہ جنگ، لاہور 30 دسمبر 2015ء)

آج یورپی ممالک میں بلند آواز سے میوزک سننا منع ہے کہ اس سے پڑوسیوں کی سمع خراشی ہوتی ہے، سڑک پر ہارن بجانا خلافِ قانون ہے اور گاڑی میں زور سے گانا نہیں سنا جا سکتا، سگریٹ پینے کو اس وجہ سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے کہ اس عمل سے دوسروں کے حقوق مجروح ہوتے ہیں۔ مگر دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے جذبات پر نشتر چلانے کی آزادی ہے۔ بغض و نفرت کی انتہا دیکھیے کہ مسلمانوں کو حلال گوشت کے استعمال سے روکا جا رہا ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اسلامی طریقے سے ذبح کیے گئے جانور کا گوشت بہت سے غیر مسلموں کے نزدیک حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس سے اسلامی شرعی قوانین کو فروغ مل رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں برطانیہ میں ویسٹ منسٹر پیلس نے اپنے ریستورانوں میں حلال گوشت فراہم کیے جانے کے مطالبے کو مسترد کر دیا ہے۔ چرچ آف انگلینڈ نے اس فیصلے کی مکمل حمایت اور تائید کرتے ہوئے مزید مطالبہ کیا کہ تمام ہوٹلوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنے ہاں حلال گوشت سے بنی کوئی چیز فروخت نہ کریں۔ باخبر ذرائع کے مطابق یورپی یونین بھی اس اقدام کو قانونی حیثیت دینے والی ہے۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ حکومت نے کئی سکولوں میں بچوں کو جو کھانا دیا، وہ غیر حلال یعنی حرام تھا۔ یاد رہے ان سکولوں میں مسلمان طلبا بھی کثیر تعداد میں پڑھتے ہیں جن کے والدین نے اس واقعہ پر شدید احتجاج کیا۔ یہ ہے وہ گھناؤنی تصویر جس نے آزادیٔ اظہار، آزادیٔ مذہب اور حقوق انسانی کے مغربی فلسفے اور نعرے کی حقیقت کا پول کھول دیا ہے۔

بقول الفت اکرم: ''فرانس کے متعصب صلیبی طبقے کے بیانات میں اسلام کے

خلاف کس قدر زہر بھرا ہوا ہے۔ برقعہ، داڑھی اور مساجد کے مینار تو اس بہانے برداشت نہ ہوئے کہ یہ ان کی مغربی ثقافت کا چہرہ تبدیل کرتے ہیں۔ اب لے دے کے وہاں کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک حلال فوڈ بچی تھی، لیکن اب مسلمانوں کو اس سے بھی محروم کرنے کے لیے سازشوں کے نئے تانے بانے بننے شروع ہو گئے ہیں اور عجیب وغریب منطق یہ بگھاری جارہی ہے کہ فرانس میں دکانوں پر حلال اشیا بیچنا گویا فرانسیسیوں پر ٹیکس عائد کرنا ہے، حالانکہ ''حلال فوڈ'' یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں میں بھی یکساں مقبول ہے۔ سائنس بھی ان کی افادیت ثابت کر چکی ہے لیکن یہ صرف اسلام کے ساتھ تعصب اور دشمنی کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی مخالفت میں اپنا بھی نقصان کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے مسلمانوں کو کیسی سنہری تعلیم دی ہے: ''کسی قوم کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر مجبور نہ کرے''۔ (المائدہ:8)

کاش اس عظیم الشان ہدایت پر مغرب کا متعصب طبقہ بھی غور کرے اور مسلم دشمنی میں کم از کم اپنا نفع نقصان تو فراموش نہ کریں۔ یہ کہنا کہ فرانس میں ''حلال فوڈ'' کو فروخت کرنا ایسے ہی ہے جیسے فرانسیسیوں پر ٹیکس عائد کرنا، بڑی عجیب بات ہے۔ فرانس کے متعصب صلیبیوں کو حقائق سے اس قدر آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں یا وہ شاید دنیا کو ہی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ وہ جو کہیں گے، دنیا اسے مان لے گی۔ دن کو رات کہیں یا رات کو دن، لوگ آنکھیں بند کر کے ان کی ہر بات مان لیں گے۔ فرانس کا یہ متعصب عیسائی طبقہ کیا بتا سکتا ہے کہ فرانس پر حکومت مسلمانوں کی ہے یا غیر مسلموں کی بلکہ وہ بتائیں کہ پوری دنیا میں حکم مسلمانوں کا چل رہا ہے یا غیر مسلموں کا؟ فرانس کے مظلوم مسلمان تو پردے کے خلاف فرانسیسی حکومت کے حکم کو تبدیل نہیں کرا سکے تو وہ بھلا فرانسیسیوں کو حلال گوشت کھانے پر کیسے مجبور کر سکتے ہیں اور فرانس میں حلال گوشت بیچنا ٹیکس کیسے ہو گیا؟ یہ تو حلال گوشت کی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بڑھتی ہوئی مقبولیت ہے جس سے آپ جل بھن کر کباب ہو رہے ہیں۔ یہ مسلمان تو ابھی آپ پر نہ کوئی ٹیکس لگا سکتے ہیں، نہ لگا رہے ہیں۔ صرف یہ اسلام کی تعلیمات کی حفاظت ہے جو اپنا آپ سب سے منوا رہی ہے۔

دوسری جانب حرام اشیا جن کو اہل یورپ بڑے شوق سے کھاتے ہیں ان کا مضر صحت ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ خنزیر میں انسانی جسم کو نقصان پہنچانے والے جراثیم کا ذخیرہ تمام جانوروں سے زیادہ ہے۔ یورپی اطبا کی

تحقیق کے مطابق خنزیر نہ صرف 450 سے زائد مہلک وبائی امراض کی زرخیز چراگاہ ہے بلکہ وہ ان میں سے 57 مہلک وباؤں کو انسان تک منتقل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ خنزیر کے مضرصحت ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں ''سوائن فلو'' کے نام سے جو بہت بڑی وبا دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ دراصل یہ بیماری خنزیر کی وجہ سے پھیل رہی ہے جو اسلام میں حرام ہے لیکن مغرب کو بہت محبوب ہے۔ جب تک کسی کھانے میں خنزیر کی کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، اہل مغرب کو مزا ہی نہیں آتا۔ برگر سے لے کر سویاں، ٹافیاں، لپ اسٹکس اور ٹوتھ پیس تک سب میں خنزیر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ ڈبوں پر جن غذاؤں کے اجزا کی بجائے صرف ایک کوڈ ''ای'' نمبر دیا ہو، ان سے مراد عموماً خنزیر کے اجزا ہوتے ہیں۔ آج اس خوراک کا نتیجہ پوری دنیا بالخصوص عالم مغرب بھگت رہا ہے۔ شراب کے مضرصحت ہونے کے بارے میں بھی پورا عالم کفر متفق ہے۔ البتہ صرف اس قدر اختلاف ہے کہ شراب کی کم مقدار سے کچھ نہیں ہوتا، حالانکہ ڈرائیونگ اور زندگی کے بعض دیگر اہم امور کے دوران شراب کی معمولی مقدار پینے پر اہل یورپ نے خود ہی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور یوں وہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ شراب کی معمولی مقدار بھی اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنی کہ زیادہ۔ اس کی معمولی مقدار کو جائز سمجھنا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایک حد تک جوئے، چوری، ڈاکے اور قتل وزنا کو جائز سمجھ لے، حالانکہ ان برائیوں کی مکمل ممانعت کے پیچھے اصل حکمت ہی یہ ہے کہ اگر ان کو معمولی سطح پر بھی کر لیا جائے تو پھر انسان کو ان کی لت پڑ جاتی ہے اور پھر عمومی طور پر ان سے چھٹکارا ممکن نہیں رہتا''۔ (روزنامہ پاکستان، لاہور 13 مارچ 2015ء)

فروری 2013ء میں ایک نیا انکشاف ہوا کہ جیلوں کو بھیجے جانے والے ''حلال گوشت'' سے بنی اشیا کچوریوں اور سموسوں میں خنزیر کے گوشت کی ملاوٹ ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق برطانیہ کی جیلوں میں 12 فیصد سے زائد مسلمان قیدی محصور ہیں۔ مسلم کمیونٹی کے احتجاج پر حکومت نے کوئی ٹھوس اقدام نہیں اٹھایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ اور ویلز کی جیلوں میں 12 فیصد سے زائد مسلمان قیدی موجود ہیں۔

دسمبر 2012ء میں برطانیہ میں بڑے پیمانے پر حلال کے نام پر حرام گوشت کی فروخت کے گھناؤنے دھندے کا انکشاف ہوا۔ کمیونٹی کے مقتدر ذرائع کے مطابق برطانیہ کے مختلف شہروں میں حلال میٹ کے نام پر بنی ہوئی دکانوں کی ایک بڑی تعداد غیر شرعی طریقے سے

ذبح کیے گئے جانوروں کو حلال گوشت کے ساتھ مکس کر کے فروخت کر رہی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حرام گوشت چونکہ بڑی تعداد میں اور سستا دستیاب ہے، اس لیے دکانداروں کی اکثریت حرام گوشت کو بھی سلاٹرز سے خرید لیتی ہے۔ ان دکانداروں کے پاس چونکہ حلال فوڈ کی تصدیق کرنے والی مختلف اتھارٹیز کے سرٹیفکیٹ ہوتے ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے ادارے سے بھی تصدیق شدہ حلال گوشت خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو بتا سکیں کہ ان کا سارا گوشت حلال ہے اور اگر ان کے خلاف کوئی شکایت ہو تو بھی وہ حلال فوڈ سلاٹرز کی رسیدیں دکھا سکیں۔

ستمبر 2013ء میں برمنگھم کے ایک سکول ٹیچر نے مسلم طلبا کو ایسے سینڈوچ کھانے کو دیے جن میں سور کا گوشت شامل تھا۔ نائن سٹائل سکول (Ninestiles School) کی پرنسپل کرس کوئن (Chris Quinn) نے کہا کہ مسلم بچوں کو جو لنچ باکس دیئے گئے تھے، ان پر حلال کا لیبل چسپاں تھا مگر انسانی غلطی کے باعث اس میں ایسے سینڈوچ ڈال دیئے گئے جن میں سور کا گوشت شامل تھا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ احتجاج کرنے والے والدین کے بچوں کو سکول سے نکال دیا گیا۔

امریکی ایوارڈ یافتہ مسلمان سائنسدان ذیشان الحسن عثمانی نے 13 اکتوبر 2016ء کو برطانوی اخبار دی انڈیپنڈنٹ (The Independent) کو بتایا کہ میرے سات سالہ بیٹے عبدالعزیز کو امریکی ریاست شمالی کیرولینا (North Carolina) کے سکول میں اس کے کلاس فیلوز نے ایسا کھانا کھانے پر مجبور کیا جو حلال نہیں تھا۔ انکار پر عبدالعزیز کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا، اس کا مذاق اُڑانے کے ساتھ ساتھ مار پیٹ بھی کی گئی اور مسلمان، مسلمان پکارتے ہوئے کلاس فیلوز اس پر تشدد کرتے رہے جس کی وجہ سے میں نے امریکہ چھوڑ دیا۔

مغرب مسلمانوں کی دل آزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اسلام کے بارے میں اس کی سوچ نہایت گھٹیا اور بغض و عناد سے بھری ہوئی ہے۔ 2008ء میں ایک امریکی کمپنی نے اسامہ بن لادن کی تصویر والا ٹائلٹ ٹشو بنانے کا اعلان کیا تو اسے اتنے آرڈر ملے کہ دن رات فیکٹری چلا کر بھی اس آرڈر کی تکمیل مشکل ہو گئی تھی۔ یہ اس ملک کا حال ہے جو آزادی اظہار کا علمبردار ہے اور پوری دنیا کو اخلاقیات کا درس دیتا نہیں تھکتا۔

2013ء میں ناروے کے چرچ کے احتجاج کے بعد، فن لینڈ کی ٹوائلٹ پیپر بنانے والی ایک کمپنی نے، ٹوائلٹ رول پر بائبل کے اقتباسات چھاپنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ یہاں

چرچ کی غیرت جاگ پڑی اور ٹوائلٹ پیپر پر بائیبل کی آیات کی پرنٹنگ برداشت نہیں ہوئی۔ ہم بھی اس کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب (نعوذ باللہ) ٹائیلٹ پیپر پر قرآنی آیات کو چھاپا جاتا ہے تو اس وقت چرچ ان کی حوصلہ افزائی کیوں کرتا ہے؟ اس وقت آزادی اظہار کی آڑ کیوں لی جاتی ہے؟

2008ء میں ہی امریکی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے ''ساؤتھ پارک'' نامی کامیڈی پروگرام شروع کیا جس میں حضور نبی رحمت حضرت محمد ﷺ سمیت تمام انبیائے کرام کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ اپریل 1990ء میں ہالینڈ کی ایک عالمی شہرت یافتہ شراب فروخت کرنے والی کمپنی نے اپنی تیار کردہ شراب کی بوتلوں کے ڈھکنوں پر کلمہ طیبہ پرنٹ کرنے کی ناپاک جسارت کی۔ 1998ء میں کورین کمپنی ''سوئز پوسٹ'' نے اپنے تیار کردہ جوتوں کے نیچے لفظ ''اللہ اور محمد'' لکھا۔ اسی سال معروف امریکی کمپنی NIKE نے خواتین کے ملبوسات پر قرآنی آیات پرنٹ کروا کر اس کی فروخت کے لیے نمائش کروائی اور اپنے تیارہ کردہ جوتوں پر لفظ ''اللہ'' لکھا۔ اس سے مسلمانوں میں بے حد اشتعال پیدا ہوا۔ دوسری طرف کمپنی مالکان کی طرف سے کہا گیا کہ جو مسلمان یہ مصنوعات نہیں خریدنا چاہتے، نہ خریدیں لیکن اِس پر احتجاج نہ کریں کیونکہ اِس سے ہمارے حقوق آزادی مجروح ہوتے ہیں۔ اِسے کہتے ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''۔

یہ بات بھی آن ریکارڈ ہے کہ 'چارلی ہیڈ و' میں یہودیوں کے خلاف مزاحیہ کالم لکھنے پر نسلی منافرت پھیلانے کے الزام میں کئی صحافیوں کو مقدمات کا سامنا ہے۔ مضمون 'لا افیئر سائنٗ' میں بائیس سالہ نکولاژ سارکوزی کی جیسکا سبوئن ڈارٹی نامی یہودی لڑکی کے ساتھ تعلقات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ ایک افواہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ صدر سرکوزی کے بیٹے یہودی مذہب اپنانے والے ہیں اور لکھا تھا 'انہیں زندگی میں ایک طویل راستہ طے کرنا ہوگا، بیچارہ چھوٹا بچہ۔' ایک بڑے سیاسی مبصر نے ان کے اس مضمون کو یہودیوں اور سماج میں ان کی کامیابیوں کے خلاف تعصب سے منسلک کرتے ہوئے سخت نکتہ چینی کی تھی۔ چارلی ہیڈو کے ایڈیٹر فلپ وال نے مورس سائن سے اس پر معافی مانگنے کو کہا۔ اس نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا جس پر اُسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ مورس سائن کو برطرف کرنے کے مسٹر وال کے فیصلے کو بشمول فلسفی برنارڈ ہینری لیوی کے سرکردہ دانشوروں کے ایک گروپ نے حمایت کی تھی۔

پروفیسر جناب خباب احمد خان اپنے مضمون ''چارلی سے اظہار یکجہتی...... یہ مسلمان

ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہودؔ' میں لکھتے ہیں:

''آزادیٔ اظہار کے متعلق بھی چارلی ہیبڈو کی مثال مغرب کے سیاہ کاروں اور ان سے یکجہتی کرنے والے مسلم حکمرانوں کے سامنے رکھیں، اسی مذموم جریدے نے اپنے ایک کالم نگار کو 2009ء میں نوکری سے فارغ کر دیا تھا، جس کا نام مورس سائن تھا جس نے فرانسیسی راہنما نکولس سرکوزی کے ایک ناکام معاشقے کے نتیجے میں جنم لینے والے اس کے بیٹے کے متعلق صرف بدقسمت کے الفاظ اپنے کارٹون میں تحریر کیے تو اسے یہود دشمنی قرار دے کر نوکری سے نکال دیا گیا۔

بی بی سی کے نمائندے ٹم ولکوکس نے 11 جنوری کو فرانس میں ایک یہودی لڑکی سے چار فرانسیسی یہودیوں کی ہلاکت کے متعلق سوال کیا، جس کے جواب میں اس لڑکی کا کہنا تھا کہ میرے خیال میں یہودیوں کے لیے صورت حال 1930ء کے ہولوکاسٹ جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ جس کے جواب میں ولکوکس نے صرف اتنا کہا کہ کئی ناقدین کی نظر میں فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی پالیسی کے باعث ایسا ہو رہا ہے جس کے باعث وہ یہ سطور تحریر کرنے تک زیر عتاب ہے اور ہوسکتا ہے مسلسل معافیاں مانگنے کے باوجود اسے بھی مورس سینٹ کی طرح نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

اس سے کیا یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مغرب کا آزادی اظہار بھی حدود و قیود کا پابند ہے۔ کیمرون اور دوسرے مغربی سربراہ فرانس کے مذموم جریدے سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے کیوں نہیں سوچتے کہ مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی کی توہین کرتے ہوئے تمام حدود و قیود پار کرنے سے کیا ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کی دل آزاری نہیں ہوتی؟ اگر ہر ایک کو آزادی اظہار رائے کا حق حاصل ہے تو برطانیہ اور دوسرے ممالک میں ملکہ کی توہین کیوں قابل سزا جرم ہے۔ ٹام لیٹ نے کارٹونوں کے ذریعے دوسروں کی توہین کرنے والوں کو ''پاگل لوگ'' درست ہی قرار دیا ہے کہ ان کے بقول یہ دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ چارلی ہیبڈو کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ یہ ''جریدہ'' صرف اور صرف اسلامی شخصیات ہی کو اپنا ہدف بناتا اور دانستہ طور پر اسلامی شخصیات کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب صورت حال ایسی بن چکی ہے کہ سچ بولنا اور اس کی طرف توجہ دلانا بھی ایک خطرناک اور مشکل کام بن چکا ہے۔ یہ سلسلہ اب رکنے والا

نہیں، اس قسم کی خون آشامی مزید بڑھے گی۔ اس جریدے کو وقتی طور پر اس حملے کے باعث اپنی بقا کا جواز مل گیا مگر اس کے عملے کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس کی ملاقات ایسے دشمن سے ہوئی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں شکست دے دے گا کہ ان کی ملاقات سچ سے ہوئی ہے۔

چارلی ہیبڈو کو بہرحال مستقبل میں سچ کا سامنا ہوگا، کیونکہ سارے منافقین کی اصلیت ''اظہار یکجہتی'' کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں پر واضح ہو چکی ہے کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ امریکی میڈیا گروپ کی جانب سے دو لاکھ ڈالر، برطانوی اخبار گارجین کی جانب سے ایک لاکھ پونڈ اور فرانسیسی جریدے لبریشن کی جانب سے ایک لاکھ 28 ہزار یورو کے عطیات کی فراہمی بتا رہی ہے کہ مستقبل کی صف بندی واضح ہو چکی ہے، طاقت والوں اور ان کے حلیف مسلم حکمرانوں کی منافقت اور دوغلا پن اب دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکا ہے۔ منافت کب تک سچ کا مقابلہ کرے گی؟ ایک نہ ایک دن اسے شکست سے دو چار ہونا ہے۔ کاش مسلمان اس کے بعد قول و فعل کے تضاد اور اپنی زندگی سے منافقت نکال کر اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنا لیں''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 18 جنوری 2015ء)

فرانس کے مشہور کامیڈین Dieudonne کا شمار معروف مزاحیہ اداکاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی مزاحیہ اداکاری میں ہولوکاسٹ پر ذو معنی گفتگو اور دبے لفظوں تنقید بھی کرتا تھا۔ جنوری 2015ء میں فرانس کی وزارت داخلہ نے اس کے تمام پروگرام منسوخ کر کے پابندی لگا دی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ کامیڈی کے دوران آزادی اظہار رائے کا غلط استعمال کرتا ہے اور اس کے بعض جملوں سے یہودیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

معروف کالم نگار جناب محمد بلال غوری ''پاس کر یا برداشت کر'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''فرانس میں مزاح اور فنون لطیفہ کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں بعض علاقے جگت بازی کے حوالے سے مشہور ہیں، اسی طرح فرانسیسیوں کی رگ ظرافت بھی پوری دنیا میں ضرب المثل ہے۔ فرانس میں ان دنوں ایک کامیڈئن Dieudonne کے بہت چرچے ہیں۔ سیاہ فام فرانسیسی کامیڈئن کی والدہ تو برطانیہ سے تھیں مگر ان کے والد کا آبائی تعلق کیمرون سے ہے۔ رواں سال جنوری کے پہلے عشرے میں اس نے فرانس کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا مگر وزیر داخلہ کی طرف سے

مقامی انتظامیہ کو ایک مراسلہ جاری کیا گیا کہ Dieudonne اپنی روایت جگت بازی کے دوران ہولوکاسٹ اور گیس چیمبرز سے متعلق سوالات اٹھاتے ہیں اور آزادی اظہار کی آڑ میں یہودی کمیونٹی کی دل آزاری کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لیے سکیورٹی یا نقص امن کو بنیاد بنا کر ان کے شوز منسوخ کر دیئے جائیں۔ اگر ملکی سطح پر پابندی لگائی گئی تو بدنامی ہوگی، لہٰذا مقامی سطح پر شو کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ یہودی کمیونٹی کے جذبات واحساسات کا احترام کرتے ہوئے اس فنکار پر پابندی عائد کر دی گئی۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ اس کے شوز منسوخ کیے گئے ہیں، اس سے قبل بھی کئی بار اسے جرمانہ کیا جا چکا ہے۔ چند برس ہوتے ہیں امریکہ میں فلاڈلفیا سے تعلق رکھنے والے ایک فلم ڈائریکٹر کو اس لیے گرفتار کر لیا گیا کہ وہ ہٹلر کی زندگی پر فلم بنانے کا سوچ رہا تھا۔ امریکہ سمیت یورپی ممالک میں سینکڑوں نہیں ہزاروں محققین، مصنفین اور دانشوروں کی زندگیاں محض اس لیے اجیرن کر دی گئی کہ انہوں نے ہولوکاسٹ کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا۔ بلکہ یورپ کے 16 ممالک میں تو ہولوکاسٹ کے موضوع پر کسی قسم کی تحقیق، تحریر یا تقریر پر پابندی عائد ہے اور جو کوئی بھی اس حوالے سے کسی قسم کی بات کرے، اسے تین سے سات سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ان دنوں آزادی اظہار کی بحث کا از سر نو آغاز فرانسیسی جریدے ''چارلی ہیبڈو'' پر حملے کے بعد ہوا۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ تمثیلاً ایک واقعہ ادھر سے بھی بیان کر دیا جائے۔ Maurice Sinet ایک معمر فرانسیسی صحافی ہیں جو ایک عرصہ تک ''چارلی ہیبڈو'' سے وابستہ رہے۔ ان کا مزاحیہ کالم Sine کے قلمی نام سے ہر ہفتے اس جریدے میں شائع ہوا کرتا تھا۔ جولائی 2008ء کے ایک شمارہ میں انہوں نے ظریفانہ انداز میں فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کے 22 سالہ یہودی دوشیزہ Jessica Sebaoun Darty سے معاشقے کا ذکر کیا۔ ''چارلی ہیبڈو'' کے مدیر نے انہیں نوٹس جاری کیا کہ وہ یہودی کمیونٹی کی دل آزاری کرنے پر معافی مانگیں ورنہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ موریس سائن نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور موقف اختیار کیا کہ آزادی اظہار کے حق پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ چنانچہ موریس سائن کو نوکری سے انکار دیا گیا۔ اس طرح کی بیشمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جب اظہار رائے کی آزادی کو خاطر میں نہ لایا گیا۔ اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں کہ مجرد آزادی تو کسی کو بھی نہیں دی جا سکتی۔

پارلیمان آزاد اور خود مختار ہے جو چاہے قانون بنائے مگر برطانوی دارالعوام ہو یا فرانسیسی قومی اسمبلی و سینیٹ، اگر وہاں یہ قانون منظور ہو جائے کہ بصارت سے محروم افراد کو پھانسی دے دی جائے گی تو کوئی ذی شعور انسان اس کی حمایت نہیں کرے گا۔ میڈیا کو اظہار رائے کی آزادی ہے لیکن کوئی اخبار یا چینل بے بنیاد الزام لگا کر پگڑی اچھالے تو اس کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کا یہ مطلب کیسے ہوسکتا ہے کہ جو جی میں آئے کہیں اور جو جی میں آئے لکھیں؟ اگر آپ کے مہذب معاشرے میں ہولوکاسٹ کو جھٹلانا جرم ہے اور اس پر اس لیے پابندی عائد ہے کہ چند کروڑ یہودیوں کی دل آزاری نہ ہو تو ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات و احساسات کے کھلواڑ کی کھلی چھٹی کیوں دے دی جاتی ہے؟'' (روزنامہ جنگ لاہور، 17 جنوری 2015ء)

2014ء میں جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں شیکسپیئر کا ڈرامہ ''دی مرچنٹ آف وِینس'' سٹیج کرنے اور فلم کی صورت میں دکھانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ وجہ یہ کہ اس ڈرامے میں ایک سفاک، زر پرست یہودی، شائی لاک کو بطور وِلن پیش کیا گیا ہے۔ جرمن انتظامیہ کو اندیشہ تھا کہ اس مقبول عام تمثیل کی نمائش نسل پرستی کے دبے ہوئے رجحان کو پھر سے ہوا دے سکتی ہے۔ چنانچہ اس امکان کو معدوم کرنے کی خاطر اِن فن پاروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اگست 2013ء میں جرمنی کے دو عیسائی طلبہ کو یہودی مخالف لطیفے بنانے اور دائیں بازو کے ایک متنازع بینڈ کے کنسرٹ میں شرکت کرنے کے الزام پر سکول سے نکالا گیا۔

فروری 2016ء میں امریکی ریاست شکاگو میں ویٹون کالج (Wheaton College) میں پولیٹیکل سائنس کی پروفیسر لائیریکا ہاکنز (Larycia Hawkins) یہ کہنے کے بعد اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھی کہ مسلمان اور عیسائی ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس پر الزام تھا کہ 10 نومبر 2015ء کو اس نے اپنے فیس بک پیغام میں لکھا کہ وہ کرسمس سے قبل انتظار کے دورانیے میں سر پر حجاب کریں گی جس کا مقصد مسلمانوں سے یکجہتی کا اظہار کرنا تھا۔

فلسطین کے معروف کارٹونسٹ ناجی سلیم حسین العلی صرف کارٹونسٹ نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہترین لکھاری، مفکر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ناجی العلی نے اپنی تحریریں اور خاکہ نگاری کو صرف اسرائیلی استبداد کے خلاف وقف کیے رکھا تھا۔ اس کے آبائی شہر الناصرہ پر

یہودی قبضے کے بعد کویت نے اسے شہریت دی تھی جہاں اس نے اسرائیلی مظالم کے خلاف پوری آزادی کے ساتھ کام کیا۔ ناجی العلی 40 ہزار کارٹون بنانے والے کارٹونسٹ تھے۔ بدنام زمانہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے انہیں اسرائیل کے خلاف کارٹون شائع کرنے پر نہایت بے دردی سے قتل کیا۔

جناب علی ہلال اپنے تحقیقی مضمون ''طنزیہ کارٹون بنانے پر پہلا قتل اسرائیلی ایجنسی نے کیا تھا'' میں لکھتے ہیں: ''مزاحیہ خاکوں پر قتل کی پہلی روایت ڈالنا بدنام زمانہ اسرائیلی ایجنسی کے نام ہے۔ موساد نے 1987ء میں لندن میں فلسطینی صحافی کو گولیاں مار کر قتل کیا تھا۔ پچیس برس قبل وقوع پذیر ہونے والے طنزیہ کارٹون بنانے پر کسی کارٹونسٹ کے قتل کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ الجزائر سے شائع ہونے والے عرب جریدے الشروق کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ ہفتے فرانس کے ملعون جریدے ''چارلی ہیبڈو'' کے دفتر پر حملے اور اس کے بعد یہودی ریسٹورنٹ پر شور مچانے والی اسرائیلی حکومت کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ طنزیہ کارٹونوں پر صحافی کو قتل کرنے کی اولین روایت صہیونی ایجنسیوں نے متعارف کرائی ہے۔ موساد نے لندن سے شائع ہونے والے کویتی جریدے ''القبس'' سے وابستہ فلسطینی صحافی ناجی سلیم حسین العلی کو اس وجہ سے قتل کیا تھا کہ وہ عربوں کی اراضی پر ناجائز اسرائیلی قبضے اور فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف طنزیہ کارٹون بنا کر عربوں کو اسرائیل کے خلاف مشتعل کرتے تھے۔ معنی خیز کارٹونوں سے صہیونی جرائم سے پردہ اٹھانے کا یہ طریقہ اسرائیل کو ناگوار گزر رہا تھا جس پر اسرائیلی حکام نے پیشہ ورانہ قتل و غارتگری کی سیاہ تاریخ رکھنے والی قاتل ایجنسی (موساد) کو مذکورہ صحافی کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری سونپی۔ موساد کے پیشہ ور قاتلوں نے لندن کے پوش علاقے میں واقع القبس کے دفتر کے باہر صحافی پر پستول سے گولیاں چلا کر موت کے گھاٹ اتارا تھا جب کہ صہیونی قاتل بڑی آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

رپورٹ کے مطابق کویت کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے کی اہمیت کے پیش نظر برطانوی حکومت نے سکیورٹی اداروں کو عرب صحافی کے پراسرار قتل کی مکمل تحقیقات کرانے کے لیے احکامات جاری کیے تھے۔ قاتلوں تک رسائی کرنے والی برطانوی پولیس کو دوران تحقیق مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جبکہ خفیہ ذرائع سے ڈرائے جانے کے باعث عینی شاہدین بھی لب بند رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نامعلوم ذرائع سے دباؤ کے بعد برطانوی پولیس نے

قاتل کی شناخت بتانے سے گریز کیا اور معاملے کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کی۔ اپنے جریدے سے منسلک نامور صحافی کے پراسرار قتل پر کویتی حکومت نے شدید احتجاج کیا اور برطانوی حکام پر مجرمانہ واردات کی تحقیقات کو حتمی نتائج تک پہنچانے کے لیے دباؤ ڈال کر سکیورٹی اداروں کو جرم میں ملوث عناصر کی نشاندہی کرنے پر زور دیا تھا۔ کویت کے ساتھ فلسطین، قطر اور دیگر عرب ملکوں کی مداخلت کے بعد برطانوی پولیس نے واقعے میں موساد کے ملوث ہونے کا اعتراف کرلیا تھا۔ برٹش پولیس کے مطابق مجرم فلسطینی یہودی تھا جسے موساد نے عرب صحافی کے قتل کا ٹاسک دیا تھا، موساد نے اسے فلسطین سے بلا کر لندن میں پناہ دی تھی اور قتل کے لیے درکار تمام سہولیات فراہم کی تھیں۔ اس انکشاف کے بعد اس وقت کی برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے اس گھناؤنے قتل میں ملوث ہونے کے باعث سخت ایکشن لیتے ہوئے موساد کو ملوث قرار دے کر لندن میں واقع موساد کا دفتر بند کرا دیا تھا۔ مارگریٹ تھیچر نے برطانیہ میں موجود موساد کے تمام ایجنٹوں کو ملک سے نکالنے کا حکم دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق موساد نے صہیونی مظالم کے خلاف طنزیہ کارٹون بنانے والے صحافی کو بعد از مرگ بھی معاف نہ کیا۔ قاتل ایجنسی نے ناجی العلی کی نماز جنازہ اور تدفین کو خفیہ رکھنے کے لیے اس کے لواحقین پر سخت دباؤ ڈالے رکھا جس کے نتیجے میں لندن کے نواح میں برگ نیفیڈ نامی مسلمانوں کے قبرستان میں انتہائی خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا گیا تھا اور اس کے جنازے اور تدفین میں صرف 50 افراد شریک ہو سکے تھے۔ رپورٹ کے مطابق عرب صحافی کے قتل کے لیے اسرائیلی حکومت نے موساد کو بھاری فنڈ جاری کیا تھا۔ ناجی العلی کے قتل کے بعد اس کی شخصیت پر عرب اخبارات میں مضامین لکھنے پر بھی پراسرار طور پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ 10 سال قبل مصر میں ناجی العلی کی خدمات و کردار پر مبنی فلم فلمائی گئی تھی جس کی رونمائی پر معزول مصری صدر حسنی مبارک نے پابندی لگوا دی تھی۔ جریدے کے مطابق فلم پر پابندی سے پردہ اٹھاتے ہوئے پروڈیوسر نے بتایا تھا کہ یہ سب موساد کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ اسے فلم پر کام کرتے ہوئے بھی دھمکیاں دی جاتی رہیں تاہم اس نے سب کو نظر انداز کر دیا لیکن مصری صدر نے وجہ بتائے بغیر فلم کی نمائش پر پابندی لگوا دی۔ عرب کے صحافتی حلقوں نے موساد کے اس مذموم عمل کی سخت مذمت کی تھی اور کھلی دہشت گردی سے تعبیر کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق موساد یہودی مخالف طنزیہ کالم نگاری اور کارٹون بنانے سے شہرت پانے والے صحافیوں کو

معاف نہیں کرتی۔ ایسے افراد کو ٹھکانے لگانا موساد کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

امریکہ کے سابق رکن کانگریس اور سابق صدارتی امیدوار ران پال کا ایک آرٹیکل شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ چارلی ہیڈو پر حملہ نائن الیون طرز کا حملہ ہے۔ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ''چارلی ہیڈو'' پر حملے کے بعد یہ انکشاف سامنے آیا ہے کہ دفتر پر حملہ امریکی و اسرائیلی ایجنسیوں کی مشترکہ کارروائی ہے جس کا اعتراف فرانس کی سیاسی جماعت فرنٹ نیشنل پارٹی کے سابق سربراہ جین میری لی پین نے بھی کیا ہے۔ لی پین کے بقول اُن کے پاس ایسی مصدقہ اطلاعات ہیں کہ پیرس حملہ امریکی و اسرائیلی ایجنسیوں کی مشترکہ سازش ہے جس کا مقصد اسلام اور مغرب کے درمیان خلیج پیدا کر کے دنیا کو جنگ کی طرف دھکیلنا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ سکیورٹی اداروں کا یہ موقف نا قابل فہم اور مضحکہ خیز ہے کہ حملہ آوروں میں سے ایک کا شناختی کارڈ اس کی گاڑی سے برآمد ہوا کیونکہ 9/11 کے وقت بھی یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ حملے میں ملوث ایک ہائی جیکر کا پاسپورٹ جائے وقوع سے ملا تھا۔ لی پین کے بقول حقیقت یہ ہے کہ فرانس کی جانب سے فلسطینی ریاست کو تسلیم کیے جانے کے بعد امریکہ اور اسرائیل، فرانس سے ناخوش تھے اور مذکورہ کارروائی اسی کا نتیجہ ہے۔ فرانسیسی میگزین کی جانب سے ایک بار پھر توہین آمیز خاکوں کی اشاعت مذہب اسلام کے خلاف کھلی دہشت گردی اور انتہا پسندی ہے جس نے مغرب کی جمہوریت پسندی کا پول کھول دیا ہے، ایسا کرنے کا مقصد مسلمانوں میں اشتعال پھیلانا اور ان میں غیرت ایمانی ختم کرنا ہے مگر مغرب کی یہ سازشیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی''۔ (روزنامہ اسلام کراچی، 17 جنوری 2015ء)

چند سال پیشتر امریکی یہودیوں نے ایک فلم بنائی جس کا نام ''محمد پیغمبر خدا'' تھا۔ (نعوذ باللہ) مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا، لیکن پابندی نہ لگائی گئی۔ اس پر ایک غیور مسلمان خلیفہ حماس عبدالخالص نے واشنگٹن میں چند یہودی افسروں کو یرغمال بنا کر مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کروایا، مگر بعد میں خلیفہ حماس ہی نہیں، بلکہ اس کی بیوی اور تین معصوم بچوں کو بھی شہید کر دیا گیا۔ اسرائیل کے شہر ''اشدود'' میں قائم یہودی ڈسکو ڈانس کلب کا نام ''مکہ'' رکھا گیا۔ مسلمانوں کے احتجاج پر فوج نے 3 فلسطینیوں کو شہید اور 11 کو شدید زخمی کر دیا۔ خود کو مہذب اور انسانی حقوق کے علمبردار کہلوانے والوں کو یہ بھی نظر نہ آیا کہ مئی 2010ء میں غزہ میں مجبور و مقہور اور محصور و بے کس پر امن فلسطینی مسلمانوں کی امداد کے لیے جانے والے

سامان کو نہ صرف اسرائیلی حکومت نے روک لیا بلکہ ان تمام افراد کو گرفتار بھی کر لیا جو سامان لے کر جا رہے تھے۔ کتوں اور بلیوں کے حقوق پر قانون سازی کرنے والوں نے چپ سادھ لی تھی۔ کسی کو معمولی سا احتجاج بھی بلند کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ امریکی سرپرستی میں ہوتا ہے۔

فلسطینیوں کے قتل عام میں ملوث صہیونی فوجیوں کی سفاکیت کی ان گنت مثالیں موجود ہیں مگر پہلی بار اسرائیل کے ایک منحرف فوجی نے انکشاف کیا کہ نئے بھرتی ہونے والے فوجی اہلکاروں کو فلسطینیوں کے قتل کے لیے نشانہ بازی کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اسرائیل کے عبرانی اخبار ''ہارٹز'' نے سابق فوجی اہلکار یارون کابلان کا ایک بیان نقل کیا جس نے 2 سال تک فوج میں خدمات انجام دینے کے بعد ضمیر کے ملامت کرنے پر فوجی سروس چھوڑ دی تھی۔ کابلان کا کہنا تھا کہ فوجی ٹریننگ سینٹروں میں فلسطینیوں کے خلاف انتہائی تشدد آمیز طریقے استعمال کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے گہرا صدمہ پہنچا۔ ہمیں جب بھی عسکری تربیت دی جاتی تو اس میں فلسطینیوں کو بندوق سے نشانہ بنا کر مارنے کا طریقہ ضرور سکھایا جاتا۔ بعض اوقات ہم سے تربیت کے دوران بھی بے گناہ فلسطینی قتل کرائے جاتے۔ ہم خود کو اپنے ہی ہاتھوں قتل ہونے والوں کے درمیان پاتے۔ اسرائیل کے فوجی نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے یہ حقائق بیان کر دیے کہ کس طرح آج کی اکیسویں صدی کی مہذب دنیا میں بھی ایک منظّم فورس کو درندگی وسفاکیت کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔

''امریکہ کی صہیونیت نوازی۔ عالمی امن کے لیے خطرہ'' کے عنوان سے روزنامہ اسلام کراچی اپنے اداریہ میں لکھتا ہے: ''امریکہ کی جانب سے ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل کی حمایت اور پشت پناہی کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ اسرائیل کا وجود ہی عالمی استعماری قوتوں کے مرہون منت ہے اور اسرائیل نے فلسطین پر ناجائز قبضہ کرنے کے بعد سے اب تک انسانیت کے خلاف جتنے بھی جرائم کیے ہیں، جتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا ہے، اس کی ذمہ داری براہ راست عالمی طاقتوں بالخصوص امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ امر اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ فلسطین کے نہتے اور تہی دست باشندوں پر جاری اسرائیل کے روح فرسا مظالم میں امریکہ سمیت دیگر مغربی ممالک، اقوام متحدہ، یورپی یونین اور انسانی حقوق کی نام نہاد علم بردار بین الاقوامی تنظیمیں برابر کی شریک ہیں کیوں کہ انھی قوتوں کی مکمل پشت پناہی، مالی و

سیاسی امداد اور سفارتی تعاون اسرائیل کو حاصل ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے پیانے پر معصوم و بے گناہ فلسطینی مرد، خواتین اور بچوں کا خون ناحق بہہ جانے کے باوجود امریکی صدر باراک اوباما یہودی مملکت کا ''حق دفاع'' محفوظ تصور کررہے ہیں۔امریکی صدر نے اسرائیل کے دفاع کو امریکہ کی اولین ترجیح قرار دے کر ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ جیسا سپر پاور کہلانے والا ملک آج بھی پنجۂ یہود میں جکڑا ہوا ہے۔امریکہ کی جانب سے فراہم کیے جانے والے 30 ارب ڈالر کے ہتھیاروں سے اب مزید فلسطینی مسلمانوں کا خون بہائے گا اور انسانیت کے خلاف مزید جرائم کا ارتکاب کرے گا۔

عالمی طاقتوں کے اس دوغلے پن اور منافقانہ کردار سے واضح ہے کہ یہ طاقتیں دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل مسلم آبادی کو سرے سے انسان سمجھنے کی روادار نہیں اور ان کی جانب سے مسلمانوں کے مسلمہ مذہبی، سماجی، معاشرتی اور انسانی حقوق کے استحصال پر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جارہا ہے۔اس صورت حال نے دنیا کے مجموعی امن واستحکام کے حوالے سے شدید خدشات وخطرات پیدا کر دیے ہیں اور عالمی قوتوں کی انتہا پسندی، دہشت گردی، اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کے افسوس ناک اور قابل مذمت رویوں سے مسلمانوں میں شدید اضطراب و ہیجان کی لہر پیدا ہورہی ہے۔موجودہ بین الاقوامی حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے بعض سنجیدہ حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر عالمی قوتوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی امتیازی اور سراسر ضد وعناد پر مشتمل پالیسیوں کا رخ نہ بدلا تو مسلم خطوں میں سلگنے والی آگ بہت جلد ان کے محفوظ اور پرامن نشیمن کا رخ کرسکتی ہے''۔(روزنامہ اسلام کراچی 11 نومبر 2015ء)

دسمبر 2015ء میں اسرائیل میں یہودی انتہا پسندوں نے مسلمان خاندان کو زندہ جلانے کا جشن منایا۔سفاک یہودیوں نے رواں برس جولائی میں سعد دوابشہ کے گھر کو آگ لگا کر 18 ماہ کے علی دوابشہ ان کے والد سعد اور والدہ کو زندہ جلا کر شہید کر دیا تھا۔اسرائیل کے ایک ٹی وی نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں شادی کی تقریب کے دوران انتہا پسند یہودی ہاتھوں میں ہتھیار اور خنجر اٹھائے شہید فلسطینی خاندان کا مذاق اُڑاتے رہے اور ان کے قتل کا جشن مناتے رہے۔ان میں سے ایک یہودی نوجوان نے سفاکیت کی انتہا کر دی، وہ بار بار 18 ماہ کے شہید بچے علی دوابشہ کی تصویر میں خنجر گھونپتا رہا جبکہ ایک اور کے ہاتھ میں فائر بم موجود تھا۔انتہا پسند یہ گانا بھی گا رہے تھے کہ مجھے فلسطینیوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک دھماکا

کرنے دو۔ تقریب میں شریک لوگوں کے پاس فوجی رائفلز اور پستولیں موجود تھیں جنھیں وہ بچوں سمیت ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔ اسرائیلی ٹی وی کے مطابق اسرائیلی فوج نے اس قسم کا اسلحہ فلسطینی علاقوں میں آباد کار یہودیوں کو اپنی حفاظت کے لیے دیا ہوا ہے۔ اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسرائیل ایک خطرناک ملک ہے جو دہشت گردوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اولے ہیگارڈرم (Olei Hagardom) سٹریٹ کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ اسرائیل کے کئی ایک شہروں میں پائی جانے والی اس سڑک کا نام یہودی جنگجو گروہ کے نام پر رکھا گیا ہے جنہیں 1940ء کی دہائی میں عربوں اور انگریز حکام کے خلاف پرتشدد کارروائیاں کرنے کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ ان پر سیاست دانوں کے قتل کرنے اور ایک ریلوے اسٹیشن کو بم سے اُڑانے کا بھی الزام تھا۔ یہ سب کچھ ایک آزاد ریاست کے قیام اور قابض قوتوں سے آزادی کے نام پر کیا گیا۔ اس گروہ کے ایک رکن، الیاہوحکیم، جس نے برطانوی لارڈ معین کو قتل کیا، کے نام سے آج حیفا میں ایک اسٹریٹ موجود ہے اور شلومو بن یوسف، جسے برطانوی حکام نے فلسطینیوں سے بھری ہوئی ایک بس کو بم سے اُڑانے کے جرم میں 1938ء میں پھانسی کی سزا دی، کے نام سے تل ابیب اور احکا میں گلیاں موجود ہیں۔ آج بھی اسرائیل اولے ہیگارڈم کے ممبران کی تصاویر والی ڈاک ٹکٹ جاری کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ ماضی کی بات ہے، تو کیا آج اسرائیلی، دہشت گردوں کی پذیرائی نہیں کرتے؟ انتہائی مطلوب شخص ایتزاک شمیر کا پوسٹر۔ اس کا تعلق اس دہشت گرد گروہ سے ہے جسے پہلے برطانوی اور بعد میں خود اسرائیلی حکومت نے بھی کالعدم قرار دے دیا۔ شمیر کو برطانوی حکام نے انتہائی جنونی دہشت گرد قرار دیا تھا۔ اس نے اقوام متحدہ کے اہم ترین نمائندے، کاؤنٹ فوک برنا ڈوٹ کو ہلاک کیا، لیکن پھر اُس کا کیا بنا؟ وہ اسرائیل کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا۔ جب وہ 2012ء میں فوت ہوا تو نیتن یاہو نے اُس کے بارے میں کہا...... ''آج ہم نے ایک سچے یہودی اور محبِّ وطن کو کھو دیا، جو انتہائی دلیر لیڈر تھا جو کبھی اسرائیل کو ملا ہو''۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اسرائیل نے نہ صرف بہت سی گلیات دہشت گردوں کے نام سے منسوب کی ہیں بلکہ اُن میں سے کچھ کو ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں پر بھی فائز کیا ہے۔

''مسلمان ہی دہشت گرد کیوں؟'' کے عنوان سے خزیمہ رشید کیلانی لکھتی

ہیں: ''آیئے اب ہم آپ کو نظریں خیرہ کرنے والے میڈیا کی چکا چوند روشنیوں سے ہٹا کر دوسری دنیا میں لیے چلتے ہیں جہاں غیر مسلم معاشروں میں بھی یہی صورت حال ہے اور وہاں بھی مسلم ممالک کی طرح دہشت گردی کی کارروائیاں ہوتی ہیں مگر انہیں ان کے علاقوں کے نام سے منسوب کر کے ان کے مذہب کو نشانہ نہیں بنایا جاتا اور جان بوجھ کر ان سے صرفِ نظر اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ مسلمانوں کو ایک خاص مقصد کے تحت بدنام اور دہشت گرد ثابت کیا جائے۔ مغربی میڈیا کے دوغلے پن کی ایک چھوٹی سی مثال ملاحظہ فرمائیے کہ فلسطین کی ایک پرانی تصویر بی بی سی نیوز پیپر میں آئی جس میں ایک فلسطینی جوان کے ہاتھ میں پتھر ہے اور اس کے قریب احتجاجی ٹائر جل رہے ہیں۔ مگر جب نیوز پیپر میں خبر آئی تو لکھا تھا ''بدتہذیب عربوں کی طرف سے معصوم یہودیوں کی بس کو آگ لگائی جا رہی ہے'' یہ حقیقی چہرہ ہے اس مغربی میڈیا کا جو اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں۔

اب سب سے پہلے انگلینڈ کا جائزہ لیتے ہیں۔ انگلینڈ میں اکثر دہشت گرد تنظیمیں عیسائیوں کی ہیں اور جس تنظیم نے انگلینڈ میں سب سے زیادہ دہشت گرد حملے کیے، وہ ''**IRA**'' یعنی آئرش ریپبلکن آرمی جو کہ عیسائی کیتھولک دہشت گرد آرگنائزیشن ہے۔ اسے کبھی میڈیا میں کرسچن کیتھولک گروپ کے نام سے نہیں پکارا جائے گا، صرف "**IRA**" کہہ کر پکارا جائے گا۔ ان لوگوں نے سو سے زیادہ دہشت گرد حملے کیے۔ فروری **1972** ء میں بم بلاسٹ کیا جس میں سات لوگ مارے گئے۔ **21** جولائی **1972** ء میں دھماکا کیا، گیارہ ہلاک اور ایک سو تیس زخمی ہوئے، کچھ دن بعد ہی دوبارہ اسی تنظیم نے تین دھماکے کیے جس میں نو مرے، **1974** ء میں دھماکا ہوا جس میں پانچ لوگ ہلاک اور چوالیس زخمی ہوئے۔ اسی سال **1974** ء میں ایک اور دھماکا ہوا جس میں اکیس سو افراد ہلاک اور سو زخمی ہوئے۔ **1996** ء میں لندن میں دھماکا کیا جس میں دو ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے، اسی سال لندن میں دھماکا ہوا جس میں دو سو کے قریب افراد زخمی ہوئے، **1998** ء میں اسی تنظیم نے پانچ سو پونڈ کا کار بم دھماکا کیا جس میں پینتیس زخمی اور دو سو سے زائد گھر تباہ ہوئے اور اسی سال پانچ سو پونڈ کا کار بم دھماکا کیا جس کے نتیجے میں انتیس ہلاک اور اکتیس زخمی ہوئے۔ اتنی زہر آلودہ تاریخ ہونے کے باوجود انہیں کیتھولک یا عیسائی تنظیم کے نام سے نہیں پکارا جاتا بلکہ ''آئی آر اے'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ السٹر ڈیفنس ایسوسی ایشن یا السٹر فریڈم فائٹرز

تنظیم ہے۔ انہوں نے چار سو سے زائد افراد ہلاک کیے اور ان کا بنیادی مقصد آئرش لوگوں کا قتل ہے۔ انہی میں سے ایک تنظیم السٹر وولینٹیئر فورس ہے۔ ان کے سر پانچ سو لوگوں کا قتل ہے اور بنیادی ہدف آئرش فوجیوں کا قتل ہے۔ لوئیلسٹ وولینٹیئر فورس، ان کے سر چودہ لوگوں کا قتل ہے اور یہ بھی آئرش کیتھولک عیسائیوں کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اورنج وولینٹیئر، ریڈ ہینڈ کمانڈوز یہ بھی بنیادی طور پر آئرش لوگوں کے قتل میں ملوث رہی ہے۔ ریڈ ہینڈ ڈیفینڈرز بھی عیسائی دہشت گرد تنظیم ہے اور پائپ بومبنگ اٹیک کی ابتدا جنہوں نے کی، وہ یہی تنظیم ہے اور یہ کیتھولک عیسائیوں کے خلاف سرگرم ہے۔

اسی طرح امریکہ میں پہلے نمبر پر The Klu Khlux Klan ہے جو افریقی امریکی لوگوں، سیاسی و مذہبی لیڈروں کے قتل میں ملوث ہیں۔ دوسرے نمبر پر کرپس (Crips) ہے جس کے ممبران تیس ہزار سے زیادہ ہیں اور دہشت گردانہ کارروائیوں میں سر فہرست ہیں۔ تیسرے نمبر پر "Sovereign Citizen" ہیں یہ گورنمنٹ کے خلاف ہیں اور بنیادی طور پر ٹیکس کی ادائیگی اور گورنمنٹ کے بنائے اصولوں کو توڑنا اور ان کے خلاف مزاحمت کرنا ان کا مقصد ہے۔ چوتھے نمبر پر "Black Liberation Army" ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ کالے امریکیوں پر مشتمل ہے لیکن ان میں سفید فام بھی بھرتی کیے گئے ہیں اور یہ تنظیم سیاہ فام لوگوں کے حقوق کے لیے گورنمنٹ سے نبرد آزماد ہے اور تیرہ پولیس آفیسرز کے قتل اور ایک جہاز ڈیلٹا ایئر لائن کو ہائی جیک کر کے ایک ملین تاوان کا مطالبہ کرنا ان کی کارروائیوں میں شامل ہے۔ پانچویں نمبر پر "Animal Liberation Front" ہے۔ یہ جانوروں کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے اور لوگوں کے فارمز ہاؤسز اور فیکٹریز تباہ کرنے کے لیے اٹیک کرتے ہیں تاکہ جانوروں کو آزادی ملے لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے پر جانور مر رہے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ یہ لوگ اپنی کارروائیوں میں تباہ ہونے والی املاک کو ہولوکاسٹ میں استعمال کرنے والے گیس چیمبرز کو تباہ کرنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ چھٹے نمبر پر "Army of God" ہے۔ یہ لوگ اسقاط حمل کے کلینکس اور مردانہ ہم جنس پرستی کے اڈوں اور کلبوں پر حملے کرتے ہیں اور تین ابارشن کلینکس، ایک مردانہ ہم جنس نائٹ کلب دھماکے سے اڑانا ان کے کارناموں میں شامل ہے۔ ساتویں نمبر پر "Earth Liberation Front" ہے۔ یہ ملک کی اہم تنصیبات کو تباہ کرتے ہیں جن میں بزنس

بلڈنگز، پائپ لائنز، فاسٹ فوڈز شاپس اور میکڈونلڈ سر فہرست ہے اور گورنمنٹ آفیسرز کو قتل کرنے اور مشی گن کی جنیٹک لیبارٹری کو دھماکے سے اڑانے میں ملوث ہیں۔ آٹھویں نمبر پر "Jewish Defence Leauge" ہے۔ اس کا مقصد غربت، کرپشن، ظلم، دہشت گردی ختم کرنا ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خود انہی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ ایک مسجد کو دھماکے سے شہید کرنا اور صرف 1980ء میں پندرہ دھماکوں کے الزام میں ایف بی آئی نے ان کے خلاف نوٹس لیا اور اس کے رہنما کو گرفتار کیا۔ نویں نمبر پر "Phineas Praisthood" ہے۔ یہ بنیاد پرست عیسائی دہشت گرد تنظیم ہے جو بزور طاقت اپنا پیغام دوسروں پر ٹھونسنے پر زور دیتی ہے اور یہ نسلی منافرت، یہودیت، ٹیکس سسٹم، ہم جنس پرستی، ثقافتی اقدار اور اسقاط حمل کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ دسویں نمبر پر "Occupy Wall Street" ہے۔ یہ تنظیم اپنے آپ کو مثبت اور پرامن سرگرمیوں کے طور پر ظاہر کرتی ہے مگر کئی ملین ڈالرز کی پراپرٹی ان کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ حملے کرنا، چوری، ڈاکا، ریپ اور روز بروز بڑھتی ہوئی منشیات کا استعمال، منظّم گروہوں کی صورت میں دیواروں پر چڑھنا، توڑ پھوڑ کرنا اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی پراپرٹیز پر قبضے کرنا بھی اسی تنظیم کی کارفرمائیاں ہیں اور امریکن ایف بی آئی کی طرف سے اس گروپ پر رٹ بھی پڑ چکی ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ امریکہ میں دسویں نمبر پر دہشت گرد تنظیم ہے اور یہ جاری کیے گئے مذکورہ ان کے کارناموں کی تفصیل ہے اور یہ تمام تنظیمیں عیسائی دہشت گرد تنظیمیں ہیں مگر میڈیا میں ان کی تشہیر کی جاتی ہے اور نہ ہی عیسائیت کا نام لے کر مذہب کو بدنام کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسپین اور فرانس میں "ETA" کے نام سے دہشت گرد تنظیم ہے۔ یہ 829 افراد کے قتل، ہزاروں لوگوں کو زخمی اور درجنوں کے اغوا میں ملوث رہے اور اس تنظیم کے 703 کارکنان مختلف جرائم کی وجہ سے جیلوں میں بند رہے ہیں اور اسی طرح افریقہ میں بھی اتنی زیادہ تنظیمیں ہیں جو قتل و غارت گری میں مصروف ہیں مگر حکومت و میڈیا کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ حقائق ڈھونڈ کر کسی بھی تنظیم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ انہی میں سے ایک تنظیم ’’Lord's Salvation Army‘‘ ہے جو کہ کرسچن دہشت گرد تنظیم ہے اور اس کا بنیادی مقصد کمسن بچوں کی ذہن سازی کر کے انہیں خودکش حملوں کے لیے تیار کرنا ہے۔

اسی طرح اگر ہم سری لنکا میں دیکھیں تو سب سے خطرناک تنظیم ’’Liberation

Tigers of Tamil Eelam ''المعروف تامل جبکہ میڈیا میں ''تامل ٹائیگرز'' یا ''ایل ٹی ٹی ای'' کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ ہندو ہیں۔ ایک انگریز مصنف Robert Pape نے جو کہ امریکن پولیٹیکل سائنٹسٹ ہیں اور انٹرنیشنل سکیورٹی افیئرز پر کام کرتے ہیں، خصوصاً خودکش بم دھماکوں اور تشدد آمیز فضائی طاقت کی حکمت عملی کے آپس میں تعلق کے بارے میں اسپیشلسٹ ہیں، نے بنام Dying to Win کتاب لکھی جو کہ خودکش دھماکوں کے بارے میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جو لوگ اس کام کی نسبت مسلمانوں کی طرف کرتے ہیں وہ یہ تو بتائیں کہ اس کی ابتدا کس نے کی؟ انہوں نے کہا کہ پہلے نمبر پر خودکش دھماکا کے ماہر تامل ٹائیگرز ہندو تھے اور شاید یاد ہو کہ ہندوستانی وزیراعظم راجیو گاندھی کو 21 مئی 1991ء میں قتل کیا گیا اور اسے قتل کرنے والی ایک خاتون تھی جس کا تعلق تامل ٹائیگرز ہندو تنظیم سے تھا جو وزیراعظم کو ہار پہنانے کے بہانے گئی اور خودکش دھماکے سے وزیراعظم کو ہلاک کیا۔ مگر جب خبر آئی تو یہ نہیں بتایا گیا کہ عورت ہندو تھی بلکہ یہ بتایا گیا کہ وہ ایک تامل عورت تھی اور جس کا تعلق سری لنکا کی ملی ٹینٹ تنظیم سے ہے''۔

(ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور اگست 2016ء)

نوم چومسکی نے کہا تھا: ''اسرائیل کے پاس دنیا کے جدید ترین زہریلے ہتھیار ہیں۔ وہ یہ ہتھیار جدید ترین جنگی طیاروں اور بحری جہازوں سے فلسطینیوں کے گنجان آباد کیمپوں، بازاروں، سکولوں اور مسجدوں پر گراتا ہے۔ وہ فلسطینی جن کے پاس اپنے دفاع کے لیے کسی قسم کے کوئی ہتھیار نہیں، کوئی فوج، کوئی توپ خانہ، کوئی ہوائی جہاز، کوئی بحری بیڑے'' کچھ بھی نہیں...... یہ جنگ نہیں ہے، یہ ایک منظّم نسل کشی اور قتل عام ہے۔

جولائی 2014ء میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف برطانوی رکن پارلیمنٹ ڈیوڈ وارڈ نے سماجی ویب سائٹ پر لکھا کہ اگر وہ فلسطین میں رہتے تو وہ بھی اسرائیل پر راکٹ حملہ کرتے۔ یہ بیان سامنے آنا تھا کہ ان پر تنقید کی بارش ہوگئی، کچھ لوگوں نے پارٹی لیڈر اور نائب وزیراعظم نک کلیگ سے ڈیوڈ کو نکالنے کا مطالبہ کیا۔

25 سالہ امریکی فوجی چیلسیا میننگ (Chelsea Manning) نے 18 جنوری 2017ء کو امریکہ کی آزادی اظہار کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا: ''عراق میں دو امریکی ہیلی کاپٹروں نے جان بوجھ کر دو صحافیوں پہ بمباری کی اور مدد کے لیے آنے والے شہریوں کے

ایک خاندان کو بھی بھون ڈالا، مجھے اس واقعے کی ویڈیو نشر کرنے کے جرم میں 35 سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ امریکیوں کا مسئلہ میں یا عافیہ نہیں بلکہ انہیں سچ سے نفرت ہے"۔

(دی ٹیلی گراف 18 جنوری 2017ء)

برطانوی صحافی وکٹوریہ بریٹین (Victoria Brittain) کا کہنا ہے کہ عافیہ صدیقی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے امریکی فوجیوں پر حملہ کیا اور بندوق سے فائر کیا جبکہ مقدمے کی کارروائی کے دوران ثابت ہوا کہ نہ تو بندوق پر عافیہ کی انگلیوں کے نشان تھے اور نہ ہی گولی کا خول ملا۔ اس کے برعکس جب عافیہ کو امریکہ لایا گیا تو وہ شدید زخمی تھی اور اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے باوجود امریکی عدلیہ کا عافیہ کو 86 سال کی سزا سنانا انصاف کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔

برطانیہ کی پارلیمنٹ خاتون ممبر جوکوس (Jocox) جس نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے برطانیہ کے ایوانوں میں مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے، ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ اسرائیل کو فلسطین کے مسلمانوں کا خون بہانے پر قاتل ملک قرار دیا، اسے آزادئ اظہار کا یہ صلہ ملا کہ 16 جون 2016ء کو اسے برطانیہ میں قتل کر دیا گیا۔

جنوری 2015ء میں امریکی نیوز چینل سی این این کے سینئر اینکر کو سوشل میڈیا پر اسرائیل سے متعلق تکرار کے باعث اپنی 34 سالہ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ سی این این کے انٹرنیشنل براڈ کاسٹر کے طور پر کام کرنے والے اینکر جم کلینسی (Jim Clancy) نے فرانسیسی جریدے چارلی ہیبڈو سے متعلق سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر اظہار خیال کیا تھا۔ جس پر اسرائیل کے حامیوں نے انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ بات بڑھتے بڑھتے اسرائیلی پراپیگنڈے تک جا پہنچی، جس پر جم کلینسی نے سخت جملے استعمال کیے۔ کلینسی کے خلاف مہم شروع کر دی گئی جس کے بعد وہ مستعفی ہو گئے۔

دنیا بھر میں اسلام مخالف تحریکوں پر گہری نظر رکھنے والے شہرہ آفاق کالم نگار جناب احمد نجیب زادے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں لکھتے ہیں:

"معروف دانشور نوم چومسکی نے چارلی ہیبڈو حملے کی مذمت کے بہانے اسلام کے خلاف متعصّبانہ مہم کی سخت مذمت کی ہے۔ نوم چومسکی نے سی این این کے اینکر پرسن جم کلینسی کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے کے حوالے سے اسرائیل اور امریکہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

واضح رہے کہ بدبخت جریدے چارلی ہیبڈو پر تنقید کرنے کے ''جرم'' میں جم کلینسی کے خلاف اسرائیلی وزیراعظم بن یامین نیتن یاہو نے براہ راست امریکی صدر بارک اوباما سے ''احتجاج'' کیا تھا جس پر جم کلینسی کو ٹوئٹر اکاؤنٹ پر اسرائیل سے معافی طلب کرنے کی ہدایت کی گئی لیکن ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والے اینکر پرسن نے معافی طلب کرنے کے بجائے استعفیٰ دینے کو ترجیح دی۔ اسرائیلی جریدے یروشلم پوسٹ نے تصدیق کی کہ جم کلینسی کی شکایت وزیراعظم نیتن یاہو نے براہ راست امریکی صدر اوباما سے کی تھی۔ واضح رہے کہ جم کلینسی اور انتہا پسند یہودیوں کے درمیان گستاخانہ خاکوں کے حوالے سے سخت جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ لیکن ٹوئٹر انتظامیہ نے ان جملوں کو حذف کر دیا۔ ایرانی خبر رساں ادارے مہر نیوز نے لکھا کہ جم کلینسی کی 34 سالہ نوکری اور باوقار صحافتی کیریئر کا انجام ثابت کرتا ہے کہ امریکی اور مغربی میڈیا انتہائی متعصب رویہ اپنائے ہوئے ہیں''۔ پیرس کی خاتون میئر اینی ہیڈالگو نے شدید ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فاکس نیوز کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا اعلان کیا۔ خاتون میئر نے فرانسیسی اخبار لی فگارو سے گفتگو میں کہا کہ شہر کا امیج خراب کرنے والے امریکی میڈیا چینل کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ دوسری جانب معروف محقق اور دانشور نوم چومسکی نے اسرائیلی دباؤ پر سی این این کے تجربہ کار اینکر پرسن جم کلینسی کی ملازمت جانے پر اسرائیل، فرانس اور امریکہ کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔ روسی خبر رساں ایجنسی ریا نووستی کا کہنا تھا کہ چارلی ہیبڈو اور اسرائیلیوں پر تنقید نے سی این این کے معروف اینکر پرسن جم کلینسی کے 34 سالہ کیریئر کا اختتام کر دیا۔ جبکہ نوم چومسکی کا کہنا تھا کہ اسرائیلی فوج نے فلسطین میں کئی عالمی و مقامی صحافیوں کو قتل کیا، لیکن چارلی ہیبڈو کے صحافیوں کے قتل پر واویلا مچانے والا مغرب اس پر کیوں خاموش رہا؟ نوم چومسکی نے سی این این کی ویب سائٹ پر اپنے آرٹیکل میں لکھا کہ چارلی ہیبڈو حملے پر مغربی اور اسرائیلی میڈیا کا کردار افسوس ناک اور بلا جواز ہے۔ اپنے مضمون میں نوم چومسکی نے سوال اٹھایا کہ عیسائیت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی مذہب کی بنیاد پر لاتعداد انسانوں اور دانش وروں کو قتل کیا۔ چومسکی لکھتے ہیں کہ یہ دوغلا پن ہے کہ ایک جانب یہی کام عیسائی کریں تو جائز ہے، لیکن کوئی مسلمان کرے تو اس پر آسمان سر پر اٹھا لیا جائے۔ نوم چومسکی نے یاد دلایا کہ 1999ء میں جب نیٹو کی فورس نے سربیائی حکومتی ٹیلی ویژن اسٹیشن پر میزائل داغ کر 16 صحافیوں کو ایک ہی حملے میں ہلاک کر دیا تھا تو مغربی دنیا اور

آزادیٔ صحافت کے علم بردار کہاں تھے؟ اس وقت مغربی دنیا نے انکوائری تک کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ چند سال قبل جب ناروے میں عیسائی دہشت گرد آندرے Anders Brelvlk نے 77 معصوم بچوں کو بے رحمی سے قتل کیا تھا تو اس وقت مغرب کا احساس اور اخلاق کہاں تھا؟ نوم چومسکی نے لکھا کہ وہ براہ راست چارلی ہیبڈو کی انتظامیہ سے ''آزادی اظہار'' کی بابت سوال کرتے ہیں کہ وہ لوگ گستاخانہ خاکوں ہی کو ''آزادی اظہار'' کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا چارلی ہیبڈو نے اپنے معروف کارٹونسٹ Sine کو محض اس بات پر فارغ نہیں کر دیا تھا کہ اس نے اسرائیل کے خلاف ایک کارٹون بنایا تھا۔ جبکہ ایک اور کارٹونسٹ کو صرف اس ''جرم'' میں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا کہ اس نے سابق فرانسیسی صدر کلولس سرکوزی کے بیٹے کا کارٹون بنایا تھا۔ اس وقت چارلی ہیبڈو کا ''آزادی اظہار'' کا واویلا کہاں تھا؟ اور کہاں تھی مغربی دنیا؟ جو اسرائیل کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔ اسرائیل نے ''آپریشن پروٹیکٹیو ایج 2014'' کے دوران غزہ میں نصف درجن صحافیوں کو ہلاک کیا تھا، لیکن چونکہ وہ تمام صحافی مسلمان تھے، اس لیے مغربی میڈیا مکمل خاموش رہا۔ دوسری جانب چارلی ہیبڈو حملے کے بعد تمام مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے''۔

(روزنامہ ''امت'' 22 جنوری 2015ء)

دنیا بھر کو مذہبی رواداری اور برداشت کا درس دینے والے امریکہ کا اصل چہرہ دیکھیے کہ وہاں آج بھی مختلف امریکی فوجی کالجز میں اسلام دشمنی پر مبنی نصاب پڑھایا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔ فوجیوں کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ خود کو اسلام کے خلاف مزاحمتی تحریک کا ایک حصہ سمجھیں۔ نصاب میں یہ بھی درج ہے کہ وقت آنے پر مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات مکہ اور مدینہ پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے اس کورس کے انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل متھیو ڈولی ہیں جو اپنی اسلام دشمنی میں فوج میں خاصے مشہور ہیں۔ اسی سے شہ پا کر آج بھی اسرائیل نہایت دیدہ دلیری سے تعصب و منافرت پر مبنی نصاب تعلیم جاری رکھے ہوئے ہے۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے جریدے ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (International Herald Tribune)'' نے 18 دسمبر 2004ء کو ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں اسرائیلی نصابی کتب کا جائزہ لینے کے بعد یہ انکشاف کیا گیا کہ اسرائیل خطرناک نصاب پڑھا رہا ہے۔ صرف نصاب ہی نہیں بلکہ اسرائیل

میں جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو اس کے ایک کان میں ''یہودی دنیا کی اعلیٰ مخلوق ہیں''! اور دوسرے کان میں ''عرب حقیر کیڑے مکوڑے ہیں ان کو قتل کرنا چاہیے''! کی آواز سنائی جاتی ہے۔ جب بچہ نرسری میں داخلہ لیتا ہے تو اس کو نقشوں کے ذریعے اکھنڈ اسرائیل کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر طلبہ کو نصابی کتب کے ذریعے یہ سکھایا جاتا ہے کہ ''یہودی اللہ تعالیٰ کی منتخب قوم ہیں جبکہ عرب حقیر، ناپاک، پیدائشی طور پر پست اخلاق اور ذلیل ہیں۔ وہ دہشت گرد، ڈاکو اور بدعنوان ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے یہودیوں کو ناقابل یقین تکلیفیں پہنچائیں اور یہودیوں نے اپنے مذہب کو بچانے کے لیے ناقابل یقین تکلیفیں اٹھائی ہیں''۔

اسرائیلی نصاب تعلیم میں شامل ہے کہ ''عربوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا عبادت ہے''۔ اسرائیلی نصاب میں جہاں بھی عربوں کا ذکر آتا ہے، وہاں ''عرب چوروں'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ عربوں کو زنا کی پیدائش کیا کہا گیا ہے، عربوں کو نسل در نسل یہودیوں کے خون کا پیاسا قرار دیا گیا ہے۔ میٹرک تک نصاب نفرت و تحقیر پر مبنی ہے، جبکہ میٹرک کے بعد نصاب میں باقاعدہ عسکریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسرائیلی بچوں کے ذہن میں یہ خیال پختہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عربوں کے خلاف جنگ لڑنی ہے۔ گیارہویں جماعت میں باضابطہ طور پر اسلحہ اور جنگی تربیت کے متعلق پڑھایا جاتا ہے۔ فوجی ٹریننگ، تعلیم کا لازمی حصہ ہے۔ کالج میں تعلیم کے دوران اسرائیلی فوجی آفیسرز طلبہ سے ملاقاتیں کرتے ہیں اور انہیں فوجی خدمات انجام دینے کے قابل کرتے ہیں۔

پاکستان کے معروف بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب مرحوم نے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کے تحت اسرائیل کا دورہ کیا تھا اور عربوں کے خلاف نفرت و حقارت پر مبنی ان کتابوں کو ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا، مگر اقوام متحدہ نے طاغوتی طاقتوں کے اشارے پر اس رپورٹ کو داخل دفتر کر دیا۔ البتہ اس رپورٹ کی بنیاد پر مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ اسکولوں میں اسرائیل کی لگائی ہوئی 113 شرانگیز کتابیں منسوخ کر دیں۔ شہاب صاحب نے لکھا ہے کہ اس اسرائیلی نصاب کی وجہ سے ہزاروں فلسطینی بچے ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے، جن میں دینِ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر انتہائی رکیک، بے بنیاد، غلیظ اور گمراہ کن حملے کیے گئے تھے۔ ایک اسکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی، ذلت آمیز سزا محض اس لیے دی گئی کہ اس نے اپنی

کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں انتہائی گستاخانہ الفاظ درج تھے۔

اسرائیل کا یہ مکروہ اور تاریک چہرہ اسلامی دنیا کے بالغ النظر اور جہاندیدہ قائدین اور سربراہوں سے یقیناً چھپا ہوا نہیں ہوگا۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ نصاب تعلیم بدلنے کی ضرورت اسلامی ممالک میں نہیں، صہیونی ریاست اسرائیل میں ہے، لیکن حالات کا جبر اور زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کر ہم واشنگٹن کی خوشنودی کی خاطر، تحمل و برداشت کو ''مزید'' فروغ دینے کے لیے اسلامی ممالک کے اس نصاب کو تبدیل کرنے کے اعلانات کر رہے ہیں، جس کی کسی ایک کتاب میں بھی نفرت و عداوت نہیں سکھائی گئی۔ اسلامی ممالک کے نصابِ تعلیم پر یلغار کرنے والوں کو اسرائیل کے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے، جہاں بچے کو پیدائش سے لے کر یونیورسٹی تک تعصب، نفرت، عداوت اور توہین انسانیت کے سوا کچھ نہیں سکھایا جاتا۔

جناب ڈاکٹر مجاہد مرزا اپنی کتاب ''یہودیوں کا نسلی تفاخر'' میں لکھتے ہیں:

''تاریخ قتل و غارت کے واقعات سے پٹی پڑی ہے مگر کسی بھی واقعے کو خصوصی لفظ مرحمت نہیں ہو پایا ہے۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے شہروں کے شہر کی آبادیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔ کھوپڑیوں کے مینار بنائے تھے۔ یورپ میں ہنی پال نے وسیع پیمانے پر قتل کیے تھے۔ لینن ااور تراتسکی نے لاکھوں افراد کو لقمہ اجل بنایا تھا۔ سٹالن کے ہاتھ کروڑوں افراد کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ چین میں ثقافتی انقلاب کی آڑ میں لاکھوں افراد کو مار دیا گیا۔ کمبوڈیا میں پال پاٹ (Pol Pot) کے سرخ کھیروں (Red Khmer) نے کئی لاکھ انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا مگر یہ سب تاریخ کے صفحات میں درج ہو گیا جبکہ بقول یہودیوں کے 60 لاکھ یہودیوں کی موت کو ایک شو کے طور پر دنیا بھر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اگر بیسویں صدی کے نصف میں ہولوکاسٹ نامی صنعت کے بارے میں محض مضامین اور چند کتابیں لکھی گئی ہیں تو نئی صدی میں یہ صنعت عروج کو پہنچ گئی ہے۔ سینکڑوں کتابیں، درجنوں فلمیں، بے تحاشا ٹی وی پروگرام، دستاویزی فلمیں اور ہزاروں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ ہولوکاسٹ کے مظلوموں کے انٹرویو، ان کے رشتے داروں کے بیانات، بچ جانے والوں کے قصے، جنگی جرائم کی داستانیں، مجرموں کے جھوٹے سچے اعترافات اس کے علاوہ ہیں۔ دو بڑے عجائب گھر ہیں جن میں ایک واشنگٹن میں ہے جسے جنگ عظیم دوم کی کسی بھی

یادگار سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور دوسرا ہولوکاسٹ کی یادگار کے ساتھ تل ابیب میں کھولا گیا ہے۔

یہودیوں کے بارے 'ہولوکاسٹ' کی روداد سے ہی دنیا بھر کے انسانوں کو غمگین نہیں کیا جاتا بلکہ فلسطینیوں کی یہودیوں سے زیادتیوں، یورپ میں نوفسطائی لوگوں کی یہودیوں سے نفرت اور امریکہ میں کوکلکس کلان (Kokolakis Kalan) والوں کے یہودیوں کے بارے میں نفرت انگیز رویوں کو ہالی ووڈ کی فلموں میں اکثر موضوع بنایا جاتا ہے۔ جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہودی بیچارے معصوم اور بے گناہ ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی کرنے والے حیوان اور انسانیت سے گرے ہوئے لوگ ہیں مگر آج تک کسی ہالی ووڈ والے نے صابرہ اور شتیلہ (Sabra and Shatila) کے دردناک قصوں پر کوئی بھی فلم نہیں بنائی اور وہ بنائیں گے بھی نہیں کیونکہ شوبزنس کی دنیا کا سچی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، انہیں تو Titanic کے غرق ہونے میں بھی محبت کے موضوع اجاگر کرنا ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ تو شعبہ ہی یہودیوں کا ہے جو ہر سال ذہین، پرلگن، بے لوث، پرتخلیق، خلیق اور جرات مند یہودیوں کی ہزاروں کہانیوں اور فلموں سے دنیا کو پاٹ دیتے ہیں جس کے برعکس کہیں دکھایا جاتا ہے کہ فرعون کی افواج بنی اسرائیل پر تلواریں تانے ان کا تعاقب کر رہی ہیں، زار روس کے پروردہ خون خوار فراک یہودیوں کو تہہ تیغ کر رہے ہیں۔ ہٹلر کے کالی وردیوں میں ملبوس گسٹاپو دستے یہودیوں پر ظلم ڈھا رہے، فلسطینی دہشت گرد یہودیوں کے بچوں کو سکولوں سے اغوا کر رہے ہیں یا سامی مخالف کسی کاروباری اور حساس یہودی کے ساتھ برا سلوک کر رہا ہے۔

جہاں تک ہٹلر کے دستوں کے ہاتھوں یہودیوں کے وسیع پیمانے پر مارے جانے کا تعلق ہے، اس کو یہودی ذرائع ابلاغ نے خصوصی تکنیک استعمال کر کے اس طرح پیش کیا ہے جس سے فسطائیوں کے خلاف دیکھنے، سننے اور پڑھنے والوں کے دل میں شدید نفرت پیدا ہوتی ہے اور بے گناہ یہودیوں کے لیے بے حد ہمدردی۔ ہٹلر کے ایک منصوبے کو ''آخری حل'' کا نام دیا جاتا ہے جس کے تحت یورپ کے سارے یہودیوں کو ہلاک کیا جانا مقصود تھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے ورنہ نہ تو بچ رہنے والے ہوتے اور نہ ہی دکھ کی داستانیں سنانے والے۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ٹی وی پر اور فلموں میں جنس اور تشدد کی بھرمار بچوں کو ذہنی طور پر بیمار کر رہی ہے۔ دوسری جانب امریکہ کے کچھ سکولوں میں 'مطالعہ ہولوکاسٹ' کے بارے میں فلمیں دیکھنا لازمی ہوگیا ہے اور پھر یہودی گروپوں نے اسے لازمی بنانے کے لیے

قانون منظور کروانے کی کوشش بھی کی ہے۔ بہرحال یہودیوں کے اثر کے باعث اب ہزاروں سکولوں نے بچوں کو ہولوکاسٹ کی فلمیں دکھانا شروع کر دی ہیں۔ یہ سارا ایک منصوبے کے تحت ہے اگرنہیں تو پھر یہودی اسرائیل کے سکولوں میں اپنے بچوں کو صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں عورتوں اور بچوں کا اپنے ہاتھوں قتل عام کیوں نہیں دکھاتے۔ کمبوڈیا میں پول پاٹ کے جرائم یا روس میں چیکا کے بہیمانہ اقدامات سکولوں میں دکھانا لازمی کیوں قرار نہیں دیا جاتا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کا واقعہ جس قدر انسانیت سوز تھا کہ ایک ہی دھماکے سے لاکھوں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان، لڑکے، لڑکیاں لقمہ اجل بن گئے۔ اس سے کہیں زیادہ شرمناک واقعہ جرمنی کے شہر ڈریسڈن (Dresden) پر جنگ کے آخری ایام میں اتحادی فوجیوں کی وہ تباہ کن بمباری تھی جو محض دھماکہ خیز تباہی کے علاوہ آتش گیر مادوں سے بھی لیس تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آگ کا طوفان نامی اس تجربے میں ہیروشیما یا ناگاساکی دونوں شہروں سے زیادہ آبادی موت کا شکار ہوئی تھی۔ ڈریسڈن میں مصوری اور ثقافتی اہمیت کی حامل اشیا کے خزینے تھے۔ یہ خوبصورت شہر فن وعلم کا مرکز تھا۔ اس کی کوئی فوجی اہمیت نہیں تھی۔ جنگ تقریباً اختتام کو پہنچ چکی تھی مگر ایک ہی حملے میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو موت کی نیند سلا دیا گیا تاکہ لاشوں کے تعفن سے وبائیں نہ پھیلیں۔ ہزاروں لاشوں کو اجتماعی طور پر آگ کے بڑے بڑے الاؤ دہکا کر نذر آتش کیا گیا تھا۔

اگر یہودیوں کی موت یعنی ہولوکاسٹ ایک جنگی جرم تھی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی عمل تھا جس کے لیے نیورمبرگ (Nuremberg) عدالت جیسا ڈرامہ سٹیج کیا گیا تو کیا جاپان کے شہروں پر ایٹم بم پھینکنا اور ڈریسڈن کو بلاوجہ نذر آتش کر دینا جنگی جرائم کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا یہ شرمناک واقعات غیر اخلاقی اور غیر انسانی نہیں ہیں؟ جرمنی کے شہروں میں بے گناہ عوام پر بم برسا کر چھ لاکھ سے زائد مردوں عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرنا جو جنگ سے کوئی ربط نہیں رکھتے تھے، اس کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ آج اقوام متحدہ معصوم شہریوں پر بم برسانے کو انسانیت کے خلاف جرم قرار دیتی ہے مگر تب؟ وہ کون سے حیوان تھے جنہوں نے اپنی بہیمیت سے بچوں تک کو معاف نہیں کیا تھا۔ اگر کسی دہشت گرد تنظیم کی مذموم کارروائی میں بچے ہلاک ہو جائیں تو حکومتیں دہشت گرد کو سزائے موت دیتی ہیں جبکہ ہیروشیما، ناگاساکی، ڈریسڈن اور دوسرے شہروں میں بچوں کی ہلاکت کے ذمہ دار افراد کو تمغے دیے گئے۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے؟

جنگ کے خاتمہ کے بعد کئی ماہ تک اتحادی افواج نے لاکھوں جرمن شہریوں کے لیے جو راشن کی مقدار مقرر کی تھی، وہ محض زندہ رہنے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ نتیجتاً ان مہینوں میں بھوک اور بیماری کے باعث لاکھوں جرمن شہری ہلاک ہوئے تھے۔ سوویت افواج نے جرمنی کے مشرقی علاقے میں لاکھوں افراد کو گھر چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ جنگ کے مصدقہ اصولوں اور جینوا کنونشن کے برخلاف جنگی قیدیوں کو ایک طویل عرصے تک قید میں رکھا گیا تھا اور غذا کے فقدان، رہائشی سہولت کے غیر مناسب ہونے اور بیماریوں کے باعث کئی لاکھ قیدی فوجی چل بسے تھے۔ یہ سب کچھ جنگ کے بعد ہوا جب کہ مرنے والوں کے نزدیک ہی اتحادی فوج کے غذا اور ادویہ کے گودام پوری طرح بھرے ہوئے تھے۔

تھیوڈور این کاف مان نامی ایک امریکی یہودی نے اپنی کتاب ''جرمنوں کو برباد ہونا ہی چاہیے''! کے دیباچے میں لکھا تھا:

''اس دھماکہ خیز نسخے میں جرمن قوم کی تباہی اور جرمن نسل لوگوں کو صفحہ ہستی سے مکمل طور پر مٹا دینے کا ایک پر از جزئیات منصوبہ درج ہے۔ ساتھ ہی ایک نقشہ بھی ہے کہ جرمنی کے خطوں کو کس طرح بانٹ کر تقسیم کیا جانا چاہیے''۔

یاد رہے یہ کتاب **1941**ء میں شائع ہوئی تھی۔ ٹائم میگزین اور اخبار نیو یارک ٹائمز دونوں میں ہی اس کتاب پر تبصرہ شائع ہوا تھا لیکن نہ تو مبصر حضرات اور نہ ہی قارئین کے کان پر اس نسل کشی کے خلاف جوں تک نہیں رینگی تھی مگر آج اگر کوئی شخص ''یہودیوں کو برباد ہونا ہی چاہیے''! نام کی کتاب لکھ دے تو پہلی بات تو یہ کہ جو شور و غوغا بلند ہو گا الامان! الحفیظ! اور دوسری بات یہ کہ مصنف کی نسل کے ساتھ اخلاقی گراوٹ منسوب کر دی جائے گی۔

ظلم کسی کے ساتھ بھی ہو، قابل مذمت ہے اور ظلم کوئی بھی کرے، قابل گرفت اور قابل تعزیر ہے۔ انسانی اقدار کی پامالی کا کوئی بھی ذی ہوش اور حساس شخص خوشی سے نہیں دیکھ سکتا مگر مبالغہ آرائی کی بھی کوئی تو حد ہونی چاہیے۔ ایسی ایسی کہانیاں گھڑی گئیں کہ رونگٹے کھڑے ہونے کے ساتھ تشکیک بھی ہونے لگتی ہے کہ آیا ایسا ہو سکتا ہے مثلاً انسانوں کی کھال سے لیمپ شیڈ بنانا یا انسانی چربی کو صابن سازی کے لیے استعمال کرنا۔ اپنی آپ بیتی لکھ کر نوبیل انعام حاصل کرنے والے یہودی نے ایسے طومار باندھے تھے جو نا قابل یقین ہیں۔ اس نے لکھا کہ یہودیوں کو اجتماعی طور پر بھڑکتی ہوئی آگ سے بھری خندقوں میں زندہ دھکیل کر جلا

دیا جاتا ہے۔ یہ بات کسی اور نے نہیں کہی اور بابی یار (Babi Yar) بستی میں یہودیوں کے قتل عام کے بارے میں وہ رقم طراز ہے کہ مہینوں تک زمین کانپتی رہی اور بار بار اس زمین سے خون کے فوارے پھوٹتے رہا کرتے تھے۔ یہ ساری داستان خیال آرائی تو تسلیم کی جاسکتی ہے مگر اسے حقیقت ماننا عقل سے باہر ہے۔

ہولوکاسٹ کی ہیئت اور شدت کو ثابت کرنے والی نیورمبرگ کی جنگی جرائم کی عدالت تھی جس کے بارے میں معروف ریپلکن سینیٹر رابرٹ ٹافٹ نے امریکی فوجی افسروں کے ساتھ اتفاق کیا تھا کہ اس نوع کی عدالت ایک غلط بنیاد ڈالے گی جو مستقبل کے تصادمات میں امریکی افواج کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ اس نے ایک معزز شخص کی حیثیت سے اخلاقی طور پر نیورمبرگ کی عدالت میں مقدمات کی مخالفت کی تھی جس کی قیمت اسے اپنی عمر بھر کی اس محنت سے ہاتھ دھو کر چکانی پڑی تھی جو امریکہ کا صدر بننے کے لیے کرتا آیا تھا۔ اس کے خلاف مخالفت کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا۔ یہودیوں کے زیر اثر ذرائع ابلاغ نے معاندانہ مہم کے سلسلے میں اس پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ لیکن سینیٹر ٹافٹ نے پھر بھی نیورمبرگ کی عدالت کی صحت کا سوال اٹھایا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ جیسا ذرائع ابلاغ چرچا کر رہے ہیں، اسی طرح یہ عدالت مغرب کی پابندی قانون کی کسی طرح بھی روشن مثال نہیں ہے۔ انہوں نے سینیٹ کی ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی جس کے سامنے بہت سے امریکیوں نے شہادت دی کہ جرمن ملزموں پر وسیع پیمانے پر تشدد کیا گیا تھا۔ سینیٹر ان باتوں سے دہل کر رہ گئے اور انہوں نے کھلم کھلا کہا کہ ایسے اعتراضات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اس عدالت کے انصاف کی بنیادوں کو ہی غلط گردانا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے مقدمات جن کو فاتحین سنتے ہیں، اس سے انصاف کو کسی طرح کی بھی شکل میں غیر جانبدار ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

فروری 1988ء میں کینیڈین حکومت نے 'ہولوکاسٹ' کو چیلنج کرنے والے ایک شخص ارنسٹ زنڈل (Ernest Zundel) پر ''جھوٹی اطلاعات پھیلانے'' کے الزام میں کارروائی کی۔ صفائی کے وکلا نے جیل خانوں کو گیس کے ذریعے سزائے موت دینے کی خاطر چیمبرز بنانے کی ایک ماہر فرم کی خدمات حاصل کیں۔ اس کمپنی کے ماہر فریڈلیوشٹر (Fredley Sheetz) کو یہ فریضہ سونپا گیا کہ وہ آشوٹز میں لوگوں کو دکھائے جانے والے چیمبرز کا جائزہ لے کر ماہرانہ رپورٹ پیش کرے۔ لیوشٹر ایک غیر سیاسی شخص ہے اور

امریکہ کی کئی جیلوں میں سزائے موت کے مختلف طریقوں کے سلسلے میں تعمیر اور توضیع کی سند ہے۔ اپنی تحقیق کے دوران موصوف نے مبینہ گیس چیمبروں کی تعمیر کا جائزہ لینے کے علاوہ زائکلون بی کی کیمیائی صفات پر تحقیق کی۔ اس نے بتلایا کہ زائکلون بی (Zyklon-B) ایک ایسا مادہ ہے جو ہوا سے مل کر مہلک ہائیڈروجن سائنائیڈ گیس خارج کرتا ہے۔ یہ اردگرد کی سطوح کے ساتھ چمٹ جاتی ہے اور لوہے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے اور لوہے کے ساتھ مل کر ایک اور مادہ فیروسائنائیڈ (Ferro Cyanide) بنتی ہے اور اگر اسے لوہے یا اینٹوں کے چیمبر میں چھوڑا جائے تو وہ خصوصی نیلا رنگ چھوڑ دیتی ہے۔ (ایسے رنگ کو اشاعت کی صنعت میں اکثر و بیشتر استعمال کیا جاتا ہے)۔ لیوشٹر نے بتلایا کہ آشوٹز کے چیمبرز اپنی ساخت کے حوالے سے ناقص ہیں۔ اس نے وہاں کی دیواروں سے کئی سیمپل لیے اور مختلف لیبارٹریوں میں تجزیے کے بعد بھی فیرو سائنائیڈ کا ایک دھبہ تک نہیں ملا۔ اس کے برعکس کپڑوں اور سامان کی جوؤں کی تلفی کے چیمبرز میں یہ رنگ بہرحال موجود تھا۔ مزید تجزیوں کے بعد اس نے ثابت کیا کہ جوئیں مارنے والے چیمبروں میں سائنائیڈ کے کیمیائی عمل کے باعث فیرو سائنائیڈ کی خاطر خواہ مقدار موجود تھی اور لیوشٹر نے تصدیق کی کہ جوئیں مارنے کے ان چیمبروں کی تعمیر بہت اچھی ہے۔ اس کا ہوا کا اخراج نہیں اور وہ حفاظت کے اصولوں کے تحت بنائے گئے ہیں جبکہ مبینہ طور پر انسانوں کی ہلاکت کے لیے بنائے گئے چیمبرز بس یونہی بنائے گئے ہیں جس کو چلانے والے خود بھی مر سکتے تھے۔

جب لیوشٹر نے اپنی رپورٹ شائع کی تو ہولوکاسٹ کے مبلغین ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے اسے بدنام کیا، ڈرایا دھمکایا اور حتیٰ کہ قید تک کروا دیا۔ اس کی مالی حالت کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہودی گروپوں نے مختلف جیلوں کو مذموم خط لکھے تاکہ اس سے وہ معاہدے منسوخ کر دیں اور اس کی آبائی سٹیٹ میساچوسٹس میں اس پر بغیر لائسنس کے انجینئرنگ کرنے کا مقدمہ تک چلوایا گیا۔ جرمن حکومت نے لیوشٹر کو نومبر 1991ء میں شہر ویزن ہائم (Wachenheim) میں اپنی تحقیقات سے متعلق لیکچر دینے کے جرم میں چھ ہفتے قید کی سزا دی حتیٰ کہ اس کی رپورٹ کا جرمن میں ترجمہ کرنے والے ایک سابقہ شریف النفس سکول ٹیچر گونمرڈ یکرٹ کو بھی ایک سال سزائے قید دی گئی اور بین الاقوامی ذرائع نے واویلا کیا کہ اس کو ناکافی سزا دی گئی ہے۔ جرمن وزیر انصاف محترم سالین نے اس سزا کو ہولو

کاسٹ کا شکار ہونے والے ہر شخص کے منہ پر ایک طمانچے کے مترادف قرار دیا اور ججوں کو غیر قانونی طور پر معطل کر دیا۔ صرف جرمنی پر ہی بس نہیں کچھ عرصہ بعد اس دھان ہان فریڈ لیوشٹر کو برطانیہ سے بھی زبردستی نکال باہر کیا گیا تھا۔ ہولوکاسٹ کی جھوٹی حقیقت کو سچ ثابت کرنے کے لیے یہودی کوئی بھی ہتھکنڈا اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ایک سال بعد خود آشوٹز میوزیم کے سٹاف نے لیوشٹر کے تجربات کو دھرایا اور نتائج وہی نکلے جو تھے۔ گرچہ انہوں نے اپنی رپورٹ شائع نہیں کی بلکہ محض یہ کہا کہ انسانوں کو ہلاک کرنے والے گیس چیمبروں سے نیلے رنگ کی فیروسائنائیڈ وقت کے ساتھ کسی طرح معدوم ہو گئی۔ ایسا ہونا کیمیائی طور پر ناممکن ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ زائیکلون بی کی ضخیم مقدار انسانی ہلاکت کے لیے استعمال کی جاتی تھی مگر تجربات کی تصدیق ہونے پر یہ کہا کہ جوؤں کو مارنے کی نسبت انسانوں کو مارنے کے لیے کم سائنائیڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے اس کی باقیات نہیں بچ رہیں۔ بعد میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کسی بھی دوسرے محقق کو تحقیق کی اجازت ہی نہیں دی جاتی بلکہ ایسی سائنسی تاریخی تحقیقات کی اشاعت پر بھی سزا تک دی جا سکتی ہے۔

ہولوکاسٹ کا شکار ہونے والوں کی تعداد نہ صرف مختلف کتابوں میں مختلف بتلائی گئی ہے بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی کتاب یا ایک ہی قاموس کے علیحدہ علیحدہ صفحات پر بھی اعداد و شمار میں واضح تفاوت دکھائی دیتا ہے۔ 2002ء میں ایک یہودی عالم ڈاکٹر نارمن فنکل شٹائن (Norman Finkelstein) جن کے اپنے والدین خود نظر بندی کیمپ کی صعوبتوں کا شکار ہوئے تھے، نے تو 'ہولوکاسٹ انڈسٹری' نامی کتاب لکھ کر تہلکہ برپا کر دیا جس میں وہ ہولوکاسٹ کے مبلغین کی جھوٹی فسانہ پردازی کی قلعی کھولتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ جس نوع سے اعداد و شمار یہودیوں نے پیش کیے، وہ جھوٹے سو جھوٹے بلکہ ناممکن کی مد میں آتے ہیں۔

ہولوکاسٹ انڈسٹری کے کارپردازان یہ قطعی برداشت نہیں کرتے کہ ان کے جھوٹے دعووں کو کوئی بھی غلط ثابت کرنے کے لیے للکارے۔ ہولوکاسٹ کی قلعی کھولنے والوں کو وہ ترمیم پسندوں کے لقب کا منفی نام دیتے ہیں اور آج تک ان سے مکالمے اور مباحثے کا کوئی بھی موقع انہوں نے پیدا ہی نہیں ہونے دیا ہے۔ صیہونیوں نے ''انٹی دی فیمش لیگ (Anti the Famished League)'' نام کی ایک تنظیم بنائی ہوئی ہے جس کا صرف امریکہ کا بجٹ 3 کروڑ ستر لاکھ ڈالر کا ہے تاکہ اسرائیل پر تنقید یا ہولوکاسٹ کے بارے میں سوال

اٹھانے والے کو بدنام کریں۔

دنیا میں جنس کے بارے میں سب سے زیادہ قدامت پسندی یہودیت میں ہے جہاں مجامعت کے وقت جسم کے کسی اور حصے کا مس ہونا غیر مذہبی حرکت شمار ہوتا ہے اور اسی یہودیت کے بطن سے وہ تین عورتیں برآمد ہوئیں جن کو جدید عورتیت کا علمبردار مانا جاتا ہے۔ ان کے نام گلوریا سٹین مان (Gloria Steinem)، بینی فریڈان (Beni Friedan) اور بیلا آبزگ (Bella Abzug) ہیں۔ ان عورتوں کے آزادی نسواں کے واویلے کے برعکس آرتھوڈوکس یہودی خاندان میں پیدا ہونے والی ایولین کے نے اپنی ''چادر میں سوراخ'' (تاکہ جسم مس نہ ہوں۔ مولف) نامی کتاب میں یہودیوں کی عورت کی تذلیل میں حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

''عبادت کے دوران، ہر صبح ایک یہودی مرد جو دعائیں مانگتا ہے۔ ان میں کئی کلمات شکر ہوتے ہیں کہ اے خدا تیرا شکر ہے کہ تم نے مجھے غیر یہودی نہیں بنایا، ایک غلام نہیں بنایا اور ایک عورت نہیں بنایا۔ ماہواری کے خون کی ناپاکیزگی کے بیجا تصور کے باعث عورتیں تورات کے اقتباس اس لیے نہیں پڑھ سکتیں کہ وہ عورتیں ہیں اور ماہواری کی قصوروار چاہے ایام حیض نہ بھی ہوں۔ ان کو اپنے بدن کے افعال کے سبب کمتر یہودی گردانا جاتا ہے''۔

تالمود میں عورتوں کو اکثر ناپاک، ٹھگیائیاں، دھوکہ باز اور کمتر درجے کی مخلوق گردانا گیا ہے۔ اس میں ایسے لمبے لمبے پیراگراف ہیں جن میں مرد کو نابالغ بچیوں سے جنسی فعل کی آزادی بخشی گئی ہے مثلاً:

''جب ایک بالغ مرد ایک بچی سے مجامعت کرتا ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، چاہے لڑکی تین برس کی ہی کیوں نہ ہو، یہ تو بس ایسے ہے جیسے آنکھ میں انگلی لگ جائے اور آنکھ میں آنسو بھر آئیں۔ چاہے بار بار ہی کیوں نہیں لیکن بینائی بحال رہتی ہے''۔

گرچہ اصلاحات پرست یہودی عورت کے ساتھ ناانصافی پر احتجاج کرتے ہیں مگر اسرائیل کو چلانے والے قدامت پسند یہودی ہیں لیکن آج تک سبھی ان تنظیموں نے جن میں یہودی شامل ہیں بشمول فیمینزم کی تنظیموں کے کسی نے اسرائیل پر انگلی نہیں اٹھائی بلکہ اس کی جی جان سے حمایت ہی کی ہے اور کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ ایسے معاشرے سے تعلق رکھنے والی خواتین دنیا بھر میں عورتوں کی جنسی آزادی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے

کہ یہ ان کا ردعمل ہے مگر ردعمل تو تب مانا جائے اگر وہ خواتین پہلے اپنے معاشرے میں اس قسم کا انقلاب لائیں وہ یہودی عورتوں کی آزادی کی بات نہیں کرتیں بلکہ دوسرے مذاہب کو انہوں نے پہلے نشانہ بنایا ہے۔ اب عیسائی معاشرے میں جب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے تو آزاد خیالی کا یہ طوفان مسلمان یا مشرقی معاشروں میں برپا کرنے کی کوشش زوروں پر ہے"۔
(یہودیوں کا نسلی تفاخر از ڈاکٹر مجاہد مرزا)

2011ء میں اسرائیل میں دو یہودی ربی دوو لیور (Dov Liver) اور یعقوب یوسف (Yaqoob Yousaf) کو 'کنگز تورا (The King's Torah)' یعنی بادشاہ کی تورات نامی کتاب کی طرف داری کرنے کے سلسلے میں حراست میں لیا گیا۔ اس کتاب کے مطابق یہودیوں کے علاوہ کسی بھی مذہب کے افراد کا قتل جائز ہے بلکہ چند صورتوں میں تو ان کا قتل ان کی جانب سے بغیر کسی تشدد کے بھی جائز ہے۔ کتاب میں ایک جگہ تو یہ بھی لکھا ہے کہ دودھ پیتے بچوں کا قتل بھی جائز ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ بڑے ہو کر یہودیوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ کتاب کے پانچویں باب، 'مرڈر آف نان جیوز ان اے ٹائم آف وار (Murder of Non-Jews in a Time of War)' یعنی غیر یہودیوں کا جنگ کے دوران قتل میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ ان افراد کا قتل جائز ہے جو یہودیوں کی جان بچانے کے لیے قتل کی حمایت یا طرف داری نہ کریں۔ اس سلسلے میں جب اسرائیلی پولیس نے ربی دوو لیور اور یعقوب یوسف سے تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا تو دونوں نے جواب دینے سے انکار کر دیا جس کے بعد انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ دونوں ربیوں کو انتہا پسند یہودیوں کی بھی حمایت حاصل ہے۔

1905ء میں جب صیہونی تحریک (1897ء) کو شروع ہوئے آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہودی عالمی سطح پر سازشوں میں ملوث تھے خصوصاً ترکی حکومت کا خاتمہ کر کے فلسطین میں یہودی حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے، اس وقت روس سے صیہون کے اکابر کے پروٹوکولز Protocols of the Elders of Zion کے نام سے روسی زبان میں ایک دستاویز شائع ہوئی جس نے یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ ان پروٹوکولز کی اشاعت پر صیہونی حلقوں نے زبردست ردعمل ظاہر کیا اور ان کو دبانے کے ہر ممکن طریقے اختیار کیے گئے کیونکہ ان میں ایک ایسے پروگرام کا نقشہ پیش کیا گیا تھا جس کے تحت یہودی تمام دنیا پر چھا جانے

کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس سازش میں فری میسنری کی مدد لی گئی تھی۔ صیہونیوں کے تمام ترگھٹیا حربوں کے باوجود ان پروٹوکولز کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی۔

''صیہونی اکابر کے ان پروٹوکولز میں ایک خفیہ یہودی پروگرام پیش کیا گیا ہے جس کا مقصد یہودیوں کی حکومت کا قیام اور ان کا عالمی سیاسی غلبہ ہے اور ان پروٹوکولز کی تعداد 24 ہے۔ ان کو یہودیوں کی اعلیٰ ترین قیادت نے اپنے ایک خفیہ اجلاس میں پیش کیا۔ ان میں سے پہلے 9 پروٹوکولز کا تعلق فوری نوعیت کے اقدامات سے ہے، باقی پروٹوکولز پر یہودیوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد عمل کرنا تھا۔ یہاں پر پروٹوکولز کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

1- ہر قسم کے حربے مثلاً طاقت، دہشت گردی، استحصال اور ظلم سے دنیا میں یہودی اثر ونفوذ بڑھایا جائے۔

2- فری میسنری کی مدد سے سیاسی انقلاب بپا کیے جائیں اور خفیہ تنظیموں کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا جائے۔ یہودی فلسفہ وفکر کی باقی مذاہب پر برتری قائم کی جائے۔

3- تباہ کن اور انقلابی نوعیت کے نعرے لگوا کر سیاسی تحریکوں کو پروان چڑھایا جائے اور انہیں بعد میں اپنے حق میں استعمال کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے گمراہ کن معاشی اور سماجی نظریات کو رواج دیا جائے۔ بادشاہتوں کو ختم کیا جائے۔ عوامی نمائندوں کو بدعنوان بنایا جائے اور دولت پر قبضہ حاصل کیا جائے۔ اس ضمن میں پرووٹوکولز میں یہودیت کے علامتی سانپ کا ذکر ہے جو آخر کار دنیا کی حکومتوں کو اپنی کنڈلی میں لے لے گا۔

4- سرمایہ داریت کی چالوں سے یورپ اور امریکہ کی معاشی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے دولت کی ہوس بڑھانے کے لیے مادہ پرستی کو فروغ دیا جائے۔

5- دانشور طبقے اور امرا کی مدد سے یہودیوں کے حق میں پروپیگنڈا کیا جائے، سیاسی، معاشی، اور سماجی بے چینی اور طبقاتی تقسیم پیدا کی جائے اور بدامنی پھیلا کر اپنے مقاصد حاصل کیے جائیں۔

6- منافقت اور الزام تراشی کو شعار بنایا جائے، خفیہ قتل کیے جائیں، اصل حب الوطنی کے جذبے کا خاتمہ کیا جائے، قدیم جاگیردارانہ نظام کو آہستہ آہستہ ختم کیا جائے۔ جاگیرداروں پر ٹیکس لگائے جائیں تاکہ یہودی سرمایہ داران کی زمینیں ہتھیا سکیں۔

7- غیر یہودیوں کے اخلاق کو گندے لٹریچر، فحش تھیٹروں، عالمی کھیلوں، جوئے، شراب اور جنسی بے راہ روی سے تباہ کیا جائے۔

8- خفیہ پولیس کا قیام عمل میں لایا جائے۔

9- عالمی یہودیت کے غلبہ کے لیے کوششیں تیز تر کر دی جائیں تا کہ لوگ آخر کار اس حاکم اعلیٰ کی طرف رجوع کریں جو داود کی نسل سے ہوگا اور اسرائیل کے تخت پر بیٹھے گا"۔

(فری میسنری، اسلام دشمن خفیہ یہودی تنظیم از بشیر احمد)

آزادیٔ اظہار رائے کے علمبرداروں کی منافقت کا یہ حال ہے کہ مغرب میں یہودیوں کے خفیہ پروٹوکولز کی اشاعت نہ صرف ممنوع بلکہ قابل تعزیر ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ 2 اگست 2015ء کو اسرائیلی وزیر اعظم بینجمن نیتن یاہو (Benjamin Natanyahu) نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ان کی حکومت نفرت کی بنیاد پر ہونے والے جرائم کو برداشت نہیں کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ شدت پسندی، نفرت اور دہشت گردی، کسی بھی جانب سے کی جائے، اس کے خلاف مل کر جنگ کی جائے گی۔

اکتوبر 2008ء کو عیسائی انتہا پسندوں نے "Obsession: Radical Islam's War Against the West" کے نام سے فلم ریلیز کی جس میں حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی گئی۔ 12 دسمبر 2008ء کو احسان جامی (مرتد) جو کہ ہالینڈ کا رہائشی اور سیاستدان ہے، نے ایک ویڈیو فلم بنائی جس کا نام "محمد سے انٹرویو" رکھا۔ اس ویڈیو فلم کا دورانیہ 15 منٹ ہے، جس میں خواتین کے حقوق، غیر مسلموں سے نفرت کے متعلق خود ساختہ سوالات بنائے گئے۔ جب ہالینڈ کے وزیر اعظم جان پیٹر بالکندے سے اس پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر مطالبہ رد کر دیا کہ یہاں مذہبی آزادی ہے۔

اسپین کے ایک علاقے گیلاس میں ایک ایسی عمارت تعمیر کی گئی جس پر 20 لاکھ 70 ہزار ڈالر لاگت آئی ہے۔ اسے ایک جامع مسجد کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ دیکھنے والے اسے ایک مسجد ہی سمجھتے ہیں۔ اس عمارت کا نام "مکہ" رکھا گیا ہے۔ مگر جب کوئی شخص وہاں پہنچتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد نہیں بلکہ ایک "نائٹ کلب" ہے جہاں دن رات شراب و شباب کی محفلیں سجتی ہیں۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا مگر میڈیا نے اسے قطعاً کوئی اہمیت نہ دی اور کہا گیا کہ یہاں ہر چیز کی آزادی ہے۔

14 مئی 2014ء کو بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ برطانیہ کے شہر بریڈ فورڈ میں دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیم کے افراد نے مساجد اور گھر گھر جا کر مسلمانوں کو دھمکانا شروع کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے گھروں اور مساجد میں زبردستی بائبل تقسیم کی جاتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان بائیبل لینے سے انکار کرے تو اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ شہر سے رکن پارلیمنٹ جارج گیلووے George Galloway پہلے ہی وزیر داخلہ تھریسامے Theresa May سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ مساجد میں زبردستی بائبل تقسیم کرنے والوں کا نوٹس لیا جائے۔ لیکن تھریسامے نے انتہائی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی کی آزادی اظہار پر قدغن نہیں لگانا چاہتی۔

یورپ نے دین اسلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو فکری، نظریاتی اور حربی مہم جوئی شروع کر رکھی ہے، اس کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس مہم میں صرف یہود و ہنود ہی نہیں، ملحد، صلیبی اور دیگر مذاہب کے پیروکار علی الاعلان، ایک پلیٹ فارم پر آ چکے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ''آزادئ اظہار'' کا عنوان منتخب کیا ہے۔ امریکی انتہا پسندوں کی ایک رہنما پامیلا گیلر مسلمانوں کی دشمن ہے۔ یہ خصوصاً میڈیا کے ذریعے اسلام پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ پچھلے ماہ اس کی تنظیم، امریکن فریڈم ڈیفنس انیشی ایٹو (American Freedom Defense Initiative 'AFDI') نے ایک شرانگیز اشتہار تخلیق کیا اور اسے سان فرانسکو کی بسوں پر لگا دیا۔ اشتہار میں درج انگریزی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''مہذب آدمی (یہودی) اور وحشی (مسلمان) کے درمیان کسی بھی جنگ میں، مہذب آدمی کا ساتھ دیجیے۔ اسرائیل کی مدد کریں۔ مسلمانوں کو شکست دیں''۔

سان فرانسکو کے بعد پامیلا یہ بے ہودہ اشتہار نیویارک کی بسوں اور ریلوے سٹیشنوں پر بھی لگانا چاہتی تھی، تاہم مقامی ٹرانسپورٹ اتھارٹی نے اسے اجازت نہ دی۔ اتھارٹی نے اشتہار کو نامناسب قرار دیا۔ پامیلا نے فیصلے کے خلاف عدالت سے رجوع کیا۔ وفاقی جج نے قرار دیا کہ اتھارٹی کا فیصلہ امریکی آئین کی پہلی شق (یعنی آزادی رائے) سے متصادم ہے۔ یوں پامیلا کو شرانگیز اشتہار لگانے کی اجازت مل گئی۔

ہفت روزہ ''ضربِ مومن'' نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا:

''امریکہ میں اظہار آزادی کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پر مبنی پروگرام اور مظاہرے اور نفرت انگیز تحریر و تقریر کے پروگرام تشکیل دینے میں سرگرم عمل امریکہ کی غیر سرکاری تنظیم امریکن فریڈم ڈیفنس انیشی ایٹو (AFDI) ہے۔خفیہ طور پر ریپبلکن پارٹی کی ذیلی ٹی پارٹی سے تعلق رکھنے والی پامیلا گیلر جو اس تنظیم کی صدر بھی ہے، 14 جون 1958ء کو نیو یارک کے علاقے لانگ آسلینڈ کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس نے نمائش کا مقام ''کرسٹی کالی ویل سینٹر'' رکھا ہے، جبکہ اس کا عنوان بھی ''اظہار رائے کی آزادی کے لیے کھڑے رہو'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں مقامی امریکن مسلم تنظیم نے ایک ماہ قبل کانفرنس بعنوان ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے رہو'' منعقد کی تھی۔ 2010ء میں پامیلا گیلر نے AFDI نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی جس میں رابرٹ اسپنسر اس کے ہمراہ تھے، جبکہ انہی کے ہمراہ ایک کتاب میں معاون مصنف بھی تھی جس کا نام ''The Post-American Presidency: The Obama Administration War on America'' تھا۔اس کتاب میں اوباما حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ 2010ء سے 2014ء تک اس نے مختلف جگہوں پر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے خطاب کیا۔ 2013ء میں اس کو جوئشڈ فیس لیگ کینیڈا نے بحثیت مقرر بلایا۔ 2010ء میں گراؤنڈ زیرو مسجد کی تعمیر پر احتجاج کیا۔مسلمانوں کے خلاف اشتہاری مہم چلائی۔ مقامی میڈیا کی جانب سے پامیلا گیلر کو متعدد بار ہدف تنقید بناتے ہوئے اس پر نفرت انگیز مہم چلانے پر برہمی کا اظہار بھی کیا گیا تاہم جو بھی ان پر تنقید کرتا، اُن کو وہ جواباً شدید تنقید کا نشانہ بنا کر اُن پر مختلف قسم کے الزامات لگاتی رہیں۔

پامیلا گیلر کے یہودی بیک گراؤنڈ، امریکی حکومت کی مخالفت، منفی ردعمل کے مزاج اور رائے عامہ کے مفادات کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کو دیکھ کر واضح محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا رخ اسرائیل سے ہٹا کر صرف امریکہ کی جانب موڑ دینا، پوری دنیا کے مسلمانوں کو مضطرب اور پریشان کرنا، یہ سب اس منفی سرگرمی کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔امریکی حکومت اور یورپ کی یہ مجبوری ہے کہ اس نے ایک جانب یہودیوں کے دفاع کا بیڑا بھی اُٹھا رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ''اظہار رائے کی آزادی'' جیسے مبہم اقدار پر سمجھوتہ نہ کرنے کا عزم بھی کر رکھا ہے، لہٰذا ان کے متضاد رویے سامنے آتے ہیں۔ ایک جانب ہولوکاسٹ پر اظہار

رائے کی آزادی کی بالکل گنجائش نہیں دی جاسکتی، دوسری جانب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی پامالی ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں اور اس کی وجہ سے اظہار رائے کی آزادی کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان ممالک میں ملک یا سرکاری اداروں، برطانیہ میں شاہی خاندان کے خلاف بولنے والوں کو چپ کرایا جاتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی کے وقت اظہار رائے کی معاشرتی قدر یاد آ جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے تار یہودیوں کی گرفت میں ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم کا امریکی صدر کے نہ چاہتے ہوئے بھی کانگریس میں بیان کرنا اور اسی میں براہ راست حکومت پر تنقید کرنا، اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ اسرائیل اور یہودی لابی اپنے کمزور وجود کو دنیا میں باقی رکھنے کے لیے قوموں کے درمیان نفرتوں کو پھیلا رہے ہیں، چنانچہ امریکہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسلمانوں کی دشمنی کا محور ومرکز بنتا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے امریکہ میں اس حوالے سے سوال اُٹھایا گیا کہ ہم دنیا میں سب سے زیادہ امداد دیتے ہیں، پھر بھی لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ جواب ملا کہ آپ کے رویے کی وجہ سے۔ جب مسلمانوں کو مال دے کر ان کے عقائد پر سمجھوتہ کرنے کا دباؤ ڈالا جائے گا تو مسلمان کبھی بھی ایسا سودا نہ کرے گا۔ غازی علم دین شہیدؒ سے عامر چیمہ تک سب مسلمان حالات سے مجبور ہو کر ہی انتہائی اقدام پر آمادہ ہوئے تھے"۔

(ہفت روزہ ضرب مومن کراچی 15 تا 21 مئی 2015ء)

آزادی اظہار مغرب کے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جسے وہ جب چاہے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرے اور جب چاہے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے۔ امریکہ میں شائع ہونے والے ناول "The Last Temptation of Christ" پر 1988ء میں اس نام سے بننے والی فلم ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت سے بوس وکنار کرتے ہوئے دکھایا گیا جس پر عیسائیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بعدازاں عیسائیوں نے بعض سینما گھروں پر پتھراؤ کیا اور ان کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ 2010ء میں کئی ملکوں میں اس کی نمائش پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بائبل کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور واقعات پر بنائی جانے والی مشہور فلم "The Ten Commandments" پر ڈنمارک میں پابندی عائد کی گئی۔ یہ پابندی ایک معمولی یہودی کی درخواست پر عائد کی گئی۔ کہا گیا کہ اس میں یہودیوں کی دل آزاری پر مشتمل کئی مناظر ہیں

جس سے معاشرے میں نفرت پھیلنے کا خدشہ ہے۔ لہٰذا اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ حالانکہ اس فلم نے 2010ء تک 977 ملین ڈالر کا بزنس کیا تھا۔ 2009ء میں ایک مقدمہ (Warman v. Northern Alliance) درج کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ متعلقہ ویب سائٹ بند کی جائے جس پر ایسا مواد رکھا گیا ہے جس سے رومیوں، یہودیوں، ہم جنس پرستوں اور سیاہ فاموں کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ اس پر کینیڈا کے قانون ضابطہ فوجداری کی دفعہ 54(1)(a) کے تحت حکم جاری کیا گیا اور ویب سائٹ بند کر دی گئی۔ اس کے علاوہ معروف ویب سائٹ www.wikipedia.com پر یہود و نصاریٰ کے مفادات پر زد پڑنے والی بے شمار کتابوں اور فلموں پر پابندی کی مکمل تفصیلات موجود ہیں۔

جناب محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''برطانیہ میں ایک فلم ڈائریکٹر مسٹر ونگرو نے ایک ویڈیو فلم تیار کی جس میں سولھویں صدی کی عیسائی راہبہ ٹریسا جو حضرت یسوع مسیحؑ کی بڑی عقیدت مند تھی، حالت وجد میں صلیب کے گرد رقص کرتے ہوئے اپنا گریبان چاک کر کے اپنے عریاں سینہ کو لہو رنگ کر لیتی ہے اور اسی حالت میں تصوراتی مسیح کا بوسہ لیتی ہے جس پر جناب مسیحؑ کے لبوں کو بھی ہلکی سی جنبش ہوتی ہے۔ اس فلم کو برطانیہ کے سنسر بورڈ نے نمائش کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جس پر یہ معاملہ عدالتوں تک پہنچا۔ جہاں یہ قرار دیا گیا کہ یہ مقدس سینٹ ٹریسا کے کردار کی توہین ہے جس سے برطانیہ کے عیسائی شہریوں کے جذبات مشتعل ہونے کا اندیشہ ہے۔ ان فیصلوں کے خلاف جوڈیشل ریویو کے لیے یہ مقدمہ برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت ہاؤس آف لارڈز میں سماعت کے لیے آیا۔ وہاں کے تمام جج حضرات نے ماتحت عدالتوں کے فیصلہ کو بحال رکھا۔ عدالت عظمیٰ کے ایک معروف لبرل جج اسکارمین نے یہ بھی قرار دیا کہ بلاس فیمی لا (Blaspheme Law) برطانیہ کی سالمیت کے لیے ناگریز ہے۔ اس فیصلہ کو مملکت برطانیہ کے خلاف مسٹر ونگرو نے یوروپی یونین کے حقوق انسانی کی اعلیٰ ترین عدالت میں چیلنج کر دیا کہ اس فیصلہ سے ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کے آزادئ اظہار کے حقوق ختم ہوئے ہیں جو یوروپی یونین کے کنونشن (آئین) کے آرٹیکل 10 کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یورپ کے ہیومن رائٹس کی اس عدالت عالیہ نے اپنے آئین کے آرٹیکل 10 کی تشریح کرتے ہوئے ہاؤس آف لارڈز کے فیصلہ کی توثیق کر دی اور ونگرو کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ مملکت برطانیہ کے حق میں فیصلہ صادر

کرتے ہوئے لکھا کہ توہین مسیحؑ کے قانون کی بدولت حقوق انسانی کا تحفظ برقرار رہتا ہے''۔
(ناموس رسولؐ اور قانون توہین رسالت ﷺ از محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ)

جناب گل شیر بٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''ہمارے ہاں عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ آزادی کے ساتھ نہ تو کوئی حدود ہیں اور نہ ہی ذمہ داری۔ اور جب بھی آزادئ اظہارِ رائے کا خیال آتا ہے تو مجھے آسٹریا کی ایک مووی "Satirical Tragedy" یاد آ جاتی ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ اس فلم میں دیگر مناظر کے علاوہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے غیر مناسب مناظر دکھائے گئے اور اس فلم کو "The Innsbruck Regional Court in Austria" نے آسٹرین پینل کوڈ کی دفعہ 188 کے تحت بین کر دیا۔ معاملہ بعنوان "Otto Preminger Institute v Austria" یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس میں لے جایا گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ مذکورہ فلم پر پابندی آزادی اظہارِ رائے کے خلاف تو نہیں، آرٹیکل 10، (یورپین کنوینشن) اور آرٹیکل 9، کے تحت دی گئی Freedom of Religion کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ عدالت نے فریقین کو سنا اور فلم مذکورہ پر پابندی کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ مذکورہ فلم پر پابندی کو "Necessary in a Democratic Society" قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے کوئی صحت مندانہ مباحثہ شروع ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اس طرح 1989ء میں برطانیہ میں 18 منٹ دورانیے کی "Visions of Ecstasy" کے نام سے ہی فلم بنائی گئی۔ برٹش بورڈ آف فلم کلاسیفیکیشن نے اس فلم پر پابندی لگا دی کیونکہ ان کے نزدیک خدا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بائبل کے حوالے سے غیر مناسب مناظر تھے۔ فلم کے ڈائریکٹر نے برطانیہ کے خلاف یورپین کمیشن میں شکایت درج کروائی اور اپنی شکایت میں لکھا کہ برطانیہ نے فلم پر پابندی لگا کر یورپین کنونشن کے آرٹیکل 10 کی خلاف ورزی کی ہے۔ یورپین کنونشن نے تسلیم کیا کہ ڈائریکٹر کے آزادی اظہار کے حق کو Violate کیا گیا ہے تاہم جب معاملہ یورپین کورٹ کے سامنے زیر عنوان "Wingrove vs United Kingdom" لایا گیا تو کورٹ نے کہا کہ فلم پر پابندی آرٹیکل 10 آف یورپین کنونشن کی Violation نہیں ہوئی۔ ویسے مجھے ان دونوں فیصلوں سے عقلی عشق ہے اور میں جج صاحبان کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور شاید ایسے ہی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے

ہولوکاسٹ سے انکار کو مختلف ممالک میں جرم قرار دے دیا گیا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے خاکوں کی بات ہو یا Satanic Verses کی تو یہ تمام اعلیٰ اصول کیوں بھلا دیئے جاتے ہیں؟ جب بات مسلمانوں کی آتی ہے تو اس وقت آزادی اظہار کے تحفظ کا خیال آ جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب پر بات ہو تو پھر آرٹیکل 9 یاد آنے لگتا ہے۔ آرٹیکل 10 کے پیرا 2 میں دی گئی حدود کا احترام کیا جانے لگتا ہے...... مجھے فکری بددیانتی محسوس کا احساس ہوتا ہے۔ Hidden Prejudice کی جھلک نظر آتی ہے۔"

(گوتم کونروان ملا تھا از گل شیر بٹ)

اکتوبر 2012ء میں پیرس فرانس کے معروف میگزین کلوزر Closer نے برطانوی شہزادہ ولیم (Prince William) کی بیوی کیٹ مڈلٹن (Kate Middleton) کی نیم برہنہ تصاویر شائع کیں تو برطانوی شاہی خاندان نے عدالت کا رُخ کیا۔ عدالتی کارروائی کے دوران رسالے کی انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ کیمرے سے کھینچی گئی تصاویر حقیقی ہیں۔ شہزادی کھلے عام بے لباسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ قارئین کو بھی یہ منظر دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ تصاویر پر پابندی لگانا آزادیٔ اظہار کے خلاف ہے، اس سے ہمارا حق آزادی مجروح ہوگا۔ عدالت، رسالے کی انتظامیہ کے موقف سے متفق نہ ہوئی اور دو دن کی سرسری سماعت کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اس جریدہ کو فوری طور پر مزید تصاویر شائع کرنے سے روک دیا جبکہ برطانوی ملکہ الزبتھ کو خوش کرنے کے لیے اس اخبار پر نہ صرف ایک لاکھ یورو کا جرمانہ عائد کیا گیا بلکہ انتظامیہ کو حکم دیا کہ شہزادی کی تمام اصل مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصاویر فوری طور پر شاہی خاندان کو واپس کر دی جائیں اور کسی شکل میں بھی انہیں دوبارہ شائع نہ کیا جائے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ اگر کسی دوسرے میگزین نے ان تصاویر کو شائع کیا تو میگزین کلوزر کو 10 ہزار یورو جرمانہ ادا کرنا ہوگا کیونکہ پہل اس میگزین نے کی ہے۔ یہ تصاویر آئرلینڈ کے ایک اخبار ''آئرش اسٹار'' نے بھی شائع کیں جس کی پاداش میں اخبار کے ایڈیٹر کو فوری طور پر برطرف کر دیا گیا۔ انٹرنیٹ پر خرید و فروخت کے سب سے بڑے ادارے "eBay" نے بھی اپنے کسی بھی لنک پر تینوں جریدوں کلوزر، شائی اور آئرش اسٹار کو اپ لوڈ کرنے پر تاحکم ثانی پابندی لگا دی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تصاویر نہ تو من گھڑت خاکے تھے اور نہ کوئی تصوراتی فلم۔ یہ تو ایک حقیقت تھی جو کیمرے کی آنکھ نے دیکھی اور محفوظ کر لی۔

آزادیٔ اظہار کے علمبرداروں سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور اس جریدے پر پابندی لگا دی۔ پورے یورپ سے اس میگزین کی تمام کاپیاں اٹھا لی گئیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پبلشرز نے عدالت اور شاہی خاندان سے غیر مشروط معافی بھی مانگی مگر عدالت نے اپنا حکم سنا دیا۔ اس کے برعکس جب دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خاکے مغربی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں تو یہ عدالتیں منافقت اور دوغلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہم اظہار آزادی پر پابندی نہیں لگا سکتے۔

اس طرح کی اور بے شمار مثالیں ہیں کہ جب مغرب کے ہاں ان کے اپنے مفادات پر زد پڑتی ہے تو انہیں آزادی اظہار کی قیود یاد آ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دسمبر 2012ء میں امریکی عدالت نے معروف شخصیات کی برہنہ تصاویر بنانے والے کمپیوٹر ہیکر کو 10 سال قید کی سزا سنائی۔ مئی 2013ء میں امریکی فوجی پر خواتین کیڈٹس کی ویڈیو فلم بنانے کا الزام سامنے آیا۔ سارجنٹ فرسٹ کلاس مائیکل میک کلینڈن پر الزام تھا کہ وہ خواتین کیڈٹس کے نہاتے ہوئے ویڈیو بناتا تھا۔ گزشتہ ہفتے میک کلینڈن پر فوجی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزیوں کے دیگر چار الزامات پر بھی فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ بعدازاں اُسے سزا دی گئی۔

دسمبر 2012ء میں کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ بینڈکٹ نے اپنے باروچی پاؤلو گبرئیل (Paolo Gibrail) کو کھانا لیٹ تیار کرنے پر نہ صرف اُسے ملازمت سے برخاست کر دیا بلکہ اس پر ویٹی کن (عیسائی ریاست) کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کرتے ہوئے جلاوطن کر دیا۔

نومبر 2012ء میں بھارت میں انتہا پسند جماعت شیوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے کی موت پر فیس بک پر تبصرہ کرنے والی 2 لڑکیوں کو پولیس نے گرفتار کر کے مقدمہ درج کر لیا۔

مئی 2014ء میں پنجاب اسمبلی میں سکھ برادری سے تعلق رکھنے والے ایک اقلیتی ممبر نے ایک قرارداد پیش کی جس میں سکھوں کے مقدس دن کو قومی سطح پر منانے کی تجویز تھی جسے پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کر لیا جبکہ دوسری طرف مئی 2014ء میں بھارت میں انتہا پسند ہندو تنظیموں نے اذان فجر پر پابندی لگانے کی مہم شروع کر دی۔ ہندو انتہا پسند مظاہرین نے فجر کی اذان دیے جانے پر پابندی کا مطالبہ کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ مینگلور کے ڈپٹی کمشنر آفس کے سامنے درجنوں افراد نے مظاہرہ کیا۔ ہاتھوں میں پلے کارڈ اور بینر اٹھائے

مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ بھارت بھر کی مساجد میں فجر کی اذان پر پابندی عائد کی جائے، کیونکہ ایسا کیے جانے سے ان کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔حکومت رات 10 سے صبح 6 بجے تک مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی عائد کرے۔اس سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل حکام پر دباؤ بڑھانے کے لیے خودسوزی کی کوشش بھی کی گئی۔

فروری 2016ء میں بھارتی ریاست آندھرا اپردیش کے ضلع نیلور کے سپرٹینڈنٹ پولیس گجا راؤ بھوپال نے مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں انتہائی قابل اعتراض اور ناشائستہ الفاظ استعمال کیے جس کے بعد مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا۔اس احتجاج کو کچلنے کے لیے پولیس کی جانب سے ہوائی فائرنگ اور مظاہرین پر زبردست لاٹھی چارج کیا گیا جس سے متعدد افراد زخمی ہو گئے۔زبردست کشیدگی کے بعد سارے ٹاؤن میں امتناعی احکامات نافذ کر دیئے گئے۔ایک تقریب سے خطاب میں ایس پی گجاراؤ بھوپال نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے آباء و اجداد ہندو تھے۔مسلمانوں کو داڑھی اور ٹوپی پہننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔انہیں اپنا لباس تبدیل کرنا چاہیے جبکہ مسلمان عورتوں کو بھی برقع ترک کر دینا چاہیے۔ انہیں بھی عام ہندوؤں کی طرح بھارت میں رہنا چاہیے۔مسلمان مکہ کیوں جاتے ہیں؟ انہیں حج کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

9 ستمبر 1908ء کو امریکی ڈانس گروپ الوین ایلی (Alvin Ailey) کے رقاص عبدالرحیم جیکسن کو اسرائیلی سکیورٹی اہلکاروں کی جانب سے اپنے اسلامی نام کی وجہ سے شدید تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔خبر رساں ادارے کے مطابق امریکی ڈانس کمپنی الوین ایلی کا یہ گروپ اپنی سلور جوبلی کے حوالے سے جاری چھ ملکی دورے کے پہلے مرحلے میں اسرائیل پہنچا تھا کہ ائیرپورٹ پر اسرائیلی سکیورٹی اہلکاروں نے عبدالرحیم جیکسن کو ان کے گروپ سے علیحدہ کر کے ان کو ایک خفیہ تفتیشی سنٹر لے جا کر اسلامی نام ہونے کے حوالے سے پوچھ گچھ کی۔ واضح رہے کہ اس سال امریکی کانگریس میں الوین ایلی ڈانس تھیٹر کو وائٹل امریکن کلچر ایمبیسیڈر ٹو ورلڈ مقرر کرنے کی قرارداد منظور کی تھی۔

نومبر 2013ء میں امریکی میڈیا میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ممتاز امریکی دانشور نوم چومسکی (Noam Chomsky) بھی امریکی خفیہ اداروں کی نگرانی میں رہے اور ان کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔یہ خبر اس لیے لوگوں کی زیادہ توجہ کا مرکز بنی کہ نوم چومسکی کو

پوری دنیا میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نوم چومسکی انتہائی دیانت داری کے ساتھ امریکہ اور اس کے دیگر اتحادیوں کی خارجہ پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں اور وہ سامراجی عزائم کے خلاف عالمی ضمیر کی آواز بن گئے ہیں۔ ویسے تو پوری دنیا میں سامراج مخالف بڑے بڑے دانشور اور سیاست دان موجود ہیں اور ان کے لیے بھی لوگوں کے دلوں میں احترام پایا جاتا ہے لیکن نوم چومسکی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ امریکی ہیں۔ لوگ ان شخصیات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جن کا تعلق بالادست اقوام سے ہو اور جو اپنی ہی قوم کے حکمرانوں کے ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کریں۔ مظلوم اقوام میں یہ شخصیات اتنی ہی معتبر ہوتی ہیں جتنے ان کے اپنے ہیروز ہوتے ہیں۔ نوم چومسکی امریکہ کے اندر سے امریکہ کے خلاف مؤثر آواز ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اوباما دہشت گردی کی سب سے بڑی کارروائی کر رہے ہیں۔ شاید ہی تاریخ میں پھر کبھی ایسی دہشت گردی ہو سکے گی''۔ وہ ببانگ دہل یہ بھی کہتے ہیں کہ ''عالمی دہشت گردی کا سب سے بڑا ذریعہ دنیا کی بڑی طاقتیں ہیں جن کی قیادت امریکہ کر رہا ہے''۔ نوم چومسکی صرف نعرے نہیں لگاتے بلکہ وہ دلیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ''طاقتور لوگوں کا اپنی ضرورت کے مطابق بنائے گئے نظاموں پر مکمل کنٹرول ہوتا ہے، اس لیے ان کی دہشت گردی کو دہشت گردی نہیں کہا جاتا''۔ انہوں نے یہ جرات مندانہ بیان بھی دیا تھا کہ ''اسلام پسندوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین (لبرل اور سیکولر) سے زیادہ جمہوری اور انصاف پسند ہیں، وہیں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ان سے زیادہ مہذب اور منظم ہیں''۔

مئی 2010ء میں اسرائیل کے امیگریشن حکام نے نوم چومسکی (Noam Chomsky) کو غرب اردن کے علاقے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ فلسفہ اور لسانیات کے شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے پروفیسر چومسکی برزیٹ یونیورسٹی میں ایک لیکچر دینے کے لیے اردن کے راستے فلسطین کے مقبوضہ مغربی کنارے میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ پروفیسر چومسکی کا کہنا تھا کہ اسرائیلی حکام کو یہ بات ناگوار گزری کہ وہ ایک اسرائیلی یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے بجائے فلسطینی ادارے میں جا رہے تھے۔ برطانوی خبررساں ادارے رائٹرز کا کہنا تھا کہ پروفیسر چومسکی کے فلسطینی میزبان مصطفیٰ ال بارگوہٹی کے مطابق فیصلہ فسطائی اصولوں کے تحت کیا گیا، جس کا مقصد آزادی رائے کو دبانا تھا۔ یاد رہے

کہ پروفیسر نوم چومسکی امریکی پالیسیوں پر ماہرا کثر مثبت تنقید کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکتوبر 2013ء کو امریکی حکومت نے سی آئی اے کو پروفیسر کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا جس کا مقصد نوم چومسکی کی آواز کو دبانا اور اسے شدید نفسیاتی ٹارچر پہنچانا تھا۔ یہ اس ملک کا حال ہے جو آزادی رائے کا چیمپیئن کہلاتا ہے۔

معروف صحافی رابرٹ فسک اپنے مضمون ''آزادیٔ اظہار رائے اور مغرب کا غیر اخلاقی روّیہ'' میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تقریباً تین سال قبل ایک بڑی امریکی یونیورسٹی میں مجھے لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے جو لیکچر دیا، اس کا عنوان تھا: ''11 ستمبر 2001ء، یہ ضرور پوچھیں کہ وہ کس کا کیا دھرا تھا، لیکن خدا کے لیے یہ دریافت مت کریں کہ ایسا کیوں کیا گیا؟'' ...... (September 11, 2001 ask who did it but for God's sake don't ask why) ...... جب میں یونیورسٹی پہنچا تو میرے علم میں لایا گیا کہ یونیورسٹی حکام نے ''خدا کے لیے'' (For God's sake) کی ترکیب عنوان میں سے حذف کردی ہے۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ ''ہم بعض اہل عقل وخرد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے''۔ واہ جی واہ! اس کا مطلب ہوا کہ ہم میں بعض ''اہلِ عقل وخرد'' بھی پائے جاتے ہیں''۔

پہلی جنگ عظیم میں لارڈ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) کو کیمبرج یونیورسٹی سے اس لیے نکال دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ جنگ جمہوری یا آزادی کو بچانے کے لیے نہیں، بلکہ ملک گیری کی ہوس کی تکمیل کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ اس پر انہیں قید کرلیا گیا تھا۔ اس طرح امریکہ میں اشتراکیت کا پرچار جرم تھا اور اب بھی ہے۔

جنوری 2016ء میں فرانس کی ایک اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والی یونیورسٹی ''Sciences Po'' نے ایک کویتی طالبہ کو فیس بک پر اپنے یہود مخالف خیالات کے اظہار کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال دیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے نزدیک طالبہ کا تبصرہ یہود دشمنی پر مبنی تھا۔

2015ء میں برطانیہ کے اخبار سنڈے ٹائمز نے اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کا ایک ایسا کارٹون چھاپا جس میں اسرائیلی وزیر اعظم کے ہاتھ فلسطینیوں کے خون میں رنگے دکھائے گئے، اس پر اسرائیل نے احتجاج کیا تو سنڈے ٹائم اخبار نے معافی مانگ لی۔ اسی طرح امریکی اخبار نیو یارک ٹائمز نے ہندوستانی وزیر اعظم نریندر مودی کو ہاتھ میں گائے

پکڑے خلا میں جاتے دکھایا تو اس پر ہندوستان معترض ہوا جس پر نیو یارک ٹائمز نے بھی معافی مانگ لی لیکن ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والے کارٹونسٹ کے حق میں نہ صرف ملین مارچز ہوئے بلکہ دوبارہ خاکے شائع کیے گئے۔ نیو یارک ٹائمز نے بھارت کے مریخ مشن پر ہلکا پھلکا سا طنز کیا تھا جس پر مذکورہ اخبار نے کارٹون کی اشاعت پر بھارتی حکومت سے معافی مانگی تھی۔ کہاں گئی امریکی آئین کی پہلی ترمیم کہ یہاں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے؟ سوچیے! کیا کوئی صحافی امریکی صدر کو اس کی پریس کانفرنس کے دوران گالی دے سکتا ہے، اس حرکت پر کیا ہوگا، سب کو معلوم ہے۔

10 ستمبر 2012ء کو بھارتی شہر کان پور سے تعلق رکھنے والے اسیم تریویدی (Aseem Trivedi) کو اتوار کے روز ریاست مہاراشٹر کی پولیس نے گرفتار کیا اور ان پر ملک سے بغاوت کرنے جیسے الزامات لگائے گئے۔ گرفتاری کے بعد انہیں ممبئی کی ایک عدالت میں پیش کیا گیا اور پولیس کے مطالبے پر انہیں عدالت نے 16 ستمبر تک پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ اس پر بھارتی پرچم کی توہین کرنے اور قومی نشان کی بے عزتی کرنے کا بھی الزام عائد کیا گیا۔ اسیم تریویدی نے ملک میں بدعنوانی کے خلاف اپنا غصہ ظاہر کرنے کے لیے کچھ کارٹون اپنی ویب سائٹ پر 'کارٹونز اگینسٹ کرپشن' یعنی بدعنوانی کے خلاف کارٹون شائع کیے تھے جن کے سلسلے میں ممبئی پولیس کو ایک شکایت موصول ہوئی تھی۔ ان کارٹونوں میں آئین اور قومی نشانات کو استعمال کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کو کس طرح لوٹا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں کارٹونوں یا کارٹون نگاروں کے خلاف کئی مرتبہ کارروائی کی گئی۔ ریاست مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی کے حکم پر ایک کارٹون انٹرنیٹ پر شائع کرنے پر ایک پروفیسر کو گرفتار کیا گیا تھا جبکہ چند ماہ قبل حکومت نے پچاس سال پرانے کچھ سیاسی کارٹون نصاب کی کتابوں سے ہٹانے کا حکم دیا تھا۔

2 دسمبر 2010ء کو انڈین پریمیئر لیگ میں پاکستانی کھلاڑیوں کے لیے بولی نہ لگائے جانے پر بالی وڈ کنگ شاہ رخ خاں کے بیان پر مہاراشٹر کی علاقائی سیاسی اور انتہا پسند جماعت شیو سینا نے سخت الفاظ میں ان پر تنقید کی اور دھمکی دی۔ شیو سینا نے اپنے ترجمان اخبار 'سامنا' میں لکھا کہ شیو سینا نے دھمکی دی ہے کہ اگر شاہ رخ خان نے بال ٹھاکرے کے جاری کردہ فرمان کی خلاف ورزی کی تو اس کے انتہائی برے نتائج ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا

کہ 'وہ شاہ رخ نہیں بلکہ ان کے اندر کا 'خان' ہے جو اس طرح کے بیان دے رہا ہے۔ وہ اگر چاہتے ہیں تو لاہور، کراچی اور اسلام آباد جا کر رہیں۔ ان کی ممبئی میں ضرورت نہیں ہے۔ راؤت نے شاہ رخ خان کے خلاف مہم چھیڑنے کی بات کی اور کہا کہ ان کی آنے والی فلم 'مائی نیم اِز خان (My Name is Khan)' کی نمائش ہونے نہیں دی جائے گی۔ ممبئی سے متصل تھانے کے علاقے میں شیوسینکوں نے فلم 'مائی نیم از خان' کے پوسٹرز بھی پھاڑے۔ انڈین پریمیئر لیگ کے تیسرے سیزن کی نیلامی میں گیارہ پاکستانی کھلاڑیوں کے لیے کسی بھی فرینچائزی نے بولی نہیں لگائی تھی۔ اس پر آئی پی ایل ٹیم کولکتہ نائٹ رائڈرز کے مالک بالی ووڈ اداکار شاہ رخ خان نے میڈیا کو انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ انہیں اس پر افسوس ہوا ہے۔ ان کے بقول پاکستانی کھلاڑی چیمپیئن اور شاندار ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کسی طرح کا کوئی تنازعہ تھا تو اس معاملے کو پہلے بورڈ کی سطح پر طے کرلیا جانا چاہیے تھا۔ خان نے یہ بھی کہا تھا کہ اس معاملے کو دوستانہ اور اچھے ماحول میں حل کیا جا سکتا تھا لیکن اب جو کچھ ہوا، وہ افسوسناک ہے۔

خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور سیکولر ملک قرار دینے والے بھارت کا مکروہ چہرہ ایک بار پھر بے نقاب ہوگیا۔ ہندو تنظیم بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت میں، ملک میں اظہار رائے بھی جرم بن گیا۔ بھارت میں اقلیت سے تعلق رکھنے والے عام اور غریب شہریوں پر حملے تو پہلے ہی معمول بن چکے ہیں تاہم اب نامور اداکاروں کو بھی انتہا پسند نہیں بخش رہے۔ نومبر 2015ء میں عالمی شہرت یافتہ بالی وڈ اداکار عامر خان کو بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب شدت پسند ہندوؤں نے ملک بھر میں ان کے خلاف احتجاج کیا، پوسٹر جلائے اور اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ عامر خان کا جرم صرف اتنا ہے کہ انہوں نے ملک میں بڑھتی ہوئی عدم برداشت کی فضا کو تشویشناک قرار دیا۔ شر پسند ہندوؤں نے نئی دہلی میں عامر خان کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کرائی اور انہیں ملک سے نکالنے کا مطالبہ کیا، جب اتنا سب کچھ کر کے بھی ان کی آگ نہیں بجھی تو انہوں نے عامر خان کے گھر پر دھاوا بول دیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ ادھر بھارتی میڈیا بھی اداکار عامر خان کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف رہا۔ تفصیلات کے مطابق بھارت میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی اور عدم برداشت نے اقلیتوں سے لے کر ملک کے نامور ادیبوں، شعرا اور بالی وڈ اداکاروں سمیت دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کو بھی پریشان کر دیا جبکہ اسی حوالے سے ایک پروگرام کے دوران

عامر خان نے اس کا اظہار کیا جس پر بھارت میں ہندو انتہا پسند بلبلا اُٹھے اور ان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔شیو سینا کے کارکنوں کی جانب سے اداکار کے گھر کے باہر پوسٹر بھی جلایا گیا۔ یاد رہے کہ عامر خان نے ایک ایوارڈ تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی اہلیہ کرن خان نے ممکنہ طور پر بھارت چھوڑ کر چلے جانے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ایک فرد کے طور پر اور اس ملک کے ایک شہری کے طور پر ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے، ہم خبروں میں بھی دیکھتے ہیں اور یقینی طور پر مجھے بہت تشویش ہے۔ اداکار عامر خان نے کہا تھا کہ اُن کے خیال میں گزشتہ چھ یا آٹھ ماہ کے دوران خوف اور عدم تحفظ کے احساسات میں اضافہ ہوا ہے۔

جون **2014**ء ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنے پر بھارتی کرکٹ ٹیم کے کپتان مہندر سنگھ دھونی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ مہندرا سنگھ دھونی کو مقامی رسالے کے سرورق پر ہندوؤں کے دیوتا وشنو سے تشبیہ دی گئی تھی، جس سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوئے۔ مہندرا سنگھ دھونی کے خلاف سماجی کارکن جیا کمار ہیری ماتھ نے کیس دائر کیا، جس میں موقف اختیار کیا گیا کہ بھارتی کپتان کی اس حرکت سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ آندھرا پردیش کی عدالت نے دھونی کو عدالت میں پیش ہونے کے لیے تین مرتبہ سمن جاری کیے لیکن دھونی پیش نہ ہوئے۔ عدالت نے بھارتی ٹیم کے کپتان کے قابل ضمانت وارنٹ جاری کرتے ہوئے پولیس کو حکم دیا کہ دھونی کو آئندہ کی سماعت میں پیش کیا جائے۔

2006ء میں بھارت میں ملک کے معروف مصور مقبول فدا کے خلاف جب سخت گیر ہندو تنظیموں کی مہم شروع ہوئی تو کچھ دانشوروں اور مصوروں کے علاوہ سبھی خاموش رہے۔ سخت گیر ہندوئیت کے علم برداروں کے ذہن میں یہ بات ایک عرصے سے خلش پیدا کر رہی تھی کہ ایک مسلم مصور ہندو دیوی دیوتاؤں اور علامتوں کو اپنی مصوری کا پیکر کیسے بنا سکتا ہے۔ یہ تنظیمیں ایک عرصے سے مقبول فدا کو نشانہ بنانے کی تاک میں تھیں اور یہ بہانہ انہیں اس وقت مل ہی گیا جب ان کی ایک برہنہ تصویر کو ایک ہندو دیوی سے منسوب کیا گیا۔ مقبول فدا کی پینٹنگز کی نمائشوں پر حملے ہونے لگے، انہیں دھمکیاں دی جانے لگیں۔ اوران کے خلاف پورے ملک میں ایک باضابطہ مہم کے تحت سینکڑوں مقدمے دائر کیے گئے۔ بالآخر برصغیر کے اس عظیم مصور کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا ڈنکا پیٹنے والی

بھارت کی حکومت اظہار کی آزادی کی شکست کا تماشا دیکھتی رہی۔ یاد رہے کہ گزشتہ چند برسوں میں بھارت میں آرٹ، ادب اور مذہب میں تنگ نظری بری طرح سرائیت کر گئی ہے۔

نومبر 2008ء میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول آف انڈیا میں ہندوستان کے نامور مصور مقبول فدا حسین کی چالیس سال پرانی مختصر دستاویزی فلم 'تھرو دی آئیز آف دی پینٹر' کی نمائش کی جانے والی تھی لیکن دو سخت گیر ہندو تنظیموں 'سناتھن سنستھا' اور 'ہندو جن جاگرتی سمیتی' کی مخالفت کے بعد ملتوی کر دی گئی۔

مہاراشٹر کے دور وسطیٰ کے مراٹھا راجہ شیوا جی ایک مذہبی کردار اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر کسی طرح کی ریسرچ اور تنقیدی جملے کہنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ شیوا جی پر لکھی گئی کئی کتابوں پر پابندی عائد ہے اور کئی کتابوں سے اقتباسات حذف کرنے پڑے ہیں۔ گاندھی جی کی زندگی کے ذاتی پہلوؤں پر کچھ کہنا اور لکھنا شجر ممنوعہ ہے۔ فلموں کی کہانیوں میں گاندھی فیملی کے کسی فرد سے مماثلت کا شک ہونے پر فلم کی ریلیز سے پہلے خصوصی شو کا انعقاد کرنا پڑتا ہے۔ مصور کو اپنی کسی تصویر کو فن پارے کا روپ دینے سے قبل کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔

2014ء میں دنیا بھر میں معروف پبلشرز پنگوئن انڈیا نے معروف امریکی مورخ وینڈی ڈانیگر کی کتاب ''دی ہندوز'' ''ہندوازم: این آلٹرنیٹو ہسٹری (ہندومت کی متبادل تاریخ)'' کی اشاعت پر پابندی لگا دی اور اسے دوکانوں سے واپس منگوا کر ضائع کرنے سے اتفاق کیا۔ ہندو تنظیم آر ایس ایس کے مطابق اس کتاب میں ہندو مذہب کی بڑی شخصیات کی تذلیل کی گئی اور حقائق کو مسخ کیا گیا۔ تنظیم کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس کتاب میں دیوی دیوتاؤں کو ایک جنسی رنگ میں دکھانے کی کوشش کی گئی جس سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔

چند برس قبل جب معروف مصنف خشونت سنگھ نے ایک ادبی سیمینار میں رابندر ناتھ ٹیگور کی انگریزی زبان کی سمجھ پر کچھ تنقیدی جملے کہے تو اس کی اتنی شدت سے نکتہ چینی ہوئی کہ انہیں معافی مانگنی پڑی۔

2015ء میں بھارت میں سکھ مذہب کے بانی گورو نانک کی زندگی پر بننے والی فلم (Nanak Shah Fakir) کی نمائش روکنے کے لیے سکھوں نے پوری دنیا میں بھرپور احتجاج کیا اور کہا کہ اس فلم میں قابل اعتراض مناظر ہیں جس سے سکھ مذہب کی توہین اور پوری دنیا کے سکھوں کی دل آزاری ہوئی ہے۔ سکھوں کی درخواست پر پنجاب حکومت نے اس

متنازعہ فلم پر پابندی لگا دی۔ 14 اکتوبر 2015ء کو مذہبی انتہا پسند ہندوؤں نے سکھوں کی مذہبی کتاب ''گروگرنتھ'' کی بے حرمتی کی جس پر سکھ کمیونٹی سراپا احتجاج بن گئی۔ بھارت کے بڑے شہروں میں سکھوں نے مظاہرے کیے۔ جس کے نتیجہ میں کئی سکھ ہلاک ہوگئے۔

23 اپریل 2012ء کو انٹرنیٹ سرچ انجن (Google) گوگل کے ایک بانی رکن سرگی برِن (Sergey Brin) نے برطانوی اخبار 'دی گارڈین' کو دیے گئے انٹرویو میں کہا کہ انٹرنیٹ کی آزادی کے خلاف دنیا بھر میں قوتیں صف آرا ہو چکی ہیں۔ میں اتنا پریشان ہوں جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا 'یہ بہت خوفناک ہے'۔ انہوں نے مزید کہا کہ انٹرنیٹ کو جن قوتوں سے خطرہ ہے، ان میں وہ حکومتیں شامل ہیں جو اپنے شہریوں کے درمیان رابطوں کے ذرائع کو کنٹرول کرنا چاہتی ہیں۔

19 جون 2012ء کو انٹرنیٹ کے معروف سرچ انجن نے اپنی تازہ ترین ٹرانسپرینسی رپورٹ میں بتایا کہ گوگل (Google) نے برطانوی پولیس ایسوسی ایشن کی درخواست پر یوٹیوب سے چھ سو چالیس ایسی ویڈیوز ہٹا دی ہیں جس سے برطانوی مفاد کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ ویڈیوز 2011ء میں ہٹائی گئی تھیں اور گوگل کا کہنا ہے کہ برطانوی چیف پولیس آفیسرز کی ایسوسی ایشن کی درخواست پر گوگل نے پانچ ایسے اکاؤنٹ بھی بند کر دیے جن کا تعلق ویڈیوز سے تھا۔ گوگل کے بقول اس کو جولائی 2011ء سے دسمبر 2011ء تک 461 عدالتی حکام موصول ہوئے جن کا تعلق 6989 ویڈیوز سے تھا۔ گوگل کے مطابق ان میں سے 68 فیصد احکامات کی تعمیل کی گئی۔ کمپنی کے مطابق ان احکامات کے علاوہ ان کو 546 غیر رسمی درخواستیں بھی موصول ہوئیں جن میں سے 43 فیصد کو مانا گیا۔

''آزادی اظہار کے مغربی نعرے کی اصل حقیقت'' کے عنوان سے روزنامہ ''اسلام'' کراچی اپنے اداریہ میں لکھتا ہے:

''ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق عافیہ موومنٹ کی سب سے پہلے بنائی جانے والی فیملی ویب سائٹ www.freeaafia.org کو بلاک کر دیا گیا جبکہ 3 ماہ قبل ایک ای میل اکاؤنٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے حوالے سے بنائی گئی ان کی فیملی ویب سائٹ جو 8 سال پہلے بنائی گئی تھی، اس ویب سائٹ پر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے تمام حالات زندگی اور عافیہ کیس کے حوالے سے دستاویزات موجود تھیں۔ عافیہ موومنٹ کے

ترجمان کے مطابق جب ویب سائٹ سے متعلق انٹرنیٹ سرچ انجن گوگل سے رابطہ کیا گیا تو اس کا کہنا تھا ''ویب سائٹ قوانین کی خلاف ورزی'' کرنے کی وجہ سے بند کر دی گئی ہے۔ تاہم اس کی کوئی ٹھوس توجیہ نہیں کی گئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب اور اس کی سرپرستی میں چلنے والے بین الاقوامی ابلاغی اداروں کی جانب سے ''آزادیٔ اظہار'' کے نعروں کی اصل حقیقت کیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے بغض و عناد کی سطح کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ حالیہ دنوں اسی گوگل کمپنی کے ذیلی ادارے یوٹیوب پر توہین رسالتؐ پر مبنی نہایت دل آزار فلم چلائی گئی تو پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور گوگل سے اپیل کی گئی کہ دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ذہنی اذیت پہنچانے والی اس ویڈیو کو یوٹیوب سے ہٹایا جائے لیکن گوگل نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے انکار کر دیا۔ اب اس کی جانب سے ڈاکٹر عافیہ کی مظلومیت دنیا پر واضح کرنے کے لیے بنائی گئی ایک ویب سائٹ کو سراسر ناجائز طریقے سے بند کیا گیا ہے۔ اب دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس کمپنی کا بائیکاٹ کرنا چاہیے''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 24 اکتوبر 2012ء)

22 اکتوبر 2013ء کو ابوظہبی میں حکام نے پاپ سٹار ریانا (Rihanna) کو ابوظہبی کمپلیکس کے باہر قابل اعتراض فوٹو شوٹ کروانے پر مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ خیال رہے کہ گلوکارہ ریانا نے فوٹو شیئرنگ سائٹ انسٹاگرام پر کالے جمپ سوٹ میں ملبوس تصاویر ٹویٹ کی تھیں۔ جامع مسجد کی جانب سے جاری کیے گئے ایک بیان میں کہا گیا کہ گلوکارہ ریانا کو نامناسب تصاویر بنوانے کے بعد مسجد سے نکل جانے کا کہا گیا۔ بیان کے مطابق یہ تصاویر مسجد کا دورہ کرنے کے لیے پہلے سے موجود شرائط پر پورا نہیں اترتی تھیں۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ 25 سالہ گلوکارہ ریانا سب سے پہلے اس دروازے سے اندر داخل ہوئیں جس سے مسجد کا دورہ کرنے والوں کو اجازت نہیں ہے۔ مسجد کے حکام نے انہیں کہا کہ وہ درست دروازے سے مسجد میں داخل ہوں اور شرائط کے تحت مسجد کا دورہ کریں۔ حکام نے قابل اعتراض تصاویر بنوانے پر اسے مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بیان میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ گلوکارہ ریانا نے مسجد کی انتظامیہ کے تعاون کے بغیر مسجد کا دورہ کیا۔ ایک تصویر میں پاپ سٹار مسجد کے صحن میں شہوانی انداز میں کمر کے بل لیٹی ہوئی ہیں۔ امریکی سینٹ میں حقوق انسانی کمیٹی نے ابوظہبی حکومت سے اس واقعہ پر شدید احتجاج کیا کہ ریانا کو مسجد سے کیوں نکالا گیا۔

چنانچہ اس واقعہ پر حکومت امریکہ کی طرف سے ابوظہبی کو انسانی حقوق کی پامالی کرنے والا ملک قرار دیا گیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی اسلامی ملک کو یہ حق حاسل نہیں کہ وہ کسی فاحشہ عورت کو اپنی عبادت گاہ مسجد میں نیم عریاں تصاویر بنانے پر روک سکے؟

جون 2004ء میں امریکی صدر بش کے خلاف نعرے والی ٹی شرٹ پہنے ایک مسافر کو آسٹریلیا کی قومی فضائی کمپنی 'قنتاس' (Qantas) نے جہاز پر بٹھانے سے انکار کر دیا جس پر مذکورہ مسافر نے قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی دی ہے۔ ایلن جیسن (Alan Jasson) ایک ایسی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے جس پر صدر بش کی تصویر کے نیچے درج تھا 'دنیا کا نمبر ایک دہشت گرد'۔ پچپن سالہ کمپیوٹر ماہر جیسن کو میلبرن کے ہوائی اڈے پر اس وقت روک لیا گیا تھا جب وہ لندن جانے والے جہاز پر سوار ہونے والے تھے۔ قنتاس کے حکام کے مطابق ٹی شرٹ سے دوسرے مسافروں کے جذبات مجروح ہو سکتے تھے۔ میلبرن ایئرپورٹ پر بین الاقوامی مسافروں کے لیے مخصوص جانچ پڑتال سے گزرنے کے بعد جیسن جب جہاز تک جانے کے لیے گیٹ پر پہنچے تو انہیں کہا گیا کہ ان کی ٹی شرٹ 'سکیورٹی رسک' ہے اور سفر جاری رکھنے کے لیے انہیں کسی دوسری شرٹ کا انتخاب کرنا ہوگا۔لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اس شرٹ کے بغیر سفر نہیں کر سکتے، چاہے انہیں کرائے کی رقم سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑ جائے۔ میں آزادی اظہار کے اصول پر کاربند رہنے کو ترجیح دوں گا' جیسن کو پچھلے ماہ دسمبر میں بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قنتاس ایئر لائن نے 'بش مخالف ٹی شرٹ' کی وجہ سے انہیں سفر کرنے سے روک دیا تھا۔

اپریل 2007ء میں بلجیم میں کیتھولک چرچ کے نمائندوں نے ٹیلی ویژن پر ایک اشتہار میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک نائٹ کلب میں متنازعہ انداز میں پیش کرنے کے خلاف احتجاج کیا۔بلجیم کے مرکزی ٹی وی چینل آر ٹی ایل پر یہ اشتہار 'پلگ ٹی وی' (Plug TV) کی مشہوری کے لیے نشر کیا گیا۔ 'پلگ ٹی وی' نوجوانوں کے لیے شروع کیا گیا تھا۔کیتھولک چرچ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ کو اس انداز میں پیش کرنا ان کے ماننے والوں کے لیے بے حرمتی ہے اور ان کو اشتہار کا موضوع بنانا بھی غلط ہے۔اس متنازعہ اشتہار میں دکھایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بال بڑھے ہوئے ہیں اور وہ ایک نائٹ کلب میں داخل ہونے کی کوشش میں جہاں دروازے پر کھڑے باؤنسر انہیں روک رہے ہیں۔ اشتہار میں دکھایا گیا

ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب کا نشان بناتے ہیں جس سے باؤنسر سکڑ جاتے ہیں اور ان کی جسامت بونے جیسی ہو جاتی ہے۔ اشتہار میں انہیں کلب میں متنازعہ انداز میں پیش کیا گیا۔ کلب سے نکلتے ہوئے جب خدا انہیں بلاتا ہے تو ان کا دھیان پلگ ٹی وی کے اشتہار کے طرف جاتا ہے۔ خدا ان سے پلگ ٹی وی دیکھنے کی خواہش پر ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ کیتھولک چرچ نے ٹی وی چینل سے اشتہار کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ایسے اشتہارات صحافت کے زمرے میں نہیں آتے اور ان کو وہ آزادی اظہار سے وابستہ وہ تحفظات حاصل نہیں جو صحافتی کام کو حاصل ہیں۔

27 مئی 2006ء کو بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ ایک صفحے سے بھی کم کے سکرپٹ سے بڑے بڑے ہجوموں اور لڑائی کے منظروں والے پانچ حصوں پر مشتمل 'بیٹل شپ پوٹمکن (Battleship Potemkin)' 27 سالہ سرگئی ایزنسٹین (Sargai Eisenstein) کی فلم کو انگلینڈ اور امریکہ میں نمائش کو 'تخریب کارانہ' کہہ کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ ابھی فلموں کے لیے نام نہاد ضابطہ اخلاق طے کرنے والا Code Hays نہیں آیا تھا لیکن دونوں جگہ فلم کی نمائش کو ناممکن بنا دیا گیا۔

اپریل 2004ء میں امریکی محکمہ دفاع نے امریکی ویب سائٹس پر اپنے فوجیوں کے تابوتوں کی تصویریں شائع ہونے پر شدید غصے کا اظہار کیا۔ یہ تصاویر ان امریکی فوجیوں کی تھیں جو عراق میں مختلف جنگی کارروائیوں یا حادثات میں ہلاک ہوئے اور جن کے تابوت عراق سے امریکی فضائی اڈوں پر واپس لائے گئے۔ امریکی محکمہ دفاع ان تصاویر کو عام کرنے پر اس وقت تیار ہوا جب وہاں کی ایک عدالت نے حکم دیا کہ اطلاعات کی آزادی کے قانون کے تحت امریکی فوجیوں کی لاشوں کی واپسی کی تصاویر عام کی جائیں۔ تاہم جب یہ تصاویر مختلف ویب سائٹس پر شائع ہوئیں تو امریکی محکمہ دفاع نے کہا وہ مزید تصاویر میڈیا کو جاری نہیں کرے گا۔ ادھر امریکہ کی ایک کارگو افسر نے بتایا کہ اسے اس بنا پر نوکری سے نکال دیا گیا کہ امریکی جھنڈے میں لپٹے ہوئے بیس تابوتوں کے ساتھ اس کی تصویر ایک اخبار میں شائع ہوگئی تھی۔

امریکی محکمہ دفاع کے ایک سینئر افسر نے کہا کہ آسٹریلوی ٹیلی ویژن چینل کو عراق کی ابوغریب (Abu Ghraib) جیل میں قیدیوں کے ساتھ مظالم کی نئی تصاویر نشر نہیں کرنی چاہئیں تھیں۔ امریکی محکمہ دفاع کے ایک اہلکار کا کہنا تھا کہ ان تصاویر سے 'اشتعال بڑھے گا اور

غیر ضروری پر تشدد کارروائیاں سامنے آسکتی ہیں' ۔آسٹریلوی چینل نے قیدیوں کے ساتھ 2003 میں زیادتی کی وہ تصاویر جاری کیں جو پہلے منظر عام پر نہیں آئیں۔ یہ دو سال قبل منظر عام پر آنے والی ابو غریب میں قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تصاویر سے کہیں زیادہ خوفناک اور خونریز ہیں۔ان تصاویر میں تشدد، قتل اور جنسی تذلیل کے مناظر شامل ہیں۔ان میں عراقی قیدیوں کی کچھ ایسی خونریز تصاویر ہیں جس میں یہ بھی پتہ نہیں چل رہا کہ یہ بے ہوش ہیں یا مر چکے ہیں۔

جون 2013ء کو اسرائیلی حکام نے فلسطینی اتھارٹی کے سپانسر کردہ پتلی تماشہ شو دکھانے والے تھیٹر پر پابندی عائد کردی۔ پابندی کا اطلاق داخلی سیکورٹی کے وزیر کے حکم پر کیا گیا۔تھیٹر ڈائریکٹر محمد ملائقہ نے کہا کہ اس پتلی تماشہ شو میں اسرائیل کے فلسطینی مسلمانوں پر مظالم کو دکھایا جارہا تھا۔

مئی 2007ء میں مشہور امریکی فلم ڈائریکٹر مائیکل مور (Michael Moore) کی فلم ''فارن ہائیٹ نائن ون ون (Fahrenheit 9/11)'' جس میں امریکی صدر بش کے کردار پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی، امریکہ میں اس کی نمائش پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مائیکل مور کا کہنا تھا کہ ایک سال کی جدوجہد سے انہوں نے یہ سبق سیکھا کہ اس ملک میں ایسا آرٹ تخلیق کرنا کتنا مشکل ہے جو صاحب اقتدار لوگوں کو پسند نہ ہو۔

برطانوی اخبار ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کی اشاعت 17 جنوری 2013ء کے مطابق بنکاک میں تھائی لینڈ کی عدالت نے حکومت مخالف تحریک کے دوران خطاب میں بادشاہ King Bhumibol Adulyadej کی توہین کے الزام پر ملک کے معروف کامیڈین یوساوارس چک لوم (Yosawaris Chuklom) کو دو سال قید کی سزا سنا دی۔ یوساوارس نے 2010ء میں تھالی لینڈ کے دارالحکومت میں حکومت مخالف مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے بادشاہ بھومی بول اڈولیا ڈج کا مذاق اڑایا تھا۔

15 اپریل 2008ء کو فرانس کی پارلیمنٹ نے خواتین کو وزن کم کرنے پر ابھارنے والے اشتہارات شائع کرنے کو جرم قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی پر 3 سال قید اور 30 ہزار یورو جرمانے کی سزا قرار دی اور اگر کوئی خاتون مر گئی تو اشتہاری کمپنی یا میگزین و اخبار کے ایڈیٹر کو 3 سال قید اور 45 ہزار یورو کی سزا کا اعلان کیا۔فرانس کے وزیر صحت نے اس موقع پر کہا ''نوجوان لڑکیوں کو وزن گھٹانے کے لیے کم خوراکی پر مائل کرنا، اظہار رائے کی آزادی

نہیں بلکہ ایسے پیغامات، موت کے پیغامات ہیں''۔

15 مئی 2010ء یونان کے شہر سیلونیکا میں ایک یہودی قبرستان کے باہر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھنے پر تین افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں ایک 7 سالہ بچہ بھی شامل تھا۔ اسی دن یعنی 15 مئی کو پولینڈ کے جنوب میں ایک فٹ بال سٹیڈیم سے پانچ شائقین کو گرفتار کیا گیا جنہوں نے یہودیوں کے بارے میں ایک بینر پر ایک بڑا سا کارٹون بنایا تھا جس میں ایک لمبی ناک والا شخص جو یہودیوں کی علامت ہے، اس پر موت کی علامت بنائی گئی تھی۔ 11 مئی 2010ء کو کینیڈا کے ایک 83 سالہ بوڑھے شخص میکس مہر کو چھ ماہ قید سنائی گئی اور دو سال پروبیشن پر رکھنے کو کہا گیا جس نے دیوار پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھے تھے۔ 6 مئی 2010ء کو امریکہ کے شہر نورفوک کی عدالت نے ایک شخص کرسٹوفر وبروکس کو پانچ سال قید کی سزا سنائی جس نے ساٹھ سٹکروں پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھے اور انہیں گرجے کی دیواروں پر لگایا۔ 3 مئی 2010ء کو ناروے کی وزارتِ ثقافت نے ایک مصری ٹیلی ویژن ''الرحمۃ'' کی نشریات پر پابندی لگا دی۔ کہا گیا کہ وہ یہودیوں کے خلاف نفرت ابھارتا تھا۔ اسی ٹیلی ویژن چینل پر فرانس میں 31 اکتوبر 2004ء کو اس وقت پابندی لگائی جب اس نے ایک مصری عالم دین کی یہودیوں کے خلاف تقریر نشر کی۔ 30 اپریل 2010ء کو برطانیہ کی نیوکاسل عدالت نے 19 سالہ نکی ڈیوسن جو ایک دودھ بیچنے والا نوجوان ہے، اس کو اس بات کا مجرم قرار دیا کہ اس نے انٹرنیٹ پر یہودیوں کے خلاف آرین سٹرائک نامی گروپ بنایا تھا۔ اس سارے فیصلہ کی سماعت صرف پچاس منٹ میں مکمل ہوگئی۔ 16 اپریل 2010ء کو جرمنی کے شہر ریگن برگ کی ایک عدالت نے ایک عیسائی بشپ رچرڈ ولیم سن کو اس بات پر سزا سنائی کہ اس نے سویڈن کے ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ جنگ عظیم دوم میں یہودیوں کا قتل عام ہوا تھا۔ 14 اپریل 2010ء کو فرانس کی حکومت نے وہاں کے ایک سیٹلائٹ آپریٹر کو حکم دیا کہ وہ ایک مصری چینل کی نشریات مکمل طور پر بند کر دے کیونکہ یہ یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔ 12 اپریل 2010ء کو اٹلی کی ایک عدالت نے ایک شخص پاؤلو منزی کو اس بات پر مجرم قرار دیا کہ اس نے انٹرنیٹ پر ایک بلاگ بنایا تھا جس میں 162 یونیورسٹی پروفیسروں کی لسٹ شائع کی تھی جو متعصب یہودی ہیں۔ کینیڈا کی یارک یونیورسٹی نے یکم اپریل 2010ء کو ایک طالب علم کو

یونیورسٹی سے نکال دیا جس نے یہودیوں کے خلاف ایک ویب سائٹ بنائی تھی۔ اس وقت وہ شخص پولیس کی تحویل میں ہے۔ 25 مارچ 2010ء کو امریکہ کے شہر یوجین کی پولیس نے ایک شخص مائیکل رسٹر کو گرفتار کیا جو بازاروں میں یہودیوں کے خلاف نعرے لگاتا تھا۔ 18 مارچ 2010ء کو امریکہ کی ریاست ٹیکساس کی عدالت نے ایک فرم بردار سکاٹ کو ایک لاکھ پندرہ ہزار ڈالر جرمانہ کیا تھا کیونکہ اس کے اعلیٰ افسران اکثر گندے یہودی "Dirty Jew" جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ 18 مارچ 2010ء کو کینیڈا کے شہر کالگری میں ایک 17 سالہ لڑکے کو گرفتار کیا گیا جو دیواروں پر یہودیوں کے خلاف نعرے لکھتا تھا۔ 9 مارچ 2010ء کو سپین کے شہر بارسلونا کی عدالت نے ایک شخص پیڈرو ویریلا کو دو سال نو ماہ قید کی سزا سنائی۔ یہ شخص ایک کتابوں کی دکان یورپا بک سٹور کا مالک تھا اور یہودیوں کے خلاف کتابیں بیچتا تھا۔ 20 فروری 2010ء کو امریکہ کے شہر بوگارائن کی پولیس نے 15 سے 16 سال کی عمر کے تین لڑکوں کو گرفتار کیا جنہوں نے ایک یہودی عبادت گاہ کے پاس کھڑے ہو کر انہیں برا بھلا کہا تھا۔ 18 فروری 2010ء کو چیک ریپبلک کی سپریم کورٹ نے ایک سیاسی پارٹی ''ورکرز پارٹی'' پر پابندی لگائی کیونکہ وہ یہودیوں کے خلاف نظریات رکھتی تھی۔ 13 فروری 2010ء کو برطانیہ کی لبرل ڈیموکریٹ کی رکن اور ترجمان بیرنس جینی ٹونگے کو پارٹی سے برطرف کر دیا کیونکہ اس نے صرف یہ بیان دیا تھا کہ اسرائیلی افواج نے ہیٹی کے زخمیوں کے اعضاء فروخت کر ڈالے تھے۔ 11 فروری 2010ء کو برطانیہ کے کلیمنگ علاقے کے جج نے 18 سالہ جورڈن بوکٹن کو مجرم قرار دیا کیونکہ اس نے ایک نوکری دینے والے ادارے میں یہ نعرہ لگایا تھا ''یہودی کے لیے موت''! اسے بارہ ماہ کی سزا سنائی گئی۔ 5 جنوری 2010ء کو نیویارک کے علاقے بروک لین کے ایولوایونو کو اس جرم پر 18 سال قید کی سزا سنائی گئی جبکہ اس نے 23 شہر پیٹرز برگ کے اخبار آرتھوڈکس رشیا کے چیف ایڈیٹر کانٹین ڈرشبود کو تین سال سزا سنائی کیونکہ اس نے اپنے اخبار میں یہودیوں کے خلاف لکھا تھا۔

مارچ 2013ء میں برطانیہ کی لیبر پارٹی نے لارڈ نذیر احمد کو معطل کر دیا اور ان کے ان الزامات کی تحقیقات شروع کر دی، جن میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ خطرناک ڈرائیونگ پر ان کی سزائے قید، یہودی سازش تھی۔ برطانوی اخبار ''دی ٹائمز'' کے مطابق لارڈ نذیر احمد نے الزام لگایا کہ ان کی کار کے خطرناک حادثے کے بعد یہودیوں نے جن کے اخبارات اور

ٹیلی ویژن چینلز ہیں، عدالتوں پر دباؤ ڈالا۔ مسلم پیپر نے مبینہ طور پر پاکستان کے اردو زبان کے براڈ کاسٹ میں کہا کہ جس جج نے انہیں کار حادثے پر بارہ ہفتے جیل کی سزا سنائی، اسے ایک اہم کیس میں ٹونی بلیئر کے ''یہودی ساتھی'' کی مدد کے بعد ہائیکورٹ میں مقرر کیا گیا تھا۔ اخبار میں ان کے ریمارکس کی اشاعت کے بعد لیبر پارٹی کے ایک ترجمان نے کہا کہ لیبر پارٹی اس کی مذمت کرتی ہے اور وہ کسی قسم کی یہودی مخالفت رویہ کو برداشت نہیں کرتی۔

مارچ 2013ء میں امریکہ میں اونچا ہنسنے کے الزام میں ایک شخص کو 30 روزہ قید یا 500 امریکی ڈالر جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ 42 سالہ امریکی رابرٹ شاویلی (Robert Shavelle) پر نقص امن کے الزامات عائد کیے گئے۔ رابرٹ کے خلاف اس کے ہمسائے نے کھڑکی میں کھڑا ہو کر اونچا ہنسنے کا الزام عائد کیا تھا، رابرٹ کا کہنا تھا کہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر ہنسنا جرم ہے۔

2013ء میں برطانیہ کے دارالحکومت لندن میں ایک حاضر سروس فوجی کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ جس میں ملزمان نے فوجی کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی لاش سڑک پر رکھ دی اور کچھ دیر تک لوگوں کو خوفزدہ کرتے رہے۔ پولیس موقع پر پہنچی تو ملزمان نے پولیس پر حملہ کی کوشش بھی کی۔ یاد رہے کہ برطانوی فوجی ''لی رگبی (Lee Righby)'' جو افغانستان میں تعینات رہ چکا تھا، کو وولٹ نامی علاقہ کی فوجی بارکوں کے نزدیک قتل کر دیا گیا تھا۔ اس افواہ کے بعد کہ قاتل مسلمان ہیں، برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے واقعات میں زبردست اضافہ دیکھنے میں آیا۔ نام نہاد اعتدال پسندی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے گوروں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کی انتہا کر دی۔ روز بہ روز مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ ان اشتعال انگیز واقعات میں مساجد پر حملے، دیواروں پر مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز نعرے، مسلمان عورتوں کے حجاب کو کھینچنے، مسلمانوں کو گالیاں دینا اور مختلف ناموں سے پکارنے کے واقعات شامل ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق فیتھ میٹرز (Faith-Matters) نامی چیرٹی کی ہیلپ لائن کو 162 ایسے واقعات کی اطلاع ملی، جن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔ اس سے پہلے اس چیرٹی کو روزانہ اوسطاً 6 ایسے واقعات کی اطلاع ملتی تھی۔ ایک دوسری خبر کے مطابق برطانیہ کی انتہا پسند تنظیم انگلش ڈیفنس لیگ (The English Defence League) کو لندن میں دندناتے پھرنے کی کھلی چھوٹ مل

گئی۔ گزشتہ روز برطانوی فوجی کے دن دہاڑے قتل کے نام پر سینٹرل لندن میں ''ای ڈی ایل'' نے مارچ کیا اور مسلمانوں کے خلاف نعرے لگائے۔ برطانوی وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے سامنے کیے گئے اس مظاہرے کے شرکا بینر اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے اور انتہا پسند تنظیم کے لیڈر ٹومی روبنسن (Tommy Robinson) نے عرب ممالک میں انقلاب کی طرز پر اپنے کارکنوں کو برطانیہ میں انگلش اسپرنگ لانچ کرنے پر اکسایا۔ واضح رہے کہ قتل کے واقعہ کے بعد سے انتہا پسندوں کی جانب سے مساجد پر بھی حملے کیے جا رہے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اسلامی ثقافتی مرکز پر پیٹرول بم سے حملے کرنے والے 2 افراد کو گرفتار بھی کیا گیا۔

ایک تازہ واقعہ میں ریڈچ کی جامع مسجد کو نشانہ بنایا گیا۔ شرپسندوں نے رات کے وقت مسجد کی دیواروں پر ای ڈی ایل لکھ دیا اور نازی نشان سواستیکا بھی بنا دیا۔ انگلش ڈیفنس لیگ ان دنوں مسلمانوں کے خلاف سرگرم ہے اور اس ہفتہ کو ورسٹر شائع میں نامعلوم افراد نے ایک زیر تعمیر مسجد میں گھس کر دیواروں اور کھڑکیوں پر قابل اعتراض الفاظ بشمول صلیب کی اشکال سپرے کر دیں۔ یہ نسل پرستانہ نقش کم سے کم چھ کھڑکیوں پر سپرے کیے۔ دراندازگیٹ کے ذریعے اندر داخل ہوئے اور مرکزی عمارت میں گھس گئے۔ ریڈچ کے سماجی رہنما راجہ محمد ساجد نے کہا کہ دو روز قبل والسال کی عائشہ مسجد کے سامنے بم سے حملہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ یہ بم مکمل طور پر پھٹ نہیں سکا، نامعلوم دہشت گردوں اور نسل پرست لوگوں نے ریڈچ کی نو تعمیر شدہ مسجد کو پینٹ سے خراب کر دیا اور مسجد سے تقریباً ایک ہزار پونڈ مالیت کے اوزار بھی چوری کر لیے۔

برطانوی فوجی کے قتل کے بعد مسلمانوں پر حملوں میں 8 گنا اضافہ ہوا۔ یورپ کے چند ملکوں میں مسلم برادری کے خلاف حملوں کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن تاحال یورپی یونین کی جانب سے ایسے حملوں کے اعداد و شمار درج کرنے یا انہیں جاری کرنے سے متعلق کوئی موثر حکمت عملی سامنے نہیں آئی۔ ''مجھ پر کئی مرتبہ حملہ کیا جا چکا ہے۔ تھوکا گیا، مارا پیٹا گیا حتیٰ کہ جب میں حاملہ تھی، مجھے میرے بیٹے اور میرے خاوند کے سامنے روندا گیا''۔ یہ بات اپنی شناخت مخفی رکھنے کی شرط پر ایک عورت نے برطانیہ میں فعال ٹیل ماما نامی ایک ویب سائٹ کو بتائی۔ یہ ویب سائٹ برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے حملوں کا ریکارڈ رکھتی ہے۔ اس کی انٹرنیٹ ویب سائٹ کے انتظامی امور کی نگرانی ایک مذہبی فاؤنڈیشن کرتی ہے۔

برطانیہ میں مقیم مسلمان اپنے خلاف ہونے والے حملوں کے بارے میں اس ادارے کے ساتھ رجوع کر سکتے ہیں۔ ٹیل ماما کے ڈائریکٹر فیاض مغل نے بتایا کہ پچھلے اٹھارہ مہینوں کے دوران مسلمان اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف مجموعی طور پر بارہ سو حملے کیے گئے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ رواں سال بائیس مئی کو لندن میں لی رگبی نامی برطانوی فوجی کے قتل کے واقعے کے بعد مسلمانوں کے خلاف ہونے والے حملوں میں کوئی آٹھ گنا اضافہ ریکارڈ کیا جاچکا ہے۔ یورپی یونین کی ایجنسی برائے بنیادی حقوق عرصہ دراز سے یونین میں شامل حکومتوں پر زور ڈال رہی ہے کہ وہ ایسے اسلام مخالف حملوں سے متعلق اعداد وشمار جمع کریں اور انہیں جاری بھی کریں۔

برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز اور اشتعال انگیز مہم میں آئے روز اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو نفرت کی بنا پر تعصب کا نشانہ بنانے کے زیادہ تر واقعات میں برطانیہ میں مقیم 40 سے زائد خواتین کو اسلامی لباس پہننے پر نشانہ بنایا گیا جبکہ حملہ کرنے والے زیادہ تر برطانوی مرد تھے۔ بسوں اور بس سٹاپوں پر حجاب پہنے خواتین کے منہ پر تھوکنے اور انہیں برا بھلا کہنے کے واقعات عام ہیں۔ افسوس اس بات پر ہے کہ ایسے ناپسندیدہ اور اشتعال انگیز عمل کو بار بار دہرانے کے باوجود بھی تماشا دیکھنے والے کسی غیر مسلم نے ان جنونیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس افسوسناک، غیر انسانی اور ہتک آمیز رویے پر لطف اندوز ہوتے، ہنستے اور ان خبطیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

2 اکتوبر 2017ء کو امریکی ریاست نواڈا Nevada کے شہر لاس ویگاس LasVegas میں میوزک کنسرٹ کے دوران فائرنگ سے 50 افراد ہلاک اور 500 سے زائد زخمی ہو گئے جبکہ جوابی فائرنگ میں ایک حملہ آور بھی مارا گیا۔ ابتدائی اطلاعات کے مطابق منڈالے بے کیسینو اور ہوٹل کے احاطے میں میوزک کنسرٹ جاری تھا کہ ایک سفید نام مسلح شخص نے ہوٹل کی 32 ویں منزل سے نیچے موجود ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تاہم پولیس کی جوابی کارروائی میں حملہ آور بھی مارا گیا۔ امریکی پولیس نے حملہ آور کی شناخت ظاہر کرتے ہوئے اس کا نام اسٹیفن پیڈوک Stephen Paddock بتایا جس کی عمر 64 سال تھی۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک سنگین اور بدترین دہشت گردی کی واردات تھی۔ جس میں درجنوں عام شہریوں کو بے دردی سے مارا گیا جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے مگر حیرت کی بات

یہ ہے کہ اس واقعے میں 50 افراد کی ہلاکت کی تصدیق کے بعد امریکی پولیس نے بیان جاری کیا کہ ''ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ دہشت گردی کی واردات ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتل وخوں ریزی اور کشت وخون کی بڑی سے بڑی واردات بھی اس وقت تک ''دہشت گردی'' نہیں کہلا سکتی جب تک اس میں کسی مسلمان شخص یا گروپ کے ملوث ہونے کی تصدیق نہ ہو۔ کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت دنیا میں دہشت گردی کے نام پر صرف اور صرف منافقت کا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سے مراد مسلمانوں کے خلاف جنگ ہی ہے؟ اس طرح اس واقعہ کے چند گھنٹوں بعد امریکی صدر نے اپنے خطاب میں اس خونریزی کو دہشت گردی قرار دینے سے گریز کیا اور اس واقعے کے لیے انہوں نے Pure Act of Evil (شیطانی واردات) کا لفظ استعمال کیا۔ بلاشبہ دہشت گردی شیطانی عمل ہی ہے، لیکن ایسا لگا کہ ان کے خیال میں کسی واقعے کو دہشت گردی قرار دینے کے لیے نامزد ملزم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

امریکی فوج نے 1993ء میں اپنے صدر کا کارٹون بنانے والی خاتون کو اس کے گھر والوں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جس نے بغداد کے الرشید ہوٹل کے سامنے زمین پر جارج بش اول کا کارٹون بنایا اور ہوٹل میں آنے والا ہر فرد اس کارٹون پر پاؤں رکھ کر گزرتا تھا۔ امریکہ سے اپنے صدر کی یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور اس نے کارٹون بنانے والی خاتون لیلیٰ العطار کو صرف یہ کارٹون بنانے کی پاداش میں اس کے گھر میں رات کے وقت تین میزائلوں سے نشانہ بنا کر اُسے تمام اہل خانہ سمیت شہید کر دیا اور گھر کو کھنڈر بنا دیا۔ جبکہ یہاں تو کسی معمولی آدمی کی کوئی ایک تصویر نہیں بنائی گئی بلکہ حضور سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کے لیے امریکی عیسائیوں نے شرانگیز ویڈیو فلم بنائی اور جب مسلمان اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے احتجاج کرتے ہیں تو میڈیا انہیں دہشت گرد گردانتا ہے جو سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔

فروری 2013ء میں زمبابوے کے رابرٹ موگابے (Robert Gabriel Mugabe) کی توہین کرنے کے الزام میں گرفتار سیمنٹ فیکٹری ورکر کلیمنس زخائیل کو ایک مقامی عدالت نے 3 ماہ قید کی سزا سنا دی۔ پراسیکیوٹرز کے مطابق زخائیل (Clemence Zikhali) پر صدر کی توہین کا الزام لگایا گیا تھا۔ گواہوں کے مطابق زخائیل نے صدر

موگابے بارے انتہائی قابل اعتراض الفاظ استعمال کیے۔ واضح رہے کہ زمبابوے میں صدر موگابے کے بارے توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے پر سزا ملتی ہے۔

مئی 2014ء میں شمالی کوریا کے صدر کی جانب سے امریکی صدر باراک اوباما کے لیے بدصورت بندر کے الفاظ استعمال کرنے کو امریکی حکومت نے بے عزتی قرار دیا اور اس کی شدید مذمت کی۔ امریکی حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''یہ آزادی اظہار رائے'' ہے اور اس پر احتجاج کرنا ''ان پڑھ'' لوگوں کا کام ہے۔

اپریل 2014ء میں برونائی کی حکومت نے اپنے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کیا تو امریکہ و یورپ میں کھلبلی مچ گئی۔ ہالی وڈ کے سٹارز نے برونائی کے اسلامی قوانین نافذ کرنے کے فیصلے کے خلاف بیورلے ہلز Beverly Hills میں ایک معروف ہوٹل کا جو برونائی کے سلطان کی ملکیت ہے، بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کامیڈین جے لینو Jayleno اور ایلن ڈی جینیریز Ellen De Generes بھی ان معروف شخصیتوں میں شامل ہیں جنہوں نے بیورلے ہلز ہوٹل کا بائیکاٹ کیا۔ واضح رہے کہ بیورلے ہلز ہوٹل برونائی حکومت کی ملکیت ہے۔ بیورلے ہلز سٹی کونسل نے ان قوانین کی مذمت کرنے کے لیے ایک قرارداد بھی پیش کی۔ برونائی کے سلطان حسن بلقیہ نے نئی سزاؤں کے پہلے مرحلے کا اعلان کیا جن کے تحت ہم جنس پرستی اور زنا کے مرتکب افراد کے لیے سنگساری اور چوری کرنے پر اعضا کاٹنے کی سزائیں دی جائیں گی۔ متعارف ہونے والے ان نئے قوانین کا مکمل نفاذ اگلے تین سال میں ہوگا۔ بیورلے ہلز کے میئر للّی بوسے Lilli Bosse نے شہریوں سے برونائی کے نئے قوانین کی مذمت کرنے والی قرارداد کو پاس کرنے پر زور دیا اور اس ملک کے ہوٹل اور دسری املاک سے اپنے پیسے ہٹانے کی اپیل کی۔ غیر ملکی میڈیا کے مطابق برونائی کے سلطان کے اعلان کے بعد ملک میں سرگرم غیر ملکی کاروباری اداروں، ثقافتی تنظیموں ،غیر ملکی این جی اوز اور میڈیا گروپس نے اس فیصلے پر سخت خفگی ظاہر کی اور سلطان حسن البلقیہ کا معاشی بائیکاٹ کر دیا۔ سلطان کا معاشی بائیکاٹ کرنے والوں میں برونائی میں سرگرم مختلف کاروباری شعبوں کو مشاورتی معاونت فراہم کرنے والے بین الاقوامی گروپ ''ورجن'' (Virgin) کا نام سرفہرست ہے۔ گروپ کے سربراہ رچرڈ برینسن (Richard Branson) نے اعلان کیا ہے کہ ان کی کمپنی کا کوئی ملازم حسن البلقیہ کے ملکیتی ہوٹل میں

قیام نہیں کرے گا۔ جب کہ ان کا کاروباری گروپ کسی بھی ایسے ادارے کے ساتھ تعلق نہیں رکھے گا جس کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق حسن البلقیہ سے ہو۔ برونائی حکومت کے حالیہ فیصلے کے بعد حقوق نسواں اور انسانی آزادی کی نام نہاد تنظیموں نے بین الاقوامی سطح پر حسن البلقیہ اور برونائی حکومت کے ملکیتی عالیشان ہوٹلوں اور کاروباری فرموں کے بائیکاٹ کی مہم شروع کر دی۔ حقوق نسواں کے لیے کام کرنے والی ہالی وڈ کی امریکی ''فیمینسٹ'' (Feminist) نے نیویارک میں واقع حسن البلقیہ کے ہوٹل میں منعقد کی جانے والی ہائی وڈ تقسیم ایوارڈز کی سالانہ تقریب منسوخ کر دی۔ برطانیہ میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں نے بھی معاشی و ثقافتی اور سماجی سطح پر برونائی کا بائیکاٹ کیا۔ برونائی حکومت نے اسلام کی فوجداری سزائیں ریاست میں متعارف کرائی تھیں جس کے تحت ملک میں شراب کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی عائد کی گئی۔ حالیہ نافذ کئے جانے والے شرعی قوانین کے مراحل کے مکمل نفاذ کے بعد برونائی میں برطانوی قوانین کے منسوخ ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ اپنے قوانین کے مقابلے میں شرعی قوانین کا نفاذ برطانیہ اور امریکہ کو برداشت نہیں ہے اور وہ بین الاقوامی سطح پر برونائی کو معاشی و اقتصادی پابندیوں کے جال میں پھنسانے کے لیے سرگرم ہیں۔ واضح رہے کہ برونائی، ملائشیا اور انڈونیشیا کے پڑوس میں واقع تیل کی دولت سے مالامال چھوٹی سی ریاست ہے۔ یہاں کا نظام حکومت بادشاہت ہے۔ سلطان حسن البلقیہ کا دنیا کی امیر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کے مقابلے میں برونائی کے عوام اور حکومت میں اسلامی قوانین پر عملدرآمد کا جذبہ نمایاں ہے۔ برونائی کی کل آبادی قریباً 4 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ ریاست کی 70 فیصد آبادی مسلمان ہے جو مالے نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ 15 فیصد آبادی غیر مسلم چینی عیسائیوں، ہندوؤں اور پارسیوں سمیت دوسرے غیر مسلم گروپوں پر مشتمل ہے تاہم ریاست میں متعارف شرعی قوانین کا اطلاق صرف مسلمانوں پر کیا جاتا ہے جس کے سبب ریاست میں بسنے والے غیر مسلموں نے شرعی قوانین کے نفاذ پر کبھی تنقید نہیں کی۔

کینیڈا کی حکومت نے مسلمانوں کی اقدار پر حملہ کرتے ہوئے ہر اخلاقی قدر پار کرلی۔ نومبر 2014ء میں وزیر امیگریشن کرس الیگزینڈر نے کہا کہ ''ہماری حکومت کینیڈا میں اقامت اختیار کرنے والوں کو یہ واضح پیغام دینا چاہتی ہے کہ انسانی حقوق کے منافی کسی تہذیبی روایت کو بالکل برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دوسری شادی کی وحشیانہ تہذیبی روایت کو آگے

بڑھانے والوں کو کینیڈا کی شہریت نہیں دی جائے گی‘‘۔ وزیر موصوف کا کہنا تھا کہ اس سے عورتوں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ دوسری شادی کرنا وحشیانہ عمل ہے لیکن جسم فروشی، طوائفانہ کلچر اور ہوموسیکس جائز اور قانونی ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ اب تو یورپ میں جسم فروشی ایک صنعت کا درجہ اختیار کر چکی ہے جو ان کی معیشت کے لیے ایک بڑا سہارا ہے۔

مارچ 2017ء میں یوٹیوب سٹار آدم صالح کو عربی بولنے پر ڈیلٹا ائیر لائنز کے جہاز سے زبردستی اتار دیا گیا۔ آدم صالح نے بی بی سی کو بتایا کہ جب وہ اپنی والدہ سے عربی میں بات کر رہا تھا تو اس کو لندن سے نیو یارک جانے والی فلائٹ سے اتار دیا گیا۔

دسمبر 2016ء میں جرمن کی ایک اعلیٰ عدالت نے حکم دیا کہ مسلمان خواتین لازمی طور پر لڑکوں کے ساتھ پیراکی سیکھیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک 11 سالہ مراکشی طالبہ نے برقینی (Burkini) پہن کر لڑکوں کے ساتھ پیراکی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ برقینی میں بھی جسم نمایاں ہوتا ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے۔ تاہم اسکول انتظامیہ کی جانب سے دباؤ پر لڑکی کے والدین نے عدالت سے رجوع کیا۔ تاہم یہ مقدمہ جرمن زیریں عدالتوں سے ہوتا ہوا اعلیٰ ترین عدالت میں پہنچ گیا جس نے مسلم طالبہ کے والدین کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمان لڑکیاں اپنے کلاس فیلو لڑکوں کے ساتھ پیراکی نہیں کرتیں تو یہ کام ان سے زبردستی کروایا جائے۔

یورپی ملک آسٹریا (Asteria) کے صدر نے یکم اکتوبر 2017ء سے خواتین کے نقاب کرنے پر پابندی لگانے کی منظوری دی۔ چہرے کا نقاب کرنے والی خواتین کے خلاف 150 یورو کا جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ جب کہ انتہا پسندانہ لٹریچر پر پابندی کے نام پر قرآن مجید کے نسخے تقسیم کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ مذکورہ متنازع اقدام دراصل یورپ میں بڑھتی ہوئی اسلام کی مقبولیت اور آفاقیت کا راستہ روکنے کی شعوری کوشش ہے۔ لیکن اسلام کا راستہ پہلے کبھی ایسے طاغوتی ہتھکنڈوں سے رکا نہ آئندہ رکے گا۔ فی الواقع اسلامی شعائر پر بلاجواز اور جانب دارانہ پابندیاں ہی دنیا میں انتہا پسندی، دہشت گردی اور تشدد پسندی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ لہٰذا قیام امن کے لیے یورپ کو اپنی انتہا پسندانہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

جنوری 2017ء میں برطانوی ملکہ کے ایک پادری ’’گیون اشنڈن‘‘ Gavin

Ashenden نے گلاسکو چرچ میں قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت دینے پر بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا، اس سے قبل انہوں نے چرچ پر تنقید کی تھی۔ غیر ملکی میڈیا کے مطابق پادری ''گیون اشنڈن'' Gavin Ashenden نے ایک بلاگ میں کہا کہ بکنگھم پیلس (Buckingham Palace) کے حکام کی جانب سے جب اس سلسلے میں بات چیت شروع کی گئی تو انہوں نے سب سے زیادہ عزت والا قدم اٹھاتے ہوئے استعفیٰ دے دیا ہے۔ 6 جنوری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایک تقریب میں گلاسکو چرچ کی جانب سے قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت دی گئی تھی جس میں ایک طالب علم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآنی آیت پڑھی تھی۔

دسمبر 2016ء میں اسرائیلی پارلیمنٹ میں اذان سے یہودی حواس باختہ ہو گئے۔ اذان پر پابندی کی بحث کے دوران جب فلسطینی رکن نے اذان دینا شروع کی تو یہودیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور پارلیمنٹ سے باہر چلے گئے۔ تفصیلات کے مطابق اسرائیل کی پارلیمنٹ کے مسلمان رکن احمد تیبی Ahmad Tibi نے پارلیمنٹ میں اظہار خیال کے دوران مساجد میں اذان پر پابندی کا متنازع بل کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہودی لابی اسلام فوبیا کا شکار ہے۔ بل کی منظوری اسرائیلی فاشسٹ معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ اپنے خطاب کے دوران انہوں نے اذان دینا شروع کر دی۔ اس دوران ایک اور مسلمان رکن طالب ابوعرار Taleb Abu Arar نے بھی اذان دینا شروع کر دی جس پر صیہونی ارکان میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے شور شرابہ شروع کر دیا، یہودی ارکان انہیں روکتے رہے لیکن انہوں نے اذان مکمل کی۔ واضح رہے کہ اسرائیلی پارلیمنٹ میں بل پیش کیا گیا جس میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا جسے پارلیمنٹ منظور کر چکی ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مسلمانوں کے خلاف تعصب اور نفرت سے بھرپور اقدامات کے بعد دیکھنے میں آیا ہے کہ پورے امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف حقارت آمیز رویہ اپنایا جانے لگا ہے۔ باحجاب مسلمان طالبات سے سکولوں میں نہایت بدسلوکی کی جاتی ہے۔ انہیں بس سے زبردستی اتار دیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات سکول میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے اور بہانہ بنایا جاتا ہے کہ آپ کا اس سکول سے کوئی تعلق نہیں، آپ ہمارے لیے اجنبی ہیں۔

فروری 2015ء میں امریکہ میں 23 سالہ ضیا برکت کو ان کی اہلیہ 21 سالہ یسر محمد اور خواہر نسبتی 19 سالہ رزان محمد کے ہمراہ چیپل ہل میں واقع ان کی رہائش گاہ پر منگل کو قتل کیا گیا اور جمعرات کو ان کے جنازوں میں پانچ ہزار سے زیادہ افراد شریک ہوئے۔ پولیس نے اس قتل کے الزام میں 46 سالہ کریگ سٹیون ہکس نامی شخص کو گرفتار کیا۔ مقتولین کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ یہ نفرت کی وجہ سے قتل کا واقعہ ہے۔ دورۂ میکسیکو کے دوران اپنے ایک خطاب میں ترک صدر اردوغان نے امریکی صدر اوباما، نائب صدر جو بائیڈن اور وزیر خارجہ جان کیری پر اس واقعے کے بارے میں بیان نہ دینے پر تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'اگر آپ اس قسم کے واقعے پر خاموش رہتے ہیں اور کوئی بیان نہیں دیتے تو دنیا آپ کی حمایت میں بھی نہیں بولے گی۔ خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق محمد ابوصالحہ نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ان کی بیٹیوں اور داماد کو مذہب سے نفرت کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'میڈیا نے امریکی شہریوں پر بار بار اسلامی دہشت گردی کے لفظ کی یلغار کر کے انہیں ہم سے خوفزدہ کر دیا ہے، وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔' انھوں نے کہا کہ 'اگر آپ کا کسی سے کوئی تنازع ہے اور وہ آپ سے پہلے ہی نفرت کرتا ہے تو آپ کے سر میں گولی ماردی جاتی ہے۔

دسمبر 2016ء میں امریکہ میں مسلمانوں سے مذہبی منافرت کا ایک اور دلخراش واقعہ رونما ہوا۔ نیو یارک میں فوڈ سٹور کے باہر مسلمان لڑکی پر کھولتی ہوئی کافی پھینک کر اس کا چہرہ جلا دیا گیا، کھولتی کافی سے اس کے چہرہ بری طرح جھلس گیا۔ لڑکی کو امداد کے لیے قریبی ہسپتال لے جایا گیا۔ واقعہ نیو یارک کے پوش ترین علاقے منہٹن (Manhattan) کے سیونتھ ایونیو پر پیش آیا۔ 34 برس کے نیتھن گرے (Nathan Gray) نے 21 برس کی مسلم لڑکی کا گلا دبوچا اور اس کے سر پر اپنا بیگ بھی مارا۔

27 مئی 2017ء کو نارتھ ایسٹ پورٹ لینڈ (Northeast Portland) امریکہ میں ہولی وڈ ٹرانزٹ سٹیشن پر میکس ٹرین (Max Train) میں شام ساڑھے 4 کے قریب ٹرین میں سوار ایک شخص نے 2 خواتین پر، جو حلیے سے مسلمان نظر آ رہی تھیں، نسل پرستانہ اور اسلام کے خلاف دل آزاد، نفرت انگیز اور توہین آمیز، مذہبی فقرے کسنا شروع کیے۔ پولیس کے مطابق خواتین پر دل آزار جملے کسنے والے شخص کو 3 افراد نے روکنے کی کوشش کی تاہم خنجر کے وار لگنے سے 2 افراد مارے گئے اور ایک زخمی ہو گیا۔ واقعے کے بعد حملہ آور کو

فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔عینی شاہدین نے پولیس کو بتایا کہ مذکورہ خواتین ممکنہ طور پر مسلمان تھیں جن میں سے ایک نے حجاب لے رکھا تھا۔ پورٹ لینڈ پولیس کے ترجمان پیٹی سمپسن (Sgt. Pete Simpson) نے نیوز کانفرنس کے دوران بتایا کہ جس وقت حملہ آور خواتین پر چلا رہا تھا، چند افراد نے مداخلت کی اور خواتین پر جملے کسنے والے شخص کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔تاہم ملزم نے ان پر حملہ کر دیا۔ پولیس کا مزید کہنا تھا کہ حملے کے نتیجے میں ایک شخص موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا، دوسرے نے ہسپتال میں دم توڑا جبکہ تیسرے شخص کا ہسپتال میں علاج جاری ہے۔ پولیس ترجمان کے مطابق یہ افراد ٹرین میں سفر کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے حملے کی زد میں آ گئے۔

19 جون 2017ء کو شمالی لندن میں سیون سسٹرز روڈ پر واقع فنز بری پارک (Finsbury Park) مسجد سے لوگ نماز تراویح پڑھ کر باہر نکل رہے تھے کہ ایک وین میں سوار متعصب گورے ڈیرن اوسبارنے (Darren Osborne) نے فٹ پاتھ پر منی ٹرک چڑھا کر انہیں روند ڈالا جس کے نتیجے میں ایک مسلمان موقع پر شہید اور 10 زخمی ہو گئے۔منی ٹرک لوگوں پر چڑھ دوڑنے سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ پولیس نے تصدیق کی کہ حملے کا نشانہ بننے والے تمام افراد مسلمان تھے جنہیں فوری طور پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔عینی شاہدین کے مطابق جب منی ٹرک میں بیٹھا ہوا شخص باہر آیا تو وہ بھاگتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ میں تمام مسلمانوں کو مارنا چاہتا ہوں، میں تمام مسلمانوں کو مار ڈالوں گا۔عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ متاثرین سوال کر رہے تھے کہ پولیس اور ایمبولینس سروس کہاں ہے؟ لندن برج حملے کے بعد تو پولیس کمانڈوز نے آٹھ منٹ کے اندر تمام حملہ آوروں کو ہلاک کر دیا تھا اور زخمیوں کو فوری طبی امداد دی گئی تھی۔عینی شاہدین کے مطابق منی ٹرک میں تین افراد سوار تھے جن میں دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے جبکہ تیسرے کو لوگوں نے پکڑ لیا۔نمازیوں کو کچلنے والے وین ڈرائیور کو امام مسجد نے مشتعل افراد سے بچا کر بحفاظت پولیس کے حوالے کیا۔مسلم کونسل برطانیہ نے کہا کہ نمازیوں کو ہدف بنانے والا یہ حملہ ایک دہشت گرد کارروائی ہے۔ وین ڈرائیور نے جان بوجھ کر گاڑی نمازیوں پر چڑھائی۔عینی شاہدین کے مطابق قاتل ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنا کام کر دیا اور پولیس وین میں بھی وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے گیا۔مسجد انتظامیہ نے واقعے پر غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی میڈیا واقعے کو دہشت

گردی کے بجائے حادثہ کہتا رہا۔

19 جون 2017ء کو امریکی ریاست ورجینیا میں مسجد سے نکلنے والی لڑکی کو وحشیانہ تشدد سے ہلاک کرنے کے بعد لاش تالاب میں پھینک دی گئی۔ پولیس کے مطابق 17 سالہ نبرا حسنین اپنی 4 سہیلیوں کے ہمراہ آل ڈلاس (All Dulles) ایریا مسلم سوسائٹی کی مسجد میں عبادت کے لیے آئی تھی۔ سحری سے قبل جب وہ گھر جانے کے لیے باہر نکلیں تو ایک کار سوار نے ان پر فقرے کسے اور گاڑی سے نکل کر نبرا پر لوہے کی راڈ سے حملہ کر دیا۔ نبرا کی سہیلیاں خوفزدہ ہو کر واپس مسجد میں چلی گئیں تاہم کار سوار، نبرا کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔ واقعے کی اطلاع ملنے پر پولیس نے نبرا کی تلاش شروع کی تو ایک گھنٹے بعد اس کی مسخ شدہ لاش اسٹرلنگ کے علاقے میں ایک تالاب سے ملی۔ پولیس نے ناکہ بندی کر کے سفاک قاتل 22 سالہ ڈراون مارمینز ٹوریس (Darwin Martinez Torres) کو گرفتار کر لیا۔ مذہبی تعصب کی بنیاد پر نبرا کے قتل کے بعد مسلم کمیونٹی میں خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔

ڈیلی اینڈیپنڈنٹ لندن (Daily Independent) کے مطابق یکم جولائی 2017ء کو برطانیہ میں پاکستانی نژاد برطانوی ماڈل اور طالب علم ریشم خان اپنے کزن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اپنی 21 ویں سالگرہ منانے کے لیے کہیں جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ونڈو کھلی تھی کہ اچانک ایک سفید فام شخص جان ٹاملن (John Tomlin) قریب آیا اور اس نے تیزاب سے بھری بوتل ان پر پھینکی اور فرار ہو گیا۔ ریشم خان یا اس کے کزن کے ذہن میں اس اچانک حملے کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ برطانیہ میں اس طرح کی دہشتگردی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس تیزاب سے کچھ ہی لمحوں میں اس کا جسم جلنا شروع ہو گیا۔ وہ چلانے لگے اور بہت دیر تک وہ لندن کی سڑک پر مدد کے لیے پکارتے رہے لیکن کسی نے مدد کی اور نہ ہی کسی نے ایمبولینس منگوائی۔ آخر کار ایک راہگیر کار والے نے ان کو ایشیائی سمجھ کر کار روکی اور دونوں کو ہسپتال پہنچایا۔ یہ واقعہ سراسر دہشت گردی ہے مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض جگہوں پر مقامی پولیس مسلمان خواتین پر ہونے والے سفید فام دہشتگردوں اور انتہاء پسندوں کے حملوں کو مانچسٹر میں اور لندن کے واقعات کا ردعمل قرار دے کر اس طرح مستعدی کا مظاہرہ نہیں کر رہی جس طرح کا ردعمل کسی سفید فام شخص

پر حملے کی رپورٹ ملتے دیکھنے میں آتا ہے۔ لندن میں دہشتگردی ہو یا مانچسٹر میں، ان تمام حملوں کے بعد مسلمانوں کے خلاف میڈیا کے غیر معقول رویے کی وجہ سے ہمیشہ نفرت بڑھی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر پارک اور عوامی مقامات پر کچھ علاقوں میں حجاب پہنے مسلمان خواتین پر سفید فام مرد و خواتین کے حملوں کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف امریکی تعصب کی انتہا دیکھیے کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی تقریب حلف برداری میں صرف پادریوں کو بلایا گیا جس سے پوری دنیا کو یہ تاثر دیا گیا کہ امریکہ ایک عیسائی ریاست ہے۔ فروری 2017ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے سات اسلامی ممالک کے شہریوں پر امریکہ میں داخلے پر پابندی کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں کو امریکی ایئر پورٹس پر ہراساں کر کے انہیں تضحیک کا نشانہ بنایا گیا جبکہ ریاست ہیوسٹن (Houston) میں ایک تاریخی مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ مسجدوں کو شہید کرنے کا یہ سلسلہ ڈونلڈ ٹرمپ کی صدارتی انتخابی مہم کے دوران شروع ہوا تھا اور اب تک امریکہ میں قائم کئی مساجد کو نذر آتش کیا جا چکا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف ڈونلڈ ٹرمپ کی تعصب پسندی کا اندازہ سوشل میڈیا پر چلنے والی ایک مشہور ویڈیو سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ڈونلڈ ٹرمپ کی پریس کانفرنس کے دوران سیکورٹی اہلکاروں نے ایک صحافی اور اینکر (Jorge Ramos) کو اس بنا پر تقریب سے دھکے دے کر نکال دیا کہ صحافی نے صدارتی حکم نامے کو اسلام مخالف قرار دیتے ہوئے ڈونلڈ ٹرمپ سے کچھ سوالات پوچھے تھے مگر ٹرمپ نے صحافی کے کسی سوال کا جواب دینا گوارہ نہیں کیا اور سیکورٹی اہلکاروں نے صحافی کو یہ کہہ کر نکال دیا کہ ''ٹرمپ دور حکومت میں مسلمانوں کو امریکہ سے جانا ہوگا''۔ امریکی صدر کے حکم نامے کے بعد امریکی شدت پسندوں کا متعصب چہرہ اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف چھپی نفرت کی چنگاری کھل کر سامنے آ گئی۔

جرمنی کے ایک فرنیچر اسٹور کو اس وقت شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب اسٹور میں بکنے والے چائے کے کپوں پر جرمنی کے سابق متنازعہ چانسلر اڈالف ہٹلر (Adolf Hitler) کی تصویر کی موجودگی کا انکشاف ہوا۔ سٹور کے مالکان نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے فوری طور پر تمام کپ ہٹا لیے اور فروخت شدہ تمام کپوں کی واپسی کے عوض خریداروں کو گفٹ واؤچر دینے کا اعلان کر دیا۔ اسٹور کا موقف تھا کہ یہ کپ چین کی ایک کمپنی

سے بنوائے گئے تھے اور اس کمپنی نے بھی اس غلطی پر معذرت کر لی ہے۔ واضح رہے کہ جرمنی میں ہٹلر کی تصاویر والی کسی بھی چیز کے بیچنے کی ممانعت ہے۔

اکتوبر 2013ء میں برطانیہ میں ایک اسلامی سکول کو حکومت کے نگران ادارے کے معائنے کے بعد فوری طور پر بند کر دیا گیا۔ ڈربی کے علاقے میں واقع المدینہ نامی مفت تعلیم فراہم کرنے والے اس سکول پر اسلامی شعائر کے نفاذ کا الزام تھا۔ ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے سے پہلے وضو کیوں کرواتے ہیں۔ اس سے بچوں کے بیمار ہونے کا خدشہ ہے۔ پوچھا جانا چاہیے کہ جب عیسائی اپنے بچوں کو بپتسمہ دینے کے لیے چرچ میں لے جاتے ہیں اور وہاں انہیں مکمل برہنہ کر کے تیل کی مالش کی جاتی ہے۔ کیا اس عمل سے عیسائی بچوں کے بیمار ہونے کا خدشہ نہیں۔ چونکہ یہ عیسائیوں کا مذہبی شعار ہے، اس لیے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اسلام سے تعصب کی بنا پر اس کے تمام شعائر پر مغرب کو اعتراض ہے۔

دسمبر 2012ء میں لندن کونسل کی انتظامیہ نے لندن اولمپکس پارک کے قریب اسلامک گروپ کو 9 ہزار سے زائد نمازیوں کے لیے جامع مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مسلم کمیونٹی مشرقی لندن میں 1999ء سے جامع مسجد تعمیر کرنے کے منصوبے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر حکومت ہر دفعہ اعتراض لگا کر درخواست کو غیر ضروری التوا میں ڈال دیتی ہے۔ اس واقعہ سے مغرب کی فراخ دلی اور وسعت قلبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نومبر 2013ء میں امریکہ میں بین الاقوامی کوریئر کمپنی نے ڈیوٹی کے دوران باجماعت نماز ادا کرنے پر 24 مسلمان ملازمین کو برطرف کر دیا۔ امریکی خبر رساں ادارے کی رپورٹ کے مطابق امریکی ریاست کنٹیکی کے شہر ہیبرون (Hebron) میں بین الاقوامی کوریئر کمپنی ''ڈی ایچ ایل'' میں کام کے دوران وقفوں میں باجماعت نماز کی اجازت دی جاتی تھی، تاہم بعد میں کوئی بھی وجہ بتائے بغیر اسے ختم کر دیا گیا اور اس کا اطلاق وقفے پر بھی کر دیا گیا۔ تاہم جب ادارے کے مسلمان ملازمین نے وقفے کے دوران باجماعت نماز ادا کی تو ان میں سے 24 ملازمین کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ امریکہ میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی ''تنظیم کونسل آن امریکن اسلامی ریلیشن'' نے اسے امریکی قانون کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے کہا کہ باجماعت نماز کی ادائیگی مسلمانوں کا بنیادی حق ہے جو

امریکی آئین نے انہیں دیا ہے، اس لیے کوریئر کمپنی کی جانب سے ان کی برطرفی غیر قانونی ہے۔ اسی طرح فروری 2016ء میں امریکی مینوفیکچرنگ کمپنی میں 7 ملازمین کو نماز کے لیے وقفہ لینے پر نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ نوکری سے نکالے جانے والے افراد صومالی مسلمان تھے۔ یہ دنیا میں آزادیٔ مذہب اور مذہبی رواداری کے سب سے بڑے علم بردار ملک امریکہ کی کہانی ہے جو مغربی طاقتوں کی منافقت اور دوغلے پن کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر کسی اسلامی ملک میں کسی اور مذہب کے پیروکاروں کو عبادت کرنے کی بنا پر ملازمتوں سے نکالنے کا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا، تو اب تک امریکہ شاید اس ملک کے خلاف پابندیاں لگانے کی قرارداد اقوام متحدہ سے منظور کروا چکا ہوتا اور مغربی میڈیا نے اس پر ماتم برپا کر دیا ہوتا۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا، اس لیے کہ مذہبی تعصب کا نشانہ بننے والے مسلمان ہیں۔ کیا انصاف کے اس معیار کے ہوتے ہوئے دنیا میں پائیدار امن واستحکام کا خواب دیکھا جا سکتا ہے؟

اگست 2012ء میں امریکہ کے شہر ٹیکساس کی ایک فوجی عدالت نے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار امریکی فوج کے ماہر نفسیات میجر نڈال حسن (Major Nidal Hasan) کو داڑھی رکھنے پر ایک ہزار ڈالر جرمانہ کرتے ہوئے آئندہ پیشی سے قبل زبردستی اس کی داڑھی منڈوانے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر وہ آئندہ پیشی پر ایسی حالت میں عدالت آئے تو وہ توہین عدالت کے بھی مرتکب ہوں گے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اسلام دشمنی میں کس حد تک چلا گیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ ملک ہے جو دنیا بھر کے ممالک کو اپنے ہاں مغربی آزادیوں کے سلسلہ میں مزید مراعات دینے اور رکاوٹوں کو ختم کرنے کا حکم جاری کرتا رہتا ہے۔

انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کے علم بردار ملک امریکہ میں داڑھی ختم کرنے سے انکار پر مسلمان پولیس افسر کو معطل کر دیا گیا۔ برطانوی نشریاتی ادارے کے مطابق امریکہ کے شہر نیویارک کی پولیس کے ایک افسر نے مسلمان پولیس افسر مسعود سید کو اپنی داڑھی صاف کرنے کا حکم دیا جسے مسعود سید نے ماننے سے انکار کیا تو انہیں معطل کر دیا گیا۔ مذہبی آزادی، رواداری، انسانی حقوق، اقلیتوں کے حقوق اور کثیر الثقافتی معاشرے کا قیام وہ خوبصورت نعرے ہیں جن کی بنیاد پر امریکہ دنیا کی دیگر تمام اقوام کو بلیک میل کرتا رہتا ہے لیکن خود اس کے اپنے معاشرے میں کتنی رواداری، مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کی پاس داری پائی

جاتی ہے، کسی بھی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔

ستمبر 2013ء میں داڑھی منڈوانے سے انکار پر برطانیہ کے علاقے لنکا شائر ((Lancashire) میں 2 طالب علموں کو سکول سے نکال دیا گیا۔ بچوں کے والدین نے سکول کے اس اقدام کو تعصب پر مبنی ٹھہرایا۔ ایگریکنگٹن میں واقع ماؤنٹ کارمل رومن کیتھولک ہائی سکول کے اس اقدام سے طلبہ کے والدین بے چینی کا شکار ہو گئے۔ نیا تعلیمی سال شروع ہونے پر ان کے کلاس لینے پر پابندی لگائی گئی تھی اور والدین کو بلا کر زور دیا گیا تھا کہ وہ بچوں کو شیو کرائیں، انکار پر دونوں طالب علموں کو سکول سے نکال دیا گیا۔

جرمنی میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت انگیز کارروائیاں انتہا پر پہنچ گئیں۔ جرمن میڈیا کے مطابق صرف 2016ء کے دوران 91 مساجد پر پیٹرول بموں سے حملہ کیا گیا یا توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا گیا جبکہ عیسائی نسل پرستوں کے ہاتھوں ایک ہزار سے زائد مسلمان مرد و خواتین شدید زخمی ہوئے۔ اسی طرح نماز پڑھنے والے سینکڑوں مسلمانوں کو ملازمتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ جرمن پولیس کے مطابق محض 12 مساجد پر حملوں میں ملوث افراد کو گرفتار کیا گیا جو عیسائی انتہا پسند تھے۔ ان میں سے دو کی ضمانت مسترد ہوئی جبکہ 10 ملزمان ضمانت پر آزاد ہیں۔ جرمن میڈیا کے مطابق مقامی سیاست دانوں کی جانب سے دیئے جانے والے نفرت انگیز بیانات سے بھی جرمنی میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا ہوا۔

30 جنوری 2017ء کو کینیڈا کے شہر کیوبک (Quebec) کی ایک مسجد میں فائرنگ کے نتیجے میں 6 نمازی شہید اور 8 شدید زخمی ہو گئے۔ غیر ملکی میڈیا کے مطابق حملہ آور مقامی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ مرکزی ملزم 27 سالہ الیگزینڈر (Alexandre Bissonnette) نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس نے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی مسلم دشمنی پر مبنی تقاریر سے متاثر ہو کر اس قبیح فعل کا ارتکاب کیا۔

برطانیہ جیسا ملک جس کا کوئی تحریری آئین موجود نہیں ہے پھر بھی وہاں قوانین پر سختی سے عملدرآمد کروایا جاتا ہے لیکن اقلیتوں کے لیے یہ صورتحال یکساں نظر نہیں آتی۔ گزشتہ کئی سالوں سے ایسی رپورٹس سامنے آ رہی ہیں جن کے مطابق برطانیہ میں ایشائی اور خاص طور پر مسلم خواتین اور بچوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے صورتحال ہر آنے والے دن زیادہ تشویشناک ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں بھی ایک 12 سالہ معصوم بچی کے

ساتھ نہ صرف زیادتی کی گئی بلکہ اس کی نازیبا تصاویر اتار کر اسے مسلسل بلیک میل بھی کیا جاتا رہا۔ یہ بچی پاکستانی نژاد تھی۔ 2011ء میں پیش ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں 2 ہزار سے زائد بچوں اور نوجوانوں کو جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کے واقعات ریکارڈ کیے گئے۔ متاثر ہونے والے افراد میں مختلف علاقوں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت موجود ہے۔ جنسی طور پر ہراساں کرنے کے زیادہ تر واقعات میں بہت سے گینگ ملوث ہیں جو انٹرنیٹ کے استعمال سے بچیوں کو راغب کرتے ہیں اور ان کا نشانہ بننے والوں میں بھارتی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، افریقی اور افغانی لوگ شامل ہیں۔ برطانوی خیراتی ادارے این ایس پی سی سی نے ایسے جنسی ہراساں کیے جانے والے واقعات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے واقعات کی روک تھام بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اقلیتوں کی حفاظت اور انہیں عزت دینے کے لیے ایک پروگرام شروع کرنے کا عندیہ بھی دیا۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتی سطح پر سخت اقدامات کے ذریعے ایسے جرائم میں ملوث افراد کی سرکوبی کی جاسکے۔ ایشیائی ممالک میں اگر اس نوعیت کے واقعات سامنے آئیں تو یورپی ممالک ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں لیکن اپنے ہاں ہونے والے اس قبیح جرم پر خاموشی انتہائی قابلِ مذمت ہے۔ اقلیتوں کو تحفظ دیئے بغیر کوئی ملک اور معاشرہ مہذب کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

جناب رضی الدین سید اپنے گرانقدر مضمون ''مغرب مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں کیوں؟'' میں لکھتے ہیں:

''نہ جانے کیا بات ہے کہ مغرب مسلمانوں سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خفا رہنے لگا ہے، جب دیکھو تیوریاں چڑھی ہوتی ہیں، آنکھیں غصے سے اُبلی پڑتی ہیں اور لہجے میں وہ گھن گرج کہ خدا کی پناہ! جس طرف نظر دوڑاؤ، مسلمان تباہ و برباد ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کی آبادیوں کی آبادیاں آگ میں بھسم کی جا رہی ہیں، جغرافیائی حدود پامال کی جا رہی ہیں اور راتوں رات اغوا کر کے گوانتانا موبے پہنچا دیا جاتا ہے۔ اہلِ مغرب کے دلوں میں موجود خفیہ جذبے اُمڈ اُمڈ کر زبانوں پر آ رہے ہیں۔ ''آؤ! مسلمانوں کو نیست و نابود کر دو! ''انہیں بھسم کر دو'' ! اور ''تاریخ کا ایک فراموش شدہ سبق بنا دو!'' مسلم دنیا میں مغربی کلیدی شخصیات کا آنا جانا مستقل لگا رہتا ہے۔ ایک دو شخصیات رخصت ہوتی ہیں، تو وہ چار نئی اور آن وارد ہوتی ہیں۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلم قوم کے تنخواہ دار حکمرانوں کے ہاتھوں میں تباہی و بربادی کے

نئے نئے ایجنڈے تھمائے جائیں اور انہیں ان پر عمل در آمد کا پابند کیا جائے۔عراق، افغانستان اور پاکستان ان کے اس سلوک کی زندہ مثالیں ہیں، بلکہ افغانستان تو ویسے ہی ایک بنجر ملک تھا، لیکن اسے، اس سے بھی زیادہ کھنڈر بنا دیا۔ ہزار ہا مسلمان مغرب کے آتش و آہن سے بھسم ہو گئے اور ہزاروں مکانات راکھ کا ڈھیر بن گئے۔عراق میں سیکڑوں بچے جل کر خاک ہو گئے، جب کہ فلسطین میں ان کے ہاتھوں سجایا ہوا دہشت گردی اور فاشزم کا بازار آج تک گرم ہے، لیکن مجال ہے کہ مغرب کے کسی بھی مہذب اور انسانیت کے کسی بھی پیروکار ملک کو کوئی ادنیٰ سا بھی دکھ محسوس ہوا ہو۔اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ آتش و آہن کا یہ کھیل وہ بذات خود عالمی امن کی خاطر ہی برپا کر رہے ہیں، جس قدر زیادہ مسلمان تباہ و برباد ہوں گے، تو ان کے مطابق اسی قدر دنیا میں امن و استحکام قائم ہوگا۔ یہ ہے ان کا ''امن فارمولا''۔

مسلمانوں کو جہنم میں جھونکنے کی اس مہم میں کیا جرمنی، کیا برطانیہ، کیا امریکہ اور کیا فرانس، سب کے سب شریک ہیں۔ٹھیک اس حدیث مبارکہ کے مطابق جس میں کہا گیا ہے کہ ''ایک زمانہ آئے گا، جب کفر کی تمام قوتیں تم پر اکٹھی ہو کر حملہ آور ہوں گی اور تم خوف سے ان کی غذا بنے ہوئے ہو گے''۔سوال کرنے والا سوال کرتا ہے کہ اس سارے معاملے میں مسلمانوں کا آخر قصور کیا ہے؟ انہوں نے کون سا ایسا جرم کر دیا ہے کہ مغرب ان پر اپنے تمام تیر و تلوار گرم کیے ہوئے کھڑا ہے؟

نائن الیون کا واقعہ بھی آج تک شکوک و شبہات کی فضا میں معلق ہے۔آج تک اس کے بارے میں کوئی دو ٹوک رائے نہیں پائی جاتی کہ ایسا نازک آپریشن فی الواقع محض کیا مسلمانوں ہی نے کیا تھا؟ الزام تا حال ثبوت کا محتاج ہے، لیکن ملبہ ہے کہ سارے کا سارا مسلمانوں ہی کے سر پر ڈال دیا گیا ہے۔جگہ جگہ قرآن شریف کی بے حرمتی کی جاتی ہے، مکّے اور مدینے پر بم باری کی نیم سرکاری تجاویز سامنے لائی جاتی ہیں۔ داڑھی و اسکارف کو ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے۔ جب دل چاہتا ہے تو کسی بھی مغربی ائرپورٹ پر کسی بھی مسلمان شخصیت کو اچانک زیر حراست لے کر اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جاتی ہیں؟ کیا قصور ہے، آخر اس بے چاری مسلم دنیا کا؟ وہ تو خود پس ماندگی کی دلدل میں گھری ہوئی ہے؟ اور پھر بات یہ ہے کہ مغرب کو بھی تو آخر اپنی اداؤں پر غور کرنا چاہیے کہ کیوں وہ خوامخواہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ کیوں راستے چلتے ہوئے

مسلمانوں کو محض شک کی بنا پر اغوا کروا دیتا ہے؟ کیوں وہ مسلمانوں سے ان کا جمہوری حق چھین لیتا ہے؟ اور کیوں وہ انہیں ان کے ذاتی مذہب پر عمل درآمد کی کھلی آزادی نہیں دیتا ہے؟''

(ہفت روزہ ایشیا لاہور 8 مئی 2014ء)

اپریل 2006ء میں امریکہ میں مشیگن سٹیٹ یونیورسٹی (Michigan State University) کی 'مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن' کا کہنا تھا کہ جس پروفیسر نے ان کو نفرت بھری ای میل بھیجی، انہیں تنظیم سے معافی مانگنی چاہیے اور یونیورسٹی کو انہیں کھلے عام سرزنش کرنی چاہیے۔ یونیورسٹی میں مکینیکل انجینئرنگ کے پروفیسر ڈاکٹر انڈرک وکمین (Professor Indrek Wichman) نے اپریل 2006ء میں مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کو ایک ای میل میں جارح، ظالم، غیر تہذیب یافتہ اور 'غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے مسلمان' کہا تھا۔ ای میل میں مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے ممبران سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ 'اگر انہیں آزادی اظہار کی مغربی اقدار پسند نہیں تو وہ امریکہ چھوڑ کر اپنے آبائی وطنوں کو لوٹ جائیں اور امریکیوں کو تنگ کرنے کے بجائے خود ان کی تعمیر کریں۔ جب امریکہ میں مسلمانوں کے حقوق کی تنظیم، کیئر، کے حوالے سے یہ خبر پٹسبرگ یونیورسٹی (Whndham Pittsbert University) کے طالب علم وحیت سیمیتوگلو کو پہنچی تو انہوں نے ڈاکٹر وکمین کو احتجاجاً ای میل بھیجی۔ مسٹر سیمیتوگلو کا کہنا تھا کہ ایک پروفیسر کا کام نوجوانوں کی تعلیم ہے اور ایسے شخص کو خصوصاً بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے۔ مسٹر ڈنبو کے مطابق اگرچہ کچھ لوگ ڈاکٹر وکمین کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن افسوس! انہیں امریکی آئین کے تحت مسلمانوں کے خلاف سب کچھ کہنے اور رائے کے اظہار کی آزادی ہے۔

جنوری 2014ء میں بالی وڈ کی معروف اداکارہ پرینکا چوپڑا نے پہلی بار تسلیم کیا کہ انہیں امریکہ میں زبردست نسل پرستانہ نفرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل کے ساتھ ایک انٹرویو میں پرینکا نے کہا کہ 2013ء میں جب انھوں نے امریکہ میں این ایف ایل (نیشنل فٹ بال لیگ) کے ایک میچ سے پہلے اپنے سنگل نغمے ''ان مائی سٹی'' "In My City" پر پرفارم کیا تھا تو اس کے بعد انھیں بہت سارے ٹویٹس اور ای میلز آئے جس میں ان پر کئی قابل اعتراض تبصرے کیے گئے تھے۔ پرینکا نے بتایا: ''مجھے ٹویٹس میں لوگوں نے عرب دہشت گرد بھی کہا۔ مجھے کہا گیا کہ تم امریکن نہیں ہو، این ایف ایل میں

تمہیں پرفارم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے‘‘۔ پرینکا نے کہا کہ ’’اس طرح کے تبصرے دو لحاظ سے قابل اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ ہر عرب شخص کو دہشت گرد کس طرح کہہ سکتے ہو اور دوسری بات یہ کہ میرا رنگ آپ سے مختلف ہے تو کیا آپ مجھے گالی دو گے‘‘؟

2014ء میں ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کرکٹ کپ بنگلہ دیش میں منعقد ہوا۔ پاکستان اور بھارت کے مقابلہ میں بعض تماشائیوں نے پاکستانی کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کی عمدہ پرفارمنس پر پاکستانی پرچم لہرائے جس پر بھارتی حکومت نے بنگلہ دیش سے سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ بنگلہ دیشی حکومت نے سٹیڈیم کے باہر پاکستانی پرچم کی فروخت پر پابندی عائد کر دی جس سے بنگلہ دیشی حکومت کا پاکستان کے خلاف تعصب کھل کر سامنے آ گیا۔ بنگلہ دیش کرکٹ بورڈ کے ڈائریکٹر اسماعیل حیدر کی طرف سے یہ بہانہ تراشا گیا کہ یہ اقدام سکیورٹی کے پیش نظر کیا گیا۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ 2010ء کے ایشیا کپ کا فائنل پاکستان اور بنگلہ دیش ٹیموں کے درمیان اسی میدان میں کھیلا گیا تھا۔ اس وقت بھی سٹیڈیم کے باہر پاکستانی پرچم بڑی تعداد میں فروخت ہوتے رہے تھے اور کوئی سکیورٹی کا مسئلہ نہیں بنا تھا۔ دوسری جانب کچھ عرصہ پہلے ایک اور ایشیا کپ کی میزبانی بنگلہ دیش نے انجام دی جس میں بھی ایسا کوئی ایشو منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ کرکٹ حلقوں کا خیال ہے کہ بھارتی حکومت کا بنگلہ دیش حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ زیادہ ہونے کی بنا پر پاکستان کے خلاف نفرت کا مظاہرہ، میزبان ملک کے حکمرانوں کی جانب سے بھی دیکھنے میں آیا۔ بنگلہ دیشی شائقین کرکٹ پہلے دو میچوں میں پاکستانی ٹیم کو سپورٹ کرتے دکھائی دیئے لیکن پھر گرفتاری کے خوف سے شاید ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

برطانیہ کے وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے RUPERT BROON کے روزنامہ SUN سمیت دیگر مطبوعات پر اس لیے پابندی عائد کر دی کہ اس ادارے نے حکام کی ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو پر مبنی خبریں شائع کر دی تھیں اور ادارے کی انچارج REBECA کو حراست میں لے لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو آزادیٔ اظہار رائے کے زمرے میں نہیں آتی؟ اس کالے دھندے میں ڈیوڈ کیمرون خود ملوث تھا، اس کے ربیکا REBECA سے راز و نیاز کے تعلقات تھے اور دونوں میں خط و کتابت ہوتی تھی، ان کے تعلقات کی قربت و نوعیت کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ربیکا کو لکھے گئے خطوط کے آخر میں کوئی فحش جملہ یا لطیفہ ضرور لکھتا تھا۔ چونکہ مذکورہ ادارے کی

اشاعت میں حکام کے کالے کرتوتوں اور ان کی گھناؤنی نجی زندگی کے واقعات منظر عام پر آتے تھے، اس لیے وہاں آزادیٔ اظہار خیال ممنوع قرار دے دی گئی۔

اپریل 2014ء میں سری لنکا کے حکام نے ایک برطانوی سیاح خاتون کو اپنے بازوؤں پر بودھ مذہب کے بانی گوتم بدھ کا ٹیٹو (Tattoo) بنوانے پر ملک بدر کرنے کا حکم دیا۔ بھارت سے سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کے ہوائی اڈے پر پہنچنے والی نادمی مائیکل کولمین (Naomi Michelle Coleman) کے دائیں بازو پر کنول کے پھول پر بیٹھے بدھا کا ٹیٹو دیکھے جانے پر انہیں فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ حکام کا کہنا تھا کہ ان کے اس عمل سے دوسروں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ برطانوی خاتون کو واپس بھیجے جانے تک اسے تارکین وطن کے حراستی مرکز میں رکھا گیا۔ سری لنکا میں بودھ مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ یہاں بدھا کی تصاویر کے حوالے سے خاص طور پر کافی حساس رویہ اپنایا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ سال مارچ میں بھی سری لنکا میں ایسا ایک اور معاملہ سامنے آیا تھا تب ایک برطانوی سیاح کو کولمبو بین الاقوامی ہوائی اڈے پر داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ برطانوی سیاح کا کہنا تھا کہ وہ صورتحال پر حیران ہے۔ وہ حکام سے مسلسل اصرار کرتی رہیں کہ وہ خود بدھ مت کی ماننے والی ہیں اور بدھ کے احترام ظاہر کرتے ہوئے ہی وہ ٹیٹو بنوایا تھا۔ ان کے بقول ہوائی اڈے پر سب کچھ ٹھیک تھا، تاہم باہر آنے پر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ ان کے بازوں پر بنا بدھا کا ٹیٹو انتہائی سنگین مسئلہ ہے۔ پھر سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار انہیں پولیس سٹیشن لے گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سری لنکن حکام نے ان کا موقف جاننے کی کوشش نہیں کی اور انہیں ملک بدر کرنے کا حکم سنا دیا۔ برطانوی سیاح کا کہنا تھا کہ انہیں سری لنکا کے بعد مالدیپ جانا تھا، اس لیے انہوں نے سری لنکن حکام سے کہا کہ وہ وہاں چلی جاتی ہیں، تاہم حکام نے انہیں بتایا کہ انہیں برطانیہ ہی ڈی پورٹ کیا جائے گا۔ دو سال پہلے، یہاں بدھ کی مورتی کو چومنے کی وجہ سے تین فرانسیسی سیاحوں کو جیل بھیج دیا گیا تھا۔

دسمبر 2014ء میں میانمار میں پولیس نے نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک شراب خانے کے منیجر فلپ بلیک وُوڈ کو گرفتار کیا۔ بار منیجر پر الزام تھا کہ اس نے مہاتما بدھ کی منشیات کے زیر اثر ایک خیالی تصویر انٹرنیٹ پر جاری کی تھی جس میں وہ کسی ڈی جے کی طرز پر ہیڈ فون پہنے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ میانمار میں بدھ مت یا مہاتما بدھ کی توہین

کرنے کی سزا دو برس قید ہے۔

19 اکتوبر 2015ء کو بھارتی شہر بنگلور میں انتہا پسند ہندوؤں نے آسٹریلوی شہری کو ٹانگ کاٹنے کی دھمکی دی اور ذہنی ٹارچر کیا۔ تفصیلات کے مطابق ایک آسٹریلوی شہری میتھیو گورڈن (Matt Gordon) نے الزام لگایا کہ ہندو دیوتا (Yellamma) کا ٹیٹو بنوانے پر انہیں بھارت کے شہر بنگلور میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے شدت پسندوں نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے یہ ٹیٹو نہ مٹایا تو ان کی ٹانگ کاٹ دی جائے گی۔ 21 سالہ میتھیو گورڈن کا کہنا تھا کہ وہ ہفتے کو اپنی خاتون دوست ایملی (Emily Kassianou) کے ساتھ بنگلور کے ایک ریسٹورنٹ کنارک (Konark) میں موجود تھے کہ ایک شخص نے آکر ان کی پنڈلی پر بنے ہوئے Yellamma کے ٹیٹو پر اعتراض کیا۔ اس کے فوری بعد ہی وہاں ایک ہجوم جمع ہوگیا اور آسٹریلوی شخص پر ٹیٹو بنوا کر ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنے کا الزام لگایا۔ خطرے کو بھانپ کر گورڈن نے اپنے ایک مقامی دوست ابھیشیک کو بلالیا، جس نے مشتعل ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، جس کے بعد گورڈن کو اشوک نگر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ گورڈن کا کہنا تھا کہ حیرت انگیز طور پر پولیس نے بھی اسے ہی ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ یہ بھارت ہے اور تم ہندوؤں کے جذبات مجروح کر رہے ہو۔ پولیس اسٹیشن میں اسے بتایا گیا کہ ہندو دیوتاؤں کے ٹیٹو پنڈلیوں یا ٹانگوں پر بنوانا قابل اعتراض ہے اور توہین کے زمرے میں آتا ہے۔ اسے تین گھنٹے تک پولیس اسٹیشن میں رکھا گیا اور مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچانے پر معافی نامہ لکھیں اور حلفیہ بیان جمع کرائیں کہ جب تک وہ بھارت میں رہیں گے، اس ٹیٹو کو چھپا کر رکھیں گے۔

2014ء میں امریکی گلوکارہ کیٹی پیری (Katy Perry) کے گانے 'ڈارک ہورس' (Dark Horse) کی ویڈیو ریلیز ہونے پر ان پر توہینِ مذہب کا الزام عائد کیا گیا۔ کیٹی پیری کا یہ گانا جنوری کے آخری ہفتے میں ریلیز ہوا تھا جبکہ اس کی ویڈیو 20 فروری کو ریلیز کی گئی۔ ڈارک ہورس گانے کی ویڈیو میں کیٹی پیری مصری ملکہ کے روپ میں ہیں جو اپنا ہاتھ مانگنے والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ گلوکارہ کیٹی پیری کے خلاف یہ الزام برطانیہ کے شہر بریڈفورڈ کے رہائشی شہزاد اقبال نے لگایا۔ انہوں نے کیٹی کے خلاف آن لائن پٹیشن کا بھی آغاز کیا۔ شہزاد اقبال کا اس پٹیشن میں کہنا تھا کہ 'ویڈیو کے سوا ایک منٹ گزرنے کے بعد ایک مرد کو گلے میں ایک ہار پہنے دکھایا گیا ہے جس پر اللہ لکھا ہے۔ اس مرد کو وہ ہار پہنے ہوئے

جلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں صاف توہینِ مذہب کا ارتکاب ہوا ہے کیونکہ اس میں کیٹی نے اس شخص کو جلایا ہے جس نے اللہ کے نام کا ہار پہن رکھا ہے۔ اس آن لائن پٹیشن کی حمایت برطانیہ ہی سے نہیں بلکہ دیگر ممالک سے بھی کی گئی جن میں آسٹریلیا، ملائشیا، انڈونیشیا، مراکش، لبنان اور امریکہ شامل ہیں۔ ڈارک ہورس ویڈیو 20 فروری 2014ء کو ریلیز ہوئی اور ابھی تک اس کو 34 ملین افراد دیکھ چکے ہیں۔ یاد رہے کہ اس متنازعہ گانے کی وجہ سے امریکی گلوکارہ کیٹی پیری نے پیپلز چوائس ایوارڈز میں سب سے زیادہ پانچ ایوارڈز حاصل کیے۔ ان میں پسندیدہ خاتون کا ایوارڈ بھی شامل ہے۔

مارچ 2014ء میں ہالی وڈ نے حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی پر ایک فلم ''نوح'' (Nooh) ریلیز کی جس میں قابل اعتراض مناظر کے علاوہ اسلامی تاریخ کو بھی مسخ کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ فلم مسلمانوں کے عقیدے کے منافی اور اسلامی شریعت کے بنیادی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔ اس سے لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

18 مئی 2017ء کو اسرائیلی حکومت کی سرکردہ وزیر میری ریگیو (Miri Regev) نے قبلہ اول مسجد اقصیٰ کی تصویر والا لباس زیب تن کر کے ایک نئے تنازعے کو جنم دیا جس کے نتیجے میں فلسطینی عوام اور سیاسی حلقوں میں سخت غم وغصہ پایا گیا۔ دی گارڈین کے مطابق اسرائیلی حکومت میں شامل وزیر برائے کھیل وثقافت میری ریگیو نے ایک بین الاقوامی ثقافتی تقریب میں متنازع گاؤن پہن کر شرکت کی جس میں ارواح اسماعیل نامی ایک فلم کی بھی نمائش کی گئی۔ اسرائیلی وزیر سے جب پوچھا گیا کہ انہوں نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی تصویر والا لباس کیوں پہن رکھا ہے تو ان کا کہنا تھا وہ بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کی 50 ویں سالگرہ منا رہی ہیں، اس کی مناسبت سے ایسا لباس تیار کرایا ہے۔

1951ء میں اٹلی کے روبرٹو روسیلنی کی فلم "The Miracle" میں فلم کے ایک کردار کو ''حضرت مریمؑ'' بنا کر پیش کیا گیا۔ اس فلم کے ریلیز ہونے پر دنیا بھر میں عیسائیوں کے مظاہرے شروع ہوگئے۔ اس دوران جو کتبے اور سائن بورڈ اٹھا رکھے تھے، اس پر لکھا تھا: ''فلم ہر معزز عورت کی بے عزتی ہے''! ''دہریئے مت بنو''! ''شیطانی کام''! وغیرہ وغیرہ۔ کیتھولک چرچ کے دباؤ میں آ کر فلم بورڈ نے اسے مذہبی منافرت پھیلانے کے جرم میں بند کرنے کا حکم جاری کر دیا، اس کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا اور فلم کی مزید نمائش روک دی گئی۔

بی بی سی کے پروگرام "The Opera" میں ایک ایکٹر نے خود کو مسیح ؑ بنا کر پیش کیا اور اس دوران اس نے قابل اعتراض لباس پہن رکھا تھا۔ برطانیہ میں عیسائیوں نے بڑے مظاہرے کیے۔ ایک اخبار "Christian Voice" نے بی بی سی کے عہدیداروں کے گھر کے پتے اور فون نمبر شائع کیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ ایک مسیحی تنظیم "Christian Institute" نے بی بی سی پر بلاسفیمی چارج لگا کر مقدمہ دائر کیا، لیکن ہائی کورٹ نے اس کو خارج کر دیا۔

2004ء میں حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک کارٹون فلم میں قابل اعتراض کردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس پر کمپنی کو 250,000 درخواستیں موصول ہوئیں، آخر کار کمپنی کو کردار بدلنا پڑا۔

2008ء میں سویڈن میں ایک اخباری اشتہار نے اس وقت مظاہرے شروع کروا دیے، جب اس اشتہار میں حضرت مسیحؑ کو شیطان سے جنگ کرتے اور ہارتے دکھایا گیا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر ان چیف کو عیسائی تنظیموں کی طرف سے جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی وصول ہوئیں۔

اسلامی شعائر کی بے حرمتی اور توہین اسلام کے حوالے سے مذموم شہرت یافتہ یورپی ملک ڈنمارک میں کھلونے تیار کرنے والی ایک کمپنی نے ایک نئے شیطانی عمل کے ذریعے مسلمانان عالم کی دل آزاری کی۔ گیمز تیار کرنے والی کمپنی ''کاپ کام'' (Cap-com) نے مارچ 2005ء میں ''ریزیڈنٹ ایول'' (Resident Evil) نامی ایک نئی ویڈیو گیم تیار کی ہے جس میں اسلامی مقدسات بالخصوص قرآن کریم، بیت اللہ اور روضہ رسول ﷺ کی سخت توہین کی گئی ہے۔ گستاخ اسلام کمپنی کی تیار کی گئی نئی شوٹنگ گیم میں جو منظر ترتیب دیا گیا ہے، اسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ گیم ذہنی تفریح سے زیادہ کسی مسلمان کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کی غرض سے بنائی گئی ہے۔ گیم فائرنگ کا نشانہ بنانے اور مسمار کرنے کے لیے ڈیزائن کی گئی عمارتوں میں خانہ کعبہ اور مسجد نبوی شامل ہیں جنہیں گیم کے ہیرو نے (نعوذ باللہ) ڈھانا ہوتا ہے۔ ان مقدس عمارتوں کی جانب بڑھنے سے قبل گیم ہیرو کے لیے قرآن کریم کو زمین پر پھینک کر اسے فائر کا نشانہ بنانا ہوتا ہے، (نعوذ باللہ)۔ ایسا کیے بغیر پلیئر کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ جب وہ قرآن کریم کو (نعوذ باللہ) زمین پر پھینک کر

آگے بڑھتا ہے تو اس کے سامنے مسجد نبوی کی طرز پر ڈیزائن کیا گیا ایک خوبصورت دروازہ موجود ہوتا ہے، تاہم اس کے اوپر پیغمبر اسلام ﷺ کے نام مبارک کی جگہ پر شیطان ملعون کی تصویر دی گئی ہے۔ گیم کا ہیرو اس دروازے کو پیر سے کھولنے کی گستاخی کر کے اندر گھستا ہے جس کے مطابق اسے اندر موجود شیاطین کو قتل کرنا ہوتا ہے۔ اس تمام مرحلے میں نام لیئے بغیر محض دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پھینکی جانے والی کتاب کوئی اور نہیں بلکہ قرآن کریم ہے، جبکہ مذکورہ عمارت مسجد نبوی ﷺ ہے۔ اس کے ساتھ گیم کی گرافکس فیس پر دی گئی تصویر میں خانہ کعبہ کی عمارت کو بھی بدطینت ڈیزائنرز نے گیم کے فائٹر ہیرو کے نشانہ بننے والے اہداف میں شامل کرلیا ہے۔ نشانہ بننے والی ان عمارتوں کو ''ریزیڈنٹ ایول'' یعنی شیطانی پناہ گاہ کا نام دے دیا گیا ہے جس کا مطلب سمجھنا مذہب سے ادنیٰ معلومات رکھنے والے کسی مسلمان کے لیے مشکل کام نہیں۔

شیطانی کمپنی نے توہین آمیز گیم تک نیٹ صارفین کی رسائی ممکن بنانے کے لیے اسے مفت ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی دی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اس دجالی گیم کو ڈاؤن لوڈ کر کے اسلامی شعائر کی بے حرمتی کے مرتکب ہوں۔ گیم تیار کرنے والی "Capcom" کاپ کام کمپنی دراصل جاپانی ہے۔ اس کے تمام تر انتظامات چلانے والے آرگنائزر سب ڈنمارک کے ہیں۔ کمپنی کے تمام گیمز مذکورہ ملعون ٹیم کی اپنی مرضی و منشا کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔ نیٹ پر موجود کاپ کام کمپنی کی دیگر گیمز کے بارے میں سرچ کریں تو پتا چلتا ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ کمپنی کی تیار کردہ درجنوں دیگر ایسی گیمز موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طور سے اسلامی شعائر کی توہین اور بے حرمتی کی گئی ہے جس کا مقصد مسلمان بچوں کو ذہنی تفریح فراہم کرنے کے بجائے ان کے دل و دماغ میں دین اسلام سے نفرت اور تعصب بھرنا ہے، تاکہ مسلمان بچے کم عمری سے ہی قرآن کریم اور عالم اسلام کے مقدس ترین مقامات کے بارے میں منفی سوچ کا شکار ہوجائیں۔ کمپنی نے مذکورہ ویڈیو گیم کی تین کروڑ ویڈیوز اور سی ڈیز تیار کی ہیں، جن میں سے نصف سے زیادہ کو عرب ممالک میں بھیجا گیا۔ چونکہ عرب ممالک کے بچوں میں شوٹنگ گیمز بہت مقبول ہیں، اس لیے عرب باشندے اپنے بچوں کا شوق پورا کرنے کے لیے انہیں مہنگے ترین گیمز مہیا کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ ان کی اس دریادلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان صفت کمپنیاں ایک جانب مسلمانوں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتی

ہیں، جبکہ دوسری جانب ان کے بچوں کو باغی اور بے دین بنانے کے لیے سرگرم ہیں۔ اس انکشاف کے بعد سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر عرب اور مسلمان صارفین کی جانب سے احتجاج شروع ہوا۔ انہوں نے اپنی حکومتوں سے اس توہین آمیز حرکت کی تحقیقات کروانے کا مطالبہ کرتے ہوئے ماضی کی طرح ڈنمارک کی مصنوعات کے بائیکاٹ کا مطالبہ کیا۔

عیسائیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف توہین آمیز واقعات پر احتجاج کرنے والے مسلمانوں کو برداشت کا سبق دینے والے پوپ بینی ڈکٹ خود عدم برداشت کے کتنے اونچے درجے پر فائز ہیں، اس کا اندازہ روزنامہ گارجین لندن کا 15 ستمبر 2010ء کا اخبار پڑھ کر کیا جا سکتا ہے جس میں پوپ بینی ڈکٹ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے یورپ اور برطانیہ میں لانچ کی جانے والی آئس کریم کمپنی انتونیو فریڈریسی (Antonio Federici) کی اشتہاری مہم پر غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا اور اس اشتہاری مہم کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اعلیٰ برطانوی حکام کو اس اشتہاری مہم کو روک دینے کا حکم دیا جس کے چند گھنٹے بعد لندن کے حکام نے اپنا فرض عین سمجھتے ہوئے اس اشتہاری مہم کو روک کر اس پر ہمیشہ کے لیے پابندی عائد کر دی۔ اطالوی آئس کریم کمپنی کے اشتہار کے حوالے سے ایڈورٹائزمنٹ واچ ڈاگ کا کہنا تھا کہ وہ اشتہار عیسائیوں کے لیے ناقابل برداشت تھا، اس لیے اس کو ہٹا دیا گیا۔ آئس کریم کمپنی انتونیو فریڈریسی کے اشتہار میں ایک عیسائی راہبہ کو حاملہ دکھایا گیا ہے جس پر پوپ بینی ڈکٹ نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ واضح رہے کہ آئس کریم کمپنی کے لیے اشتہار تیار کرنے والی اشتہاری کمپنی کا کہنا تھا کہ اس نے اشتہار میں وہی معاملات دکھائے جو اس وقت بھی یورپ اور کلیسا میں ایک کڑوی حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔ یورپ سے لے کر امریکہ اور آسٹریلیا سے لے کر افریقہ تک پھیلے کلیساؤں میں بدکردار پادریوں کے کارنامے خود یورپی اور امریکی میڈیا منظر عام پر لا چکا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ میں ایک پادری نے برطانوی شہزادے کی منگنی ٹوٹنے کی پیش گوئی کی تو اس پادری کو چرچ سے فارغ کر دیا گیا۔ پوپ بینی ڈکٹ نے اس بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی حالانکہ اسے اس معاملہ میں زیادہ بڑھ چڑھ کر بولنا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کوئی نہیں سوچتا اور نہ یہ پوچھتا ہے کہ جناب یہ دوہرا معیار کیوں؟

2005ء میں بھارت میں بولی وڈ نے ایک فلم سنز Sins ریلیز کی۔ اس فلم کی

مختصراً کہانی یہ ہے کہ ایک عیسائی پادری ایک نوجوان حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں سب کچھ کر گزرتے ہیں جو محبت میں ہوتا ہے۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو عیسائیوں نے اس پر شدید احتجاج کیا اور اسے چرچ پر حملہ قرار دیا۔ عیسائی تنظیم کے سیکریٹری جوزف ڈاکس نے ایک وفد کے ساتھ ریاست کے وزیر اعلیٰ ولاس راؤ دیس لکھ اور فلم سنز بورڈ کو ایک احتجاجی عرضداشت پیش کی۔ فلم کے پروڈیوسر ونود پانڈے Vinod Pande نے بی بی سی کو بتایا کہ انہوں نے یہ فلم اخبار میں شائع ایک سٹوری سے متاثر ہو کر بنائی ہے۔ فلم حقیقی واقعات پر مبنی ہے اور اس کے مناظر کہانی کے مطابق فلمائے گئے ہیں۔ اصل واقعہ جس سے متاثر ہو کر پروڈیوسر نے فلم بنائی، وہ یہ ہے کہ ایک عیسائی پادری نے ایک حسین و جمیل لڑکی سے دھوکہ دہی سے پہلے اپنا منہ کالا کیا اور بعد ازاں اسے قتل کر دیا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوں تو ان کے پرتشدد مظاہرے بھی جائز۔ لیکن جب مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوں تو انہیں آزادی اظہار کے نام پر برداشت اور رواداری کا درس دیا جاتا ہے۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟

''اہل یورپ و امریکہ کی فکری بددیانتی'' کے عنوان سے جناب گل شیر بٹ لکھتے ہیں: ''آسٹریا کی انزبرک ریجنل کورٹ نے بی بی مریم علیہ السلام کے حوالے سے بننے والی فلم Satirical Tragedy بین کر دی جبکہ فلم کے پروڈیوسر نے یورپین کنونشن کے آرٹیکل 10 کے تحت دی گئی آزادی اظہار کے تحت یورپین کورٹ فار ہیومن رائٹس سے رجوع کیا کہ فلم سے پابندی اٹھائی جائے۔ یورپین کورٹ نے فلم مذکورہ پر ''دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت'' اور برداشت کی روح کے منافی ہے، کی بنیاد پر ریجنل کورٹ کی پابندی کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اسی طرح برطانیہ میں بننے والی فلم Visions of Ecstasy میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بائبل کے متعلق ہتک آمیز مواد شامل کیا گیا۔ یورپین کورٹ نے اس فلم کی ڈسٹری بیوشن پر پابندی کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ فلم عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے منافی ہے۔ دونوں صورتوں میں آزادی اظہار کے حق کو دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کی بنیاد پر تسلیم نہ کر کے کروڑوں عیسائیوں کو دل آزاری سے بچا کر ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔

دوسری طرف ڈنمارک میں توہین آمیز خاکے شائع کیے جاتے ہیں۔ فیس بک پر توہین آمیز خاکوں کا مقابلہ کروا کر کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان اور اہتمام کیا

جاتا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ اہل یورپ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں مصروف ہیں اور ہم غلامانہ سوچ اور چند مفادات کی خاطر سچ کے اظہار کی قوت سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔ ہم نے اسلام کے خلاف بات کرنے کو پڑھا لکھا ہونے کی دلیل بنالیا ہے۔ کوئی سوال کرنے والا ہی نہیں رہا کہ ہولوکاسٹ اگر جرم ہے تو نبی کریم ﷺ کی توہین جرم کیوں نہیں؟ دراصل وہ بھول جاتے ہیں کہ برابری اور مساوات کے پرچارک اہل یورپ اور امریکہ نے آزادی اظہار رائے اور اس کی تشریح کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سنڈی لی گارشیا کی طرف سے حالیہ متنازعہ فلم دکھانے کے لیے یوٹیوب پر پابندی کی بابت گزاری گئی درخواست لاس اینجلس کی سپریئر کورٹ جج لوئس لیون کی طرف سے مسترد نہ ہوتی............''

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 12 اکتوبر 2012ء)

شراب نوشی دین اسلام اور عیسائی مذہب دونوں میں سختی سے حرام ہے۔ ہمارے علما کرام مسلمانوں کو شراب نوشی سے روکتے اور اس کی خرید وفروخت کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عیسائی ''پوپ'' سمیت تمام پادریوں کا یہ حال ہے کہ قانونِ آزادیٔ اظہار ہونے کے باوجود اُن کی جرأت نہیں کہ وہ شراب کی خرید وفروخت کے خلاف کوئی بات کرسکیں کیونکہ اِس صنعت سے کروڑوں لوگ وابستہ ہیں اور روزانہ لاکھوں ڈالر کا بزنس ہوتا ہے۔ مختلف شراب کمپنیوں کے مالکان چرچ کو وسیع چندہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے پادری حضرات شراب کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتے، بلکہ حد یہ ہے کہ امریکہ میں مشہور شراب کا نام "Bloody Merry" حضرت مریم علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں کنٹر بری میں برطانیہ کا قدیم ترین گرجا گھر فروخت کیا گیا۔ سب سے زیادہ بولی شراب کے تاجر نے دی۔ آج یہ چرچ شراب خانے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسے معاشرے سے مقدس ترین ہستیوں کی عزت وتوقیر کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ جس روز پوپ نے بائبل کی روشنی میں شراب نوشی اور اس کی خرید وفروخت کو ممنوع قرار دیا، اُسی روز اُس کی اِس پرکشش عہدہ سے چھٹی ہو جائے گی۔ اِسلام دشمن مستشرق سر ولیم میور اعتراف کرتا ہے: ''اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترکِ میکشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے، کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے''۔ (لائف آف محمد: 521) انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگرس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحاق ٹیلر نے کہا تھا: ''دنیا میں انسداد میکشی کی سب

سے بڑی انجمن خود اسلام ہے، برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہنچتے جاتے ہیں، مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے‘‘۔

یہ نومبر 2004ء کی بات ہے کہ جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ نے فیصلہ کیا کہ ہاشم آملا کو قومی ٹیم میں شامل کیا جائے۔ یوں ہاشم آملا جنوبی افریقن کرکٹ ٹیم کا حصہ بننے والے پہلے ہندوستانی نژاد مسلمان کھلاڑی بن گئے۔ ہاشم کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کیونکہ جنوبی افریقا میں ہزارہا نوجوان کرکٹ کھلاڑی سوتے جاگتے یہی خواب دیکھتے اور تمنا رکھتے ہیں کہ کسی بھی طرح قومی ٹیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن قومی ٹیم میں شامل ہوتے ہی نوجوان ہاشم کو ایک مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ شراب بنانے والی ایک کمپنی، کیسل (Castle) جنوبی افریقن ٹیم کی سپانسر تھی۔ لہٰذا ٹیم میں شامل تمام کھلاڑیوں پر لازم تھا کہ وہ اپنی ٹی شرٹس اور قمیضوں پر کمپنی کا لوگو یا نشان چسپاں کریں۔ ہاشم اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے نوجوان ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لباس پر کیسل کا نشان چسپاں کرانے سے انکار کر دیا۔ جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ نے شروع میں انھیں ترغیب دی کہ پہلے ٹیسٹ میں نشان لگوا لو، پھر اس بابت کوئی فیصلہ کریں گے مگر ہاشم نے انکار کر دیا۔ وہ پہلے ٹیسٹ سے قبل فیصلہ چاہتے تھے۔ اس وقت ہاشم کی عمر محض 21 سال تھی۔ انھوں نے بین الاقوامی کرکٹ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ وہ محض بلے بازی کی خداداد صلاحیتیں رکھنے پر منتخب ہوئے تھے۔ دوسری طرف ان کا مقابلہ 102 سالہ بوڑھے جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ سے تھا۔ ہاشم خوب جانتے تھے کہ اصرار پر انھیں قومی کرکٹ ٹیم سے نکالا بھی جا سکتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے لباس پر نشان ثبت کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر نوجوان مسلم کرکٹر کی دینی حمیت و استقامت کے سامنے جنوبی افریقن بورڈ ہی کو جھکنا پڑا۔ اس نے ہاشم کو مطلع کیا کہ نشان چسپاں نہ کرانے پر از روئے قانون انھیں 500 ڈالر فی میچ جرمانہ دینا ہو گا۔ ہاشم نے بھاری بھر کم جرمانہ دینا قبول کر لیا، لیکن اپنے ایمان کو متزلزل کرنے والا کوئی سمجھوتا قبول نہیں کیا۔ 7 اگست 2006ء کو سری لنکا اور جنوبی افریقا کے مابین ٹیسٹ جاری تھا۔ مشہور ٹی وی چینل، ٹین سپورٹس سے سابق آسٹریلوی کھلاڑی ڈین جونز (Dean Mervyn Jones) میچ پر رواں تبصرہ کر رہا تھا۔ اچانک ہاشم نے ایک سری لنکن کھلاڑی کا کیچ پکڑ کر اسے آؤٹ کر دیا۔ ڈین جونز یہ دیکھ کر بولا ’’ٹیررسٹ (دہشت گرد) نے کیچ پکڑ لیا۔ یہ جملہ

ٹی وی پر جنوبی افریقا سمیت پوری دنیا میں سنا گیا۔ مگر افسوس ہے انسانی حقوق اور آزادی اظہار رائے کے علمبرداروں پر کہ کسی ''مہذب'' نے اس واقعہ کی مذمت نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب اسلام دشمنی میں اندھا ہو چکا ہے۔

دسمبر 2010ء میں معروف ویب سائٹ وکی لیکس کے بانی اور آسٹریلوی صحافی جولین اسانج Julian Assange کی گرفتاری نے مغرب کے دعویٰ آزادی صحافت کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ ان کی ویب سائٹ نے امریکہ کی خفیہ دستاویزات کے اجرا کے ذریعے عالمی شہرت حاصل کی اور دنیا بھر کے سفارتی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ اسانج کے انکشافات دنیا بھر میں متعین امریکی سفیروں کے مراسلات، خفیہ بات چیت اور سرگرمیوں کی رپورٹوں پر مشتمل تھے۔ ان انکشافات سے امریکہ کی سفارتی منافقت، مختلف ملکوں کے خلاف سازشوں، اندرونی معاملات میں مداخلت اور انہیں اپنے زیر اثر لانے کے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا راز فاش ہوگیا۔ اس پر امریکی حکومت آپے سے باہر ہوگئی۔ اس نے سویڈش اور برطانوی حکومت پر زور دیا کہ اس پر مقدمات قائم کر کے اسے گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ سویڈش حکومت نے امریکی دباؤ کے تحت جنسی جرائم کے الزام میں ایک پرانے مقدمہ میں جولین اسانج کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ اسانج کی سرگرمیاں چونکہ برطانیہ میں جاری تھیں، اس لیے اس کی گرفتاری برطانوی پولیس کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ ہے امریکہ اور یورپ کے ممالک کی آزادی اظہار کی اصل حقیقت! جب اظہار رائے کے ذریعے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو آزادی کے بارے میں ان کے قوانین تبدیل ہو جاتے ہیں اور جب مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ آزادی رائے پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔

یہاں بطور خاص یاد رہے وکی لیکس نے یہ بھی خوفناک انکشاف کیا تھا کہ امریکی سفارت کار، انٹیلی جنس معلومات کے لیے عیسائی چرچوں کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے وسیع نیٹ ورک سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی پادریوں کو پوری دنیا میں تبلیغ کی آڑ میں جاسوسی کرنے، ارتداد پھیلانے کی مکمل آزادی اور امریکی سرپرستی حاصل ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اگر عیسائی مشنریز کو ان کی خلاف قانون سرگرمیوں سے روکا جائے تو وہ پوری دنیا میں چیخ چیخ کر پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ان کی آزادی مذہب پر پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ چنانچہ پورا مغربی میڈیا ان کی حمایت میں نکل آتا ہے۔

جون 2013ء میں امریکی خفیہ انٹیلی جنس مواصلاتی ایجنسی (ادارہ برائے قومی سلامتی National Security Agency) (جو امریکی خفیہ ایجنسی CIA کے اشتراک سے کام کرتی ہے) کے ایک ملازم ایڈورڈ اسنوڈین (Edward Asnoden) نے گھر کے بھیدی کی حیثیت سے لنکا ڈھاتے ہوئے ایسے خفیہ رازوں سے پردہ اٹھایا جس سے امریکہ کو بے حد پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ NSA کا شمار امریکہ کی انتہائی خطرناک قومی ایجنسیوں میں ہوتا ہے۔ اس میں 12 لاکھ سے زائد لوگ کام کرتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس میں قادیانیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ ایڈورڈ NSA کے جس شعبہ میں کام کرتا تھا، وہاں کئی ممالک کی نہ صرف مواصلاتی جاسوسی کی جاتی تھی بلکہ خفیہ طریقوں سے انٹرنیٹ اور فون کالز کے ذریعے ان ممالک کی حساس معلومات کا ڈیٹا بھی اکٹھا کیا جاتا تھا۔ مارچ 2013ء میں صرف ایران سے 14 ارب اور پاکستان سے 13 ارب خفیہ معلومات اکٹھی کی گئیں۔ یہی حال دیگر ممالک کا ہے۔ جنگ مخالف ''اینٹی وار'' جریدے کے مدیر ''جیس ڈیز'' نے لکھا ہے کہ شکر ہے کہ یہ راز بھی فاش ہوگیا کہ امریکی جاسوسی نظام کا راز فاش کرنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ ایک امریکی باشندہ ہے، جس نے امریکی انٹیلی جنس کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے۔ امریکی انٹیلی جنس ایجنسیاں سیٹلائٹ سسٹم کی مدد سے بالعموم مغربی اور بالخصوص اسلامی ممالک کی ٹیلی فونک اور انٹرنیٹ جاسوسی میں مشغول ہیں۔ ایڈورڈ کے اس انکشاف کے بعد اسے اپنی زندگی کو خطرہ لاحق محسوس ہوا کیونکہ سی آئی اے اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ بھیس بدل کر ہانگ کانگ چلا گیا۔ امریکی حکومت کی سرتوڑ کوشش ہے کہ ایڈورڈ اس کے حوالے کیا جائے تاکہ اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

وکی لیکس کے مطابق ایڈورڈ کا کہنا تھا کہ اوباما نے اپنے نائب صدر کو ہدایت کی کہ ان ممالک کے سربراہان پر دباؤ ڈالیں جہاں اس نے پناہ کی درخواست دے رکھی ہے۔ یاد رہے کہ ایکواڈور کے صدر رافائل کوئریا کے مطابق امریکی نائب صدر نے ان سے ایڈورڈ سنوڈن کی پناہ کی درخواست مسترد کرنے کے لیے کہا۔ ایڈورڈ سنوڈن کا کہنا تھا کہ ایک عالمی رہنما کی جانب سے اس طرح کا دھوکہ یا ماورائے قانون جلاوطنی انصاف نہیں ہے۔ یہ سیاسی تشدد کے پرانے اور برے ہتھکنڈے ہیں۔ ان کا مقصد مجھے خوفزدہ کرنا نہیں بلکہ میرے بعد آنے والے لوگوں کو ڈرانا ہے۔ بیان میں سنوڈن نے خود کو ایک ''بے ریاست'' شخص قرار دیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق برطانوی حکومت نے ہوائی کمپنیوں کو خبردار کیا کہ امریکی حکومت کے نگرانی سے متعلق خفیہ راز افشا کرنے والے سی آئی اے کے اس سابق ملازم کو برطانیہ نہ آنے دیا جائے۔ امریکی خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس نے کہا کہ اس نے تھائی لینڈ کے ایک ہوائی اڈے پر ایک دستاویز دیکھی جس میں کہا گیا ہے کہ 29 سالہ ایڈورڈ سنوڈن کو برطانیہ نہ آنے دیا جائے۔ برطانیہ کے ہوم آفس کے لیٹر پیڈ پر لکھے گئے اس خط کے مطابق اس بات کا قوی امکان ہے کہ سنوڈن کو برطانیہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ خط میں سنوڈن کی تصویر تھی اور اس کی تاریخ پیدائش اور پاسپورٹ کا نمبر بھی دیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ: ''اگر یہ شخص برطانیہ سفر کرنے کی کوشش کرے تو ہوائی کمپنیاں اسے جہاز پر سوار نہ ہونے دیں''۔ خط میں ہوائی کمپنیوں کو خبردار کیا گیا کہ اگر سنوڈن کو برطانیہ کا سفر کرنے دیا گیا تو ان کی گرفتاری اور بے دخلی کا خرچ ہوائی کمپنیوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ بنکاک ائیرویز، سنگاپور ایئرلائنز اور ملیشیا ایئر لائنز نے تصدیق کی کہ انہیں بھی یہ نوٹس ملا ہے۔ سنوڈن نے گارڈین اخبار کو بتایا تھا کہ امریکی خفیہ ادارہ این ایس اے امریکی انٹرنیٹ اور ٹیلی فون کمپنیوں سے لوگوں کا ڈیٹا حاصل کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کو کس نے اجازت دی ہے کہ وہ لوگوں کی بنیادی آزادی کو سلب کرے۔ ان کی ذاتیات میں مخل ہو یا ان کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کرے۔

پروفیسر انوار الحق لدھیانوی اپنے بیش قیمت مضمون ''معلومات کا لٹیرا'' میں لکھتے ہیں:

''گارڈین برطانیہ کا ایک معروف جریدہ ہے۔ اس جریدے نے 8 جون 2013ء کو انکشاف کیا کہ امریکہ نے دنیا کی 97 ارب خفیہ معلومات چرالیں۔ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے فیس بک، یوٹیوب، اسکائپ، ایپل، پال ٹاک، گوگل، مائیکروسافٹ، یاہو، ای میلز، فون کالز، کریڈٹ کارڈز، ایس ایم ایس اور اسی قسم کے تمام کوائف کے ذریعے دنیا بھر سے انتہائی حساس ڈیٹا چرا لیا۔ امریکہ دنیا کے ہر شخص کی جاسوسی کرتا ہے۔ اس انکشاف کے بعد پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اگلے روز ''دی گارڈین (The Guardian)'' نے معلومات افشا کرنے والے کا نام اور انٹرویو بھی شامل کر دیا۔ یہ رازدان سی آئی اے کا سابق ٹیکنیکل کنسلٹنٹ ایڈورڈ اسنوڈین تھا۔ ایڈورڈ اسنوڈین (Edward Snowden) جنوبی کیرولینا کے شہر الزبتھ میں پیدا ہوا اور اس نے میری لینڈ کے کمیونٹی کالج سے کمپیوٹر کی تعلیم

حاصل کی۔ اسنوڈین نے 2003ء میں امریکی فوج میں شمولیت اختیار کی اور اسپیشل فورسز کے ساتھ تربیت شروع کر دی۔ اس تربیت کے دوران اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور یوں اسے فوج سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ اس کے بعد میری لینڈ میں امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی ''این ایس اے'' ((National Security Agency (NSA)) کے ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ فورٹ میڈ منتقل ہو گیا۔ اس نے پہلی نوکری نیشنل سکیورٹی ایجنسی کی میری لینڈ یونیورسٹی میں واقع خفیہ مرکز میں بطور گارڈ شروع کی اور اس کے بعد خفیہ ایجنسی سی آئی اے میں انفارمشین ٹیکنالوجی سکیورٹی کے شعبے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اسنوڈین باقاعدہ تعلیمی قابلیت نہ ہونے کے باوجود کمپیوٹر میں اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ایجنسی میں ترقی کرتا چلا گیا اور 2007ء میں جنیوا میں سفارت کار کے روپ میں سی آئی اے کی پوسٹ پر تعینات ہو گیا۔

ایڈ روڈ اسنوڈین 2009ء میں سی آئی اے کو چھوڑ کر نیشنل سکیورٹی ایجنسی میں بیرونی کنٹریکٹرز کے طور پر ملازم ہو گیا۔ یہ اس دوران ایک طاقتور مشاورتی کمپنی ''بوز ایلن (Booz Allen)'' کے لیے بھی کام کرتا رہا۔ یہ کمپیوٹر کا ماہر، ملنسار، خاموش طبع اور اسمارٹ شخصیت کا سنگ دل انسان ہے۔ یہ امریکہ کے خفیہ نظام، خفیہ ایجنسیوں اور سراغ رساں نیٹ ورک کی رگ رگ سے واقف ہے۔ گارڈین نے اس انکشاف کے اگلے ہی روز اسنوڈین کا پورا انٹرویو شائع کر دیا اور اس انٹرویو نے امریکہ کے مکروہ چہرے کو پوری دنیا میں ننگا کر دیا۔ اسنوڈین کا کہنا تھا: ''میں اس معاشرے میں نہیں رہنا چاہتا جہاں اس قسم کا مکروہ کام کیا جائے۔ میں ایسی دنیا میں نہیں رہنا چاہتا جہاں ہر وہ چیز جو میں کروں یا کہوں، اس کو ریکارڈ کیا جائے۔ میں نے جنیوا میں جو دیکھا اس نے مجھے فریب سے باہر نکال دیا۔ میں سوچنے پر مجبور ہوا، میری حکومت کس طرح کام کرتی ہے اور اس کا دنیا پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا میں ایک ایسے کام میں ان کا شراکت دار ہوں جس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ میں نے پہلے پہل عوام میں جانے کا فیصلہ کیا، لیکن پھر خیال آیا مجھے نئی حکومت کا انتظار کرنا چاہیے۔ میرا خیال تھا 2008ء کے انتخاب میں صدر اوباما کے آنے کے بعد امریکی پالیسیوں میں تبدیلی آئے گی، لیکن صدر اوباما نے سابقہ پالیسیوں کو جاری رکھا''۔

اسنوڈین نے حیران کن لہجے میں کہا: ''میں ان لوگوں سے خوفزدہ ہوں جو مجھے جانتے ہیں۔ میرا خاندان نہیں جانتا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے خوف یہ ہے امریکی انتظامیہ میرے

خاندان، میرے دوستوں، میرے شراکت داروں اور ہر اس فرد کا پیچھا کرے گی جس کا میرے ساتھ تعلق تھا اور امریکی انتظامیہ ہر اس شخص کے ساتھ سختی سے پیش آئے گی جو مجھے جانتا ہے اور یہ خیال مجھے رات بھر جگائے رکھتا ہے''؛ اس کا کہنا تھا: ''امریکہ دنیا کے ہر شخص کی جاسوسی کرتا ہے۔ کسی کے بچنے کی گنجائش ہی نہیں اور امریکی جاسوس ادارے دنیا کے مواصلاتی نظام کو ہمہ وقت مانیٹر کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ امریکی باشندے، امریکی جج، امریکی فوج کے سربراہان اور امریکی صدر اس جاسوسی سسٹم سے مستثنیٰ نہیں۔ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی ان کی ٹیلی فون کالز اور ای میلز تک بآسانی چیک کرسکتی ہے''۔ اسنوڈین کا کہنا تھا: ''میں ایسے معاشرے میں نہیں رہ سکتا جہاں ذاتیات میں مداخلت ہو رہی ہو اور مجھے اس کا بھی کوئی ڈر اور خوف نہیں کہ میں اس انکشاف کے بعد پھنس جاؤں گا۔ دنیا میں ہر انسان کو آزادی کا حق ہے اور کسی ملک کا لوگوں کی ذاتی زندگی میں مخل ہونا درست نہیں۔ میں کوئی غلط بھی نہیں کر رہا جو میں خوف سے چھپتا پھروں۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں دو لاکھ ڈالر تنخواہ لیتا ہوں۔ میری گرل فرینڈ بھی ہے اور ہوائی میں سمندر کنارے خوبصورت گھر بھی ہے''۔ اسنوڈین نے اخبار سے عہد لیا وہ اس انکشاف کو اس کے نام سے مشتہر کرے گا اور اس نے گارڈین کو ثبوتوں کا پلندا بھی بطور ثبوت پیش کر دیا۔ اب گارڈین یہ ثبوت کب مشتہر کرتا ہے؟ ان دستاویزات میں کیا کیا راز چھپے ہیں اور ان رازوں کے افشا ہونے پر دنیا کا ردعمل کیا ہوگا؟ یہ کہانی ابھی کھلی نہیں۔ آشکار ہو گی تو شاید امریکہ اپنے ہی پاؤں میں گر جائے گا۔

(ہفت روزہ، ضرب مومن، کراچی، 15 جولائی 2013ء)

یہ انکشافات اور یہ ردعمل اپنی جگہ لیکن امریکہ کا جاسوسی نظام کسی بھی لحاظ سے درست اقدام نہیں۔ عالمی قوانین کی رو سے دیکھا جائے تو کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم کی ٹوہ لگانا، جاسوسی کرنا غیر قانونی ہے۔ کسی بھی ملک کے خفیہ معاملات تک رسائی عالمی قانون کے خلاف ہے۔ یہ خودمختاری کی حدود کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ حساس اور دفاعی رازوں تک رسائی ہر اعتبار سے غیر اخلاقی ہے، لیکن امریکہ ابلیس کی طرح ہر قوم، ہر ملک اور ہر انسان کی ٹوہ لگائے ہوئے ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو بریڈلی میننگ (Bradley Edward Manning) نامی ایک امریکی اہلکار عراق جنگ کے دوران اسی کام پر متعین تھا۔ یہ عراق میں جاسوسی کرتا تھا۔ مختلف علاقوں، حساس علاقوں اور عراق کی دفاعی لائن کی خفیہ رپورٹس

امریکہ کو بھیجتا تھا۔ یہ اس کے بعد افغانستان شفٹ ہو گیا اور افغان جنگ میں امریکہ کے لیے کام کرتا تھا۔ تاہم 2010ء میں اس بریڈلی میننگ نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس سے یہ پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ اس نے امریکہ کی اڑھائی لاکھ خفیہ معلومات وکی لیکس کے حوالے کر دیں۔ ان معلومات کا افشا ہونا تھا بریڈلی میننگ کی زندگی عذاب ہو گئی۔ اسے گرفتار کیا گیا۔ اس پر بائیس جرائم کا الزام لگا۔ مقدمہ چلا اور اسے غدار قرار دے کر عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

ایڈورڈ اسنوڈین دوسرا امریکی اہلکار ہے جس نے امریکہ کے حقیقی چہرے کو دنیا پر عیاں کر دیا۔ انجام یقیناً بریڈلی میننگ سے مختلف نہیں ہو گا، لیکن ایک بات طے ہے امریکہ کے اپنے ہی شہری امریکہ کے خفیہ ہتھکنڈوں کے خلاف ہیں۔ امریکہ کے اپنے عوام ''پرزم'' نظام اور ڈرون حملوں کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ بانگ دہل امریکی پالیسیوں کو للکارتے ہیں اور امریکہ کے شاطرانہ منصوبوں کو جھٹلاتے ہیں۔ بریڈلی میننگ اور ایڈورڈ اسنوڈین وہ لوگ ہیں جو شیطان کے لشکروں میں ہو کر بھی شیطانوں کے راز افشا کرتے ہیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اسنوڈین کے انکشافات کے مطابق امریکی خفیہ ایجنسی یورپی ممالک کے رہنماؤں کے فون کی نگرانی کرتی ہے، جس میں جرمن چانسلر اور یورپ کی سب سے طاقت ور حکمران، اینگلا مرکل کے ذاتی فون کی نگرانی بھی شامل ہے۔ خیال رہے کہ جرمنی، امریکہ کا قریب ترین دوست اور مرکل واشنگٹن کی پالیسیوں کی حامی مانی جاتی ہے۔ اکثر بین الاقوامی کانفرنسز میں مرکل اور اوباما خوش گوار موڈ میں ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اسنوڈین کی جانب سے اس سلسلے میں فراہم کی گئی دستاویزات نے جرمن چانسلر کو مشتعل کر دیا۔ اسی انکشاف کو بنیاد بنا کر جرمن میڈیا میں دعویٰ کیا گیا کہ امریکہ گزشتہ دس برس سے زائد عرصے سے مرکل کی فون کالز کی نگرانی کر رہا ہے۔ صدر باراک اوباما کو 2010ء میں اس نگرانی کے بارے میں بتایا گیا تھا، لیکن انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ممتاز جرمن جریدے، ''ڈاسپیگل (Der Spiegel)'' کے مطابق، اس نے این ایس اے کی 2002ء کی وہ رپورٹس بھی دیکھی ہیں، جن میں مرکل کا موبائل فون نمبر بھی موجود تھا، جب کہ وہ 2005ء میں چانسلر بنی تھیں۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ 2013ء میں بھی مرکل کے فون کی جاسوسی جاری تھی۔ تاہم، رپورٹ یہ واضح نہیں کرتی کہ مرکل کی فون کالز کی جاسوسی کی نوعیت کیا تھی۔ البتہ اس کی دو وجوہ تھیں کہ مرکل کی بات چیت ریکارڈ کی جا رہی ہے یا ان

کے مختلف لوگوں سے تعلقات جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جرمن چانسلر نے میڈیا میں ان خبروں کے آنے کے فوراً بعد امریکی صدر سے رابطہ کیا اور کہا کہ یہ طرز عمل ان کے لیے نا قابل قبول ہے۔ دوسری جانب ایک اور اخبار، ''سنڈے بلڈز'' نے امریکی انٹیلی جنس کے ذرائع کے حوالے سے بتایا کہ نیشنل سکیورٹی کے سربراہ، جنرل کیتھ الیگزینڈر نے 2010ء میں خود صدر اوباما کو جرمن چانسلر کے ذاتی فون کی جاسوسی کے بارے میں بریفنگ دی تھی، لیکن اوباما نے جاسوسی روکنے کی بجائے اسے جاری رکھنے کا حکم دیا۔

وال سٹریٹ جرنل اور گلوبل ریسرچ کی رپورٹ کے مطابق امریکہ دنیا میں جاسوسی کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ امریکہ کے پاس ایک عام امریکی کی معلومات دوسرے ممالک کے شہریوں سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔ اس سے قبل یہ کہا جاتا تھا کہ جرمن کے دولخت ہونے کے بعد سب سے زیادہ جاسوسی مشرقی جرمن کی گئی تھی لیکن امریکہ نے ان کا بھی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ درحقیقت امریکہ ایک اوسط درجے کے شہری کے بارے میں معلومات اس سے بھی زیادہ رکھتا ہے جتنی سٹالن روس کی اور ہٹلر جرمن کی عوام کی رکھتا تھا۔ امریکہ ہر شہری کی فون کال، خرید و فروخت کی پرچی پر لکھا ڈیٹا، ای میل کا ریکارڈ، موبائل پیغامات، انٹرنیٹ پر ای سرچز، سوشل میڈیا پر لوگوں کی بات چیت، صحت کی معلومات، روزگار رکھنے والوں کا ڈیٹا، سفر کرنے والوں کی تفصیلات اور طالب علموں کے بارے میں معلومات کی اپ ڈیٹ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ ذرائع کے مطابق امریکہ نے ایسے سافٹ ویئرز بھی بنا لیے ہیں جو راہ چلتے لوگوں کی جاسوسی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جدید موبائل فونز کی مدد سے استعمال کرنے والے کی حقیقی جگہ کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ امریکہ کے لیے کسی بھی شخص کی موجودگی کا پتا لگانا بچوں کا کھیل ہے۔ امریکی نیشنل سکیورٹی ایجنسی کے سربراہ کا کہنا ہے کہ امریکہ کے پاس ایک کھرب افراد کی معلومات کا ریکارڈ موجود ہے۔ امریکہ روزانہ لاکھوں افراد کی ای میلز کا ریکارڈ محفوظ کرتا ہے، خفیہ ادارے کے سربراہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ نیشنل سکیورٹی ایجنسی سیاستدانوں، جرنیلوں حتیٰ کہ تمام سرکاری ملازمین کی معلومات رکھتی ہے، امریکہ کے پاس ایسا سافٹ ویئر بھی موجود ہے جس میں خود بخود ہی متعلقہ شخص کی معلومات اپ گریڈ ہوتی رہتی ہے۔ نیشنل سکیورٹی ایجنسی کے سسٹم کی ہی مدد سے مشتبہ شخص کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے، حتیٰ کہ مشتبہ شخص کے لواحقین اور اردگرد موجود لوگوں کا بھی ڈیٹا لے لیا جاتا ہے، امریکی خفیہ اعلیٰ اہلکار کا یہ بھی کہنا تھا

کہ لوگوں کی جاسوسی 9/11 کے واقعے کے بعد نہیں بلکہ اس سے کئی دہائیوں پہلے ہی امریکی عوام کی جاسوسی کی جارہی ہے۔

اسی طرح وکی لیکس کو امریکی محکمہ دفاع کے منصوبوں کے بارے میں سابق امریکی انٹیلی جنس اہلکار چیلسیا میننگ (Chelsea Manning) کی جانب سے معلومات کی فراہمی کو مبنی برحق قرار دیا گیا۔ Manning کا کہنا ہے کہ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ کی سرگرمیاں قانون اور انسانیت کی نفی کرتی ہیں، لہٰذا عالمی رائے عامہ کو ان کے سدباب کے لیے اقدام کرنا چاہیے۔ یہ بڑی بات ہے کہ امریکی انتظامیہ کا کوئی جاسوس یا اہلکار اس کی گھناؤنی اور خلاف قانون سرگرمیوں سے اتنا متنفر ہو جائے کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دنیا والوں کو اس کے کرتوتوں سے آگاہ کر دے۔ یاد رہے کہ 1949ء میں روزن برگ بھائی بہن (Julius Rosenburg & Ethel Greenglass Rosenberg) امریکہ کے جوہری اسلحہ ساز منصوبے میں کام کرتے تھے لیکن اس نسل کش اسلحے کے ہیروشیما اور ناگاساکی میں بے دریغ استعمال پر ان کے ضمیر نے بغاوت کر دی اور اس وقت ایٹم بم کے بل بوتے پر ساری دنیا کو فتح کرنے کے امریکی منصوبے کو روکنے کی انہیں یہی ترکیب سمجھ میں آئی کہ وہ سوویت روس کو ایٹم بم کا نسخہ فراہم کر دیں تاکہ وہ جوہری طاقت بن کر امریکہ کے مذموم عزائم کی روک تھام کر سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ روس نے امریکی توسیع پسندی اور جارحیت کو لگام دے دی لیکن روزن برگ بھائی بہن کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ 1953ء میں امریکہ کی عدالت عظمیٰ نے انہیں سزائے موت دے دی۔ عدالت میں Justis Douglas (جسٹس ڈگلس) ایک واحد فرد تھا، جس نے عدلیہ کے فیصلے کے خلاف اپنا اختلافی نوٹ تحریر کیا، جو عدلیہ کی تاریخ میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح عالمی برادری کا فرض ہے کہ وہ جولین اسانج، میننگ اور ایڈورڈ سنوڈن کے حق میں نہ صرف آواز بلند کرے اور انہیں پناہ دے، بلکہ ان کے انکشافات کی بناء پر کھلی عدالت میں امریکی صدر پر انسانیت کے خلاف جرائم Crime Against Humanity کا مقدمہ چلا کر اسے قرار واقعی سزا دے۔

امریکی صحافی گلین گرین ویلڈ (Glenn Greenwald) نے امریکی خفیہ ایجنسی کے سابق اہلکار ایڈورڈ اسنوڈن کی جانب سے افشا کردہ معلومات کی بنا پر امریکی اور

برطانوی خفیہ پروگراموں کے حوالے سے مضامین لکھے تھے۔ چنانچہ اگست 2013ء کو برطانوی حکومت نے ایڈورڈ کے ساتھی جگن گرین ویلڈ کو انسداد دہشت گردی قانون کے تحت گرفتار کرلیا۔

سی آئی اے کے سابق اہلکار جان کیرا ئیکو (John Kiriakau) جس نے 1990ء سے 2004ء تک سی آئی اے کے لیے کام کیا، نے 2007ء میں ایک ٹی وی انٹرویو میں صحافی کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے امریکی انڈر کور ایجنٹ کا نام بتایا اور یہ بھی سچ اگلا کہ گوانتاناموبے جیل میں مسلمان راہنما ابوزبیدہ سے تفتیش کے دوران تشدد و بربریت کے کون کون سے ہولناک طریقے استعمال کیے گئے تھے۔ جان کیراٹیکو کے اس سچ بولنے پر اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں جنہیں عبور کرنا قانونی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مغرب میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی ''ایسی آزادی'' کہلاتی ہے جس کی کوئی حدود نہیں، خواہ اس سے کتنا ہی فساد فی الارض کیوں نہ پھیلے کیونکہ مغرب سمجھتا ہے کہ اسلامی روایات کی پامالی اس کا حق ہے۔

بارک اوباما اس تنقید کا شکار ہیں کہ انہوں نے آزادی صحافت کی حوصلہ شکنی کی اور حکومتی اداروں نے خفیہ اقدامات کا راز فاش کرنے والوں سے سختی سے نمٹنے کی کوشش کی جن میں وکی لیکس کے جولین اسانج، نیشنل سکیورٹی ایجنسی کا اسنوڈین، نیشنل سکیورٹی کا تھامس ڈریک، کانگریشنل کمیٹی کی جیلین راڈک، پیٹر وان بورن اور سی آئی اے کے جیفری اسٹرلنگ سرفہرست ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ان اداروں اور حکومت کے ایسے خفیہ کاموں سے پردہ اٹھایا جو امریکی آئین، قانون اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہیں یا پھر جن سے حکومتی وسائل کا ضیاع اور بے دریغ استعمال ثابت ہوتا ہے۔ صدر اوباما نے انکشافات کرنے والے صحافیوں کی اپنی تقریروں میں تو خوب تعریف کی لیکن عملاً ان پر مقدمات چلائے۔ افغانستان و عراق کی جنگوں میں امریکی ڈالروں سے بھرے فوجی کارگو طیاروں کی پروازیں اور تقسیم، امریکی سی آئی اے، این ایس اے اور دیگر اداروں کے خفیہ اقدامات، امریکی عوام کے فونز کا ڈیٹا اور کالز کی ریکارڈنگ، عراق کی جنگ کی خفیہ کہانی اور دیگر انکشافات سامنے لانے میں سیمور ہرش، جیمز رائزن، ڈیوڈ سانگر جیسے صحافیوں کی محنت اور قربانی کا بڑا دخل ہے۔

1997ء میں کار حادثے میں شہزادی ڈیانا کی موت کو قتل قرار دینے والے برطانوی فوجی کو جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسپیشل فورس کے اس اہلکار نے پولیس کو دیے گئے

بیان میں انکشاف کیا تھا کہ شہزادی ڈیانا کی موت میں برطانوی فوج کا خصوصی دستہ SAS ملوث تھا۔ برطانوی اخبارات کی رپورٹس کے مطابق سولجر این (Soldier N) کے نام سے جانے، جانے والے اس اہلکار کو یہ بیان دینے کے بعد جان کے لالے پڑ گئے، اسی لیے اس نے فرار ہو کر تھائی لینڈ میں پناہ لے لی۔ فوجی اہلکار کے بیان کے مطابق ایک منصوبے کے تحت شہزادی ڈیانا کی گاڑی کے ڈرائیور کی آنکھوں میں روشنی کی شعاعیں پھینکی گئی تھیں، جس کے باعث وہ گاڑی کا کنٹرول کھو بیٹھا اور پیرس کی سرنگ میں دوڑتی کار ستون سے جا ٹکرائی تھی۔ اس اہلکار کے فرار کے بعد شہزادی ڈیانا کے قتل کی تفتیش ایک بار پھر تعطل کا شکار ہو گئی۔

نومبر 2015ء ویٹی کن کی عدالت نے کلیسائے روم کے راز افشا کرنے والے صحافیوں پر فرد جرم عائد کر کے مقدمہ چلانے کا اعلان کیا۔ عدالت نے صحافی ایمیلیا نوفتی پالدی کی اپیل سننے سے بھی انکار کر دیا۔ اسرائیل کا معروف صحافی یوری ایونری (Uri Avnery) یہودی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور آج کل تل ابیب میں رہتا ہے۔ وہ اسرائیل کے فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم پر اکثر احتجاج کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنا ایک رسالہ HaOlam HaZeh بھی نکالتا ہے۔ اس پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ بعد ازاں اس کے دفتر کو نامعلوم افراد نے نذر آتش کر دیا جس سے اس کا تمام قیمتی ریکارڈ جل کر راکھ ہو گیا۔ پولیس نے حملہ آوروں کو گرفتار کیا لیکن بعد ازاں انہیں ''پاگل'' قرار دے کر چھوڑ دیا گیا...... تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر یہی صحافی اسلامی تعلیمات پر حملہ کرتا، مسلمانوں کے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی تنقیص کرتا، قرآن مجید کے بارے ہرزہ سرائی کرتا یا مسلمانوں کے مقدس مقامات پر نعوذ باللہ حملہ کرنے کی بات کرتا تو وہ آج اسرائیل کا ہیرو قرار پاتا۔ امریکہ اسے نوبیل انعام کے لیے نامزد کرتا، برطانوی ملکہ اسے سر کے خطاب سے نوازتی۔ سویڈن اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری جاری کرتا۔ جرمنی اسے اپنے ملک کی شہریت دے دیتا، فرانس اسے کسی بھی شہر کا میئر بننے کی پیش کش کرتا۔ ڈنمارک اپنے ہاں کسی معروف سڑک کا نام اس سے منسوب کر دیتا، اقوام متحدہ پوری دنیا میں اسے اپنا خیر سگالی کا سفیر مقرر کرتا۔ ویٹی کن سٹی اس کے اعزاز میں عالمی عشائیے کا اہتمام کرتا، پوپ اسے اپنا نمائندہ قرار دیتا، عالمی کلیسا بائبل میں سے کوئی فقرہ نکال کر اس پر منطبق کرتے ہوئے اسے ''مجاہد'' قرار دیتا، سی این این، بی بی سی، اور سکائی نیوز کے نمائندے اس سے انٹرویو کے لیے بے چین ہوتے، اسے سخت سیکورٹی فراہم کی جاتی، ہر بڑی یونیورسٹی میں اس کے

لیکچر ہوتے۔اس کا شمار مغربی تھنک ٹینکس میں ہوتا، ہالی وڈ اُس پر فلمیں بناتا............

ے نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

آزادیٔ اظہار کے علمبرداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود یورپ میں بھی آزادیٔ اظہار بے لگام نہیں ہے۔ 1985ء میں امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر واکو میں ایک شخص ڈیوڈ کوریش (David Koresh) نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ اپنے آپ کو ''Yeh Weh'' (پرانی کتابوں میں خدا کا نام) کہلواتا تھا۔اس نے ٹیکساس میں دوا یکڑ اراضی پر اپنی قلعہ نما رہائش تعمیر کروائی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اپنی بے شمار نوجوان بیویوں، بچوں اور پیروکاروں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس قلعے میں عیاشی کا مکمل سامان موجود تھا۔ اس کے پیروکار ہمہ وقت شراب و شباب میں ڈوبے رہتے۔ یہی ان کی عبادت تھی۔اس کے پیروکاروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔آخر کار اپریل 1993ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے ایف بی آئی (FBI) کو اس کا قلعہ تباہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فروری 93ء میں تربیت یافتہ کمانڈوز نے بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے چھاپہ مارا تو دونوں اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجہ میں 10 سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے۔ پولیس نے 51 دن تک عمارت کا محاصرہ کیے رکھا۔ بالآخر عمارت کو آگ لگا دی گئی جس سے ڈیوڈ سمیت 100 سے زائد افراد ہلاک ہوگئے جن میں 21 چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔

ہم اس اقدام کی تائید کرتے ہیں کہ جعلی عیسیٰ کے مدعی کو قتل ہونا چاہیے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دعویدار جھوٹا مسیح موعود امریکہ میں دعویٰ کرتا ہے تو وہاں کی حکومت اس فتنہ کا فوراً قلع قمع کر دیتی ہے لیکن جب کوئی جھوٹا مسیح موعود پاکستان یا ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے تو امریکی حکومت نہ صرف اس کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالتی ہے کہ ان کا ہر صورت میں خیال رکھا جائے۔آخر یہ منافقت کیوں؟ جس طرح جعلی عیسیٰ بننے اور اس پر ایمان لانے والوں کو سزا دی گئی ہے، اس طرح (نعوذباللہ) جعلی محمد بننے اور نبوت و رسالت کے لٹیروں پر بھی اس سزا کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اوراگر حکومت پاکستان اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھاتی ہے تو اس پر کسی کی ناک بھوں نہیں چڑھنی چاہیے۔ اگر حقوق انسانی کی تنظیموں کو 100 کے قریب انسانی جانوں کا زندہ جلا دینا انسانی

حقوق کی خلاف ورزی نظر نہیں آیا (جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوا) تو پھر کسی کا ایسے ہی کسی جرم میں پھانسی چڑھا دینا کیونکر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو سکتا ہے؟ اگر گستاخ رسول ﷺ کی سزا، سزائے موت انسانی حقوق کے منافی ہے تو سو انسانوں کو زندہ جلا دینا بدرجہا اولیٰ انسانیت کا قتل قرار پاتا ہے اور جب اپنے پرائے مذہب کے نام پر جعل سازی کرنے والوں کی سزا پر متفق ہیں تو گستاخ رسول ﷺ کی سزا پر بھی کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آتا ہے جبکہ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی آتا ہے نظر
دیکھ اے غافل، اپنی آنکھ کا شہتیر بھی

2003ء میں معروف امریکی مصنف اور ناول نگار ڈان براؤن Dan Brown نے ایک ناول ''دی ڈونچی کوڈ'' The Da Vinci Code لکھا۔ عیسائی راہنماؤں کا کہنا تھا کہ اس ناول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر رکیک حملے کیے گئے ہیں اور مصنف نے حضرت مسیح کی شخصیت کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے انتہائی دیدہ دہنی کا ثبوت دیا ہے۔ عیسائی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہ ناول عیسائیت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کا ارتکاب ہے۔ بعد ازاں 2006ء میں ہالی وڈ نے اس ناول پر فلم بنائی جس پر عیسائی دنیا نے زبردست احتجاج کرتے ہوئے اس ناول اور فلم پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ بعض ممالک میں اس متنازعہ ناول کی اشاعت، خرید و فروخت اور فلم کی نمائش وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس متنازعہ ناول کے خلاف معروف عیسائی مصنف ارون ڈبلیولٹزر نے ایک کتاب شائع کی جس کا ترجمہ ''ڈونچی کوڈ کے پس پشت کیا ہے؟'' کے نام سے معروف عیسائی ادیب ڈاکٹر کنول فیروز نے کیا جسے پاکستان بائیبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے 2008ء میں شائع کیا۔ یاد رہے یہ وہی ڈاکٹر کنول فیروز ہیں جو پاکستان میں برداشت، رواداری اور آزادئ اظہار کے بڑے مبلغ تصور کیے جاتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جب یورپی اخبارات و رسائل نے حضور نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کیے تھے تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے بھرپور احتجاج پر یورپی کمیشن کے صدر جوزمینوئل باروسووہ (Jose Manuel Barrose) نے اس ناپاک جسارت کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آزادی اظہار ہے اور آزادی اظہار پر کوئی

بات نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ ہمارے آزاداور جمہوری یورپی معاشرے کی ایک اہم اورضروری قدر ہے۔حالانکہ ایسا عمل آزادیٔ رائے کا مسئلہ نہیں بلکہ فساد فی الارض ہے۔

2004ء میں ہالی وڈ کے معروف ہدایت کار مل گبسن (Mel Gibson) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر ایک نئی فلم The passion of the Christ ''دی پیشن آف دی کرائسٹ'' ریلیز کی جس نے امریکی سینماؤں میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔اس فلم میں بائبل کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آخری 12 گھنٹوں میں یہودیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کیے جانے والے بیہمانہ ظلم وتشدد کو جس انداز میں دکھایا گیا، خدشہ تھا کہ امریکہ میں عیسائی یہودی فسادات شروع ہو جاتے۔ چنانچہ یہودیوں کے احتجاج پر امریکی حکومت نے اس فلم کی نمائش پر فوری پابندی لگا دی۔ حالانکہ اس فلم نے ابتدائی چند ہفتوں میں 600 ملین ڈالر کا بزنس کیا تھا۔

برطانیہ کا ''میری وہائٹ ہاؤس بنام گے نیوز'' کیس بہت اہم ہے۔ 1977ء میں ''گے نیوز'' (Gay News) نے ایک مصور تشریحی نظم شائع کی، جس میں (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہم جنس زدہ دکھایا گیا تھا۔ مقدمے میں پبلشر کو دو کے مقابلے میں دس ججوں نے مجرم قرار دیا۔اپیل میں بھی تین اور دو کی اکثریتی رائے نے فیصلہ برقرار رکھا۔ اس کیس میں ارادے اور جذبات کو مجروح کرنے کے دونوں پہلو زیر بحث رہے کہ یہی دوسوال ہمارے ہاں کے لادین بھی اٹھاتے رہے ہیں۔ قانونی کیس کا حوالہ دے کر کوئین یونیورسٹی بلفاسٹ کے شعبہ فقہی امور کے پروفیسر سائمن لی (Simon Lee) کا کہنا تھا:

''جج صاحبان کے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا ہتک وتوہین کا جرم اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کی پشت پر ایک ارادہ ہو جو صدمے کی کیفیت کو جنم دے اور عیسائی عوام میں غصے اور آزردگی کا باعث بنے۔ یا جرم یہ بھی ہوگا کہ محض ایک نظم کی اشاعت کا ارادہ تھا جس کے مذکورہ اثرات تو ہوئے جبکہ پبلشر کا مقصد دوسروں کو مشتعل کرنا نہ تھا''۔

فیصلے میں کہا گیا کہ اگر کسی کے جذبات مجروح کرنے کا ارادہ نہ بھی ہو، لیکن اس کی اشاعت سے لوگ مشتعل ہوگئے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

سائمن لی کے بقول لارڈ سکارمین (Lord Scarman) کا اس قانونی نکتہ پر اظہار رائے ''منصفانہ حد تک کافی مشہور و معلوم'' ہے، کیونکہ موصوف برطانوی ججوں کے حلقے

میں بہت زیادہ آزاد خیال مانے جاتے ہیں اور بائیں بازو کے بہت پسندیدہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مائی لارڈ! میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ توہین و ہتک کے عام قانون کا جُرم قانونی نظام میں کوئی مفید خدمت انجام نہیں دیتا۔ اس کے برعکس میں سمجھتا ہوں کہ یہ قانون سازی کا ایک کیس بنتا ہے، جس کا دائرہ غیر عیسائی آبادی کے مذہبی عقائد اور جذبات کے تحفظ تک وسیع کیا جائے۔ اس جرم کا تعلق ان فوجداری جرائم کے گروپ سے ہے، جن کی تشکیل وتسوید برطانوی مملکت کے امن وسکون کے تحفظ کے لیے کی گئی ہے۔ ایک روز افزوں ہم رنگ عقائد ونظریات کے حامل معاشرے میں، جیسا کہ جدید برطانوی معاشرہ ہے، یہ لازم ہے کہ نہ صرف سبھی اختلافی مذہبی عقائد، محسوسات اور طور طریقوں کو احترام دیا جائے بلکہ انہیں فحش گوئی و بدکلامی، تذلیل و رسوائی اور تحقیر وتوہین سے بھی بچایا جائے''۔

سینیٹر بلیک اسٹون **Black Stone** کی وہ تقریر جو امریکہ میں آزادی اظہار خیال کے قانون کی بنیاد تصور کی جاتی ہے، اس میں اس نے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہر آزاد شخص کو بلاشبہ یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ عوام کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر سکے، اس پر پابندی لگانا پریس کی آزادی کو ختم کرنا ہے، لیکن اگر وہ ایسی بات چھاپتا ہے جو نامناسب، شرانگیز یا غیر قانونی ہو تو اسے اپنی جسارت کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ پریس کو محتسب کی قدغن کے ماتحت کرنا آزادی ضمیر کو ایک ایسے شخص کے ذاتی رجحان پر چھوڑنا ہوگا جسے علم، مذہب اور حکومت کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کن اور غلطی سے مبرا مان لیا گیا ہو، لیکن خطرناک اور مجرمانہ تحریریں جنھیں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ مقدمہ کے بعد نقصان دہ سمجھا جائے، اس پر سزا دینا امن و امان، حکومت اور مذہب کی بقا کے لیے ضروری ہے کیونکہ انہی پر شہری آزادی کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس طرح افراد کا ضمیر تو آزاد ہے لیکن اس کے غلط استعمال پر سزا دینا تعزیراتی قانون کا مقصد ہے''۔

بقول شخصے: ''آزادیٔ اظہار بڑی پرفریب اصطلاح ہے۔ اس کی آڑ میں جو منہ میں آئے، بولنا اور لکھنا جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ ایک اصطلاح آزادی عمل کی بھی ہے، اس کا اطلاق پہلے مقصد کے حصول کے بعد کیا جاتا ہے یعنی جب کسی قوم کو آزادی اظہار کے ذریعے بے حس بنا دیا جائے تو پھر اسے آزادی عمل کا چکمہ دیا جاتا ہے کہ اب جو کرنا ہے، کر گزرو۔ کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔ امریکی اور مغربی تہذیب دونوں

حدیں پار کر چکی اور اب وہ باقی دنیا کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مادر پدر آزادی کا نظریہ مسلم ممالک پر زبردستی ٹھونسا جارہا ہے"۔

امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس اولیور ہومز (Oliver Wendell Holmes) نے 1919ء میں ایک امریکی شہری شینک کے مقدمہ میں اپنے ایک فیصلہ میں کہا تھا کہ "فری سپیچ" کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی آدمی ایک بھرے ہوئے تھیٹر میں اٹھ کر آگ، آگ، آگ کا شور مچادے کیونکہ اس آزادی اظہار کے نتیجہ میں جو بھگدڑ مچے گی، وہ جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے اور یوں یہ آزادی اظہار ایک مجرمانہ فعل بن جائے گا جس کی قانون میں کوئی گنجائش نہیں۔ عدالت نے فیصلہ دیا جو آزادئ اظہار تشدد پر ابھارے یا جس کا نتیجہ تشدد نکلے یا جس کا مقصد تشدد کے لیے مشتعل کرنا ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں مزید لکھا کہ ہر معاملے میں سوال یہ ہوتا ہے کہ جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، کیا اُن کی نوعیت ایسی ہے کہ جن سے ایسی محسوس اور ٹھوس خرابی کو جنم دینے کا خطرہ رونما ہوتا ہو، جسے روکنے کا حق کانگریس کو حاصل ہے"۔ متذکرہ حقائق اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی خود مغربی دنیا میں بھی مطلق نہیں ہے، بلکہ اس کو حدود وضوابط کا پابند بنایا گیا ہے۔

اگست 2012ء میں روس کی معروف گلوکارہ ماریا رائیو کینا کے خلاف ماسکو کے ایک چرچ میں حکومت کے خلاف گانا گانے پر مقدمہ درج کیا گیا۔ بعد ازاں عدالت نے گلوکارہ کو 2 سال کی قید سنا کر جیل بھیج دیا۔ کچھ عرصہ قبل افغان جنگ پر تنقید کرنے پر برطانوی رکن پارلیمان پائل فلائن کی رکنیت ختم کردی گئی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ خود مغرب میں آزادی اظہار بے لگام نہیں بلکہ اس کی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ بے لگام آزادی اظہار کے علمبرداروں سے پوچھنا چاہیے کہ جب آپ روڈ پر گاڑی چلاتے ہیں تو چوراہوں پر سرخ لائٹ روشن ہونے پر کیوں گاڑی روک لیتے ہیں؟ حالانکہ سڑک بھی خالی ہوتی ہے اور وہاں کوئی سپاہی بھی نہیں ہوتا۔ محض چالان کا ڈر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ مغرب میں ہر آزادی مادر پدر آزاد نہیں۔ اس کی چند قیود و حدود بھی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی تذلیل کے سلسلہ میں مغرب ہر قانون، آئین اور اخلاقیات سے عاری ہے۔ یہ رویہ مغرب کے کھلے تعصب اور تنگ نظری کا آئینہ دار ہے۔

امریکی فوج کی خواتین اہلکار کس طرح اپنے مرد ساتھیوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی

ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ مئی میں منظر عام پر آنے والی ایک ٹاسک فورس کی رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ٹاسک فورس عراق، کویت اور افغانستان میں تعینات امریکی فوج کی 900 سے زائد خواتین اہلکاروں کی اس شکایت پر فروری میں تشکیل دی گئی تھی کہ آرمی، نیوی، ایئر فورس اور میرین کور کے مرد سپاہیوں کی جانب سے انہیں جنسی حملوں یا بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ گذشتہ پانچ سال میں امریکی فوج میں خواتین اہلکاروں کے ساتھ زیادتی کے واقعات میں تیز رفتار اضافہ ہوا ہے۔ اس کی توثیق آرمی کریمنل انویسٹی گیشن ڈویژن کے جاری کردہ اعدد وشمار سے بھی ہوتی ہے۔ روزنامہ واشنگٹن پوسٹ نے آزادی اطلاعات کے قانون کے تحت یہ معلومات حاصل کرکے شائع کردی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ 1998ء کے مقابلے میں 1999ء سے 2002ء تک عورتوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات رپورٹ کیے گئے۔ ان واقعات میں مجموعی طور پر انیس فیصد اضافہ ہوا جبکہ اسی مدت میں ریپ کے پچیس فیصد زیادہ کیس رپورٹ ہوئے ہیں۔ اس طرح آخری سال زیادتی اور ریپ کے واقعات کی تعداد بالترتیب 783 اور 445 رہی۔ واضح رہے کہ یہ اعداد وشمار رپورٹ کی جانے والی وارداتوں کے ہیں، جبکہ واشنگٹن پوسٹ لکھتا ہے: ”آرمی کو اعتراف ہے کہ اس تقابل سے ممکنہ طور پر مسئلے کی حقیقی شدت کا اظہار نہیں ہوتا۔ متاثرہ عورتوں کی قانونی امداد کرنے والے وکلا کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ جنسی زیادتی کے واقعات عموماً کم ہی رپورٹ کیے جاتے ہیں اور فوج میں تو نشانہ بننے والوں پر رازداری کے حوالے سے زیادہ ہی قانونی بندشیں ہوتی ہیں۔ ظاہری اور تحقیقی صورتحال میں واقعتاً کتنا فرق ہے، اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے 1988ء میں پینٹاگون کی جانب سے کیے گئے ایک سروے میں بتایا گیا ہے کہ فوج میں مردوں کے ہاتھوں جنسی بدسلوکی کا نشانہ بننے والی نوے فیصد عورتیں بوجوہ متعلقہ حکام کو ان واقعات کی اطلاع نہیں دیتی ہیں۔ اس انکشاف سے واضح ہے کہ امریکی فوج میں کام کرنے والی عورتوں کو کتنے بڑے پیمانے پر جنسی بدسلوکی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اب دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ امریکی فوج کا نظام انصاف ان عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا کیا ازالہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مظلوم عورتوں کو خاطر خواہ قانونی اور نفسیاتی امداد اور تعاون فراہم نہیں کیا جاتا اور جنسی جرائم کی تفتیش میں رکاوٹوں کا ڈالا جانا ایک عام معمول ہے۔ کولوریڈو کی ایئرفورس اکیڈمی

(Colorado Air Force Academy) کی خاتون کیڈٹوں کی شکایات کے حوالے سے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنسی زیادتی کے الزامات اکثر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں جبکہ اس اکیڈمی کے بارے میں محکمہ دفاع کے انسپکٹر جنرل کی ایک علیحدہ رپورٹ کے مطابق اکیڈمی میں کام کرنے والی بیس فیصد خواتین اہلکاروں نے کم از کم ایک بار اپنے مرد ساتھیوں کی جانب سے زیادتی کا شکار بنائے جانے یا اس کی کوشش کیے جانے کی شکایت کی۔ لوواسٹی میں سابق فوجیوں کے میڈیکل سینٹر کی 2003ء کی ایک انکوائری سے پتہ چلتا ہے کہ سروے میں شامل 558 عورتوں میں سے اٹھائیس فیصد نے بتایا کہ انہیں فوج کی ملازمت کے دوران ریپ کیا گیا یا اس کی کوشش کی گئی'' امریکی فوج میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی پر امریکی صحافیوں ایم ہرڈی اور مائلز موفیٹ نے نو ماہ کی تحقیق کے بعد ایک رپورٹ تیار کی ہے جو نومبر 2003ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ رپورٹ ڈینور پوسٹ میں بھی شائع ہوئی اور اس کی بنیاد پر ''مجرموں کی پردہ پوش فوج میں عورتوں کے خلاف جنسی تشدد'' کے عنوان سے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ویب سائٹ پر ایک مضمون بھی دیا گیا ہے جس میں یہ اقرار ملتا ہے کہ امریکہ کی ''مسلح افواج میں جنسی زیادتی اور گھریلو تشدد کے جرائم بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں''۔ رپورٹ میں کولریڈو ائیر فورس اکیڈمی کے سکینڈل کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ 142 کیس رپورٹ ہونے کے باوجود ایک ملزم کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ ان رپورٹوں نے ایسی مزید مثالیں دیتے ہوئے لاس ویگاس (Las Vagas) میں 1991ء میں ہونے والے نیوی ٹیل ہک کنونشن کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس موقع پر سو سے زائد افسروں نے درجنوں خاتون اہلکاروں کو جنسی طور پر ہراساں کیا مگر جب اس سلسلے میں نیوی کی طرف سے انکوائری ہوئی تو مجرم افسروں نے تحقیقاتی عمل کو بالکل سبوتاژ کر کے رکھ دیا اور ان میں سے ایک کو بھی سزا نہیں دی جا سکی۔ امریکہ کی مسلح افواج میں ملازمت کرنے والی عورتوں کی موجودہ تعداد دو لاکھ ہے۔ سابق فوجیوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والے محکمے کے گذشتہ دس سال کے دو جائزوں میں سے ایک میں مرد فوجیوں کی ہوس کا شکار ہونے والی خواتین اہلکاروں کا تناسب اکیس اور دوسرے میں تیس فیصد بتایا گیا ہے۔ ایک فیڈرل سروے کے مطابق جو 2000ء میں کیا گیا، سول ملازمتوں میں یہ تناسب اٹھارہ فیصد پایا گیا ہے۔ امریکی کانگریس کی جانب سے 1991ء میں جاری کی گئی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ گذشتہ

5 سالوں میں امریکی فوج میں کام کرنے والی دو لاکھ عورتیں مرد سپاہیوں کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہیں۔ جرم کی اس کثرت کے باوجود پچھلے پورے عشرے میں اگر کسی کا کورٹ مارشل ہوا اور اسے سزا بھی ملی تو وہ عدالتی نہیں بلکہ صرف انتظامی نوعیت ہی تک محدود رہی حتیٰ کہ بار بار جرم کا ارتکاب کرنے والے عادی اور ڈھیٹ مجرموں کو بھی محض انتظامی اقدام کرتے ہوئے استعفیٰ دینے کی اجازت دے کر یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ اپنے دامن کے کسی داغ کے بغیر سول زندگی شروع کر سکیں۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکہ کا فوجی نظام یہ رعایت جن مجرموں کو دے رہا ہے، ان کے جرم کے اثرات ونتائج کیا ہیں اور جو عورتیں ان کی درندگی کا نشانہ بنتی ہیں، ان کی بقیہ زندگی کس طرح گزرتی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ایسی ساٹھ عورتوں سے بات چیت کی جنھوں نے انتقام کے خوف یا مجرموں کے خلاف کسی کارروائی سے مایوس ہونے کی بنا پر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہیں رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ اخبار لکھتا ہے کہ مجرمانہ حملوں کا نشانہ بننے والی درجنوں سابق فوجی خواتین اہلکاروں نے بتایا کہ اذیت کے اندرونی احساس کے سبب ان کے کیریئر تباہ ہوگئے۔ انہوں نے منشیات اور کثرت شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس سے ان کی زندگیاں برباد ہوگئیں۔ ماریان ہڈ ایسی ہی ایک مظلوم سابق امریکی سپاہی ہے۔ وہ اپنے کرب کا اظہار ان لرزہ خیز الفاظ میں کرتی ہے: ''پہلے جب میں امریکی پرچم پر نظر ڈالتی تو یہ مجھے سرخ سفید اور نیلا دکھائی دیتا تھا مگر اب میں اس پر صرف خون کے رنگ دیکھتی ہوں۔ سرخ رنگ اس خون کی علامت ہے جو میرے بدن سے بہا، نیلا رنگ ان چوٹوں کی نمائندگی کرتا ہے جو میرے جسم نے سہیں اور سفید رنگ میرے خوفزدہ چہرے کا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے ماری پیٹی گئی اور میری عزت لوٹی گئی؟ اس سے زیادہ ادا کیا ہوسکتا ہے''!

امریکی افواج میں اس ظلم کا شکار ہونے والی عورتوں کی رضا کارانہ قانونی امداد کرنے والے وکلا کے گروپ مائلز فاؤنڈیشن (The Miles Foundation) کی ڈائریکٹر کرسٹائن ہینسن (Christine Hansen) نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا کہ: ''ان عورتوں کی نفسیاتی کیفیت کی بار بار جانچ پڑتال ہوتی، انہیں سزائیں دی جاتی ہیں اور ان کی کردارکشی کی جاتی ہے۔ ہم ان کے جو مقدمے لڑتے ہیں، ان میں سے اکثر میں انصاف نہیں

ملتا''۔ پھر ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا مزید اہتمام یہ ہے کہ جنسی حادثات اور صدموں کے نتیجے میں لاحق ہونے والی معذوری قانونی طور پر قابل معاوضہ نہیں ہے۔ ایسی سابق فوجی اہلکار عورتیں اسی وقت کسی ازالے کی مستحق قرار پاسکتی ہیں جب متعلقہ محکمہ کی وضاحت کے مطابق ان کے اندر بھی وہی نفسیاتی علامت پیدا ہوجائیں جو میدان جنگ میں حادثے سے دو چار ہونے والوں میں پیدا ہوسکتی ہیں''۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات جنسی زیادتی کے صدمے کو جھیلنا میدان جنگ میں پیش آنے والے حادثوں کے اثرات کا مقابلہ کرنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ 1998ء میں سابق فوجیوں کے معاملات کے ایک جائزے میں کہا گیا ہے کہ ''ماہرین کے مطابق جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی بہت سی عورتیں چونکہ کہیں اس کی رپورٹ نہیں کرتیں اور انہیں اپنے طور پر ہی اس کے حوصلہ شکن اثرات کے ساتھ ہی زندگی گزارنے کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ان میں سے ایک بڑی تعداد احساس اذیت کو دبانے کے لیے الکوحل یا منشیات کا سہارا لیتی ہے۔ یہ عورتیں معاشرے سے الگ تھلگ ہوجاتی ہیں، کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں، سونا اور کھانا پینا ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، معدے اور دل کے امراض سمیت مختلف قسم کی جسمانی بیماریاں ان کی جان کو لاگو ہوجاتی ہیں اور ان کا تولیدی نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا ہے''۔

امریکی فوج میں عورتوں کا یہ حشر حقوق نسواں کے تحفظ کے ضمن میں امریکہ کے سارے دعوؤں کی کھلی تردید ہے۔ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط ان کے خالق کے بنائے ہوئے قانون فطرت کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس لیے اس کے نتائج معاشرے میں ظلم اور فساد کے فروغ کے سوا کسی دوسری شکل میں نکل ہی نہیں سکتے۔ قرآن وسنت میں مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار اسی لیے الگ الگ رکھے گئے ہیں۔ کاش مغربی معاشروں کی اس ہولناک صورتحال سے ہمارے وہ ارباب اختیار اور اہل دانش کوئی سبق سیکھ سکتے جو ہر معاملے میں آنکھ بند کرکے مغرب کی تقلید کو ترقی کا بے خطا فارمولا اور نسخہ کیمیا تصور کرتے ہیں۔

جو لوگ مغرب کو جنت اور عورتوں کے حقوق کا علمبردار سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مغرب میں آج بھی عورت کی خرید وفروخت اور تجارت ہوتی ہے۔ 1997ء میں مغربی محقق ''کریس ڈی اسٹوب'' نے یورپ میں عورتوں کی تجارت پر تحقیق کی اور انکشاف کیا کہ ''مغرب میں عورت کی زندگی جہنم ہے، صرف اسپین میں 5 لاکھ خواتین جسم فروشی پر مجبور

ہیں، ڈنمارک جس کو ملحدین کا گڑھ کہا جاتا ہے، اب اس کو بغیر نکاح کے شادی کی جنت کہا جا رہا ہے، سوئٹزرلینڈ کو اب کلب کی لڑکیوں کا ملک کہا جاتا ہے‘‘۔ دوسری طرف معروف امریکی نیوز چینل CNN نے ایک اخباری رپورٹ نشر کی جس میں Marylandd (امریکہ) میں Hopkins johns یونیورسٹی کی اہم تحقیقات پر اعتماد کیا گیا جس کے مطابق امریکہ میں ہر سال 2 لاکھ بچوں اور عورتوں کی باقاعدہ غلام کے طور پر خرید و فروخت ہوتی ہے اور ایک لاکھ 20 ہزار عورتیں مشرقی یورپ (روس اور اس کے آس پاس غریب ممالک) سے جسم فروشی کے لیے مغربی یورپ سمگل کی جاتی ہیں۔ 155 ہزار عورتوں کو جسم فروشی کے لیے امریکہ بھیج دیا جاتا ہے جن سے اکثریت کا تعلق میکسیکو سے ہوتا ہے۔ مشرقی ایشیا سے لائی جانے والی عورت کو امریکہ میں 16 ہزار ڈالر تک بیچا جاتا ہے جن کو بعد ازاں بے حیائی کے اڈوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ان عورتوں کو بیچتے وقت نمبر اور اسٹمپ لگائی جاتی ہے۔ برطانوی اخبار ’’انڈیپنڈنٹ‘‘ نے 30 ستمبر 2014ء کو ایک رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا "Human Traffickers Victims Branded Like Cattle" جسم فروشی کی غرض سے برطانیہ سے غلاموں کو ٹرکوں میں بھر دیا جاتا ہے پھر ان کو 200 سے 600 پاونڈ کے درمیان فی کس فروخت کیا جاتا ہے۔ اخبار نے اس کو عورت کی غلامی کہا ہے جس کو جانوروں کی طرح امریکہ اور یورپ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کمیشن والے دلال ہیں جو اس میں ہزاروں ڈالرز کماتے ہیں۔

معروف صحافی و کالم نگار انصار عباسی اپنے مضمون ’’بیچاری عورت‘‘ کے عنوان سے لکھتے ہیں: ’’امریکہ کے ایک معروف ادارے ’’ایسوسی ایشن آف امریکن یونیورسٹیز‘‘ (Association of American Universities) نے حال ہی میں ایک سروے کروایا جس کے مطابق امریکہ میں ایک چوتھائی (یعنی ہر چار میں سے ایک طالبہ) طالبات یونیورسٹی کیمپس میں جنسی حملوں اور غلط طرز عمل کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ سروے امریکہ کی 27 اعلیٰ یونیورسٹیوں بشمول ہارورڈ یونیورسٹی میں کروایا گیا جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ طالبات سے جنسی حملے اور زیادتی کے متعلق ان کے تجربات کے بارے میں پوچھا گیا۔ جنگ میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق اس سروے سے معلوم ہوا کہ 27 معروف یونیورسٹیوں کی 23.1

فیصد انڈر گریجویٹ طالبات کو جنسی زیادتی اور جنسی غلط طرزِ عمل کا شکار بنایا گیا۔ سروے میں مجموعی طور پر 11.7 فیصد طالبات نے بتایا کہ انہیں جبری طور پر جنسی حملہ کے تجربے سے گزرنا پڑا۔ یہ حالت اُس معاشرے کی ہے جہاں بغیر شادی جنسی تعلقات رکھنا ایک ایسا رواج بن چکا ہے جسے قانونی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر بُرا نہیں جانا جاتا اور جس سے شاید ہی کوئی فرد بچا ہو۔ جہاں نہ صرف جسم فروشی کو قانونی حیثیت حاصل ہے بلکہ ہم جنس پرستی کو بھی بُرا نہیں جانا جاتا۔ امریکہ میں تو شراب پینے کی بھی اجازت ہے۔ وہاں تو نائٹ کلب بھی عام ہیں۔ وہاں تو انٹرٹینمنٹ، کھیل، تماشہ، تھیٹر اور دوسری سہولتوں کی بھی کوئی کمی نہیں کہ کہا جائے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں خواتین کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو لبرلزم اور روشن خیالی کے نام پر مغربی تہذیب کو پاکستان میں پھیلا کر ہمارے معاشرتی اور دینی اقدار خصوصاً شرم وحیا کے خاتمہ کے خواہاں ہیں، اُن کے لیے اس سروے میں سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان حلال وحرام کے تعلق کو ختم کرنا اور فحاشی وعریانیت کی کھلی چھٹی دینے کا مطلب عورت کے خلاف جنسی زیادتی کے رجحانات کو بڑھانا ہے اور یہی وہ ظلم ہے جس کا بدترین شکار آج مغرب کی عورت ہے۔ اسلام کے مطابق جب حیا چلی جائے تو ایمان بھی چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں لیکن ہم ہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید میں نہ صرف اپنے ایمان کو داؤ پر لگا رہے ہیں بلکہ اپنی عورتوں کو ہی غیر محفوظ بنا رہے ہیں۔ ہم جس تہذیب کے لیے مرے جا رہے ہیں، وہاں تو حرام بچوں کی تعداد حلال بچوں سے زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ وہاں تو اب بغیر شادی کے مرد اور عورت کا ساتھ رہنا اور جب جی چاہے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رہنا ایک معمول ہے۔ وہاں تو اگر کوئی شادی شدہ ہے، وہ بھی کسی غیر مرد یا عورت کے ساتھ بھی تعلق رکھ سکتا ہے اور اسے معاشرے میں بُرا نہیں جانا جاتا۔ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا نشانہ عورت ہے لیکن ہمیں یہ سب کچھ ترقی اور عورتوں کے حقوق کے نعرہ کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں مجھے ایک خاتون اپنے کسی عزیز کے حوالے سے ملنے آئیں۔ وہ ایک ایمبیسی میں کام کرنے کے علاوہ کسی انٹرنیشنل ادارے میں بھی نوکری کر چکی ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ بتا نہیں سکتی کہ کام کے دوران اُن کا کیسے کیسے لوگوں سے پالا پڑا اور کس طرح مرد باہر نکلنے والی عورت کا استحصال کرتے ہیں۔ پاکستان میں آج کل خواتین کو ہر شعبہ میں نوکریاں دینے کی بہت بات کی جا رہی ہے لیکن کیا ہم نے نوکری

پیشہ خواتین کے لیے اُس ماحول کی فراہمی کو یقینی بنایا ہے جس میں وہ اپنی عزت اور وقار کو محفوظ رکھ سکیں اور جہاں کوئی مرد اُن کی مجبوری سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ نوکری پیشہ خواتین کو یہاں بہت مشکل حالات کا سامنا ہے اور طرح طرح کی کہانیاں آئے دن سامنے آتی ہیں۔ ایک بہت بڑے افسر کے بارے میں جو کچھ ایوانِ اقتدار کے ذمہ داروں کو بتایا گیا اُس سے سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل راولپنڈی پولیس کے اعلیٰ حکام کی طرف سے ایک تحریری ہدایت نامہ جاری ہوا جس میں متعلقہ افسر کو کہا گیا کہ ''تمام بازاروں میں خوبصورت لیڈیز پولیس کی ڈیوٹی ضروری ہونی چاہیے''۔ یہ وہ سوچ ہے جس نے عورت کو اشتہار اور کاروبار کے لیے استعمال کیا۔ یہ دھندہ مغرب نے شروع کیا اور ہم نے اس کی تقلید میں پڑ گئے، بغیر سوچے سمجھے کہ یہی عورت ہمارے اپنے گھروں میں ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں موجود ہے۔ حقوق نسواں کے نام پر ہم عورت کو اُس کے بنیادی کام سے ہٹا کر اسے کئی حصوں میں بانٹ رہے ہیں کہ وہ گھر بھی چلائے، بچے بھی پیدا کرے اور پالے، نوکری کے ساتھ بھی انصاف کرے اور اپنی ساتھ ہونے والے معاشرتی استحصال کے ساتھ بھی اکیلی لڑے''۔

(روزنامہ جنگ لاہور 22 فروری 2016ء)

جون 2014ء میں دارالحکومت لندن میں جنگ زدہ علاقوں میں جنسی تشدد کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس میں کشمیری نقطۂ نظر نہ سنے جانے پر احتجاج کیا گیا۔ لندن میں جاری کانفرنس کی میزبانی ہالی وڈ کی اداکارہ انجلیا جولی اور برطانوی وزیر خارجہ ولیم ہیگ نے کی۔ اس لندن کانفرنس میں کشمیر کا ذکر تک نہیں ہوا حالانکہ وہاں ان 117 ممالک کی بات کی گئی جہاں جنسی تشدد کے واقعات پیش آئے۔ برطانیہ میں رہنے والی ایک کشمیری کارکن ثناء سلطان نے بی بی سی کو بتایا کہ کانفرنس کے دو کشمیری کارکنوں کو پہلے یہ کہہ کر جانے کا کہا گیا کہ وہ دوسرے دن آ سکتے ہیں لیکن اگلے دن بھی انہیں آدھے گھنٹے بعد کہا گیا کہ وہ کانفرنس میں شرکت ہی نہیں کر سکتے۔ ثناء کا کہنا تھا کہ انہیں پہلے دن اس بنا پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے روکا گیا کہ ان کے ہاتھوں میں پوسٹر تھے جن پر کشمیر میں ریپ کے واقعات کا لندن کانفرنس میں ذکر نہ ہونے پر احتجاجی جملے درج تھے۔ دوسرے دن جب کشمیری کارکن کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تو انہیں یہ کہہ کر کانفرنس سے نکال دیا گیا کہ ان کا احتجاج پالیسی کے خلاف ہے۔ کشمیری کارکن ایک پٹیشن پر بھی کام کر رہے ہیں جو برطانوی پارلیمان کے حوالے

کی جائے گی۔ اس پٹیشن پر لوگوں کے دستخط لیے جا رہے ہیں اور اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ بھارتی فوج کشمیر میں جس مبینہ جنسی تشدد کا ارتکاب کر رہی ہے، اس پر کانفرنس اور برطانوی پارلیمان خاموش کیوں ہے؟ اخبار 'کشمیر والا' کے مدیر فہد شاہ نے بی بی سی کو بتایا کہ کشمیر میں آرمڈ فورسز سپیشل پاورز ایکٹ جیسے متنازع قوانین ہیں جن کے تحت بھارتی سکیورٹی فورسز سزا سے بے خوف ہو کر جنسی تشدد کا ارتکاب کر رہی ہیں۔ لندن میں ہونے والی کانفرنس کا ایک بنیادی نکتہ یہی تھا کہ جنگ زدہ علاقوں میں سکیورٹی افواج کو جنسی تشدد سے روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ فہد شاہ کہتے ہیں 'ریپ جہاں کہیں بھی کیا جاتا ہے وہ ریپ ہی ہوتا ہے' تو پھر یہ کیوں ہے کہ کشمیر میں کیے جانے والے جنسی تشدد پر روشنی نہیں ڈالی جا رہی؟''

جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی کے مطابق **1989**ء سے اب تک کشمیر میں **7000** سے زائد جنسی تشدد کے واقعات ہوئے ہیں اور ان کے مطابق ان میں سے محض **100** کیس عدالت تک پہنچے۔ ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور کئی ابھی بھی زیر التوا ہیں۔ ریپ سپورٹ گروپ کا کہنا ہے 'ان میں سے ایک مقدمہ فروری **1991**ء میں ہونے والے ایک اجتماعی ریپ کا کیس ہے۔ اس مقدمے میں سکیورٹی اہل کاروں نے **50** سے **70** تک خواتین کا ریپ کیا، حکومت نے اس وقت اس کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ پچھلے سال اس سپورٹ گروپ نے پھر سے یہ معاملہ اٹھایا ہے، لیکن کوئی شنوائی نہیں۔

آزادئ اظہار کے علمبرداروں کو بھارت کی بھی خبر لینی چاہیے جہاں آپ کشمیر کی آزادی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتے، جہاں آپ مہاتما گاندھی کا کوئی کارٹون شائع نہیں کر سکتے، جہاں ہندوؤں کی فرسودہ رسوم و رواج پر بات نہیں سکتے، جہاں پاکستان زندہ باد! کہنے پر غداری کا مقدمہ درج ہو جاتا ہے، جہاں مسلمان بچوں کو زبردستی بندے ماترم پڑھایا جاتا ہے، جہاں گائے کی قربانی تو بڑی دور کی بات ہے، اس کے تذکرہ سے ہی پورے بھارت میں فسادات پھیل جاتے ہیں اور حکومتی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔

آزادی اظہار کے علمبرداروں کی منافقت ملاحظہ کیجیے کہ **1931**ء میں ایک ہندو پنڈت نے سوامی دیانند کے خلاف ''رنگیلا رشی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سوامی دیانند کی شرمناک کرتوتیں بیان کی گئی تھیں۔ ہندو پریس نے اس کتاب کی مخالفت میں آسمان سر پر اٹھا لیا اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے

کیونکہ ایسی کتابیں ان کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں۔ (ماہنامہ آریہ سماج جلد 2، شمارہ 10، مارچ 1931ء)۔ اس کے برعکس 1923ء میں جب ملعون راجپال نے دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اقدس کے خلاف نہایت دل آزار کتاب شائع کی تو مسلمانوں کے ہاں کہرام مچ گیا اور کتاب کے خلاف پورے ملک میں احتجاجی جلسے اور جلوس نکلنا شروع ہوگئے۔ اس پر تمام ہندوؤں اور ان کے پریس نے کھل کر ملزم راجپال کے موقف کی حمایت کی اور اسے ہر ممکن اخلاقی، مالی اور جانی تعاون پیش کرنے کا اعلان کیا۔ پوچھنا چاہیے کہ مذہبی منافرت پھیلانے، نفرت انگیز مواد شائع کرنے اور مقدس ترین ہستیوں کی توہین کرنا کیا ہندو مذہب کا حصہ ہے؟ کیا ان میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ راجپال کی مذموم حرکت پر ملامت کرتے؟ عجیب ہے جب ان کے اپنے مذہبی راہنما پر تنقید ہوئی تو سب کو ''احترام'' یاد آ گیا۔

نومبر 2013ء کو بھارت میں الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنو بنچ نے نئی بھارتی فلم ''گولیوں کی رسیلہ، رام لیلا'' کی اترپردیش میں نمائش پر پابندی عائد کی۔ رام لیلا دراصل بھگوان رام چندر اور راون کے مابین ہزاروں سال پہلے لڑی جانے والی جنگ کا احوال ہے۔ فلم کے خلاف ایک ہندو تنظیم ''پربھو دھرمک رام لیلا'' کی جانب سے عدالت میں درخواست دائر کی گئی کہ اس فلم کے متنازعہ اور قابل اعتراض مکالموں سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ نیز فلم میں بھگوان سمیت دیگر ہندوؤں کی بے حرمتی اور تضحیک کی گئی ہے۔

جب بھارت میں بالی وڈ فلم ساز مہیش بھٹ اور مکیش بھٹ کی متنازعہ فلم ''یارب'' جہاد اگینسٹ ٹیررازم'' ریلیز ہوئی تو بھارتی مسلمانوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تو ہندو تنظیموں نے اسے آزادی اظہار کے خلاف قرار دیا اور مسلمانوں کو برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کرنے کا درس دیا۔ ایک متشدد اور انتہا پسند ہندو تنظیم آر ایس ایس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مسلمانوں کو ایسی فلم قبول نہیں تو انہیں پاکستان چلے جانا چاہیے۔

1995ء میں بھارتی ہٹلر بال ٹھاکرے نے سلمان رشدی کے تازہ ناول ''مورز لاسٹ سائی'' (The Moor's Last Sigh) پر شدید تنقید اور احتجاج کیا جس میں اسے بدمعاش سیاسی ٹھگ کے روپ میں پیش کیا گیا۔ بال ٹھاکرے نے رشدی کا ناول پڑھنے کے بعد اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ بال ٹھاکرے کے چالیس ہزار سے

زائد کارکنوں نے دھمکی دی کہ کوئی بھی شخص اس ناول کو بمبئی میں فروخت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ناول کا مرکزی کردار رامن فیلڈنگ (Roman Fielding)، بال ٹھاکرے کی طرح ہندوؤں کا مذہبی رہنما بننے سے پہلے ایک کارٹونسٹ تھا۔ بال ٹھاکرے اور اس کے ماننے والے بمبئی کو موبئی کہتے ہیں، جبکہ فیلڈنگ کی پارٹی کا نام بھی موبئی ایکسز ہے، چونکہ ناول کے کردار اور بال ٹھاکرے کا مقصد مشترکہ ہے اور وہ ہے بھارت کو مسلمانوں سے پاک کرنا اور ہٹلر کے معتقد فیلڈنگ کا مقصد بھی یہی ہے۔ بال ٹھاکرے نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے ملک میں جو کرتے ہیں، اس سے دوسرے ممالک میں رہنے والوں کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ بال ٹھاکرے نے کہا کہ رشدی کا ناول ایک بھونڈی نقل ہے۔ رشدی کے ناول میں کارٹونسٹ فیلڈنگ کو کرکٹ سے لگاؤ رکھنے والا بتایا گیا ہے اور اس کی گیارہ رکنی ٹیم ہے جو اس نے اپنے دشمنوں کو برباد کرنے کے لیے بنا رکھی ہے۔ اسی طرح بال ٹھاکرے کو بھی کرکٹ سے بہت دلچسپی ہے۔ بال ٹھاکرے ان بھارتی رہنماؤں میں ہے جنہوں نے رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' کی بھارت میں پابندی کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ جذبات کی آزادی ہر ایک کو ہونی چاہیے لیکن جب رشدی نے اس پر کتاب لکھی تو بال ٹھاکرے چیخ رہا ہے۔

جون 2015ء میں ہندی کے معروف مصنف ڈاکٹر کاشی ناتھ سنگھ کی کتاب ''کاشی کا اسی'' پر مبنی فلم ''محلّہ اسی'' ریلیز ہونے سے پہلے ہی تنازعات کا شکار ہوگئی۔ اس فلم کے مبینہ ٹریلر پر ایف آئی آر درج کر لی گئی جس میں اداکار سنی دیول، اداکارہ ساکشی تنور کے علاوہ فلم کے ہدایتکار چندر پرکاش دویدی کے نام شامل ہیں۔ یہ ایف آئی آر وارانسی کے قصبے سومیرو پیٹھ کے شنکر اچاریہ سوامی نگیند رنند سرسوتی نے درج کروائی۔ دراصل ''محلّہ اسی'' کے دومنٹ کے ٹریلر میں ایک طرف تو ایک مخصوص گالی کو بنارس کا ذائقہ کہا گیا جبکہ دوسری طرف ہندوؤں کے دیوتا بھگوان شیو کے روپ میں فنکار دیا شکر پانڈے اپنے عقیدت مند سنی دیول کو گالی دے رہے ہیں۔ شیو کے روپ میں گالی دینے پر سب سے زیادہ اعتراض کیا گیا۔ سوامی جی کا کہنا تھا کہ ''اس ٹریلر سے ملک اور مخصوص مذہبی برادری کی ساکھ متاثر ہوئی ہے۔ ہم اس فلم کو پورے ملک میں ریلیز نہیں ہونے دیں گے''۔

دسمبر 2014ء میں ایک امریکی کمپنی نے اپنی بیئر کے کین اور بوتلوں پر بھارت کے 'بابائے قوم' مہاتما گاندھی کی تصویر شائع کی جس پر حیدرآباد بھارت میں اس کمپنی کے

خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ مقدمہ دائر کرنے والے کا کہنا تھا کہ شراب کے کین پر گاندھی کی تصویر اور ان کی تفصیل، بھارتی قوانین کے تحت قابل سزا جرم ہے۔ اس بیئر برانڈ کا نام 'گاندھی باٹ' ہے۔ نیو انگلینڈ کمپنی کے مطابق گاندھی باٹ میں امریکی ہوپس کی تین اقسام کی بیئر کا مرکب ہے۔ حیدر آباد کے وکیل سنکاری جنار دن نے میٹروپولیٹن مجسٹریٹ، سائبر آباد کے سامنے داخل کی جانے والی درخواست میں کہا تھا کہ بیئر کے کین پر گاندھی کی تصویر اور ان کی تفصیل، بھارتی قوانین کے تحت قابل سزا جرم ہے۔ پٹیشن کے مطابق یہ جرم 'پریونشن آف انسلٹس ٹو نیشنل آنر ایکٹ، **1971**ء اور تعزیرات ہند (آئی پی سی) کی 'دفعہ **124**۔اے، (اشتعال انگیز الفاظ، پیغام یا تصویر کا استعمال) کے تحت آتا ہے۔

یاد رہے کہ مہاتما گاندھی کو بھارت میں بابائے قوم کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں کرنسی نوٹوں سمیت تمام سرکاری دفاتر اور بیرون ممالک سفارت خانوں میں ہر جگہ اس کی تصویر آویزاں ہے۔ بھارت میں اس کی شان میں گستاخی کرنا جرم ہے۔ لیکن جب سے بی جے پی اقتدار میں آئی ہے، مہاتما گاندھی کے قاتل نتھو رام گاڈسے کو ہیرو کا درجہ دینے کی تحریک چلائی جا رہی ہے۔ **2015**ء میں مہاسبھا کے صدر چندر پرکاش کی طرف سے وزیر اعظم کو لکھے جانے والے خط میں اس کیس کو ری اوپن کرنے کا کہا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نتھو رام نے یہ قتل شوقیہ نہیں بلکہ ملک وملت کے وسیع تر مفاد میں بحالت مجبوری کیا تھا۔ اب بھارت کے معروف شہروں میں نمایاں مقامات پر اس قاتل کے مجسمے نصب کرنے کا پروگرام ہے۔ اس کے نام پر مندر تعمیر کیے جا رہے ہیں، فلمیں ریلیز ہو رہی ہیں، لوک سبھا میں یہ بھی کہا گیا کہ قاتل مقتول سے کہیں بہتر ہے۔

مئی **2015**ء میں بالی وڈ کی سپر سٹار اداکارہ پرینکا چوپڑا نے کہا کہ امریکہ میں قیام کے دوران وہ اس قدر نسلی تعصب کا شکار ہوئیں کہ انہیں بالآخر امریکہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ پرینکا چوپڑا نے بی بی سی ہندی کو بتایا کہ وہ **12** برس کی عمر میں تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ گئی تھیں لیکن اس دوران اس قدر نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان کے جذبات مجروح ہوئے اور وہ وطن واپس لوٹ آئیں۔ پرینکا چوپڑا نے کہا کہ 'میں نے زندگی میں بہت نسلی تعصب برداشت کیا ہے، مجھے یاد ہے جب میں امریکن سکول میں پڑھتی تھی تب مجھے سب ''براؤنی'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔'

جون 2015ء میں یروشلم فلم فیسٹیول میں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کے قاتل پر مبنی ڈاکومنٹری فلم کی نمائش کے فیصلے سے تنازعہ پیدا ہوگیا۔'بیونڈ دی فیر' (Beyond the Fear) ڈاکومنٹری میں 1995ء میں اسحاق رابن کو قتل کے بعد عمر قید کی سزا پانے والے ایگال عامر (Yigal Amir) کی جیل میں زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ڈاکومنٹری فلم لیٹویا میں پیدا ہونے والے ڈاکومنٹری ڈائریکٹر ہرز فرنک کا آخری کام ہے، وہ اس ڈاکومنٹری کی تیاری کے دوران انتقال کر گئے تھے۔ وائی نیٹ ویب سائٹ کے مطابق بہت سارے اسرائیلی شہری اس بات پر برہمی کا اظہار کر رہے ہیں کہ یہ فلم ایگال عامر کے جرم کے بجائے ان کی ذاتی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ اس فلم میں ایگال عامر کی اہلیہ لاریسا ٹرمبولر کے انٹرویوز بھی شامل ہیں جس نے جیل میں ان کے ساتھ شادی کی تھی۔ اس کے علاوہ ایگال عامر کے فون پر اپنے بچے کو رات کے وقت کہانیاں سنانے کے مناظر بھی شامل ہیں۔ اسرائیل کے سیاسی حلقوں میں بھی اس فلم کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ سابق صدر شمون پیریز، اسحاق رابن کے دوست اور قریبی ساتھی تھے، وہ کہتے ہیں کہ یہ 'ایک ہولناک قاتل کو جائز قرار دینے کی کوشش' ہے۔ اسحاق رابن کی پوتی نوا روتھمن نے فلم سازوں پر 'انہیں نقصان پہنچانے کے غرض سے آزادی اظہار رائے کے استعمال' کا الزام عائد کیا ہے۔

فروری 2015ء میں چینی حکام نے 7 ہزار ٹوائلٹ رول اور 20 ہزار ٹشو کے پیکٹ پکڑے ہیں جن پر ہانگ کانگ کے چیف ایگزیکٹو 'سی وائی لیونگ' کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ہانگ کانگ کی ڈیموکریٹک پارٹی نے جوان ٹشو کے پیکٹوں کو اگلے ہفتے ہونے والے ایک میلے میں بیچنا چاہتی تھی، حکام کی جانب سے ان کو قبضے میں لینے کو اظہار رائے کی آزادی کی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ ٹشو کے پیکٹ جمعے کے روز چین میں ایک فیکٹری سے ضبط کیے گئے۔ ہانگ کانگ کے چیف ایگزیکٹو لیونگ عوام میں خاصے غیر مقبول ہیں اور حالیہ برسوں میں ان کا مذاق اڑانے والی اس طرح کی مصنوعات بڑی تعداد میں فروخت ہوئی ہیں۔ ضبط کیے گئے ٹشوں پر چین کے حمایت یافتہ لیڈر کے متعلق مختلف تضحیک آمیز پیغامات لکھے ہوئے تھے۔

پاکستانی نژاد برطانوی باکسر عامر خان کو ویزہ جاری کرنے کے باوجود امریکہ میں داخلے سے روک دیا گیا۔ عامر نے لاس اینجلس میں باکسنگ مقابلہ دیکھنے جانا تھا۔ برطانوی اخبار کے مطابق امریکہ میں داخلے سے روکے جانے کی اطلاع عامر خان نے سماجی ویب

سائٹ پر دی اور انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ عامر خان کا کہنا تھا کہ انہیں ہفتے کو لاس اینجلس میں شیڈول باکسنگ فائٹ دیکھنے امریکہ جانا تھا۔ عامر خان کو 2010ء میں ویزہ مسائل کی وجہ سے امریکہ میں پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اس وقت انہیں کسٹم حکام نے دو گھنٹے سے زائد صرف اس لیے روکے رکھا کہ وہ ایک مسلمان ہیں۔

مئی 2014ء میں بھارتی ریاست اتر پردیش میں انتہا پسند طلباء نے کشمیری طلبا کو پاکستان کے خلاف نعرے نہ لگانے پر تشدد کا نشانہ بنایا۔ واقعہ کے خلاف کشمیری طلبا نے شدید احتجاج کیا۔ اتر پردیش کی ایک یونیورسٹی میں انتہا پسندوں نے رات کے اندھیرے میں ہاسٹل پر حملہ کر دیا اور سوتے ہوئے کشمیری طلبہ کو کمروں سے نکالا، خوب مارا پیٹا اور کہا پاکستان مخالف نعرے لگاؤ۔ جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو ان کی شدید پٹائی کی گئی۔ ایک طالب علم شوکت کا کہنا تھا کہ ایسے واقعات کے بعد کشمیری طلبہ بھارت کے تعلیمی اداروں میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ واقعے پر بھارت بھر کے کشمیری طلبہ مشتعل ہیں۔ گریٹر نوئیڈا یونیورسٹی کے طالبعلموں نے ہاسٹل کے باہر احتجاج بھی کیا۔ یہ پہلی بار نہیں کہ بھارتی تعلیمی اداروں میں کشمیریوں کو تعصب کا نشانہ بنایا گیا ہو، پہلے بھی اسی گریٹر نوئیڈا یونیورسٹی کے 6 کشمیری طلبہ کو فارغ کیا جا چکا ہے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ایشیا کپ میں پاکستان کے ہاتھوں بھارت کی شکست پر خوشی منائی تھی۔ اسی جرم پر میرٹھ یونیورسٹی کے 67 کشمیری طلبا بھی معطل کر دیئے گئے تھے۔

اکتوبر 2016ء میں بھارتی ریاست جھاڑکھنڈ کے رہائشی نوجوان کو گائے کی توہین کے الزام میں دوران حراست شہید کر دیا گیا۔ منہاج انصاری کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے بعض ہندو دوستوں کو واٹس اپ میسیج میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام کی رو سے گائے کا گوشت کھانا حلال ہے۔ واضح رہے کہ ہندو نوجوانوں نے واٹس ایپ پر پروپیگنڈا مہم شروع کر رکھی ہے کہ قرآن میں گائے کا گوشت کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ (معاذاللہ)۔ منہاج انصاری نے اپنے پیغام میں واضح کیا کہ قرآن میں ایسے کوئی احکامات نہیں ہیں اور یہ کہ گائے کا گوشت کھانا اسلامی شریعت میں حلال ہے۔ تاہم اس کی وضاحت کو ''گئو ماتا'' کی توہین سے عبارت سمجھا گیا اور مقامی ہندوؤں نے پولیس اسٹیشن میں منہاج کے خلاف گائے کی توہین کا کیس درج کرا دیا۔ دوسری جانب جھاڑکھنڈ کے نارائن پورہ پولیس اسٹیشن میں متعصب ہندو اہلکاروں نے منہاج پر ایسے انسانیت سوز تشدد ڈھائے کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر خالق

حقیقی سے جاملا۔ انڈیا ٹو مارو کی رپورٹ کے مطابق جھاڑ کھنڈ کے راجندرا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے سپرنٹنڈنٹ نے تصدیق کی ہے کہ بائیس سالہ منہاج انصاری کو شدید زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شدید تشدد کی تصدیق کی ہے اور بتایا ہے کہ منہاج انصاری کی کمر، ٹانگوں اور سر سمیت ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں کی متعدد ہڈیاں کند ہتھیار کی ضربوں کے سبب ٹوٹ چکی تھیں۔ انڈیا ٹو مارو کی رپورٹ میں مزید انکشاف کیا گیا ہے کہ 2 اکتوبر کو گرفتاری کے بعد منہاج کو ایک ہفتے تک بھوکا پیاسا رکھ کر بدترین تشدد کیا گیا تھا جس کے سبب 9 اکتوبر کو وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔

ستمبر 2015ء میں بھارت کی ریاست اتر پردیش میں گائے کا گوشت کھانے کی افواہ اُڑا کر ایک مسلمان شخص اخلاق احمد کے گھر ہندوؤں نے دھاوا بول کر اُسے قتل کر دیا جبکہ اس کے بھائی دانش کو شدید زخمی کر دیا۔ تحقیقات میں پتہ چلا کہ اس سازش میں بی جے پی کے لیڈر سنجیرانا کے بیٹے وشال نے مندر سے اسپیکر پر اعلان کرایا تھا کہ اس گھر میں گائے کا گوشت ہے جس پر سینکڑوں ہندوؤں نے گھر پر حملہ کر دیا۔ اس واردات پر بھارتی سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس کانجو نے کہا کہ گائے کسی کی ماتا نہیں ہوسکتی، یہ محض ایک جانور ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ گائے کے گوشت کے نام پر محمد اخلاق کا قتل سیاسی محرکات کے سبب کیا گیا۔ جنتا دل کے صدر لالو پرساد نے ایک بیان میں سوال کیا، کیا ہندو بیف نہیں کھاتے؟ اسی حوالے سے انہوں نے مزید کہا کہ جو ہندو بیرون ممالک جاتے ہیں وہ بیف کھا رہے ہیں کہ نہیں؟ اپنے آپ کو ہندو کہنے والے بھی تو بیف کھا رہے ہیں۔ جو گوشت کھاتے ہیں ان کے لیے گائے اور بکرے کے گوشت میں کیا فرق ہے؟ لالو نے الزام لگایا کہ بی جے پی اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) (Rashtriya Swayamsevak Sangh) بیف کا نام لے کر پورے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ 21 اکتوبر 2015ء کو آر ایس ایس کے ترجمان نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ویدوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ گائے مارنے والے پاپی کو قتل کرنا کوئی گناہ نہیں۔ 6 اکتوبر 2015ء کو بھارتی ریاست اتر پردیش میں ہندو مسلم فسادات کرانے کی سازش ناکام ہوگئی۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق آر ایس ایس کا ایک کارکن مسلمان لڑکی کا روپ دھارے مندر میں گوشت پھینک رہا تھا کہ اسے رنگے ہاتھوں شہریوں نے پکڑ لیا۔ خدانخواستہ یہ بھیانک سازش کامیاب ہوجاتی تو پورے بھارت

میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ 16 اکتوبر 2015ء کو بھارت کی ریاست ہریانہ کے وزیر اعلیٰ منوہر لعل کھتر نے کہا کہ مسلمانوں کو بھارت میں رہنا ہے تو انہیں گائے کا گوشت کھانا چھوڑنا ہی ہوگا۔ 19 اکتوبر 2015ء کو انتہا پسند حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی کے سربراہ نے کہا کہ گائے کا گوشت کھانے والے کو ہر صورت پھانسی دینی چاہیے۔ ممبئی میں احتجاج کرنے والے مسلمانوں پر پولیس نے اندھا دھند تشدد کیا اور کہا کہ پاکستان چلے جاؤ، یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔

جناب اشتیاق بیگ اپنے کالم ''بھارتی گائے مسلمان کی زندگی سے قیمتی'' میں لکھتے ہیں:

''بھارت جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور سیکولرازم کا علمبردار قرار دیتا ہے، میں گزشتہ دنوں پیش آنے والے واقعہ نے بھارت کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے بے نقاب کردیا ہے۔ یہ واقعہ بھارتی ریاست اتر پردیش میں پیش آیا جہاں گائے کا گوشت کھانے کے شبہ میں انتہا پسند ہندوؤں نے 50 سالہ اخلاق احمد کو تشدد کرکے شہید جبکہ بیٹے کو شدید زخمی کردیا۔ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کچھ شرپسند ہندوؤں نے علاقے میں افواہ پھیلا دی کہ اخلاق احمد کے گھر میں گائے کا گوشت کھایا جارہا ہے جو فریج میں رکھا ہے جس کے بعد ''گائے بچاؤ تنظیم'' کے 200 سے زائد انتہا پسند ہندوؤں نے اخلاق احمد کے گھر پر دھاوا بول کر انہیں بیٹے سمیت گھر سے باہر گھسیٹ کر تشدد کا نشانہ بنایا اور اینٹوں سے مارا۔ اس دوران دونوں باپ بیٹے اور اہل خانہ، انتہا پسند ہندوؤں کو یقین دلاتے رہے کہ ان کے گھر میں رکھا گوشت گائے کا نہیں بلکہ بکرے کا ہے مگر انتہا پسند ہندوؤں نے ان کی ایک نہ سنی اور دونوں کو تشدد کا نشانہ بناتے رہے جس کے نتیجے میں اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا جبکہ بیٹے کو تشویشناک حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ واقعہ کے دوران پولیس خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہی اور بعد ازاں گوشت قبضے میں لے کر ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری بھیج دیا گیا جس کی رپورٹ میں مقتول اخلاق احمد اور ان کے اہل خانہ کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ گھر میں رکھا گوشت گائے نہیں بلکہ بکرے کا تھا۔ بھارت میں کسی مسلمان کے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل کئی واقعات پیش آچکے ہیں۔ جن میں 2014ء میں پیش آنے والا واقعہ بھی شامل ہے جب پولیس نے گائے ذبح کرنے کے الزام میں ایک مسلمان کے خلاف مقدمہ درج کیا جس کے بعد ہندو انتہا پسندوں نے مسلمان کو قتل کردیا۔ اسی طرح رواں سال مارچ

میں ایک ایسی ویڈیو منظر عام پر آئی جس میں ہاتھ بندھے مسلمان کو تشدد کرتے ہوئے گائے کی پوجا پر مجبور کیا جا رہا تھا جس کا جرم صرف گائے خریدنا اور بیچنا تھا۔

بھارت میں کچھ ایسی ریاستوں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد ہے جن میں ریاست اتر پردیش اور مقبوضہ کشمیر بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر کے مسلمان اس بار عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی کرنے سے محروم رہے۔ بھارتی حکومت کی پابندی کے خلاف گزشتہ دنوں کشمیر اسمبلی کے اجلاس کے دوران رکن اسمبلی انجینئر راشد جب اپنے پیش کیے گئے بل پر بحث کے لیے کھڑے ہوئے تو ہندو انتہا پسند جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کے اراکین نے انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جبکہ دیگر مسلمان اراکین کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے بل کی حمایت کی تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ انجینئر راشد نے اس سے قبل کشمیر اسمبلی میں یہ انکشاف کیا تھا کہ نریندر مودی کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے بھارت میں 600 سے زائد فرقہ وارانہ مسلم کش فسادات ہوئے ہیں جن میں کئی مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مودی حکومت اپنے اقتدار کے محل کو مسلمانوں کی لاشوں پر کھڑا کرنا چاہتی ہے۔

یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ بھارت کے ان علاقوں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، میں گائے ذبح کرنے اور گائے کا گوشت کھانے پر پابندی عائد ہے مگر بھارت کی عیسائی اکثریت ریاست گوا میں گائے کا گوشت کھانے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ بھارت کا شمار دنیا میں گائے کا گوشت ایکسپورٹ کرنے والے ممالک میں سرفہرست ہوتا ہے جو بڑی مقدار میں خلیجی و عرب ممالک کو گائے کا گوشت ایکسپورٹ کرتے ہیں جس سے بھارت اور دیگر ممالک کو کثیر زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے مگر بھارتی حکومت نے گائے کے گوشت کی ایکسپورٹ پر کبھی پابندی عائد نہیں کی۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے جب مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی جدوجہد کا آغاز کیا تو انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ''برصغیر میں مسلمان اقلیت نہیں بلکہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان میں مقیم دو بڑی قومیں یعنی مسلمان اور ہندو کبھی ایک قوم بن کر نہیں رہ سکتیں کیونکہ ان کے مذہب اور زندگی گزارنے کے طریقے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا مسلمانوں کا الگ وطن کا مطالبہ ان کا بنیادی حق ہے، مسلمان

ایسی مملکت چاہتے ہیں جہاں انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو اور وہ اپنے مذہبی عقائد پر بلاخوف وخطر عمل کر سکیں''۔ آج کئی دہائیاں گزرنے کے بعد قائداعظم کا یہ قول سچ ثابت ہو رہا ہے اور بھارت کے مسلمان یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ کم تر درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے اور انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف بڑھتی ہوئی مذہبی عصبیت ایسے پاکستانیوں کے لیے سبق آموز ہے جو تقسیم ہند کو قائداعظم کی سنگین غلطی قرار دیتے ہیں۔

اتر پردیش میں پیش آنے والا حالیہ واقعہ امت مسلمہ کے لیے باعث تشویش ہے جس سے بھارت میں رہنے والا ہر مسلمان خوف کا شکار ہے۔ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی جن کے ہاتھ مسلموں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، کی مسلم دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ جب گجرات کے وزیراعلیٰ تھے تو ان کے دور میں ہونے والے فسادات کے دوران ایک ہزار سے زائد مسلمانوں کو شہید کیا گیا مگر نریندر مودی نے آج تک اس کی مذمت نہیں کی۔ اسی طرح مودی نے جنونی ہندوؤں کے ہاتھوں اخلاق احمد کے سفاکانہ قتل کی ابھی تک مذمت نہیں کی ہے بلکہ ان کی انتہا پسند جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینئر رہنما اور وزراء گائے کا گوشت کھانے کے شبہ میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمان کے قتل کو درست قرار دے رہے ہیں جبکہ انہوں نے یہ کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا ہے کہ ''جو بھارتی مسلمان گائے کا گوشت کھائے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ پاکستان چلا جائے''۔

اپنے آپ کو سیکولر ریاست کہلانے والے ملک بھارت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ملک میں آباد تمام اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ یقینی بنائے اور ایسے اقدامات کرے کہ ملک کی تمام اقلیتیں اپنے مذہبی عقائد کے مطابق بلاخوف وخطر زندگی گزار سکیں۔ سمجھوتہ ایکسپریس کو واہگہ بارڈر پر روکنا، شیوسینا کی مخالفت پر بھارت میں پاکستانی گلوکار غلام علی کے کنسرٹ کی منسوخی اور حال ہی میں ممبئی میں پاکستان کے سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی کتاب کی تقریب رونمائی کے آرگنائزر سدھیندرا کلکرنی کے چہرے پر شیوسینا کے انتہا پسندوں کی جانب سے کالک ملنا جیسے واقعات دنیا میں نام نہاد بھارتی سیکولرازم کا چہرہ بے نقاب کر رہے ہیں جس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں اور طالبان میں کوئی فرق نہیں اور مودی کے بھارت میں گائے، مسلمان کی زندگی

سے زیادہ قیمتی ہے‘‘۔(روزنامہ جنگ لاہور، 14 اکتوبر 2015ء)

اسلام نے تو 14 سو سال پہلے ہی یہ بات قرآن کریم کی واضح آیت سے طے کر دی ہے کہ دین کے قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ویسے بھی عقیدہ دل کا فعل ہے۔ جب تک کوئی شخص خود سے راضی نہ ہو، اس کے دل کا فعل ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا مذہب پر مجبور کرنا شرعاً اور عقلاً دونوں طرح منع ہے۔ آج کی مہذب دنیا بھی اس کی قائل ہے کہ مذہبی نظریات میں جبر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مغربی دنیا تو اس معاملے میں اسلام پر بھی اعتراضات کرتی رہتی ہے کہ وہ تلوار کے ذریعے پھیلا ہے، گو اس اعتراض میں ذرا برابر بھی کوئی حقیقت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام اور جدید عصری تعلیمات اس پر متفق ہیں کہ مذہب میں سختی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک ہزار سال حکومت کرنے کے باوجود مسلمانوں کی اقلیت، اکثریت میں نہ بدلی، کیونکہ مسلمان زورا زوری کے قائل نہ تھے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں ایک ہزار سالہ غلامی اور انگریزوں کے دور کے اندر مسلمانوں کی جانب سے غیر متعصب سلوک کے باوجود ہندو قوم پرست تنظیمیں اسلام کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے جانے دینے پر تیار نہیں۔

بھارتی انتہا پسند تنظیمیں خاص طور پر راشٹریہ سوام سیوک سنگھ، آر ایس ایس، بجرنگ دل، وشوا ہندو پریشد، بی جے پی اور سناتھن سنستھا آئے روز مسلمانوں کے خلاف گھناؤنی سازشیں کرتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی ہو جائے تو پورے ملک میں واویلا مچ جاتا ہے۔ کوئی ہندو لڑکی اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے کسی مسلم نوجوان سے شادی کر لے تو مسلم کش فسادات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ 8 دسمبر 2014ء کو کثیر الاشاعت بھارتی انگریزی روزنامہ ’’ٹائمز آف انڈیا‘‘ اور ہندی اخبار ’’نو بھارت ٹائمز‘‘ کے مطابق بھارتی شہر آگرہ کے علاقے مادھونگر میں ’’ہندوؤں کی گھر واپسی‘‘ کے نام پر دو سو سے زائد مسلمانوں کو طاقت کے بل بوتے پر زبردستی ہندو مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا گیا مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی بلکہ الٹا مسلمانوں کو دھمکا کر ان کی زندگیاں اجیرن بنائی گئیں۔ یہ مکروہ کارروائی آر ایس ایس کی ذیلی تنظیم ’’دھرم جاگرن منچ‘‘ اور ’’بجرنگ دل‘‘ کی سرپرستی میں انجام پائی۔ آر ایس ایس کے صوبائی سربراہ ’’راجیشور سنگھ‘‘ نے اس مہم کو کامیاب قرار دیا۔ ہندو انتہا پسند تنظیموں کا کہنا تھا کہ انگلینڈ میں رہنے والے انگریز، جرمنی میں رہنے والے جرمن، امریکہ میں رہنے والے امریکی ہیں تو پھر ہندوستان میں بسنے والے سب لوگ ہندو کیوں نہیں ہو

سکتے؟ یہاں جس کسی کو رہنا ہے، اسے ہندو ہی ہونا چاہیے۔ یہ اس ملک کا حال ہے جو پوری دنیا میں اپنے سیکولرازم کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔

''روزنامہ اسلام'' اپنے اداریہ ''بھارت میں اقلیتوں کو درپیش مسائل میں اضافہ'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ آج کی ترقی یافتہ اور جدید تمدن وتہذیب کی علم بردار دنیا میں اقلیتوں کے تحفظ کا ڈھنڈورا زور وشور سے پیٹا جا رہا ہے اور اقلیتی برادری کو درپیش سماجی، مذہبی اور تہذیبی مسائل کو اجاگر کرنے اور انہیں لاحق مشکلات کے حل کے ضمن میں اونچے پیمانے پر سیمینار، جلسے جلوس اور عوامی اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس جدوجہد کا مقصد دنیا سے مذہبی منافرت اور عدم مساوات کا خاتمہ اور سرعت پذیر متشدد رویوں کی اصلاح باور کرایا جاتا ہے، لیکن یہ بھی عجب دہرا معیار اور کھلا تضاد ہے کہ یہ تمام تر کوششیں یک طرفہ اور سراسر تعنت وعناد اور تعصب پر مبنی ہیں۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ امن، مساوات، انصاف، ترقی، انسانی فلاح و بہبود اور آزادیٔ اظہار رائے کے نام نہاد اصول وضوابط کو عالم انسانیت پر لاگو کرنے کی خواہش مند قوتیں صرف غیر مسلم اقلیت کے حقوق کی نگہداشت یقینی بنانے اور ان کا حل ڈھونڈنے کی باتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں، جبکہ مختلف غیر اسلامی ریاستوں میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کی زبوں حالی اور تباہی پر دو حرف منہ سے نکالنا گوارا نہیں کیا جاتا۔ اس تناظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ صورت حال دنیا کو خوف ناک تصادم اور ٹکراؤ کی جانب دھکیلنے کی شعوری کوشش ہے۔

بھارت بصد افتخار خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوری اور سیکولر ریاست کہلانا پسند کرتا ہے لیکن وہاں گزشتہ چھ عشروں سے زائد جو کچھ مسلمانوں پر بیت رہی ہے، آج تک اس پر امریکا، برطانیہ، جرمنی، فرانس، روس اور اقوام متحدہ سمیت دیگر عالمی ادارے چیں بجبیں نہیں ہوئے۔ بھارت میں کھلم کھلا مسلمانوں کی نسل کشی کی جاری ہے، انہیں امتیازی قوانین اور نفرت انگیز رویوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، نیز روزگار، ترقی، تعلیم، صحت اور زندگی کے مختلف شعبوں میں قصداً انہیں پیچھے رکھنے کی کوششیں عروج پر ہیں۔ اس پر مستزاد متشدد ہندوؤں کی علم بردار جماعت بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے مسلمانوں کو جبراً مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ خدانخواستہ یہی کچھ پاکستان میں پیش آتا تو اب تک اس کی

مذمت وقباحت میں آسمان زمین ایک کر دیئے جاتے، بین الاقوامی ذرائع ابلاغ اسے موضوع بحث بنا لیتے اور اس موقع پر عالمی طاقتیں سیاسی، سفارتی، اخلاقی اور اقتصادی دباؤ ڈال کر اپنے مفادات کی تکمیل سے نہ چوکتیں۔ اگرچہ مخفی طاقتوں کی جانب سے وطن عزیز میں وقفے وقفے سے ایسا ماحول پیدا کیا جاتا رہا ہے جس کے تحت دنیا کو پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کے غیر محفوظ اور مسائل میں گھرے ہونے کا تاثر دیا جا سکے اور لوگوں کو یقین دلایا جا سکے کہ پاکستان میں اقلیتی برادری کے استیصال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جا رہا، تاہم ہر منصف مزاج، سنجیدہ اور باشعور انسان اس حقیقت تک بآسانی رسائی رکھتا ہے کہ مختلف عوامل کی بنا پر بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے اندر اقلیتوں کے حقوق زیادہ محفوظ ہیں اور ان کے لیے مملکت خداداد میں اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کی ادنیٰ قدغن بھی موجود نہیں۔ روز روشن کی طرح ظاہر اس حقیقت کو دیکھنے کے بعد دنیا کی نگاہوں سے فریب کی پٹی اتر جانی چاہیے اور پاکستان کے خلاف بے بنیاد اور شرانگیز پروپیگنڈا مہم کا خاتمہ کیا جانا چاہیے''۔(روزنامہ اسلام کراچی 4 مئی 2015ء)

جولائی 1997ء کے پہلے ہفتے فلسطین میں غزہ کی پٹی کے نزدیک، جہاں مقام الخلیل پر یہودیوں نے مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود نئی بستیاں بسانی شروع کر دی تھیں، ایک یہودی عورت نے دانستہ دیواروں پر ایسے پوسٹر چسپاں کیے جس میں نبی کریم ﷺ اور قرآن حکیم کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ یہ پوسٹر انتہائی دل آزار تھا، جس کے چسپاں ہوتے ہی فلسطینی مسلمانوں میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ہر جگہ مظاہرے کیے اور اسرائیلی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس عورت کے پیچھے اس گروہ کو سخت سزا دے جس نے دراصل یہ کام کروایا ہے۔ اس پوسٹر کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہنگاموں میں اسرائیلی فوجیوں نے پانچ فلسطینی شہید کر دیے۔ امریکہ میں مقیم یہودیوں نے یک آواز اعلان کیا کہ الخلیل میں جس یہودی عورت نے حضور نبی پاک ﷺ کے بارے میں دل آزار پوسٹر چسپاں کیے، وہ درست اور حقیقت پر مبنی تھے۔ نیو یارک سے شائع ہونے والے معروف یہودی ہفت روزہ ''دی جیوش ویک'' (The Jewish Week) نے 11 جولائی 1997ء کے شمارے میں اس ملعون عورت کے حق میں ایک طویل اداریہ تحریر کرتے ہوئے اسے اسرائیل اور عالمی یہودیوں کی ''مجاہدہ'' کے لقب سے یاد کیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جبکہ دوسری طرف فروری 2013ء کو

اسرائیل نے 33 سالہ فلسطینی کارٹونسٹ محمد صبا (Muhammad Saba'aneh) کو مغربی کنارے سے گرفتار کیا اور اس پر بے پناہ تشدد کیا۔ محمد صبا پر الزام ہے کہ اس نے اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف کارٹون بنائے جس سے حکومت کی تضحیک ہوئی۔

جرمنی کے علاقے ڈریسڈن میں مصری خاندان سکونت پذیر تھا۔ یہ مختصر سی فیملی تین افراد پر مشتمل تھی۔ علوی عکاظ شوہر، مروۃ الشربینی بیوی اور ان کا 3 سالہ پیارا معصوم سا بچہ مصطفیٰ۔ اسکندریہ (مصر) سے یہ فیملی مشرقی جرمنی شفٹ ہوگئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مروۃ الشربینی کے شوہر علوی عکاظ کو ڈریسڈن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی تھی اور وہیں ان کی جاب تھی۔ مروۃ الشربینی ایک دین دار خاتون تھیں، وہ شام کے وقت مقامی پارک میں چہل قدمی کے لیے گئیں۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا مصطفیٰ بھی تھا۔ حسب معمول مروۃ الشربینی نے حجاب زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان کے پاس ایک شخص ایلیکس وینز (Alex Wiens) آیا، اس نے نہ صرف حجاب کی مذمت کی، برا بھلا کہا بلکہ اس نے مروۃ الشربینی کو نازیبا کلمات کہے۔ مروۃ الشربینی ایک غیرت مند خاتون تھیں۔ انہوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یکم جولائی 2009ء کو مقدمے کی کارروائی کے دوران ایلیکس نے بھری عدالت کے اندر مروۃ الشربینی پر خنجر کے پے در پے وار کر کے انہیں شہید کر دیا اور جب ان کے شوہر انہیں بچانے کے لیے آئے تو سیکورٹی اہلکاروں نے ان پر فائرنگ کر دی جس سے وہ شدید زخمی ہوگئے۔ اس الم ناک اور دلسوز سانحہ پر پورا مغرب خاموش ہے۔ ہیومن رائٹس کی ساری تنظیموں کی زبانیں گنگ ہیں، آزادی اظہار اور جمہوریت کی دعویدار ریاستوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

؎ قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

ہفت روزہ ''ضرب مومن'' کراچی اپنے اداریہ ''رواداری کے دعویدار کہاں ہیں؟ میں لکھتا ہے:

''اس چھوٹے سے واقعے نے مغرب اور اس کے باشندوں کی ''انسان دوستی'' کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ مسلمان ممالک میں سیکولرازم، مغربیت کو رواج دینے کے لیے دولت کے منہ کھول دینے والے یہ مغربی ممالک خود مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ عورتوں کے حقوق کے علمبردار بننے والے خاتون کو بھری عدالت میں

قتل ہوتا دیکھتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بچانے والے شوہر کو گولی ماردی اور اب مغرب کے نزدیک ''عظیم'' کارنامہ انجام دینے والے اس کے قاتل کو بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مسلمان ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی مغربی خاتون کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تو پوری دنیا تڑپ اٹھتی لیکن شربینی کا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ باحجاب تھی۔ اس کے لیے تمام طعنے اس نے سہے اور پھر اس کے لیے شہید ہوگئی۔ ابھی تک نہ کسی مسلم سربراہ نے اس پر کوئی سخت ردِعمل دیا ہے اور نہ عالمی برادری کی طرف سے کوئی توانا آواز آئی ہے کیونکہ یہ واقعہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے''۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی 17 تا 23 جولائی 2009ء)

ستمبر 2013ء میں برطانیہ کے شہر لیسیسٹر (Leicester) میں دہشت گردی کا شکار ہونے والے ایک پاکستانی خاندان کو مذہبی تعصب کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجہ میں 17 سالہ بلال توفیق، 20 سالہ زینب، 15 سالہ جمال توفیق اور 45 سالہ ڈاکٹر شہنیلا توفیق اپنے گھر کے اندر جل کر خاکستر ہوگئے۔ یہ واقعہ برطانیہ جیسے محفوظ سمجھے جانے والے ملک کے ایک اہم ماڈرن شہر لیسیسٹر میں پیش آیا جہاں اس بدقسمت خاندان کے واحد زندہ بچ جانے والے سربراہ 55 سالہ ڈاکٹر توفیق ستار کا کہنا تھا کہ اس کے خاندان کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا جبکہ پولیس نے اس سلسلے میں 5 افراد کو حراست میں لیا ہے جس میں 3 خواتین اور 2 مرد شامل ہیں۔ پولیس کو شبہ ہے کہ یہ مسلمانوں سے نفرت کرنے والے کسی گروپ کی درندگی کا شاخسانہ ہے۔ عینی گواہوں کے مطابق جنہوں نے پولیس کو بیان دیا کہ کچھ لوگوں نے ڈاکٹر توفیق کے گھر جمعہ 13 ستمبر کی شب 12 بج کر 35 منٹ پر ایک بوتل پھینکی، شاید اس میں کوئی آتش گیر مادہ یا خطرناک کیمیکل تھا جس سے اس مکان میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس کے فوراً بعد ڈاکٹر شہنیلا توفیق کی چیخ سنائی دی جس میں وہ کہہ رہی تھیں ''پلیز سیو مائی چلڈرن!'' (میرے بچوں کو بچاؤ) ! اور اس کے بعد گھر میں خاموشی چھا گئی، صرف آگ بھڑکنے اور چیزوں کے جلنے اور چٹخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آگ اتنی شدت اور تیزی سے پھیلی کہ کسی کو اس بدقسمت خاندان کی مدد کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر توفیق ستار کا ڈبلن آئی لینڈ میں کلینک ہے اور وہاں وہ پریکٹس کرتے ہیں جبکہ ان کے بچے لیسیسٹر میں رہائش پذیر تھے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والا یہ ایک خالصتاً مذہبی گھرانا تھا اور اس گھرانے کے مذہبی ہونے کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی خواتین کی تصاویر بھی جاری نہیں کی گئیں، یہاں تک کہ جب

ایک اخباری نمائندہ شہنیلا توفیق کے والدین کے گھر پہنچا تو گھر والوں خاص طور پر خواتین نے درخواست کی کہ ان کی تصویر نہ بنائی جائیں کیونکہ یہ غیر شرعی عمل ہے۔ تاہم اس موقع پر اصرار کے بعد 75 سالہ والدہ کی تصویر بنانے کی اجازت دی گئی اور ان کے ماموں کی تصویر لینے کی اجازت دی گئی جبکہ مرحوم والد کی تصویر ریکارڈ میں سے نکال کر دی گئی۔ ڈاکٹر شہنیلا کی بیٹی زینت عالمہ کا کورس کر رہی تھی اور ایک ماہ کے بعد انہیں عالمہ کی باقاعدہ سند ملنے والی تھی۔ 17 سالہ بلال توفیق حافظ قرآن تھا، تراویح پڑھاتا تھا اور جمعہ کے خطبے میں اسے تقریر کرنی تھی جس کے لیے اس نے اپنے ایک دوست اور والد کو فون کر کے کہا کہ وہ جمعہ کے اجتماع میں ضرور شریک ہوں اور اس کی تقریر سنیں جس کے لیے اس نے بھرپور تیاری کی ہے۔ جبکہ تیسرا بیٹا جمال توفیق 24 سپارے حفظ کر چکا تھا اور بہت جلد اس نے بھی حفظ کے بعد عالم بننے کا کورس شروع کرنا تھا۔ ڈاکٹر توفیق خود بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور ان کی اہلیہ بھی ان سے زیادہ مذہبی رجحان رکھتی تھیں جس کی وجہ سے تمام بچے مذہب کی جانب زیادہ مائل تھے اور پولیس کو شبہ ہے کہ اس خاندان کو مذہبی تعصب کا نشانہ بنایا گیا۔

آزادی اظہار، آزادی اظہار کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے امریکہ اور مغربی ممالک کو کیا معلوم ہے کہ برما میں کوئی مسلمان اظہار رائے کی آزادی تو بڑی دور کی بات ہے، اس پر ایک لفظ تک ادا نہیں کرسکتا۔ آج کل برما کے مسلمانوں پر کس قدر ظلم وتشدد ہو رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برمی مسلمان جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انہیں معزول کر دیا گیا اور ان کی جگہ بدھسٹوں کو منتخب کرلیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے مال و جائیداد سرکاری تحویل میں لے لیے گئے ہیں۔ 300 سے زائد مدارس و مکاتب بند کر دیے گئے ہیں، ان کی کتابوں، اخبارات اور جرائد پر پابندی عائد کردی گئی، بچوں سے زبردستی بیگار لی جارہی ہے، نوجوانوں کو بے دریغ قتل کیا جارہا ہے، اب تک 35 ہزار کے قریب برمی مسلمانوں کو قتل کیا جاچکا ہے۔ مسلم راہنماؤں کو جیل میں بند کردیا گیا ہے۔ سرکاری فوج مسلمان خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کی مرتکب ہورہی ہے۔ انہیں مسلم نام رکھنے، قرآن مجید پڑھنے، مسجد میں جانے، روزہ رکھنے اور اذان دینے کی سختی سے ممانعت ہے، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے ملک ہجرت بھی نہیں کرسکتے۔ چھپ چھپا کر بے پناہ اذیتوں اور صعوبتوں کے بعد ہجرت کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ان کے سارے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لیے گئے ہیں۔ بدقسمتی

سے مسلمانوں کی اس حالت زار پر اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہی حالات عیسائیوں کے ہوتے تو اقوام متحدہ اس ملک پر حملہ کرنے کی منظوری دے دیتا۔

برما (موجودہ میانمار) کی حکومت نے 1982ء میں سٹیزن شپ قانون کی منظوری دی جس میں قرار دیا گیا کہ 1185 سے 1823 کے دوران برما میں آباد ہونے والوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ برمی شہری ہیں۔ اس قانون کا تاریک تر پہلو یہ تھا کہ جن لوگوں کے آباؤ اجداد 1823 کے بعد برما میں آئے تھے اور اسے اپنا مسکن بنایا تھا، وہ برما کے شہری نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو ایک ایسی سرزمین، جو صدیوں سے ان کا ''وطن'' تھی اور جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، میں اجنبی اور مہاجر قرار دے دیا گیا۔ اس قانون کی زد میں آنے والے وہ بدنصیب مسلمان تھے جنھیں آج دنیا ''روہنگیا'' کے نام سے جانتی ہے اور بدھ مت کے پیروکاروں نے میانمار کی سرزمین جن پر تنگ کر رکھی ہے۔ اپنے ہی دیس میں پردیسی بلکہ بے شناخت قرار دیئے جانے والے ان روہنگیا مسلمانوں پر اس سے قبل 1978ء میں قیامت توڑی گئی جب برمی حکومت نے انہیں ان کے آبائی علاقوں سے نکال کر بنگلہ دیش کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر عالمی برادری نے دباؤ ڈالا تو برمی حکومت نے بنگلہ دیش کے ساتھ ان روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے ایک معاہدہ کر لیا لیکن اس کے محض تین برس بعد ان مسلمانوں کو برما حکومت نے بیک جنبش قلم اجنبی قرار دے دیا تھا۔

سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برما کی حکومت کو آخر کیا ضرورت پیش آئی کہ اس نے مذکورہ سیٹیزن شپ لاء متعارف کروایا؟ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر قانون سازی ضروری ہی تھی تو پھر عالمی سطح پر تسلیم شدہ اخلاقی اور قانونی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مذکورہ بالا قانون کا ماضی پر اطلاق کرنا کیوں کر ضروری سمجھا گیا؟ حالانکہ اس حوالے سے 1949ء کے جنیوا کنونشن III کے آرٹیکل 99 کے پہلے پیراگراف میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکتا جس کا اطلاق ماضی پر کیا جا سکے۔

1994ء میں برمی حکومت نے روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے یہ قانون نافذ کر دیا کہ ان لوگوں کو شادی کے حوالے سے حکومتِ وقت سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا ہو گا، اُنہیں دو سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہے نیز اُنہیں اپنے گاؤں سے نکلنے کے لیے بھی خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کا پابند بنا دیا گیا۔ ان تمام قوانین کا واحد مقصد

روہنگیا مسلمانوں کو برما سے نکالنا ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسے گروپ کا قیام تھا جس کو کسی قسم کے انسانی، سیاسی یا سماجی حقوق حاصل نہ ہوں اور بدھ مت کے پیروکار جب چاہیں اور جس طرح چاہیں، ان کا خون بہا کر اپنے اندر کی حیوانیت کو خوش کرتے رہیں۔ برما کی حکومت، فوج اور سول سوسائٹی، روہنگیا مسلمانوں کے خلاف پرتشدد کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ آن سانگ سوکی (Aung San Suu Kyi) جیسی جمہوریت پسند اور امن دوست برمی رہنما کا ان مسلمانوں کے حق میں ہونا تو درکنار، ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی روادار نہیں ہے۔ بی بی سی کے معروف پروگرام بی بی سی ٹوڈے کی خاتون میزبان مشال حسین نے آن سانگ سوکی سے جب ایک انٹرویو میں میانمار میں مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں سخت سوالات کیے اور کہا کہ کیا آپ ان واقعات کی مذمت کرتی ہیں تو وہ اس پر آپے سے باہر ہو گئی اور غصے سے کہا:

"No one told me I was going to be interviewed by a Muslim"

گویا کسی مسلمان کے حقیقت پر مبنی سوالات کا جواب دینا ٹھیک نہیں۔ افغانستان میں طالبان نے بامیان میں بدھا کے قدیم مجسمے توڑ دیئے تھے تو پوری دنیا اُن کو کوسنے دینے میں لگ گئی تھی لیکن اسی بدھا کے پیروکاروں نے نہ جانے کتنے معصوم روہنگیا بچوں کو تہہ تیغ کر دیا لیکن کوئی آنکھ نم تک نہیں ہوئی۔ نہ جانے مسلمانوں کے خلاف یہ عالمی منافقت کب تک جاری رہے گی!

بدھ مت کی تعلیمات میں تشدد نہ کرنے کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن عملی صورتحال کچھ اور ہے۔ 1958ء میں ایک بدھ راہب ہی تھا جس نے وزیر اعظم ایس ڈبلیو آر ڈی بندرا نائیکے کو قتل کیا تھا۔ بدھ مت کی دہشت گرد تنظیمیں ''1969'' اور ''دی بدھا بالا سینا'' (بی بی ایس) مسلمانوں کے قتل عام میں پیش پیش ہیں۔ اسلام کے خلاف بدھ بھکشوؤں کا بھیانک روپ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ میانمار کے بے بس روہنگیا مسلمانوں پر ان کا ظلم و ستم دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ حکومتی سرپرستی میں مساجد کو شہید کرنا، نماز اور دیگر مذہبی عبادات پر پابندی، مسلمان نوجوانوں کو زندہ جلا دینا، ان کے بچوں کو ذبح کرنا، بوڑھوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنانا، خواتین کی آبرو ریزی کرنا اور انہیں بھوک سے مرنے کے لیے خطرناک جنگلوں میں چھوڑ دینا معمول کی بات ہے۔ عالمی میڈیا کی مجرمانہ خاموشی حیران کن ہے۔ گنگ زبانیں اور بے فکر اذہان۔ المیہ یہ ہے کہ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان

ہیں۔ لاکھوں روہنگیا مسلمان مہاجرین کو تھائی لینڈ حکومت نے کشتیوں میں ڈال کر سمندر میں پھینک دیا جن کی مدد کے لیے کوئی نہ آیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس قیامت خیز ظلم وتشدد میں برما کی وحشی حکومت کے ساتھ تھائی لینڈ کی حکومت بھی شامل ہوگئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ، 56 اسلامی ممالک، او آئی سی، عرب لیگ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں کہاں ہیں؟ امریکہ اور یورپی ممالک کی انسان دوستی کے دعوے کہاں ہیں؟ اگر یہی کچھ عیسائیوں یا یہودیوں کے ساتھ ہوتا تو اب تک بڑی طاقتیں برما پر حملہ کر کے اسے سبق سکھا چکی ہوتیں۔ اس کے باوجود دہشت گردی، انتہا پسندی، شدت پسندی، سفاکیت و بہیمیت اور شقاوت و بدبختی کے القابات اور استعارے مسلمانوں کے لیے وقف ہیں۔ اس ظلم و سفاکیت اور بدترین بہیمیت پر برما کی حکومت سے باز پرس کرنے، اس پر پابندیاں لگانے اور وہاں کی مسلمان اقلیت کو تحفظ دلانے کی بجائے امریکی صدر بارک اوباما نے اسی دوران برما کا دورہ کر کے برمی صدر کی پیٹھ تھپتھپائی اور دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی۔ عالمی قوتوں نے اگر اس وقت اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا ہوتا اور انسانیت کی خاطر ہی روہنگیا مسلمانوں پر مظالم روکنے کے لیے کچھ اقدامات کیے ہوتے تو آج شاید صورت حال اتنی سنگین نہ ہوتی۔

''روہنگیا مسلمانوں کی بے بسی'' کے عنوان سے شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ لکھتے ہیں: ''برما کے علاقے ''اراکان'' (جس کا نام اب تبدیل کر کے ''راکھین'' رکھ دیا گیا ہے) پر 1942ء سے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ 1962ء میں وہاں فوجی حکومت قائم ہوئی اور وہاں بارہ سو سال سے آباد مسلمانوں کو باغی قوم قرار دے کر قتل عام کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہ سلسلہ 1962ء سے 1982ء تک جاری رہا۔ اس قتل عام میں تقریباً ایک لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ 1997ء میں ایک مرتبہ پھر بدھ بھکشوں کے ہاتھوں دن دہاڑے راکھین شہر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، بستیوں کو نذر آتش کیا گیا اور مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

جون 2012ء میں چند مسلمانوں کے دردناک قتل سے شروع ہونے والا فساد اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ سارے اراکانی مسلمان پوری دنیا میں تتر بتر ہوکر رہ گئے اور عالم انسانیت سسک اٹھی۔ ان کے گھر بار کو جلایا گیا، بعض علاقے مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ ان کے کھیت کھلیان کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ ان کی دکانیں ساز وسامان سمیت آگ میں جلا

دی گئیں۔ان کے مدارس اور تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے، اس طرح ان کے لیے تعلیم کے دروازے مکمل طور پر بند ہو گئے۔ان پر مسجدوں میں با جماعت نمازیں پڑھنے کی پابندی لگا دی گئی اور مساجد پر تالے ڈال دیئے گئے۔مسلمانوں پر حج کرنے اور اس کے لیے سفر کی پابندی عائد کر دی گئی۔قربانی پر پابندی عائد کر دی گئی۔مسلمانوں کی جائیدادیں ان سے چھین کر مگھ اور برمی مدھسٹوں کو دی جا رہی ہیں۔مسلمانوں کی بستیوں کو تاراج کر کے ان کو کیمپوں میں پہنچایا جا رہا ہے اور ان کی بستیوں میں غیر مسلموں کو بسایا جا رہا ہے۔اراکان میں صنعتوں، ملز اور فیکٹریوں کا کوئی تصور نہیں، وہاں غالب ذریعۂ معاش کھیتی باڑی اور معمولی دکانداری ہے، لیکن چونکہ مسلمانوں سے ان کی زمینیں اور جائیدادیں چھین لی گئیں، اس لیے کھیتی باڑی سے محروم ہو گئے اور پھر ان پر ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک جانے آنے کی پابندیاں ہیں، اس لیے دکانوں کے معمولی سامانوں کے حصول کے لیے بھی وہ مگھ بدھسٹوں کے محتاج ہیں، اس لیے عملاً ان کی دکان داری کا ذریعۂ معاش بھی ختم ہو کر رہ گیا۔مسلمانوں پر اپنے مکانات اور رہائش گاہوں کی مرمت و اصلاح کی پابندی ہے۔مسلمانوں پر شادی بیاہ کے سلسلہ میں شرمناک قدغنیں ہیں۔

مسلمانوں پر زیادہ بچوں کی پیدائش پر پابندی عائد ہے۔کوئی مسلمان اپنے علاقے سے دوسرے علاقہ کی طرف بغیر پرمٹ کے نہیں جا سکتا اور نہ ہی وہاں رات گذار سکتا ہے حتیٰ کہ ایک بیٹی اپنے میکے آ کر رات گذار نہیں سکتی۔علماء کے ایسے دشمن ہیں کہ وہ کرتا پہن کر ادھر سے ادھر آ جا نہیں سکتے، چنانچہ ایسے موقع پر وہ صرف بنیان اور لنگی پہن کر چلت پھرت کی کوشش کرتے ہیں۔مسلمانوں کے قبرستان کو ان کے آباء واجداد کے آثار مٹا ڈالنے کی غرض سے تھانوں اور کچہریوں میں تبدیل کر رہے ہیں۔مسلمانوں کے تاریخی آثار مٹانے کی غرض سے اراکان کا نام ''راکھین'' رکھا اور اکیاب کا نام ''سٹوے'' سے تبدیل کیا گیا۔بے گھر اور خانماں برباد لوگوں نے اپنی جانیں بچا کر کشتیوں میں سوار ہو کر بنگلہ دیش میں پناہ لینے کی کوشش کی تو وہاں کی حکومت نے انہیں پناہ دینے کے بجائے دوبارہ سمندر میں دھکیل دیا۔جس کے نتیجہ میں ہزاروں افراد مچھلیوں کی خوراک بن گئے۔ذرائع ابلاغ کی پہنچ اور ان کی دُہائی کے بعد معمولی عالمی دباؤ آیا تو عمومی فساد تو رُک گیا، لیکن بے گھر اور بے سہارا افراد کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، ان کو ایسے کیمپوں میں بسا دیا گیا جن میں کسی قسم کی بنیادی

سہولت نہیں۔ برما کے سابق صدر جنرل تھین سیئن نے نہایت ڈھٹائی سے یہ بیان دیا کہ یہ روہنگیا برما کے باشندے نہیں ہیں، ان کو ہم کیمپوں ہی میں رکھیں گے۔ اگر کسی کے دل میں درد ہو تو وہ ان کو اپنے ہاں لے جا کر آباد کرائے۔ جن لوگوں کے مکانات ابھی باقی ہیں، وہ برائے نام اپنے گھروں میں تو ہیں، لیکن ان کے سروں پہ چوبیس گھنٹے ننگی تلوار لٹکی رہتی ہے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا اور کوئی رات ایسی نہیں گذرتی کہ ان میں کسی ایک یا چند گھروں پر قیامت نہ بیتتی ہو، برمی فوج کے اہلکار گھروں میں دھاوا بول دیتے ہیں اور پھر چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کرتے ہوئے مردوں کو گرفتار کر لیتے ہیں، عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں، بچوں اور بوڑھوں تک کو نہیں بخشتے۔ کبھی اسلحہ کی تلاشی کے بہانے پورے گھر کو کھود ڈالتے ہیں اور کبھی موبائل رکھنے کے ناکردہ جرم پر لاکھوں کیات (برمی کرنسی) کا جرمانہ عائد کرتے اور قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال دیتے ہیں۔ آئے دن لوگوں کو فوجی کیمپوں میں پکڑ کر لے جاتے ہیں اور وہاں ان سے بیگار لیتے ہیں پھر ان کو معاوضہ تو درکنار، بھوکا پیاسا چھوڑ دیتے ہیں۔ ظلم وستم کے یہ شکار مشقتوں اور خوف و ہراس کے اس ماحول سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے لیے سوائے سمندر کے راستے کے اور کوئی راستہ نہیں رکھا گیا، چنانچہ سمندر کی طرف جانے اور کشتیوں کے ذریعہ نقل مکانی کرنے کے لیے بھی انہیں پولیس اہلکاروں سے لے کر ایجنٹوں، دلالوں اور اسمگلروں تک کو رشوت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر جن ''خوش نصیبوں'' کو اس طرح کشتی میں جگہ مل جاتی ہے، ان کی کیفیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح لکڑیوں اور تختوں کی تھپئی لگائی جاتی ہے۔ اس طرح ان ''انسانوں'' کی جن میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی، عورتیں بھی ہوتی ہیں اور بچے بھی، ان کی بھی تھپئی لگائی جاتی ہے۔ چنانچہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کے ساتھ ان کو بیچ سمندر میں لے جا کر بڑے جہاز میں سوار کرایا جاتا ہے۔ یہاں سے گویا اب یہ انسانی اسمگلروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کو ٹھونس کر تھائی لینڈ کے غیر آباد جزائر کی طرف لے جایا جاتا اور وہاں کے جنگلات اور غاروں میں ان اسمگلروں کے مراکز بنے ہوئے ہیں، وہاں لے جا کر ان کو مارا کوٹا جاتا، ان کے عزیز و اقارب جو مختلف ملکوں میں بسے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے فون نمبرز پہ کال کر کے ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی جاتیں اور ان کے ذریعہ ان سے بھاری رقوم کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس طرح بعض خوش نصیب رہائی پا جاتے اور اکثر ان کے غلام باندی کی حیثیت سے رہ جاتے

ہیں، ان کو زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا ہے اور ان کی عورتوں کی عصمت دری کی جاتی ہے جس کی ویڈیوز بنا کر پوری دنیا میں مسلمانوں کی غیرتوں کو للکارا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کی قید میں مر جاتے ہیں بلکہ مار دیے جاتے ہیں جن کی اجتماعی قبریں بھی دریافت ہو چکی ہیں۔

بہت سے خوش نصیب وہ بھی ہیں جو کسی طرح تھائی لینڈ کی سرزمین پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اسی طرح بعض ملائیشیا اور بعض انڈونیشیا تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ان کے لیے وہاں ایک نئے عذاب کا سلسلہ منتظر ہوتا ہے، کیونکہ ان کو وہاں پناہ گزین کی حیثیت کے بجائے غیر قانونی تارکین وطن کی حیثیت سے جیلوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں ہر ایک پہلے ہی سے مصیبتوں کا مارا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی فیملی کے کسی نہ کسی فرد کو یا کئی کئی افراد کو بدھسٹوں نے مار دیا ہوتا ہے، اور وہ خود سمندروں کی بے رحم موجوں سے لڑتے ہوئے کسی طرح اپنی جانیں بچا کر وہاں پہنچتے ہیں تو وہاں ان کے لیے جیل اور قید و بند کی صعوبتیں منتظر ہوتی ہیں، ان کی اَشک شوئی کے لیے کوئی نہیں ہوتا۔ حال ہی میں عالمی ذرائع ابلاغ نے یہ انکشاف کیا کہ ہزاروں کی تعداد میں (جن کی تعداد تقریباً 27 ہزار بتائی جاتی ہے) روہنگیا مسلمان مختلف چھوٹی بڑی کشتیوں میں سمندر کے بیچوں بیچ سرگرداں ہیں کہ ان کو کوئی ملک قبول کرنے کو تیار نہیں، ان میں بوڑھے بھی ہیں جوان بھی، عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی، سوشل میڈیا کے توسط سے ان کی گریہ وزاری اور آہ و بکا لوگوں کی سماعتوں سے ٹکرائی جو عرش الٰہی کو تھرا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس حال میں بھی سنگدل ایجنٹوں نے کتنے ہی جوانوں اور بوڑھوں کو سمندر برد کیا، کتنی ہی عورتوں کی عصمتوں کو پامال کیا''۔

(ہفت روزہ ضرب مومن کراچی 16 تا 22 دسمبر 2016ء)

ستمبر 2017ء کو ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جانب سے اقوام متحدہ کو لکھے گئے مکتوب میں کہا گیا کہ 5 روز میں 2100 دیہات مسلمانوں سمیت جلا دیے گئے، 10 ہزار افراد بھاگتے ہوئے مارے گئے، 1500 سے زائد خواتین عصمت دری کے بعد فوج میں تقسیم کر دی گئیں، زندہ انسانوں کے اعضا کاٹ کر کھلے میدانوں میں پھینک دیئے گئے، ایک لاکھ 30 ہزار افراد شدید زخمی اور ایک لاکھ سے زائد افراد جنگلوں میں محصور ہیں، بنگلہ دیشی حکومت کی سنگدلی کے باعث کشتیوں میں سوار 20 ہزار افراد سمندر میں بھٹکنے پر مجبور ہیں۔ لگتا ہے دنیا میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔

یہی صورتِ حال انگولا (Angola) کی ہے۔ اس کے آئین میں تمام باشندوں کو مذہب کی مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ اب انگولا کی حدود میں اسلام کے پیروکاروں کو یہ آزادی حاصل نہیں رہی۔ افریقا کے کئی اخبارات کی رپورٹس کے مطابق انگولا کی حکومت نے اسلام پر پابندی عائد کردی ہے۔ دنیا بھر میں انگولا واحد ملک ہے جس نے مسلمانوں کے خلاف اس قدر سخت اقدام کی جرأت کی ہے۔ انگولا کی وزیر ثقافت روزا کروزای سلوا (Rosa Cruz e Silva) نے 22 نومبر 2013ء کو بتایا کہ وزارتِ انصاف و انسانی حقوق نے اسلام کو قانونی حیثیت دینے کے عمل کی اب تک منظوری نہیں دی، اس لیے تمام مساجد تا حکم ثانی بند رہیں گی۔ روزا کروزای سلوا نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام یا کسی بھی دوسرے مذہب کو قانونی حیثیت دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ انگولا کے صدر ہوزے ایڈوارڈوز سانتوز (José Eduardo dos Santos) نے اعلان کیا ہے کہ انگولا کی حکومت ملک میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے کے لیے حتمی کارروائی کر رہی ہے۔ انہوں نے بھی یہ واضح کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ انگولا کے معاشرے پر اسلام کے اثرات کیا ہیں اور انہیں ختم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ لوانڈا کے گورنر بینٹو بینٹو کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو انگولا میں کسی بھی صورت قبول نہیں کیا جائے گا۔ حکومت مسلمانوں کے لیے مساجد یا عبادت کے دیگر مقامات کو قانونی حیثیت نہیں دے گی۔ انگولا میں مسلمانوں کی تعداد 80 سے 90 ہزار کے درمیان ہے۔ یہ آبادی کا تقریباً 18 فیصد ہے۔ انگولا کے مسلمانوں کی اکثریت مغربی افریقا اور لبنان سے آئے ہوئے تارکین وطن پر مشتمل ہے۔

اسی طرح وسطی افریقی جمہوریہ میں عیسائیوں نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ مسلسل عذاب میں رہنے والے ان مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ عیسائیوں کی متعصب اور خونخوار ملیشیا ''بالاکا'' کے درندے مسلمانوں پر تشدد کر کے انھیں بڑی بے دردی سے قتل کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی لاشوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا جاتا ہے۔ امدادی تنظیم ''سیو دی چلڈرن'' کے مطابق ایک واقعہ میں چاقوؤں اور خنجروں سے لیس عیسائیوں کے ایک مشتعل ہجوم نے پناہ کے لیے فرار ہونے والے مسلمانوں کے ایک قافلے کو تشدد کا نشانہ بنایا جس میں 75 افراد مارے گئے، ان میں 15 بچے بھی تھے۔ ایمنیسٹی انٹرنیشنل نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں پے در پے مظالم کے باعث مسلمان

اتنے بڑے پیمانے پر انخلا کر رہے ہیں کہ اسے تاریخی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تک 27 ہزار سے زائد مسلمان قتل اور 50 ہزار سے زائد شدید زخمی ہو چکے ہیں۔ 4 لاکھ مسلمان بے گھر ہو چکے ہیں۔ 100 سے زائد مساجد کو نذر آتش کیا جا چکا ہے۔ مسلمانوں کی املاک کو بے دردی سے لوٹا جا رہا ہے۔ افسوس یہ سب کچھ فرانسیسی امن فوج کی ناک تلے ہو رہا ہے جو حقوق انسانی کی علمبردار کہلاتی ہے۔

اقوام متحدہ نے وسطی افریقی ریاست میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمان بچوں کے لرزہ خیز قتل عام کو انتہائی بھیانک اور انسانی المیہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ معصوم اور بے گناہ بچوں کا سفاکانہ اور وحشیانہ قتل عام دیکھ کر وہ کانپ اٹھے۔ یونیسف UNICEF کے ریجنل ڈائریکٹر برائے مغربی وسطی افریقہ مینوئل فونٹین Manual Fontaine نے ایک بیان میں کہا کہ وسطی افریقی ریاست میں گزشتہ دو ماہ کے دوران 715 سے زائد معصوم بچوں کو انتہائی بیدردی اور سفاکانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ بچوں کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے یا ان کے جسم کے اعضاء کاٹ دیئے گئے۔ مینوئل فونٹین نے کہا کہ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ کس طرح معصوم بچوں کے سر تن سے جدا کئے گئے یا ان کے جسم کے اعضاء کاٹے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہاں بالغ لوگ بے گناہ بچوں کا وحشیانہ قتل عام کرتے ہوں تو وہاں ملک کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ انہوں نے مزید کہا کہ معصوم بچے صرف اپنے مذہب اسلام کی وجہ سے نشانہ بنتے ہیں۔ یونیسف کے حکام علاقے میں بچوں کے کاٹے گئے گلے اور اعضاء دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ فونٹین نے کہا کہ زخمی بچوں کو علاج کی سہولت بھی دستیاب نہیں۔ اقوام متحدہ نے اسے انسانی المیہ قرار دیا ہے۔ اب تو مغربی اخبارات بھی چیخ اُٹھے ہیں کہ جمہوریہ وسطی افریقہ میں عیسائی جنگجو ملیشیاء، فرانسیسی فوج کے تعاون سے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام کر رہی ہے۔ اب تک ہزاروں مسلمان شہید اور لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی اس قدر زیادہ ہے کہ مغربی انسانی حقوق کے ادارے اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسے مسلمانوں کی منظّم نسل کشی قرار دینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر فرانس کا کردار بہت مشکوک ہوگیا۔ فرانس نے مسلمان حکومت سے تعاون کے بجائے عیسائی باغیوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ فرانسیسی فوج اپنے ساتھ وہ ہتھیار لائی تھی جو وسطی افریقہ ایسے فاقہ زدہ اور بدحال ملک کے پاس نہیں تھے۔ یہ فرانسیسی ہتھیار عیسائیوں کی حفاظت اور مسلمانوں کے قتل عام کے

لیے استعمال ہونے لگے۔ معروف عرب ٹی وی الجزیرہ نے بے شمار ایسے شواہد ذکر کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فرانس بھرپور طور پر حکومت کے خلاف باغیوں کی مدد کر رہا تھا۔

اپریل 2014ء میں مسلمانوں کی نسل کشی پر امریکہ کی جانب سے وسطی افریقی جمہوریہ کے لیے 67 ملین ڈالر کی رقم مختص کی گئی۔ امدادی رقم عیسائی ملیشیاؤں کو مضبوط کرنے، مسلمان علاقوں میں عیسائی آبادکاری، مساجد کو چرچ میں تبدیل کرنے اور قاتل عیسائیوں کی معاشی بحالی پر خرچ کی جائے گی۔ تفصیلات کے مطابق جب سے وسطی افریقہ جمہوریہ میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا ہے، امریکہ کی جانب سے انتہا پسند عیسائیوں پر مالی نوازشات کا سلسلہ جاری ہے۔ امریکہ تا حال 45 ملین ڈالر انتہا پسند عیسائیوں کو دے چکا ہے اور گزشتہ ہفتے مزید 22 ملین ڈالر کی رقم عیسائی ملیشیاؤں کے لیے مختص کی گئی۔

افریقی ملک وسطی جمہوری افریقا میں مسلمانوں کی دوسرے ممالک میں نقل مکانی کے بعد ان کے مکانات پر عیسائیوں نے قبضے شروع کر دیئے۔ شر پسند عیسائی ملیشیا کے اہلکاروں نے مساجد کو بھی نہ بخشا اور جگہ جگہ مساجد پر قبضہ کر کے وہاں شراب کی خرید و فروخت اور رقص و سرود کی محفلوں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ مصدقہ رپورٹ کے مطابق دارالحکومت بنگوئی میں کام کرنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں کے کارندوں نے تصدیق کی کہ اینٹی بالا کا ملیشیا (Anti-Balaka Militias) کے اہلکاروں کی سرپرستی میں درجنوں مساجد میں شراب نوشی اور رقص کی پارٹیاں منعقد ہوتے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ شرپسندوں نے اکثر مساجد سے مینار اور گنبد ہٹا کر ان کا اسلامی تشخص بری طرح پامال کیا۔ بہت سی مساجد میں رقص و سرود کی محفلوں کے شرکاء کی تفریح طبع کے لیے سور کے گوشت کے سیخ کباب کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جبکہ بازاروں میں واقع بعض مساجد کو تجارتی مراکز کے طور پر استعمال کئے جانے کی خبریں ہیں۔ دارالحکومت بنگوئی اور دوسرے بڑے شہر مبائیکی سمیت وسطی جمہوری افریقا سے مسلمانوں کی ہمسایہ ممالک میں ہجرت کے بعد ہزاروں بے گھر عیسائیوں کو مسلمانوں کے مکانات میسر آ گئے ہیں جن میں انہوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

ہماری غلط فہمی تھی کہ این جی اوز کی کئی ایک خواتین ظلم و تشدد پر بہت بولتی ہیں، آمریت کی دشمن اور جمہوریت کی پرجوش حامی ہیں۔ انسان دوست اور انسانی حقوق کی علمبردار ہیں۔ برما، انگولا، وسطی افریقی جمہوریہ اور مصر میں مظلوم مسلمانوں کے قتل عام پر ان

کی مجرمانہ خاموشی کو دیکھ کر ہماری غلط فہمی دور ہوگئی۔ جہاں معاملہ اسلام اور اسلام پسندوں کا ہو، وہاں سب اندھے، گونگے، بہرے بن جاتے ہیں۔ کہاں کی جمہوریت پسندی، کہاں کی انسان دوستی..........ڈالر ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

فروری 2013ء میں بحر اوقیانوس کی چھوٹی سی شمالی ریاست آئس لینڈ نے انٹرنیٹ پر جنسی بے راہروی پھیلانے والی ویب سائٹس پر پابندی لگانے کے لیے قانون سازی کرنے کا اعلان کیا تاکہ چھوٹی عمر کے لڑکے یا لڑکیاں ذہنی طور پر تباہ نہ ہوسکیں۔ آئس لینڈ کے وزیر داخلہ نے جب اس حوالے سے اعلان کیا تو اپوزیشن نے حکومت پر شدید تنقید شروع کردی۔ اپوزیشن کا کہنا تھا کہ حکومت کا اس قسم کا اقدام آزادی رائے پر پابندی لگانے کے مترادف ہوگا جس سے ملک کا وقار یورپی معاشرے میں مجروح ہونے کا اندیشہ ہے جبکہ حکومت کا مؤقف یہ ہے کہ یہ بہت ہی دانشمندانہ اقدام ہے جس سے ملک کا مستقبل غلط سمت میں جانے کی بجائے محفوظ ہوگا۔ پورنوگرافی پر آئس لینڈ میں پہلے ہی پابندی ہے مگر انٹرنیٹ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نئے قانون سے انٹرنیٹ پر بھی پہلے سے موجود قانون کا اطلاق ہوگا۔ اس قانون کو ڈرافٹ کرنے والے حکومتی مشیر گنرز ڈاٹر کا کہنا تھا کہ کیا یہ آزادی رائے اور فریڈم آف سپیچ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو جنسی بے راہروی کی طرف جانے دیں اور کیا ہم اس قسم کی آزادی رائے کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں؟

فرانس کے ایک قصبے میں شادی شدہ خواتین میں احساس کمتری پیدا ہونے سے بچانے کے لیے لفظ Mademoiselle جو انگریزی میں Miss یا اردو میں دوشیزہ کے مترادف ہے، کے استعمال پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ یہ دلچسپ فیصلہ دو خواتین گروپس کی مہم کے بعد کیا گیا۔ ان گروپس کے بقول یہ لفظ جنسی تعصب اور شادی شدہ خواتین کو چڑانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس سے ان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اب فرانس میں ہر خاتون کو مادام کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس سے قبل جرمنی میں بھی شادی شدہ خواتین کو اس احساس سے بچانے کے لیے فراؤلین (Fraulein) کہنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

2012ء میں پاکستان میں ہم جنس پرستوں میں آگاہی اور ان کی مدد کے لیے بنائی گئی پہلی باضابطہ ویب سائٹ پر سرکاری طور پر پابندی عائد کردی گئی۔ اعداد و شمار کے مطابق اس ویب سائٹ کو پانچ سو سے ایک ہزار افراد روزانہ دیکھتے تھے۔ ویب سائٹ پر

نہایت فحش مواد اور ہم جنس پرستی سے متعلقہ ویڈیوز موجود تھے۔ مرد سے سیکس کرنے کے 50 سے زائد طریقے تصاویر کی مدد سے بیان کیے گئے تھے۔ سب سے اہم بات کہ کئی اہم شخصیات کی آرا اور تجربات اس سائٹ پر موجود تھے۔ ویب سائٹ کے بند ہوجانے کے بعد مغرب زدہ این جی اوز سمیت سیکولر صحافیوں نے اس پر خوب احتجاج کیا اور اسے آزادی اظہار رائے کا قتل قرار دیا۔

کیا امریکہ اور مغربی ممالک کی جمہوری حکومتوں کے اندر کسی شخص کو آزادی اظہار کے نام پر یہ کہنے اور لکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ جمہوریت کے برعکس فاشزم اور آمریت کا پرچار کرے؟ کیا ان ممالک میں کوئی شخص ہولوکاسٹ کے خلاف فلم بنا سکتا ہے؟ کیا وہاں کسی پب کے دروازے پر لکھا جاسکتا ہے کہ یہاں آئرش، سیاہ فام نگر (Nigger) اور کتوں کا داخلہ بند ہے؟ کیا وہاں ماں اور بیٹی جو ایک ہی بوائے فرینڈ پر گزارا کرتی نظر آتی ہیں، کوئی شخص ان کے خلاف ایک جملہ بھی ادا کرسکتا ہے؟

جناب عبداللہ اپنے مضمون ''آزادی اظہار کے پردے میں اسلام دشمنی'' میں لکھتے ہیں:

''مغرب میں آزادی اظہار کا تعلق اس کی تہذیب کے ارتقا سے ہے جو اس کو اس معاشرت کا بنیادی عنصر بناتی ہے۔ تاریخی طور پر جب یورپ میں کلیسا کی حکمرانی تھی تو اس کے خلاف بولنے کے بہت برے نتائج نکلا کرتے تھے، گلیلیو (Galileo) کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صدیوں کا وچ ہنٹ (Witch Hunt) کلیسا کے مظالم کی ایک چھوٹی سی مثال ہے جس نے مغربی اقوام کو آزادی اظہار پر پابندی اور ظلم و جبر کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی لیے مغربی اقوام نے اپنے قوانین اور آئین میں آزادی اظہار کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ امریکہ کے قیام کے بنیادی مقاصد میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک یورپ سے بھاگ کر آئے ہوئے ان مسافروں (Pilgrims) کی بدولت وجود میں آیا جو یورپ میں کلیسا کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر نئی دنیا میں پناہ لینے آئے تھے۔ لہٰذا یہاں انہیں تحریر و تقریر، مذہب اور تمام عقائد پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہوگئی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی آزادی رائے کے قانون کو مطلق آزادی حاصل نہیں مثلاً جہاں نفرت آمیز، نسلی، جنسی و سیاسی تنقید، تحریر و تقریر کی عمومی طور پر پوری آزادی ہے، وہاں فحاشی، بچوں سے متعلق جنسی مواد اور کوئی ایسی تحریر و تقریر جو امن عامہ کے لیے لازمی خطرے کا باعث ہو، قانوناً منع ہے۔ اور تو اور گالی دینے پر بھی آپ کو قانونا جرمانہ ہوسکتا ہے۔

آپ امریکی صدر کی شان یا ہجو میں جو چاہے، کہیں لیکن کسی بھی قسم کی پر تشدد دھمکی آپ کو فوراً جیل کا منہ دکھا سکتی ہے۔ من الحیث المسلم اب آپ یہ سوچ رہے ہونگے کہ تشدد پر ابھارنا جرم لیکن مقدس ہستی کا مذاق اڑانا جرم نہیں، یہ کیسا انصاف ہے؟ لیکن بد قسمتی سے یہی وہ اختلاف اور تفاوت ہے جو مغرب اور اسلامی اقدار کو آزادی اظہار کے بارے میں جداگانہ تشخص دیتا ہے۔

کینیڈا میں پچھلے سال کسی ریپ کیس کے سلسلہ میں ایک پریس کانفرنس میں ایک پولیس افسر نے ایسی بات کہہ دی جس کا مطلب کچھ ایسے تھا: ''اگر عورتیں رنڈیوں کی طرح کپڑے پہننا بند کر دیں تو ایسے کیس کم ہو جائیں گے'' بس پولیس والے کا یہ کہنا تھا کہ پورے ٹورانٹو کی عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ کچھ نے آدھے کپڑے پہنے، کچھ نے اپنے پچھواڑے دکھائے اور کچھ نے چھاتیاں، کچھ نے تو سب کچھ ہی اتار دیا۔ آخر کار اس پولیس افسر کو معافی مانگنی پڑی۔ پورے شہر سے ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوا کہ بھئی یہ تو آپکا آزادی اظہار رائے کا حق ہے تو آپ کیوں معافی مانگتے ہیں۔

کچھ دن پہلے بھی ایک ایسی ہی کہانی ہوئی۔ راب فورڈ (Rab Ford) جو ٹورانٹو کے میئر ہیں، انکی بھتیجی نے اپنے ٹوئٹر کے اکاونٹ پر لکھ دیا کہ کہ عورتوں کو چاہیے: ''رنڈیوں کی طرح کپڑے نہ پہنیں'' اس پر بھی پورے میڈیا پر کھڑاک کھڑا ہو گیا، کوئی میڈیا چینل ایسا نہیں تھا جس نے اس مسئلے پر کوئی رپورٹ نہیں کی یا کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس پر مضمون نہیں لکھا، اور آخر کار کرسٹا فورڈ کو بھی یہ بات کہنے پر معافی مانگنی پڑی اور پورے ملک میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو کھڑا ہوا کہ مس کرسٹا فورڈ یہ آپکا آزادی اظہار رائے کا حق ہے، آپ کیوں معافی مانگتی ہیں۔

کچھ عرصے سے مسلسل ایسے ہو رہا ہے کہ مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، کبھی تو انکے نبی (ﷺ) کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، کبھی تو آپ ان کی مذہبی کتاب کو جلانا چاہتے ہیں، کبھی آپ ان کے نبی پر فلمیں بنانا چاہتے ہیں اور پھر اس کو آزادی اظہار رائے کا نام دے کر پوری قوم بن کر اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ جب مسلمان احتجاج کرتے ہیں تو اس کو وائیلنٹ ایکٹ (Violent Act) کا نام دیا جاتا ہے، یہ کیا وجہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے عمل کو فریڈم آف ایکسپریشن (Freedom of Expression) کا نام نہیں دیتے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ مغرب پورا بحیثیت معاشرہ ایک منافقت کا شکار ہے۔

چند سال پہلے لیبیا میں ایک ہجوم نے امریکی ایمبیسی پر حملہ کر کے انکے ایک سفیر کو ہلاک کر دیا، سب جانتے ہیں کہ کسی سفیر کو قتل کرنا جائز نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟؟؟ یہ وہ پانی ہے جو ہانڈی میں ابل رہا تھا، اب وہ باہر نکل رہا ہے۔ لیبیا میں یہ انارکی امریکیوں نے ہی پھیلائی تھی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے مغربی میڈیا اس بات پر خوش ہو رہا تھا جب لیبیا کے لوگوں نے اپنے صدر کو قتل کیا، آج وہی لیبیا والے ایک امریکی سفیر کو قتل کر رہے ہیں، یہ وہی امریکی تھے جو دو دن پہلے انکی مدد کر رہے تھے اپنی حکومت سے نجات دلانے میں آج یہ ہی امریکی ہیں جن کو ان لوگوں نے مارا ہے، جن پر اپنا غصہ نکالا ہے۔

منتظر الزیدی تو آپکو یاد ہی ہوگا، کچھ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، یہ وہ صحافی ہے جس نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش پر فقط ایک جوتا پھینکا تھا، مغرب نے اس کے فریڈم آف ایکسپریشن کا جواب بڑے اچھے انداز سے دیا، اس کو نہ صرف مارا گیا بلکہ گارجین کے مطابق رہائی کے دن اس کا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا دیکھا گیا، قید کے دوران کی ایک اخباری رپورٹ کا کہنا ہے کہ وہ اتنا زخمی تھا کہ عدالت میں بھی پیش نہیں ہو سکا۔

لیلیٰ العطار کے بارے میں بھی جان لیں جس کے گھر پر امریکی آرمی نے اس وجہ سے بمب برسا دیے کیونکہ اس نے ایک ہوٹل کے دروازے پر جارج ڈبلیو بش سینئر کی تصویر بنائی تھی اور سب لوگ اس پر جوتے رکھ کر جاتے تھے۔ اب اتنے انتہا پسند لوگ ہمیں یہ سب سکھائیں کہ ہم نے احتجاج کیسے کرنا ہے تو اس کو دوغلا پن ہی کہا جا سکتا ہے۔

آیئے اب میں اور آپ مغربی معاشرے سے پوچھتے ہیں کہ لیلیٰ العطار اور برطانوی شہزادے کی بیوی کی تصویریں شائع کرنے والوں کی آزادی آرٹ یا آزادی صحافت کہاں ہے؟ یا منتظر الزیدی کی اظہار کی آزادی کہاں ہے؟ کرسٹا فورڈ اور پولیس والے کی آزادی اظہار رائے کہاں ہے؟؟؟

مغرب کو پتہ ہے کہ مسلمانوں کو کہاں اور کیسے زک پہنچانی ہے۔ یہ پتھر پھینکتے ہیں اور ہاتھ چھپا جاتے ہیں۔ جب بھی مغرب سے ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مغربی میڈیا اور حکومتوں کے مطابق چند افراد کی حرکت ہوتی ہے۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ ایسے چند افراد کو ایک ایسے قانون کی چھتری مہیا کر دی جاتی ہے جو ان قوموں کی اکثریت کے نمائندے بناتے ہیں؟ انکے اسی

جمہوری اصولوں کے مطابق ہمیشہ ہی مغرب سے کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ''چند افراد'' دنیا کی نصف آبادی کا، ان کی الہامی کتاب کا، انکے نبی کریم ﷺ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) آخر کیوں؟ یہ بتایا جائے کہ یہ کون سے جمہوری اصول کے تحت جائز ہے؟؟ ایسے تضحیک اور توہین آمیز مواد کی اشتعال انگیزی کے پھیلاؤ کے لیے انہی کے ادارے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور دنیا کی نصف آبادی کی طرف سے ایسے مواد کو مغرب کے اور مغرب میں قائم ترسیلاتی ادارے ایسے مواد کے ہٹائے جانے کے جائز مطالبے کو رعونت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔

یہ ایک اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں۔ جدید تاریخ میں مغرب سے اس شرانگیز اور تکلیف دہ حرکات کا سلسلہ نصف صدی سے جاری ہے۔ تو کیا وجہ ایک چڑیا تک کا درد رکھنے والے، اپنے ملکوں میں پائے جانے والے حشرات الارض تک کے لیے قانون سازی کرنے والے، کیونکر مسلمانوں کی دلی تکلیف کو چڑیا کے درد کے برابر نہیں جانتے۔ حشرات الارض کے لیے قانون سازی کرنے والے دنیا کی تقریبا نصف آبادی کے مسلمانوں کو انسان سمجھتے ہوئے ان کی مذہبی دل آزاری روکنے کے لیے کوئی قانون یا ضابطہ وضع کرنے کو تیار نہیں؟ کیوں؟ مسلمان ردعمل میں احتجاج کرتے ہیں جبکہ عمل ہمیشہ مغرب سے ہوتا ہے۔ تو پھر کون انتہا پسند اور فرعون ہوا؟

امریکی حکومت اور امریکی وزارتِ خارجہ کی طرف سے بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اس دل آزار اور گستاخانہ فلم سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں لیکن مسلم ممالک کے عوام اس حکومتی موقف کو عذرِ لنگ سے تعبیر کرتے ہیں اور یوں سارے مسلم ملکوں میں امریکہ کے خلاف پہلے سے موجود نفرت میں اور شدت آ جاتی ہے۔ مغربی ملکوں میں دین اسلام کے خلاف آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کی جاتی ہے جو مسلم ملکوں میں بھونچال پیدا کر دیتی ہے۔

اس حوالے سے ترقی یافتہ مغربی ملک اس موقف کو دہراتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے معاشروں میں چونکہ اظہارِ رائے کی آزادی ہے، اس لیے اس آزادی کے خلاف کوئی کارروائی ممکن نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی فکر اور آزادی اظہارِ رائے کے بغیر کوئی ملک منطقی طور پر ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا، اور ہم بھی آزادی فکر، آزادی اظہار رائے کو معاشرتی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن خود مغربی سیاسی مفکرین کا اس حوالے سے یہ اصرار ہے کہ بے لگام آزادی فکر و اظہار انسانی معاشروں کے اندر فساد اور نفرتوں کا سبب

بنتے ہیں تو ایسی آزادیاں انسانوں کے اجتماعی مفادات کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔

امریکہ دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی اور فوجی طاقت ہے، اس حوالے سے اس سپر پاور پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ آزادی فکر و اظہار کو اتنی چھوٹ نہ دے کہ یہ آزادی دوسری قوموں کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے اور اس شدّت پسندی میں اور اضافہ ہو جائے جس سے ساری دنیا پہلے ہی پناہ مانگ رہی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش جونیئر کے دوسرے دورِ حکومت میں مَیں نے اخبارات میں پڑھا تھا۔ کسی اخبار نے امریکہ کی اُس دَور کی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس (Condoleezza Rice) کا ایک کارٹون بنایا تھا اور اس کارٹون میں اس کے پیٹ سے ایک نیا مشرق وسطیٰ جنم لیتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ تب مغرب اس اقدام کے خلاف چیخا، امریکہ دھاڑا اور آزادی اظہار رائے کی شِق کو بھول گیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ لیکن خاتون وزیر خارجہ کی بے عزتی برداشت نہ کی۔ دوسری جنگ عظیم اور دیگر جنگوں میں ان امریکی اور اتحادی فوجیوں اور افسروں نے جاپان اور کوریا میں ہزاروں اور دیگر ممالک کے اعداد و شمار ملا کر لاکھوں برہنہ عورتوں کو چند پونڈ اور ڈالرز کے عوض بیچا اور ان نشے سے دُھت فوجیوں نے عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا۔ بتایا جائے کہ یہاں قانون کی حکمرانی اور تحفظ حقوق انسانی کے دعوے کہاں گئے؟''

(ماہنامہ پولیٹیکل سین، لاہور دسمبر 2016ء)

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مغرب اسلام فوبیا میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مختلف عالمی رپورٹس میں اسلام فوبیا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''ایک نظریہ یا عالمی رائے جو بے بنیاد خوف اور نفرت پر مبنی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز اور بے گانگی برتی جاتی ہے''۔

امریکی مصنف Stephen Schwartz نے اسلام فوبیا کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"The condemnation of the entirety of Islam and its history as extremist; denying the existence of a moderate Muslims majority; regarding Islam as

a problem for the world; treating conflicts involving Muslims as necessarily their own fault; insisting that Muslims make changes to their religion; and inciting war against Islam as a whole." (Front page Magazine - April 2005)

’’اسلام کی ہر چیز کی مذمت کرنا، اس کی تاریخ کو پرتشدد قرار دینا، مسلمانوں میں اعتدال پسند اکثریت کی نفی کرنا، اسلام کو پوری دنیا کے لیے مسئلہ بنا کر پیش کرنا، مسلمانوں کا جہاں بھی کوئی جھگڑا ہو، اس بارے میں ان ہی کو قصور وار سمجھنا، مسلمانوں کو ان کے مذہب میں تبدیلی لانے پر اصرار کرنا اور ان کے خلاف محاذ جنگ شروع کرنا‘‘۔

Wikipedia میں اسلام فوبیا کی تعریف اس طرح درج ہے:

"Islamophobia is the fear and hatred of Islam, Muslims or Islamic culture. Islamophobia can be characterised by the belief that all or most Muslims are religious fanatics, have violent tendencies towards non-Muslims, and reject as directly opposed to Islam such concepts as equality, tolerance and democracy."

’’اسلام فوبیا سے مراد اسلام، مسلمان اور اسلامی ثقافت سے نفرت کا اظہار، اس کی تشریح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا نظریہ جو سمجھتا ہے کہ تمام یا اکثر مسلمانوں میں مذہبی تشدد ہوتا ہے، وہ غیر مسلموں کے بارے میں جارحانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں، مساوات، روا داری اور جمہوریت کے تصور کو مسلمان یہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب ان کے مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہیں‘‘۔

اسلام فوبیا کی اصطلاح، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی دنیا میں پائی جانے والی نفرت، بے زاری اور امتیاز کو پوری گہرائی اور وسعت کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر ہے، اس لیے اس سے بہتر تعبیر **Anti-Islamic racism** ہے، کیوں کہ اس میں مذہب اسلام سے دشمنی، نفرت اور امتیاز کا شدید عنصر پایا جاتا ہے۔

Roger Kinball کا کہنا ہے کہ اسلام فوبیا غلط اصطلاح ہے؛ کیوں کہ فوبیا کا مطلب بے جا خوف ہے جب کہ اسلام کا خوف بجا ہے اور اس خوف کی بنیادیں درست ہیں۔

اسلام فوبیا کو فروغ دینے میں میڈیا سب سے زیادہ پیش پیش رہا ہے، اس بات کا اعتراف الیزبتھ پال نے انسائیکلوپیڈیا آف ریس اور ایتھنک اسٹڈیز میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر 1994 سے لے کر 2016ء تک برطانوی پریس میں شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی بہت کم ہوئی ہے اور اگر کچھ ہوئی بھی تو وہ منفی نقطۂ نظر سے۔

''اسلاموفوبیا کی حقیقت'' کے عنوان سے معروف ریسرچ سکالر جناب مجتبیٰ فاروق لکھتے ہیں: ''اسلاموفوبیا'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ بطور اصطلاح سب سے پہلے برطانیہ میں استعمال کیا گیا۔ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ: ''یہ اصطلاح 1991ء میں امریکی رسالہ Insight میں معرض وجود میں آئی''۔ ایٹن دیمت اور سلیما بن ابراہیم نے فرانس میں یہ اصطلاح 1925ء میں استعمال کی، جب انہوں نے کہا کہ Occes detive islampnobia۔ اگرچہ اُس وقت یہ اصطلاح، آج کے عہد میں زیر استعمال اصطلاح کے تناظر میں نہیں تھی۔

کسی بھی چیز یا عمل سے خوف کھانے کو ''فوبیا'' کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، مثلاً وہ شخص جس کو پانی سے ڈر لگتا ہو، اس کے لیے ''ہائیڈروفوبیا'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح سے ایک اصطلاح ''فوبوفوبیا'' ہے۔ اس مرض کا مریض کسی حادثے کو دیکھ کر خوف زدہ رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اونچائی سے ڈر لگتا ہے، وہ ''ایکروفوبیک'' کے مریض ہوتے ہیں، جبکہ ''مونوفوبیک'' بھی ایک نفسیاتی بیماری کا نام ہے جس کا مریض تنہائی سے ڈرتا ہے۔

''فوبیا'' (Phobia) خوف، ڈر اور نفرت رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہ ذہن کی اس مریضانہ کیفیت کا نام ہے، جو کسی کی طرف سے خوف یا نفرت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ چیمبرز ڈکشنری میں 'فوبیا' کا یہ معنی مذکور ہے: فوبیا، غیر منطقی اور مریضانہ ذہنیت کا نام ہے جو خوف، بے رغبتی اور نفرت پر مبنی ہے۔ جب لفظ ''فوبیا'' کو اسلام کے ساتھ جوڑا جائے تو اس کے معنی و مفہوم: ''اسلام سے خوف، ڈر یا نفرت'' کے ہوتے ہیں جو مخالفین اسلام اور معترضین کے دل و دماغ میں رچ بس گیا ہے۔ اسلام کی حقیقی تصویر کو بگاڑنا، مسلمانوں کو بدنام کرنا، انہیں جاہل اور خوف ناک روپ میں پیش کرنا اور انہیں ذہنی و جسمانی طور سے پریشان کرنا،

تشدد کا نشانہ بنانا، مساجد اور اسلامی شعائر پر حملے کرنا، مسلمانوں کے مخصوص لباس پر طعنے دینا اور ان کے تہذیبی تشخص اور جائز اور بنیادی حقوق سے محروم کرنا وغیرہ ''اسلاموفوبیا'' کی مختلف شکلیں اور حربے ہیں۔ اگر جامع الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ صورت سامنے آتی ہے:

''اسلاموفوبیا'' سے مراد، اسلام، مسلمان اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے نفرت اور خوف کا اظہار اور عمل ہے۔ ''اسلاموفوبیا'' ایک ایسا نظریہ ہے جس کے مطابق دنیا کے تمام یا اکثر مسلمان جنونی ہوتے ہیں جو غیر مسلموں کے بارے میں متشددانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

''آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن'' (OIC) نے اسلاموفوبیا کی تعریف اس طرح بیان کی ہے: ''اسلام کے خلاف غیر منطقی، جارحانہ اور سخت ناپسندیدگی کے اظہار کا نام ''اسلاموفوبیا'' ہے''۔ اسی طرح ''اسلاموفوبیا'' میں مسلمانوں کو نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی طور پر ہراساں کرنا اور اسلام کے ماننے والوں کو ملک و قوم کے اقتصادی، سماجی، سیاسی اور روز مرہ زندگی سے بے دخل کرنا بھی شامل ہے۔ دنیا میں مسلم اقلیتوں کے ساتھ عملاً ایسا ہی سلوک ہو رہا ہے۔ مخالفین اسلام کی طرف سے یہ مبنی بر جاہلیت بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ: ''اسلام میں کوئی تہذیب ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ مغربی تہذیب سے ہر اعتبار سے کم تر ہے''۔ علاوہ ازیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور مسلمانوں کو کم تر باور کرتے ہیں۔ برطانیہ کا ایک تحقیقی ادارہ، دی رونی میڈ ٹرسٹ، بائیں بازو کا ایک ''مرکز دانش'' (تھنک ٹینک) ہے، جس نے 1997ء میں ''اسلاموفوبیا ہم سب کے لیے چیلنج'' کے عنوان کے تحت ایک دستاویز میں اسلاموفوبیا کی تعریف کے درج ذیل چھ نکات بیان کیے ہیں۔

''اسلام ایک توحید پرست، جامد اور ناقابل تغیر مذہب ہے۔ اسلام ایسا منفرد مذہب ہے جس میں دیگر مذاہب اور تہذیبوں سے مختلف اقدار ہیں۔ یہ غیر معقول، قدامت پرست، جنسی تفریق پر مبنی، خطرناک، دہشت گردی اور تہذیبی تصادم کو فروغ دینے والا مذہب ہے۔ مغربی فکر و تہذیب سے کم تر مذہب ہے۔ اسلام ایک سیاسی نظریہ ہے۔ اسلام مغربی فکر و اقدار پر غیر معمولی تنقید کرتا ہے''۔

مغرب میں ایک ہی بات بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ اسلام ''انتہا پسندی'' کا ذریعہ ہے۔ یہ امریکہ میں مارچ 2002ء میں 25 فیصد لوگوں کی رائے تھی، جبکہ 2014ء میں یہ 50 فیصد تک پہنچ گئی۔ برطانیہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔

کیرن آرم سٹرانگ لکھتی ہے: ''نائن الیون کی پانچویں برسی کے موقعے پر پاپائے اعظم بینیڈکٹ نے جرنی میں جو متنازع بیان دیا، اس نے ''اسلاموفوبیا'' کی لہر کو اور بڑھا دیا۔ اس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ ''اسلاموفوبیا'' کی تحریک کو فروغ مل رہا ہے اور مغرب ایک نئی صلیبی جنگ کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

مغرب اور یورپ میں اسلام اور حضور نبی کریم ﷺ کی تضحیک کی جاتی ہے اور مذاق اُڑایا جاتا ہے، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمان، رسول پاک ﷺ اور ان کی تعلیمات سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ اسی لیے مغرب اور یورپ میں ہر زمانے اور ہر وقت اللہ کے رسول ﷺ پر رکیک حملے کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہاں کا ہر طبقہ پیش پیش ہے۔ چاہے وہ حکمرانوں یا پالیسی سازوں کا طبقہ ہو یا دانش وروں، مصنفوں، فن کاروں اور ادیبوں کا، غرض کہ ان میں ہر گروہ یا طبقے کے سرگرم افراد اسلام اور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر حملہ کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ نے نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر کیچڑ اچھالنے کے حوالے سے مغرب کے تاریخی کردار کے بارے میں لکھا ہے: ''تاریخ کی کسی بھی بڑی شخصیت کو اتنا ہتک آمیز طور پر مغرب میں پیش نہیں کیا گیا، جتنا کہ حضرت محمد ﷺ کو پیش کیا گیا ہے''۔

مغرب میں اسی فضا کو پروان چڑھایا جا رہا ہے، گویا: ''اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہر چیز کا دوسرا نام انتہا پسندی اور دہشت گردی ہے''۔ دنیا میں جہاں بھی مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کی شہریت پر سوالات، پاسپورٹ مشکوک، نقاب و حجاب میں ملبوس عورتیں شکوک وشبہات کی شکار ہیں۔ جس مذہب کو سب سے زیادہ ہدف تنقید و ملامت بنایا جا رہا ہے، وہ اسلام ہی ہے۔ **CSEW** (کرائم سروے فار انگلینڈ اینڈ ویلز) کی تحقیق کے مطابق نفرت اور عداوت کے شکار سب سے زیادہ مسلمان ہیں، جن کا تناسب **8.3** فیصد ہے۔ اس کے برعکس ہندو **3.0** فیصد، عیسائی **1.0** فیصد اور باقی مذاہب کا تناسب **5.0** فیصد ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نائن الیون کے بعد مسلمانوں پر تشدد کے بھی بے شمار واقعات رونما ہوئے ہیں۔ **CAIR** کے مطابق امریکہ میں **2005**ء کے دوران ایک ہزار **9** سو ساٹھ جبکہ **2006**ء میں **2** ہزار **4** سو **72** حملے مسلمانوں پر ہوئے۔

اسی چیز کو پھیلا کر دیکھیے تو مغرب میں نائن الیون کے بعد جب کسی مسلمان سے کوئی جرم یا خطا سرزد ہو جاتی ہے تو اس کو نہ صرف شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ قانون کے دائرے میں بھی لیا جاتا اور اسلام پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص سے جرم یا قتل سرزد ہو جاتا ہے تو صرف اس کی ذات کو تنقید کی زد میں لایا جاتا ہے۔

میڈیا، اسلاموفوبیا کی جڑ مضبوط کرنے اور پھیلانے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر زبردست کردار ادا کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو متشدد، گمراہ، جاہل، انتہا پسند اور جنونی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نائن الیون کے بعد سے مغرب اور یورپ کا کوئی ایسا اخبار اور رسالہ نہ ہوگا، جس میں آئے روز اسلام اور اس کے ماننے والوں کے خلاف زہر افشانی نہ کی گئی ہو۔ برطانیہ کے قومی اخبارات ہر ماہ اوسطاً پانچ سو سے زیادہ تحریریں، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق شائع کرتے ہیں۔ ان میں سے 91 فیصد مضامین میں منفی تصویر پیش کی گئی، جب کہ صرف 4 فیصد نے کسی حد تک مثبت خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ 60 فیصد میں اسلام کو عیسائی اور مغربی دنیا کے لیے خطرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور زبان بھی اس کے لیے بازاری قسم کی استعمال کی جاتی ہے، مثلاً حضور نبی رحمت ﷺ کے لیے وہ جان بوجھ کر ذو معنی اور ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔

اسی طرح جب مسلم دنیا میں کوئی شخص یا عورت اسلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شبیہہ بگاڑنے کی کوشش کرتا یا کرتی ہے تو مغربی اور یورپی میڈیا اس کو امت مسلمہ کے لیے ''رول ماڈل'' کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ جس کی بدترین مثال بھارتی نژاد سلمان رشدی، بنگلہ دیشی تسلیمہ نسرین اور صومالیہ کی ایان حرثی علی کی ہے۔ اس رویے پر کیرن آرم سڑانگ نے لکھا ہے: مغربی اسکالرز نے اسلام کو کھلے عام گستاخانہ اور ہتک انگیز مذہب قرار دیا اور حضور نبی کریم ﷺ پر جھوٹ کہنے اور تلوار پر مبنی پر تشدد مذہب کی بنیاد ڈالنے کا الزام دہرایا۔''

مغربی میڈیا کی یہ سب زہر افشانیاں، جنہیں وہ ''آزادی رائے'' کہتے ہیں، صرف اسلام، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں تک ہی محدود ہیں۔ لیکن جب بھی کوئی ان کی فکر و تہذیب، ثقافت، سیاست اور اخلاقیات پر کسی قسم کی تنقید کرتا ہے تو اسے وہ آزادی اظہارِ رائے پر حملہ قرار دیتے ہیں۔ مغربی اور یورپی ممالک میں مسلسل نہ صرف اسلام اور حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام بلکہ مساجد، اسلامی مراکز، اس نفرت کا نشانہ بن رہے ہیں، بلکہ روزمرہ کاموں، سفر اور دفاتر میں مسلم خواتین کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کے واقعات بھی بڑھ رہے ہیں۔

2013ء کی ایک ہولناک رپورٹ میں ایک 21 سالہ حاملہ خاتون کی مثال پیش کی گئی، جب اس پر حملہ کیا گیا تو اس وقت وہ حجاب پہنے ہوئی تھیں۔ دو مردوں نے اس کا اسکارف چھین لیا۔ پھر اس کے بال کاٹے، اس کے بعد اس کی پیٹ پر لاتیں ماریں، جس کی وجہ سے اس کا حمل ضائع ہوگیا۔ اسی طرح سے بہت خواتین نے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کی داستان الم سنائی۔ لندن میں حال ہی میں ایک شرم ناک واقعہ پیش آیا جس میں ایک باحجاب مسلم لڑکی کو بھری ٹرین میں نسلی تعصب کی بنیاد پر حملے کا نشانہ بنایا گیا۔

مغرب اور یورپ میں میڈیا، ادبا اور دانش وروں کے ساتھ ساتھ حکمران طبقہ بھی ''اسلاموفوبیا'' کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ امریکہ میں اس کی بہت سی مثالیں ضرب المثل بن چکی ہیں۔ یورپ میں فرانس وہ ملک ہے جہاں سب سے زیادہ مسلمان (60 لاکھ) آباد ہیں۔ مارین لوپون وہاں مسلم مخالف قدامت پسند جماعت، فرنٹ نیشنل، کی سربراہ نے 2010ء میں بیان دیا کہ ''جب مسلمان، گلیوں اور سڑکوں پر عبادت کرتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ نازی جرمن دوبارہ فرانس پر قبضہ کریں گے''۔ وہ حکومت سے حجاب اور مسلم مہاجرین کی آمد پر پابندی کا مسلسل مطالبہ کرتی آ رہی ہے۔ اسلام مخالف یورپی حکمرانوں میں ہالینڈ کا خیرت ویلڈرس بہت مشہور ہے اور پارٹی فار فریڈم کا سربراہ بھی ہے جس کا لائحہ عمل ہے کہ ''اب وہ وقت آ پہنچا ہے جب یورپی معاشروں کو مسلمانوں سے پاک کر دیا جائے اور ہمیں چاہیے کہ مسلمانوں پر اپنی سرحدیں بند کر دیں''۔

بعض ماہرین کے مطابق: ''اسلاموفوبیا مسلمانوں اور عربوں کے خلاف نسلی تعصب کا نام ہے''۔ مذہبی اور نسلی تعصب زیادہ تر ڈنمارک، جرمنی، ہنگری، سوئٹزرلینڈ، ایسٹونیا، یونان اور اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ مغربی اور یورپی دنیا میں مسلمانوں کے لیے ''Others'' یعنی ''دوسروں'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر موسیلاتن کیری (ہارورڈ یونی ورسٹی) لکھتی ہیں:

''یورپ اور مغرب، اسلام اور مسلمانوں کو دشمن کے طور پر پہلے ہی سے پیش کرتے آ رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ سے مسلمانوں کو مغرب میں غیروں کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ بالخصوص ترقی، قوم، فرد اور سیکولرائزیشن کی بنیاد پر مغرب ایک ایسے مستقل میلان طبع کی نشان

وہی کرتا ہے جس کے زیر اثر اسلام کو غیر مہذب رویے سے جوڑا جاتا ہے اور مسلمانوں کی اقدار و شناخت کو لاحق خطرے کی شکل میں داخلی دشمن کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے ساتھ برسرِ پیکار خارجی دشمن بھی سمجھا جاتا ہے''۔

(www.commongroundnews.org)

آسٹریلیا میں مسلمانوں کو امتیازی سلوک اور مذہبی عدم رواداری کا غیر مسلموں کے مقابلے میں تقریباً تین گنا زیادہ سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تقریباً 60 فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ انہیں ''اسلاموفوبیا'' کی کسی نہ کسی قسم کا سامنا رہا ہے۔ اسی طرح سے ایئر پورٹ پر جہاز سے چڑھتے اور اُترتے وقت بھی مسلمانوں کو مشکوک نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نومبر 2015ء میں امریکی ریاست شکاگو سے فلاڈلفیا جانے والی پرواز سے دو مسافروں کو اس وجہ سے جہاز پر سوار ہونے سے روک دیا گیا، کیونکہ یہ آپس میں عربی بول رہے تھے۔ برطانیہ میں مسلمانوں پر حملوں میں 300 فیصد اضافہ ہوا ہے اور مسلمان اپنے آپ کو مغربی اور یورپی ممالک میں قدرے الگ تھلگ محسوس کر رہے ہیں۔

بھارت میں بھی مسلم مخالف لہر زوروں پر ہے، جہاں آئے روز مسلمان نوجوانوں کو اسلام پسندی کی بنیاد پر گرفتار کر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس طرح مسلم شناخت کی بنیاد پر مسلمانوں کو بہت سے حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ''اسلاموفوبیا'' کی بنیاد پر ہی گودھرا، میرٹھ اور مظفر گڑھ جیسے فسادات واقع ہوئے۔ 25 اگست 2015ء کو بنگلور میں ایک لڑکے شاکر کو مبینہ طور پر بجرنگ دل کے کارکنوں نے کھمبے سے باندھ کر بے رحمی سے پیٹا اور اس کے کپڑے تار تار کر دیئے۔ اسی طرح سے مئی 2015ء کو ممبئی میں ایم بی اے گریجویٹ ذیشان کو ایک کمپنی نے یہ کہہ کر نوکری دینے سے انکار کر دیا کہ ''ہم صرف غیر مسلم امیدواروں کو ملازمت پر رکھتے ہیں''۔

راشٹریہ سوامی سیوک سنگھ (آر ایس ایس)، بجرنگ دل، بی جے پی اور دیگر بھگوا زعفرانی تنظیموں اور تحریکوں کے قائدین اور سیاسی زعما کے زہر آلود نظریات و بیانات سے بھارت میں ہر مسلمان پریشان ہے۔ زعفرانی تحریکات ہندو اکثریت کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلاتی رہی ہیں کہ: ''مسلمان بھارت میں اپنی آبادی میں اضافے کے ذریعے اسے مسلم ملک بنانے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں اور چند برسوں میں بھارت ایک مسلم ملک بن

جائے گا‘‘۔اس سلسلے میں اب کھلے بندوں یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ بھارت میں اقلیتیں کسی بھی جائز مطالبے کی حق دار نہیں ہیں۔

29 تا 31 اکتوبر 2015ء کو آر ایس ایس کے قومی سطح کے اجلاس نئی دہلی میں جس مسئلے کو مرکزی حیثیت دی گئی، وہ مسلمانوں کی ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی تھا۔ اجلاس کے اختتام پر ایک قرارداد میں دو باتوں کا اظہار کیا گیا۔ ایک یہ کہ ’’بھارتی مذاہب ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے ماننے والوں کی آبادی میں تشویش ناک حد تک کمی آ رہی ہے‘‘۔ دوسری یہ کہ: ’’مسلمانوں کی آبادی میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے‘‘، آر ایس ایس سے وابستہ ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نے انڈین ایکسپریس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ’’بھارت میں مسلمان رہیں مگر اس دیش میں ان کو گائے کا گوشت کھانا چھوڑنا ہوگا، یہ یہاں کی گئو ماتا ہے۔ اس اعلان کے چند ہی روز بعد ایک مسلمان محمد اخلاق کو ہندوؤں نے محض اس افواہ کی بنیاد پر کہ اس نے گائے کا گوشت کھایا ہے، مار مار کر ہلاک کر دیا‘‘۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور نومبر 2016ء)

11 فروری 2017ء کو برطانیہ کے روزنامہ دی اینڈیپنڈنٹ (The Independent) نے اپنی ایک چشم کشا رپورٹ میں لکھا کہ خون جما دینے والی سخت سردی میں فرانس کی پولیس مہاجرین پر آنسو گیس کے فائر کرتی اور ان کے کمبل چرا لیتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ غیر انسانی کام دنیا کے اس خطے میں ہو رہا ہے جس کے سامنے سیکولر حضرات چوبیس گھنٹے سربسجود رہتے اور ان کے اعلیٰ اخلاق کی مثالیں دیتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ وہ ملک ہے جہاں سے ’’انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا‘‘ کا نعرہ برآمد ہوا تھا۔

برطانیہ، ڈنمارک اور یونان میں کفریہ کلمات ادا کرنے کے خلاف قوانین رائج ہیں، لیکن ان کا نفاذ صرف عیسائیوں کے حق میں ہوتا ہے دیگر مذاہب اس کے زیر تحفظ نہیں آتے۔ ڈنمارک کی لبرل پارٹی جو تکفیری قانون کے خلاف ہے اور برسر اقتدار قدامت پسند پارٹی نے پارلیمنٹ میں بلاس فیمی (تکفیر) کے بارے میں پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے ایک بل کی مخالفت کی ہے۔ برطانیہ میں نسلی تعلقات کا ایکٹ 1976 کے تحت نسل، رنگ یا قومیت کی بنیاد پر تفریق کو ممنوع قرار دیتا ہے، لیکن مذہبی بنیاد پر امتیاز اس میں شامل نہیں ہے، ابھی کچھ سال پہلے تک برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف نسلی تفریق کو غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ برطانیہ کی عدالتیں مسلمانوں کو نسلی گروپ تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں

اور سکھوں کو نسلی گروپ تسلیم کیا جاتا تھا۔

نیک گریفن جو ایک انتہا پسند اور جنونی حد تک مسلم مخالف برٹش نیشنل پارٹی کا لیڈر ہے، اس نے جنوری 2006ء میں ایک بیان میں کہا تھا کہ اسلام ایک غیر اخلاقی اور برا مذہب ہے، اس پر نسلی تعلقات ایکٹ 1976 کے تحت نسلی اشتعال پھیلانے کا مقدمہ چلایا گیا، لیکن عجلت میں چلائے گئے مقدمہ میں اسے بری کر دیا گیا۔ اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل پیش کی کہ اس نے ایسے مذہب کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا جس پر تنقید ممنوع نہیں، یہ صرف عیسائی انجلیکل مذہب ہے جو اس دائرہ میں آتا ہے اور اس کا تعلق نسل پرستی سے نہیں ہے۔

مغرب میں رہنے والے مسلمانوں میں یہ خیال عام ہے کہ شہریت حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغربی معاشرہ نے آپ کو قبول کر لیا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مغربی تہذیب میں جذب ہو جائیں اور اپنی روایتی تہذیبی شناخت کو مسترد کر دیں۔ 2005ء میں فرانس میں مراکش کی ایک خاتون کی درخواست شہریت محض اس بنیاد پر رد کر دی گئی کہ وہ مغربی تہذیب میں جذب ہو جانے کے معیار پر پوری نہیں اتری، دلیل یہ پیش کی گئی کہ وہ خاتون انقلابی، اسلامی رسوم و رواج پر عمل پیرا ہے جو کہ فرانس کی اقدار سے میل نہیں کھاتیں جن میں مرد و عورت کی مساوات بھی شامل ہے، اس خاتون کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ حجاب کی پابندی کرتی تھی، نقاب چہرے پر ڈالتی تھی حالانکہ اس کی شادی ایک فرانسیسی باشندے سے ہوئی تھی، وہ پیرس میں رہتی تھی، روانی سے فرانسیسی زبان بولتی تھی اور اس کے دونوں بچے بھی فرانس میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس خاتون نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی۔ فرانس کے دستور میں بنیادی حقوق کے طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت کا حوالہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اس نے فرانس کی قدروں کی پامالی کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جولائی 2008ء میں فرانس کی عدالت عالیہ نے اس کی اپیل خارج کر دی اور سابقہ فیصلہ کو برقرار رکھا۔

معروف کالم نگار جناب اشتیاق بیگ اپنے کالم ''پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع کیوں؟'' میں لکھتے ہیں: ''میں جب کبھی کراچی جیم خانہ یا سندھ کلب جاتا ہوں تو مجھے تقسیم ہند سے قبل کا وہ دور یاد آ جاتا ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا اور ان عمارتوں کے باہر ایک تختی نصب تھی جس پر تحریر تھا کہ ''یہاں کتوں اور ہندوستانیوں (مقامی افراد) کا داخلہ ممنوع ہے''۔ اس دور میں ان کلبوں اور جیم خانہ میں شام ڈھلتے ہی انگریزوں کی رقص و سرور کی محفلیں اور

شراب کا دور شروع ہو جاتا تھا۔ حالانکہ ان محفلوں میں شریک انگریزوں کو ویٹروں کی یونیفارم میں ملبوس مقامی افراد شراب اور سور کے گوشت سے تیار کیے گئے کھانے پیش کیا کرتے تھے لیکن یہاں مقامی افراد کا داخلہ ممنوع تھا۔ آج انگریزوں کا تسلط ختم ہو چکا ہے لیکن ان کلبوں اور جیم خانہ کی دیواروں پر آج بھی انگریز دور کے حکمرانوں کی تصاویر آویزاں ہیں جو ان کی عصبیت اور نسل پرستی کی بنیاد پر ہمارے بزرگوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی یاد دلاتی ہیں۔

انگریزوں کے تسلط کے خاتمے اور قیام پاکستان کے بعد ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اب نسل پرستی اور عصبیت کا دور ختم ہو چکا ہے مگر گزشتہ دنوں اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر مجھے ایک بار پھر انگریز دور میں لے گئی۔ خبر کے مطابق اسلام آباد کی انتظامیہ اور پولیس نے دارالحکومت کے متمول علاقے میں واقع ایک فرنچ ریسٹورنٹ کو اس بنیاد پر بند کر دیا کہ ریسٹورنٹ میں پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اطلاعات کے مطابق مقامی انتظامیہ کو کافی عرصے سے یہ شکایات موصول ہو رہی تھیں کہ ریسٹورنٹ میں پاکستانیوں کو داخلے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ ان اطلاعات پر انتظامیہ اور پولیس کے دو اہلکاروں نے ریسٹورنٹ میں داخلے کے لیے خود کو جرمن اور کینیڈین شہری ظاہر کیا جس پر ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے صورت سے پاکستانی نظر آنے والے ان اہلکاروں سے پاسپورٹ طلب کیا اور پاسپورٹ نہ دکھانے پر ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے انہیں داخلے سے روک دیا جس کے بعد اسسٹنٹ کمشنر اسلام آباد نے پولیس کے ہمراہ ریسٹورنٹ پر چھاپہ مار کر بڑی تعداد میں شراب کی بوتلیں برآمد کر لیں جبکہ اس دوران ریسٹورنٹ میں موجود امریکی اور یورپی باشندے شراب پیتے ہوئے پائے گئے۔ کمشنر کے مطابق ریسٹورنٹ میں کیسینو بھی قائم تھا اور یہ انوکھا ریسٹورنٹ تھا جہاں مقامی افراد کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

تعجب اور حیرانی اس بات پر ہے کہ پولیس نے محض خانہ پری کے لیے ریسٹورنٹ کے 2 پاکستانی ملازموں کو گرفتار کر لیا جبکہ ریسٹورنٹ کا مالک فرانسیسی شہری فلپ لافورگ ابھی تک آزاد گھوم رہا ہے اور غیر ملکی میڈیا کو اپنی مظلومیت کی داستان سنا رہا ہے۔ فلپ لافورگ کا موقف ہے کہ فرانسیسی لفظ ''لا میزاں'' کا مطلب گھر ہوتا ہے، اس طرح یہ ریسٹورنٹ میرا گھر ہے اور مجھے کسی کو مدعو کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس کے بقول لا میزاں ریسٹورنٹ خالص فرانسیسی کھانوں کے لیے کھولا گیا ہے جو سور کے گوشت سے تیار کیے جاتے

ہیں اور ان میں شراب کی آمیزش بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ کھانے مسلمانوں کے ایمان سے مطابقت نہیں رکھتے اور وہ پاکستانیوں کے لیے فرنچ کھانوں کی ترکیبیں نہیں بدل سکتا، اس لیے یہاں پاکستانیوں کو داخلے کی اجازت نہیں۔

فرانس نے شاید مادی ترقی کی معراج کو پا لیا ہے مگر یہ ترقی اسے مذہب، انسانیت اور تہذیب وتمدن سے دور لے گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے انتہائی پستی کی جانب گامزن ہے۔ فرانس کا صدر فرانسوا اولاند جو کئی سالوں سے شادی کے بغیر اپنی گرل فرینڈ جسے خاتون اول کا اعزاز حاصل تھا، کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، آج اس کے ایک اداکارہ کے ساتھ معاشقے کے چرچے دنیا بھر میں عام ہیں۔ فرانس میں بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں اور ایک اندازے کے مطابق فرانس میں تقریباً 65 لاکھ مسلمان مقیم ہیں۔ اس طرح اسلام، فرانس کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ فرانس میں کچھ عرصے قبل مسلمان خواتین کے حجاب پہننے پر پابندی کا قانون نافذ کیا گیا تھا جس کی رو سے اگر کوئی مسلمان خاتون اس قانون کی خلاف ورزی کرتی ہے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ فرانس ہی وہ ملک ہے جس نے تعلیمی اداروں میں مسلمان بچیوں کے اسکارف پہننے پر پابندی عائد کر رکھی ہے جو انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔ یہ بڑی حیران کن اور تعجب خیز بات ہے کہ ایک جانب فرانس میں مسلمان خواتین کے حجاب پہننے اور اسکارف اوڑھنے پر پابندی عائد ہے تو دوسری جانب وہاں کے لوگوں کو ساحلوں پر کپڑوں کے بغیر جانے کی کھلی اجازت ہے، اس طرح عریانیت قانون کے زمرے میں جبکہ جسم ڈھانپنے کا عمل خلاف قانون ہے۔

افسوس کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فرانس کا ایک شہری اپنے ریسٹورنٹ میں سور کے گوشت کے کھانے اور شراب فروخت کر رہا ہے اور اس نے وہاں پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ لیکن بالفرض اگر کوئی مسلمان یا پاکستانی، فرانس میں حلال کھانوں کا کوئی ریسٹورنٹ کھولے اور وہ وہاں مقامی لوگوں کا داخلہ ممنوع قرار دے تو کیا فرانسیسی حکومت اس کی اجازت دے گی؟ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ ریسٹورنٹ کے مالک نے مقامی انتظامیہ سے درخواست کی ہے کہ وہ ریسٹورنٹ کو پرائیویٹ کلب کا درجہ دیدے تاکہ اسے پاکستانیوں کو داخلے سے روکنے کی قانونی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اگر انتظامیہ ایسا کرتی ہے تو اسے شدید عوامی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا اور قوم سراپا احتجاج بن جائے گی۔ رنگ

ونسل اور مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ تفریق کرنا پاکستان کے آئین کے منافی ہے۔حکومت پاکستان کو چاہیے کہ آئین کی خلاف ورزی کرنے پر ریسٹورنٹ کے مالک کو گرفتار کر کے اسی طرح سزا دے جس طرح فرانس میں خواتین کو حجاب پہننے اور اسکارف اوڑھنے کے جرم میں دی جاتی ہے تا کہ آئندہ کوئی انگریز دور کے نسل پرستی کی بنیاد پر بنائے گئے کالے قانون کو پاکستان میں نافذ کرنے کی جرات نہ کرسکے"۔(روزنامہ جنگ لاہور 5 فروری 1914ء)

اس کے برعکس مسلمانوں کا یہود و نصاریٰ کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کا مظاہرہ ملاحظہ کیجیے: 2011ء میں برمنگھم میں ہونے والے فسادات میں کئی بے گناہ مسلمان شہید ہوئے۔ برمنگھم فسادات میں مارے گئے پاکستانی نژادنوجوان کے والد طارق جہاں نے کہا کہ ان کا برطانیہ کے نظام انصاف سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ انہوں نے یہ بات واقعہ کی تحقیقات میں رکاوٹ سے متعلق جاری پولیس رپورٹ میں کسی بھی اہلکار کے خلاف کارروائی نہ ہونے کی سفارش پر کی۔ 2011ء میں لندن فسادات کی آگ برمنگھم تک پھیل گئی تھی۔ سیاہ فام شخص کی پولیس کے ہاتھوں موت کے بعد برمنگھم میں لوٹ مار کے بھی واقعات ہوئے تھے اور اس دوران گھروں اور کاروباری مراکز کا تحفظ کرنے والے ہارون جہاں اور اس کے دو دوست شہزاد علی اور عبدالمصور کو کار سے کچل کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ہارون کے والد طارق جہاں نے واقعہ پر مشتعل افراد کو پرامن رہنے کی اپیل کر کے ہیرو کی حیثیت حاصل کر لی تھی تاہم اب پولیس واچ ڈاگ کی رپورٹ پر ردعمل میں مقتول ہارون کے والد نے کہا کہ ان کا برطانیہ کے نظام انصاف سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔قتل میں مبینہ طور پر ملوث 8 ملزم بری کر دیے گئے تھے جبکہ پولیس تفتیش میں مسائل کے سبب مقدمے کی کارروائی تقریباً روکنا پڑی تھی۔ اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ ویسٹ مڈلینڈز پولیس West Midlands Police یہ ظاہر کرنے میں نا کام ہوگئی تھی کہ انہوں نے مناسب اتھارٹی کے بغیر ہی عینی شاہدین کو پراسیکیوشن سے امیونٹی کی پیش کش کی تھی۔ عدالتی کارروائی کے دوران مبینہ طور پر جھوٹ بولنے پر جج نے چیف انسپکٹر انتھونی ٹیگ Anthony Tagg کی سرزنش بھی کی تھی۔ انڈی پینڈینٹ پولیس کمپلینٹس کمیشن نے ٹیگ اور انسپکٹر خالد کیانی کے اقدامات سے متعلق تفتیش کی تھی جس کی رپورٹ بدھ کی صبح جاری کی گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ ٹیگ جواب دہ نہیں، تاہم کیانی نے عینی شاہدین کو امیونٹی کی پیشکش کر کے غلط کام کیا تھا اور ریٹائر نہ ہوتے تو کیانی

کے خلاف مس کنڈکٹ کی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ طارق جہاں نے کہا کہ بیٹے کی میت پڑی تھی اور پولیس نے انہیں فسادات روکنے کے لیے پلیٹ فارم پر چڑھا دیا اور عدم تشدد کے فلسفے کا پرچار کرنے کے لیے استعمال کرڈالا۔ طارق جہاں نے کہا کہ نظام انصاف پر اعتماد کرنا ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

21 فروری 2015ء کو پیرس اور کوپن ہیگن اوسلو ناروے میں یہودیوں کی عبادت گاہ کے گرد ہزاروں مسلمانوں نے امن کا حصار قائم کیا۔ یہ علامتی حصار یورپ میں یہودیوں کے خلاف تیزی سے فروغ پاتے پرتشدد رویوں کی مذمت میں بنایا گیا تھا۔ یہ مظاہرہ فیس بک پر ایک تحریک Fredens Ring کے ذریعے عام یہودیوں کے لیے ایک مثبت قدم تھا۔ بلدیاتی منسٹر Tore Sanner نے اس موقع پر کہا کہ ہمیں اس تعاون کے لیے مسلم نوجوانوں کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ ملبورن میں ایک تصویری نمائش کا مقصد البانیہ کے مسلمانوں کے ان اقدامات کو روشن کرنا تھا جب البانیہ کے مسلمانوں نے اپنی سرحدیں یہودی پناہ گزینوں کے لیے کھول دیں تھیں اور ان کو جعلی دستاویز فراہم کر کے نازی کیمپوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب رومی سلطنت نے یروشلم پر حملہ کیا تھا تو جوڈیا اور اسمارب یہودیوں نے مسلم اسپین میں پناہ لی تھی۔ اور وہاں وہ 15 صدی عیسوی تک مسلمانوں کے درمیان پرامن زندگی گزارتے رہے۔ 1942ء میں شاہ اسپین فرڈیننڈ نے مسلمانوں کے زوال کے بعد اعلان کیا کہ تمام اقلیتیں یا تو عیسائیت قبول کرلیں یا اسپین چھوڑ دیں۔ لہٰذا بہت سے یہودیوں نے بحالت جبر عیسائیت قبول کر لی۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کے سلطان بایزید کے اس اعلان پر کہ یہودی ترکی میں پناہ لے سکتے ہیں، بے شمار یہودیوں نے ترکی کے یورپی حصے میں رہائش اختیار کی جو آج بھی سیفارڈی یہودی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان 500 سالوں میں سلطنت عثمانیہ کے تحت تمام وفادار یہودیوں کو کاروبار، تعلیم اور ثقافتی طور پر یکساں مواقع فراہم کیے گئے۔ سلطنت عثمانیہ اپنے عروج کے دور میں مذہبی، رواداری اور اقلیتوں کی حفاظت کے لیے مشہور تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں یہودی فلسطین میں پرامن زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسئلہ تو برطانیہ کے جورڈن اور فلسطین میں حکومت سنبھالنے پر ہوا۔ دوسری جنگی عظیم میں ترکش سفارت کاروں اور ڈپلومیٹ نے یورپی ممالک میں جرمن کیمپ سے مفرور پناہ گزینوں کو ویزہ فراہم کر کے ان کا سفر آسان کر دیا۔ ترکش سفیر صلاح الدین الکومان کو یونانی جریدے

Holocaust سے یہودیوں کو فرار ہونے میں مدد فراہم کرنے کی وجہ سے Rhodes انسٹی ٹیوٹ سے تمام قوموں میں سے صحیح قوم کا ایوارڈ عطا ہوا تھا۔

پیرس حملے میں انسانی جانوں کو بچانے میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ الجزائری مسلمان نے ہوٹل کے ٹیرس پر گولیاں لگنے سے زخمی دو خواتین کو محفوظ مقام تک پہنچایا اور انہیں ضروری طبی امداد دے کر ان کی جانیں بچائیں۔ اسی طرح پیرس میں 80 ہزار تماشائیوں کی گنجائش کے حامل اسٹیڈیم میں خودکش حملہ آور کو داخلے سے زہیر نامی مسلمان گارڈ نے روکا تھا۔ موقع پر موجود فرانسیسی شہریوں نے گارڈ کو ہیرو قرار دیا تھا، تاہم مغربی میڈیا اور خود فرانسیسی حکومت اس مسلمان گارڈ کی وفاداری کو چھپانے کے لیے اس کی شناخت اور درست نام تک ظاہر کرنے سے گریزاں ہے۔

مسلمانوں کی روا داری اور حسن اخلاق کا اس سے بڑا مظاہرہ کیا ہوگا کہ مارچ 2017ء میں امریکہ میں چند شر پسند عیسائیوں نے یہودیوں کے ایک تاریخی قبرستان میں لگے کتبوں کی توڑ پھوڑ کی تو امریکی مسلمانوں کی طرف سے اس واقعہ کی نا صرف شدید مذمت کی گئی بلکہ ان قبروں کی بحالی کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کیے گئے۔ ان قبروں کی بحالی کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے کی مہم سے وابستہ لنڈا سرسور اور طارق المسیدی کی طرف سے 20 ہزار ڈالر اکٹھے کرنے کا ہدف مقرر کیا تھا۔ تاہم طارق المسیدی نے اپنے فیس بک صفحے پر ایک پیغام میں لکھا کہ لگ بھگ ایک لاکھ 30 ہزار ڈالر جمع ہوئے جو یہودیوں کے قبرستان کا انتظام کرنے والے ادارے میں جمع کروا دیئے گئے۔

بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی اپنے ایک فکر انگیز مضمون ''امریکہ میں بنیاد پرست صیہونی عیسائی'' میں لکھتے ہیں:

''ہسپانیہ کے آخری مسلمان بادشاہ ابو عبداللہ نے 1492ء میں بغیر کسی لڑائی یا مزاحمت کے محض جان کی امان پر عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ایزابیلا کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو ہسپانیہ کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عیسائیوں نے فوری حکم جاری کر دیا کہ اب سارے ہسپانیہ میں صرف عیسائی ہی رہ سکتے ہیں۔ جو لوگ عیسائی نہیں بنتے، وہ فوری طور پر ملک چھوڑ کر چلے جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان کو خالی ہاتھ ملک خالی کرنا ہوگا۔ اب قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ برصغیر جیسا بڑا ملک ہسپانیہ، جہاں مسلمان آٹھ صدیوں سے رہ رہے

تھے، کے لاکھوں خاندان چشم زدن میں گھر بار چھوڑ کر کہاں جاسکتے تھے۔ لاکھوں کو شمالی افریقہ لے جانے کے بہانے کشتیوں میں سوار کر کے سمندر میں غرق کر دیا گیا، لاکھوں قتل ہوئے اور لاکھوں کو غلام بنا کر زبردستی نو دریافت شدہ براعظم امریکہ میں آبادکاری لیبر کے طور پر لے جایا گیا اور جو بدبخت جان و مال بچانے کے لیے مرتد ہو کر عیسائی بن گئے، ان کے لیے Inquisition کا قانون بنایا گیا۔ جس کے رو سے نئے عیسائیوں کو مذہبی کچہریوں میں منافقت کے الزام میں سرِ عام اذیتیں دے کر جلایا جاتا اور چونکہ ان کا مال و متاع گرجاؤں کو مل جاتا، اس لیے پادری لوگ بلا استثنا ان مرتد مسلمان عیسائیوں کو زندہ جلا دینے کی سزا دیتے اور چنانچہ آج تک ہسپانیہ کے عیسائی ادارے دنیا کے امیر ترین مذہبی ادارے ہیں حتیٰ کہ غرناطہ کے جس مشہور ہوٹل Hotel Jonduan میں راقم قیام پذیر تھا، وہ بھی غرناطہ کی ایک عیسائی Monastry کی ملکیت تھا۔ بہرحال فرڈیننڈ اور ایزابیلا نے انکویزیشن کے لیے رجسٹریشن کا جو طریقہ مقرر کیا تھا، امریکی صدر ڈبلیو بش نے اسی طریقہ کار سے ایک ورق نکال لیا ہے۔ بش اکیسویں صدی کے روشن خیال مسلمانوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ سرکاری عملے کے سامنے حاضری دے کر ہر فرد کی رجسٹریشن کروائیں جبکہ پندرہویں صدی کی تاریکی میں فرڈیننڈ نے اپنے پادریوں کی پارٹی سے مرتد مسلمان عیسائیوں کی Door to Door رجسٹریشن کرائی تھی بلکہ ہسپانیہ کے ہر بڑے شہر میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کے پانچ سو سال پرانے مکانات اور مسجدیں اب تک اپنی اصلی حالت میں زیرِ استعمال ہیں۔ مسجدیں گرجا گھر بن گئی ہیں اور رہائشی مکانوں کے دروازوں پر انکوی زیشن کی کندہ کردہ مہریں اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اشبیلیہ Saville کے شہر میں مشہور زمانہ ماسٹر آرٹسٹ پینٹر El-Murillo کے مکان کے صدر دروازے پر جو مہریں دکھائی گئی، وہ اس طرح تھیں انکویزیشن کورٹ کی مہر کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ دوسری مہر انکویزیشن جج کی اس طرح تھی۔ اس مہر کا مطلب یہ تھا کہ اس گھرانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص جعلی مہر لگانے کی حماقت کرتا تو اس کی سزا فوری موت تھی۔ سلطنت روما کے عروج و زوال کے مشہور مصنف پروفیسر گبن سمیت تمام مغربی مورخین کی روداد کے مطابق جنگوں کے دوران سفید یورپی اقوام نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم روا رکھے، ان کے تصور سے بھی تاریخ شرما جاتی ہے۔

یہی سفید فام لوگ تھے، جنہوں نے پندرہویں صدی کے آخر میں جنوب مغربی

یورپ میں آٹھ سو سال تک بسنے والے مسلمانوں کو ہسپانیہ سے اس طرح نکالا کہ آج اس وسیع وعریض برصغیر ہسپانیہ و پرتگال میں مسلمانوں کی ایک قبر بھی نہیں ملتی۔ کتنے لاکھ قتل ہوئے، کتنے لاکھ زندہ جلا دیے گئے، کتنے لاکھ غرق دریا کیے گئے اور کتنے لاکھ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر امریکہ لے جائے گئے، کوئی نہیں جانتا کیونکہ اس مکمل تباہی کی داستان سنانے کے لیے ہی کوئی نہیں بچا۔ ایک مغربی مورخ لکھتا ہے کہ ہسپانیہ میں مسلمان جس شکست سے دو چار ہوئے، زمانے کی آنکھ نے ایسی مکمل شکست کبھی نہیں دیکھی۔ ایک اور مورخ الیگزنڈر ملائیڈل 1829ء میں شائع کی گئی اپنی کتاب ''ہسپانیہ میں ایک سال'' میں لکھتا ہے کہ 1492ء میں ہسپانیہ سے مسلمانوں کا دیس نکالا عیسائیت کی فتح تو تھی لیکن یہ حقیقت میں تہذیب اور انسانیت کی شکست تھی کیونکہ ہسپانیہ کے بہادر اور ہنر مند مسلمانوں کی مکمل نسل کشی کر کے عیسائیوں نے اسپین کے عوام کو کوئی خوشی اور مسرت نہیں دی بلکہ انکویزشین کے نام سے عیسائی مذہبی کچہریوں کے ذریعے ہسپانیہ میں 200 سال تک ظلم، جبر اور فریب کا وہ لمبا دور شروع کیا گیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ انکویزیشن کچہریوں کے بارے میں ایک ہم عصر انگریز مورخ جین بلیڈی اپنی کتاب دی اسپینش انکویزیشن میں لکھتی ہے کہ ہسپانیہ میں عیسائیت کے نام پر جس طرح اذیت دے دے کر لاکھوں انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیت نے انسانی بھلائی کے لیے جتنے کام کیے ہوں گے، اگر ان سب کا موازنہ عیسائی مذہب کے نام پر کی گئی برائیوں سے کیا جائے تو شاید برائیوں کا پلڑا بھاری رہے گا۔

یہاں پر قارئین کے دل میں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ صدر ڈبلیو بش کا اس سے کیا جوڑ بنتا ہے تو گذارش ہے کہ بش ریاست ٹیکساس کے رہنے والے ہیں، جس کو ہسپانوی سفید فام لوگوں نے سولہویں صدی میں ہسپانوی مسلمانوں کو جبری غلام بنائے گئے لیبر سے آباد کیا تھا اور اسی طرح تین سو سال تک ریاست ٹیکساس میکسیکو کی ہسپانوی نوآبادی کا حصہ رہی ہے اور 1836ء میں امریکیوں نے میکسیکو کے خلاف بغاوت کرا کے ریاست ٹیکساس کو امریکہ میں شامل کر لیا تھا تو اس طرح بش خاندان کی بود و باش میں صدیوں کی پرانی اسلام دشمنی رچی ہوئی ہے حالانکہ موجودہ صدر ڈبلیو بش کی متنازعہ صدارت تو مسلمان ووٹوں کے سہارے پر ہے کیونکہ سابقہ صدارتی الیکشن میں مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں نے باجماعت اپنے سارے ووٹ ڈبلیو بش کو دیے تھے جبکہ تمام بھارتی ہندوؤں اور یہودیوں نے

اپنے سارے ووٹ ڈیموکریٹ الگور کو دیے کیونکہ اس نے اپنا نائب صدر ایک بنیاد پرست یہودی کو نامزد کیا تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی بولنے والی تمام سفید فام اقوام اس وقت اسلام کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہودیوں کے درپردہ ایما پر پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں مسلمانوں کی خلافت کو ختم کرتے ہوئے فلسطین کو یہودیوں کا وطن قرار دے دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر ٹرومین نے فلسطین میں یہودی ریاست اسرائیل قائم کردی پھر انگریزوں اور امریکیوں کی مشترکہ ملی بھگت سے مسلمانوں کو اپنے چودہ سوسالہ وطن فلسطین سے بے دخل کرنا شروع کردیا۔ تاآنکہ اب اکیسویں صدی میں یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا گیا ہے کہ حقیقت میں عیسائی مذہب تو یہودیت ہی ہے کیونکہ یسوع مسیح خود یہودی النسل تھے اور ادھر پوپ سے یہ اعلان کروا دیا ہے کہ یسوع مسیح کو یہودیوں نے صلیب نہیں چڑھوایا تو گویا گذشتہ دو ہزار سال کے دوران عیسائی مذہب جس بنیاد پر قائم تھا، اب وہ بنیاد ہی ختم کردی گئی ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عیسائیوں کی بائبل تو خود سب سے زیادہ یہودیوں کی کتاب تورات پر مشتمل ہے جس کا نام عہد نامہ عتیق رکھا گیا ہے اور جب عیسائیوں اور یہودیوں کی کتاب ایک ہی ہے تو دونوں میں کیا تفریق رہ گئی ہے۔ اس لیے اب یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ موجودہ عیسائی دراصل یہودی عیسائی ہیں اور اس طرح برطانیہ اور امریکہ میں عیسائی لوگ بنیاد پرست یہودیت کی طرف مائل ہورہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر نے اپنا آبائی عیسائی مذہب چھوڑ کر پوپ کا کیتھولک دین اختیار کرلیا ہے۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ ہی نے اسرائیل کی بنیاد رکھی تو وہی اس کی حفاظت بھی کر رہا ہے۔ دوسری طرف 11 ستمبر کو ہی صدر ڈبلیو بش نے اعلان کیا تھا کہ مسلمان ہماری تہذیب کو مٹانا چاہتے ہیں اور اس لیے ہم نے صلیبی جنگ شروع کردی ہے جو کہ ہم جیت کر رہیں گے۔ یہ بش کی زبان کی لغزش نہ تھی بلکہ یہ اپنے والد کے شروع کردہ یہودی ایجنڈا کی تکمیل کی طرف اشارہ تھا۔ امریکی عوام میں یہودی میڈیا یہ عقیدہ پھیلانے میں کامیاب ہورہا ہے کہ اسرائیل مشیت ایزدی سے قائم ہوا ہے اور عیسائیوں پر اس کی حفاظت فرض ہے کیونکہ انجیل کی پیش گوئیوں (مکاشفات سینٹ جان) کے مطابق بالآخر یسوع مسیح آسمان سے نازل ہوکر اسرائیل میں تمام یہودیوں کو عیسائی بنادیں گے۔ چنانچہ گزشتہ برس صدر بش نے اسرائیل کو مغربی کنارے سے فوجیں نکالنے کے لیے کہا تو ایک لاکھ سے زائد عیسائی یہودیوں نے صدر

بش کو غم و غصہ کی ای میل اور خطوط ارسال کیے۔

دوسری طرف قارئین کو یاد ہوگا کہ افغانستان میں جب روس کو شکست ہو رہی تھی تو یہود گزیدہ سابق صدر نکسن نے بیان دیا تھا کہ امریکہ اور روس کو باہمی چپقلش ختم کر کے اپنے مشترک دشمن اسلام سے نمٹنے کی مہم شروع کرنی چاہیے۔ سابق صدر کارٹر نے کہا تھا کہ میں بائبل کے علوم دینی کا ماہر عالم ہوں اور اپنی بصیرت کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اسرائیل کا قیام بائبل کی پیش گوئی کی تکمیل ہے۔ اسی طرح سابق صدر ریگن بھی بار بار کہتا رہا ہے اور ایک چرچ میں خطاب کے دوران بیان کیا کہ میرا عقیدہ ہے کہ آخری جنگ یروشلم میں لڑی جائے گی جس میں کم از کم بیس کروڑ فوج مشرق سے مسلمانوں کی آئے گی جبکہ کروڑوں فوج مغرب سے عیسائیوں کی آئے گی اور بالآخر یسوع مسیح آ کر **Forces of Evil** پر فتح حاصل کریں گے اور پھر دنیا میں ایک ہی خدائی حکومت قائم کریں گے۔ انہیں صدر ریگن کی حکومت کے دوران ایک یہودی اسکالر کی شائع ہونے والی کتاب میں بتایا گیا تھا کہ موصوف ہر ہفتہ واشنگٹن میں واقع ایک یہودی گرجا میں عبادت کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ اس گرجا کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اسرائیلی سفارتخانے کے بالمقابل بنایا گیا تھا تاکہ اسرائیلی سفارتخانہ کو قبلہ بنا کر عبادت کی جائے۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہاں پر اسرائیل کے لیے **Land Redemption** یعنی مزید زمین کے حصول کے لیے دعا اور عبادت کی جاتی تھی۔ الغرض اس وقت سے سارے امریکہ میں عیسائی یہودیت کے نام سے یہودی بنیاد پرستی کو فروغ دیا جا رہا تھا اور امریکی حکومت اس مہم میں پیش پیش تھی۔ بنیاد پرستی جنگی جنون اور آرمیگا ڈون کے نام سے قیامت کے نظریے پر مبنی کتابیں اب لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں۔ واضح رہے کہ عیسائی عقیدہ کے مطابق **Armageddon** کے نام پر فلسطین میں ایک عظیم معرکہ خیر و شر ہوگا۔ جبکہ بالآخر یسوع مسیح آسمان سے نازل ہو کر حضرت داؤد علیہ السلام کے تخت پر بیٹھ کر ورلڈ گورنمنٹ قائم کریں گے اور فورسز آف ایول کو ختم کر دیں گے تو جب صدر ڈبلیو بش نے برائی کے محور کے خلاف صلیبی جنگ شروع کرنے کا اعلان کیا تھا تو وہ زبان کی لغزش نہیں تھی بلکہ وہ بائبل کی زبان بول رہے تھے۔ قارئین نے سابق صدر کلنٹن کا بیان پڑھا ہوگا کہ میری تمنا ہے کہ اسرائیل میں مورچہ لگا کر رائفل سے اسرائیل کے دفاع کے لیے لڑنے کی سعادت حاصل کروں۔

ہم نے ایک ناول Holy of Holies میں درج مغربی عزائم کو اپنے اخباری مضمون میں بے نقاب کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس سے قبل ایک ناول میں ایران عراق جنگ کی نقشہ گری کی گئی تھی اور پھر امریکی یہودی ریشہ دوانیوں نے یہ جنگ اسی نقشہ کے مطابق برپا کی اور اب زیرِ نظر ناول Holy of Holies میں برطانوی انٹیلی جینس کے ذریعے ایٹم بم سے مسلح دو RAF جنگی ہوائی جہازوں کو استعمال کرتے ہوئے عین حج کے موقع پر جمعہ کے دن جبکہ لاکھوں مسلمان حرم شریف میں جمع تھے، حرم شریف پر بم گرا کر مکہ معظّمہ کو نیست و نابود کرنے کی منظر کشی کی گئی تھی۔ (نعوذ باللہ)۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ یہ ناول مسلمانوں کا ردِعمل معلوم کرنے کے لیے چھاپے گئے ہیں اور اگر کوئی ردِعمل نہ ہوا تو کل کلاں اس مذموم تجویز پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ابھی سے اس کے تدارک کے بارے میں پوری مسلم امہ کو سوچنا چاہیے اور چنانچہ نتیجہ کے طور پر آج کل امریکی پادری مسلمانوں کے دونوں مقدس شہروں کو ایٹمی حملہ سے نیست و نابود کرنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں تاکہ بقول ان کے نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، تو پھر جب مسلمانوں نے ان مذموم تجاویز پر نہ کوئی واویلا کیا نہ احتجاج تو پھر نوبت یہاں تک آ گئی کہ امریکی یہودی رسالہ 'نیوز ویک' نے اپنے 10 اکتوبر 2002ء کے شمارہ میں ایک امریکی پادری جیری فالویل (Jerry Falwell) کا پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں یہ مذموم بیان اپنے صفحہ اوّل پر جلی حروف سے چھاپا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں............ دہشت گرد تھا"۔

اس سانحہ پر نہ تو کسی اسلامی حکومت نے کارروائی کی نہ رسالہ ضبط ہوا اور نہ کسی سیاسی یا دینی جماعت نے احتجاج کیا۔ اسی طرح جب خلیج جنگ کے اختتام پر سینئر بش نے امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر شائع کیا تو ہم نے عرض کیا تھا کہ اب یہودیوں کے ایجنڈا کی تکمیل کے لیے بنیاد رکھی جا رہی ہے کیونکہ یہودیوں کے ایجنڈا میں ورلڈ گورنمنٹ کا قیام شامل ہے اور اس ورلڈ گورنمنٹ کا ٹارگٹ صرف اسلام ہی ہوگا۔ اس لیے عالم اسلام کو حفظ ماتقدم کے بارے میں کوئی ٹھوس پروگرام بنانا چاہیے۔

ورلڈ گورنمنٹ یہودیوں کا دیرینہ خواب ہے جو کہ امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے پورا ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے متعلق صدر روز ویلٹ کے ایک یہودی ساتھی جیمز وار برگ نے 17 فروری 1950ء میں سینیٹ پر واضح کیا تھا کہ آپ یہ بات پسند کریں یا نہ کریں، دنیا میں ایک یہودی ورلڈ گورنمنٹ قائم ہو کر رہے گی۔ سوال صرف یہ باقی رہ گیا ہے

کہ یہ باہمی رضامندی سے ہوگا یا جنگی فتح سے، پھر 17 جنوری 1962ء کو اسرائیلی وزیراعظم بن گورین (David Ben-Gurion) نے رسالہ ''لائف'' کو انٹرویو دیتے ہوئے مستقبل کے عالمی نقشہ کے متعلق یہ پیش گوئیاں بیان کی تھیں۔

''میں آپ کو 1987ء اور اس کے بعد کے عالمی نقشہ کا ہلکا سا تصور پیش کرتا ہوں۔ اگلے 25 برس بعد یعنی 1987ء تک تو ورلڈ وار ختم ہوجائے گی۔ روس میں کمیونزم کے بدلے جمہوریت رائج ہوجائے گی۔ مشرقی اور مغربی یورپ آپس میں مل جائیں گے اور بالآخر یروشلم میں ایک نئی اور حقیقی اقوام متحدہ قائم ہوگی، جو ساری دنیا کے لیے سپریم کورٹ کا کام دے گی اور انسانیت کے لیے آخری کچہری بن جائے گی''۔

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور 15 جنوری 2015)

معروف دانشور جناب اوریا مقبول جان اپنے کالم ''وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا'' میں لکھتے ہیں: ''جب یہ مسلم امہ سرحدوں اور جدید سیکولر قومی ریاستوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ کوئی عربی، ایرانی، مصری، شامی اور لبنانی نہیں تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے تخت پر بایزید دوم متمکن تھا۔ اس دوران میں 1492ء میں اسپین پر ازابیلا اور فرڈیننڈ نے قبضہ کر لیا اور کیتھولک چرچ نے ایک ٹریبونل قائم کیا جس کا مقصد غیر عیسائیوں، ملحدوں اور چرچ کے مخالفین سے زمین کو پاک کرنا تھا۔ اس کا نام تھا "Inquisicion santo oficio de Tribunal" اس کا مقصد غیر عیسائیوں کو زبردستی عیسائی کرنا، ان کو ملک بدر کرنا، قتل کرنا، غلط نظریات رکھنے والوں کو آگ میں جلانا اور عمر بھر جیل میں قید رکھنا تھا۔ 31 مارچ 1492ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا گیا، جسے حکم نامہ الحمرا کہا جاتا ہے جس کے تحت حکم دیا گیا کہ تمام یہودی 31 جولائی تک اسپین چھوڑ دیں۔ اس ٹریبونل کے مظالم سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ شاعروں، مصوروں، سائنس دانوں اور فلسفیوں کو جمع کیا جاتا، ٹریبونل فیصلہ کرتا کہ ان میں شیاطین کی روح گھس گئی ہے۔ پھر ایک دن شہر کے بیچوں بیچ بہت بڑا الاؤ روشن کیا جاتا اور ان سب کو اس میں پھینک دیا جاتا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم ملا کہ وہ ناپاک ہیں اور اسپین چھوڑ دیں تو ان میں نصف کے قریب عیسائی ہوگئے۔ چرچ کے پروہتوں نے یہ حکم جاری کیا کہ وہ روزانہ ان کے سامنے سور کا گوشت کھائیں گے اور ہفتہ یعنی یہودیوں کی چھٹی کے دن اپنی دکانیں کھولیں گے۔ ایک مہینے کی مہلت تھی۔ لاکھوں یہودی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار اسی

سمندر میں پناہ اور امان کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ کچھ کو قریب کے افریقی ساحلوں پر رہنا نصیب ہو گیا۔ لیکن تاریخ کا روشن باب یہ ہے کہ سلطان بایزید دوم کو جب ان کی حالت زار کا علم ہوا تو اس سمندر میں بکھرے یہودیوں کو بچانے کے لیے اپنا سب سے بڑا بحری جہاز ''کمال رئیس' روانہ کیا جو تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو سمندر کی لہروں کے سپرد ہونے سے بچا کر لایا۔ یہودیوں کو خلافت عثمانہ کے کسی بھی شہر میں آباد ہونے، کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی''۔

(روزنامہ ایکسپریس لاہور، 7 دسمبر 2015ء)

یورپی معاشرہ میں اظہار رائے کی آزادی کو مقدس اور ناقابل تغیر سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک بشمول مغربی ممالک میں اظہار رائے کی بے لگام آزادی کی اجازت نہیں ہے۔ ہر ملک میں اظہار رائے کی آزادی کے تحت بدگفتاری، کسی کو بدنام کرنے؛ دشنام دینے، توہین کرنے، فحش کلامی یا نفرت پھیلانے کی اجازت نہیں ہے، مغرب کے 20 ممالک میں میڈیا کی آزادی کے ایک حالیہ سروے میں جن کا عنوان'' آزادی کو الوداع'' ہے، اسے صحافیوں کی آزاد ایسوسی ایشن نے شائع کیا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال کے دوران 20 میں سے 18 ملکوں میں صحافیوں کو توہین، سرکاری راز کے افشا جیسے معاملات میں مجرمانہ مقدمات کا سامنا کرنا پڑا اور جیل بھی جانا پڑا۔

مختلف یورپی ممالک میں ہولوکاسٹ (یہودیوں کے قتل عام) کے بارے میں تفصیلات شائع کرنا جرم ہے جبکہ دوسری طرف انتہا پسند سیاستدان، اہل قلم اور صحافی اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہیں، لیکن انہیں کسی قسم کی سزا یا ردعمل کا خوف نہیں ہوتا، ہالینڈ میں انتہا پسند پارٹی کا لیڈر گیرٹ وِلڈرس نے کبھی اس بات کو نہیں چھپایا کہ اسے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت ہے۔ وہ اسلام کو ایک مفلوج کلچر کی آئیڈیالوجی کہتا ہے، وہ قرآن عظیم کو ہٹلر کی کتاب ''مین کیمف'' کے مساوی قرار دیتا ہے اور ہالینڈ میں مقیم مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر انہیں ہالینڈ میں رہنا ہے تو اپنے صحیفے کا آدھا حصہ پھاڑ کر پھینک دیں۔ ویلڈرس کو آزادی اظہار کے نام پر اپنی زہر افشانی کی کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔ ناقدین نے یوروپین یونین کے اس دوہرے معیار کی نشان دہی کی ہے کہ ایک طرف تو یہ ممالک عیسائیت اور یہودی نسل (سامی) کی حفاظت کے قانون بناتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی پر خاموش رہتے ہیں۔

اگرچہ مغرب میں آزادی کو ایک ناقابل تنسیخ حق سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض انتہا پسند طبقے اس آزادی کا ناجائز استعمال کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں؛ کیونکہ انہیں کسی تعزیز کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی مذہبی عدم رواداری اور تعصب کے طویل ماضی کی روایات کا ایک جدید مظہر ہے؛ حالانکہ یورپ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے تاریک ماضی کے دور سے باہر آ چکا ہے۔ کثیر ثقافتی رواداری اور بقاء باہم کے خود ساختہ دعوؤں کے علمبردار یورپ کو خود سے پوچھنا چاہیے کہ کیا وہ آج بھی ان اقدار کا پابند ہے۔

2004ء میں انجمن اقوام متحدہ کے سابق جنرل سیکرٹری کوفی عنان نے اسلاموفوبیا کو ''دور دور تک پھیلا ہوا شدید تعصب'' قرار دیا تھا۔ اسلاموفوبیا کی شدت نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جن رجحانات کو جنم دیا ہے، وہ عوام تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ سیاسی قیادت بھی اس وبا سے متاثر نظر آتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی وزیر پیٹر ہائن نے الزام لگایا تھا کہ ''اسلام تخلیہ پسند (Isolationist) ہے''۔ اٹلی کے وزیر اعظم سلویو برئس کونی (Silvio Beriusconi) بھی برسر عام کہہ چکے ہیں کہ ''مغربی تہذیب اسلام سے برتر ہے''۔ دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے منتخب نمائندہ کیتھ ایلیسن (Keith Ellison) کا کیس ہے، انہوں نے جب دسمبر 2006ء میں قرآن پر حلف لینے کی خواہش ظاہر کی تو ایک دوسرے نمائندہ ورجل (Virgil) نے اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی روایت و اقدار کے لیے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے کہا: ''مجھے اندیشہ ہے کہ اگلی صدی میں مسلمان لوگ اس ملک میں بہت زیادہ ہو جائیں گے''۔

اس مجموعی ماحول کے سماجی اثرات کا اندازہ پیو رپورٹ (Pew Report) مجریہ 2009ء کے اس انکشاف سے لگایا جا سکتا ہے کہ بالغ عمر کے ہر 10 امریکیوں میں تقریباً 6 امریکی مسلمانوں کو دوسری اقلیتوں کے افراد کے مقابلہ میں زیادہ لائق تضحیک و تعصب سمجھتے ہیں۔ یورپی یونین کے واچ ڈاگ ای یو ایم سی کی مئی 2002ء کی رپورٹ کے مطابق 9/11 کے بعد مسلمانوں کے خلاف پرتشدد و انتقامی حملے کیے گئے، اسلام اور مسلمانوں کے شعائر اور شناخت پر اس طرح کے حملے بار بار ہوئے، جن میں دشنام طرازی، مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی الزام تراشی، ان کے بچوں کو اسامہ کہنا اور ان کی خواتین کا حجاب اتروا دینا شامل ہے۔ ستمبر 2007ء میں نیو یارک میں مقیم امریکی مسلم خاتون زہرہ عاصمی پر

دہشت گردی کا الزام لگا کر مقامی باشندوں نے اسے بے دردی سے مارا پیٹا، اس کی دوکان پر ڈاکہ ڈالا اور تقریباً دو ہزار ڈالر کی رقم لوٹ لی، اس واقعہ کے بعد تقریباً دو ہفتوں تک زہرہ کو دھمکی آمیز فون کیے جاتے رہے جن میں اس سے مطالبہ کیا جاتا کہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ، کناڈا میں مقیم خاتون حلیمہ معتبر پر بھی اس لیے حملہ کیا گیا کہ وہ حجاب میں تھیں، فرانس اور برطانیہ میں اسلامی حجاب کو بار بار موضوع بحث بنایا گیا ہے، جسے اسلاموفوبیا کا ہی شاخسانہ بتایا جاتا ہے۔
16 اگست 2006ء کو ملاگا سے مانچسٹر جانے والے برطانوی مسافروں نے ہوائی جہاز کمپنی سے درخواست کی کہ جہاز پر سوار ایشیائی مسافروں کو اتار دیا جائے کیونکہ وہ اپنی وضع قطع سے مشتبہ لگ رہے ہیں حالانکہ جب تلاشی لی گئی تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جس کی بنیاد پر انہیں دہشت گردی سے جوڑا جا سکے۔ ابھی 2009ء میں ایف بی آئی نے ایئر ٹران ایئر ویز (Air Tran Airways) کی ایک فلائٹ سے 5 ائمہ مساجد کو جبراً اتار دیا۔ کچھ عرصہ قبل جب مانچسٹر سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ جانے والی ایک فلائٹ سے ایک برطانوی مسلمان کو اتارا گیا تو اس نے اس کی وجہ بتائی: ''میرا نام عربوں جیسا ہے، میں مسلمان ہوں اور برطانیہ سے آ رہا ہوں''۔ امریکہ میں اسلام اور مسلم مخالف تعصب کا یہ حال ہے کہ سیدہ متین بنام ریاست کیرولینا مقدمہ میں سرکاری وکیل نے عدالت میں یہ اعتراض داخل کیا کہ شہادت کے حلف لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کرسچین بائبل پر حلف لیا جائے۔ اس طرح کے واقعات پر اسلامی حقوق انسانی کمیشن نے اشارہ دیا ہے کہ یہ اسلاموفوبیا ''وار آن ٹیرر'' (War on Terror) کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔

ستمبر 2015ء میں امریکی ریاست ٹیکساس میں ایک 14 سالہ بچے کو پولیس نے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ اپنے اساتذہ کو اپنی بنائی ہوئی ایک گھڑی سکول میں دکھانے کے لیے لے کر گیا اور وہ اسے بم سمجھ بیٹھے۔ احمد محمد نے امریکی میڈیا سے کہا کہ اس نے اپنے گھر میں ایک گھڑی بنائی تھی جسے وہ ارونگ کے شہر میں میک آرتھر ہائی سکول اپنے انجینئرنگ کے استاد کو دکھانے لے کر گیا تھا۔ کسی اور استاد نے گھڑی کو بم سمجھ کر پولیس کو آگاہ کر دیا تھا۔ احمد کے والد کو خدشہ ہے کہ یہ واقعہ احمد کے مسلمان ہونے کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ سوشل میڈیا پر اس واقعے کے بارے میں کافی بحث چھڑی۔ احمد محمد نے اخبار ڈلاس مارننگ نیوز کو بتایا کہ اسے انجینئرنگ اور روباٹکس کا بہت شوق ہے اور اپنے اساتذہ کو اپنا ہنر دکھانا چاہتا تھا۔ احمد

نے کہا کہ اس کے انجینئرنگ کے استاد نے انہیں ''یہ بہت اچھا ہے'' کہہ کر دیگر اساتذہ کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ ایک استانی نے گھڑی دیکھ کر کہا یہ تو بم لگتا ہے۔ احمد نے کہا کہ اس کی استانی نے اس کی گھڑی اپنے پاس رکھ لی اور کچھ دیر بعد اسے کلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ اسی اثناء میں پولیس آگئی اور بچے کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ پھر سکول کے اساتذہ اور چار پولیس افسروں نے اس سے سخت سوالات کیے۔ انہیں سکول سے تین دنوں کے لیے معطل کر دیا گیا۔ پھر پولیس اسے گھسیٹتے ہوئے پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اسے تفتیش کے کئی ہولناک مراحل سے گزارا گیا۔ احمد کے والد محمد الحسن محمد نے کہا میرا بیٹا انسانیت کے لیے اچھی چیزیں بنانا چاہتا ہے لیکن 11 ستمبر کے بعد اور اس کا نام محمد ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ کونسل کی ترجمان عالیہ سلیم نے کہا، میرے خیال میں اگر اس بچے کا نام احمد محمد نہ ہوتا تو اس بات پر کوئی سوال نہ اٹھتا۔ اکتوبر 2015ء میں احمد کے اہل خانہ نے قطر روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمانوں کی تنظیم مسلم امریکن گروپ کو اس فیصلے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ گروپ کے ترجمان کا کہنا تھا کہ مسلمان خود کو امریکہ میں محصور سمجھتے ہیں کیونکہ امریکہ میں مسلمان مخالفت جذبات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جناب اشتیاق بیگ اپنے کالم ''امریکی قوم اسلام فوبیا کا شکار'' میں لکھتے ہیں:

''امریکہ جو اپنے آپ کو انسانی حقوق اور سیکولرازم کا علمبردار کہتا ہے، وہاں گزشتہ دنوں ایک متعصب چہرہ دنیا کے سامنے ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے اور مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی انتہا پسندی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ واقعہ امریکی ریاست ٹیکساس میں پیش آیا جہاں ایک مسلمان طالب علم کو محض شک کی بنیاد پر اسکول سے گرفتار کر کے اور ہتھکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ 14 سالہ احمد نے انجینئرنگ پروجیکٹ کے سلسلے میں اپنے گھر پر ایک ڈیجیٹل کلاک تیار کی تھی اور اپنی ایجاد سے اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کو متاثر کرنے کے لیے وہ یہ کلاک فخریہ انداز میں اسکول لے آیا لیکن متعصب اسکول پرنسپل اور اساتذہ نے ڈیجیٹل کلاک کو بم سمجھتے ہوئے پولیس کو طلب کر لیا اور پولیس، احمد کو نہ صرف ہتھکڑیاں پہنا کر کلاس روم سے گھسیٹتے ہوئے پولیس اسٹیشن لے گئی بلکہ انگلیوں کے فنگر پرنٹس لے کر احمد سے دہشت گردی اور مذہبی حوالے سے الٹے سیدھے سوالات بھی کرتی رہی۔ دوران تفتیش احمد زار و قطار روتے ہوئے پولیس کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کی تیار کردہ

ڈیجیٹل کلاک، ٹائم بم نہیں مگر پولیس نے ایک نہ سنی اور احمد کو لاک اپ میں بند کر دیا۔ واقعہ کے بعد ننھے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگے احمد کو سوشل میڈیا پر تصویر نے امریکہ بھر میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی اور احمد کی حمایت میں ''آئی اسٹینڈ ود احمد'' (I Stand with Ahmad) کا ہیش ٹیگ دیکھتے ہی دیکھتے سرفہرست آ گیا۔ ہیش ٹیگ پر امریکی عوام، اساتذہ، سائنسدانوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے اسکول انتظامیہ اور پولیس کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور احمد کی حمایت میں 10 لاکھ سے زائد ٹوئٹس کیے گئے جبکہ امریکہ کی مسلم کونسل نے واقعہ کو مسلمانوں سے نفرت اور خوف کی مثال قرار دیا۔ بعد ازاں عوام کے شدید دباؤ کے نتیجے میں پولیس کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ احمد کی ایجاد بم نہیں بلکہ حقیقتاً ڈیجیٹل کلاک تھی۔ پولیس سے رہائی کے بعد احمد کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ہتک آمیز سلوک کے بعد اب اسکول نہیں جائے گا جبکہ احمد کے والد محمد حسن کے مطابق ان کا بیٹا ذہین طالب علم اور انجینئر نگ کا شوقین ہے اور کئی چیزیں ایجاد کر چکا ہے مگر آج ان کے بیٹے کو نام، مذہب اور نائن الیون واقعہ کی وجہ سے برے سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔

......امریکہ میں کسی مسلمان کے ساتھ پیش آنے والا یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں بلکہ اس سے قبل بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی تعصب کے کئی واقعات پیش آ چکے ہیں جس میں نائن الیون کے بعد بے انتہا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ آج امریکہ میں ہر مسلمان کو دہشت گرد تصور کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ مسجدوں کے باہر نمازیوں کو روک کر امریکی پولیس ان سے غیر ضروری سوالات کر رہی ہے۔ انسانی حقوق کا علمبردار اور دنیا کی سپر پاور کہلانے والا ملک امریکہ، دراصل نائن الیون کے بعد اسلام فوبیا کا شکار ہے جہاں مسلمان بچوں اور عورتوں سے بھی کوئی امتیاز نہیں برتا جا رہا ہے جس کی مثال پاکستان کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ہیں جنہیں امریکہ نے دہشت گردی کا الزام لگا کر کئی سالوں سے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے اور ان سے غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے۔

دنیا بھر میں ذہین بچوں کی کسی نئی چیز کی ایجاد پر اسکول کے اساتذہ اور لوگ عموماً حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن افسوس کہ امریکہ میں ننھے بچے احمد کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اسے نسل پرستی کی بھینٹ چڑھا کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ احمد کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک صرف اس لیے روا رکھا گیا کہ وہ مسلمان تھا۔ اگر یہی کام کوئی غیر مسلم یا امریکی شہری انجام دیتا تو اسے انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔ امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف پیش آنے واقعات کے پس پردہ مقاصد شاید یہ بھی ہوں کہ مسلمانوں کو تنہا کر دیا جائے تا کہ وہ تنگ آ کر امریکہ چھوڑ دیں۔

امریکہ میں مسلمان بچوں کے ساتھ اگر یہی رویہ رکھا گیا تو وہ دن دور نہیں جب مسلمان بچوں کے بستے روزانہ تلاشی کے بہانے اسکولوں کے دروازوں پر روک لیے جائیں گے۔ نائن الیون کے بعد صدر بش نے عراق پر حملے کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا جسے بعد میں زبان کی لغزش کہا گیا لیکن بعد میں پیش آنے والے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ عراق اور افغانستان کی امریکی جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود کو مہذب اور پرامن کہنے والی امریکی قوم، مسلمانوں اور ان کے بچوں سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہے؟ دراصل امریکی قوم ''اسلام فوبیا کا شکار ہے''۔ (روزنامہ جنگ لاہور 23 ستمبر 2015ء)

امریکی معاشرہ کس قدر تعصب زدہ، منفی رویہ اور اسلام فوبیا کا شکار ہے، اس کا اندازہ ایک معمولی واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکیوں کو ایک ایشیائی خاتون کا امریکہ کی ملکہ حسن قرار پانا کس قدر تکلیف دے رہا ہے۔ 6 اکتوبر 2013ء کو امریکہ میں مقابلہ حسن منعقد ہوا جس میں ''مس امریکہ'' کا انتخاب ہونا تھا۔ امریکی شہری Nina Davuluri کا تعلق بھارت سے ہے۔ وہ نیویارک امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اپنے بے پناہ حسن کی وجہ سے وہ ''مس امریکہ 2014ء'' منتخب ہوئی۔ عام طور پر یہ اعزاز حاصل کرنے والی حسینہ کے حصے میں مبارک باد اور ستائشی جملے آتے ہیں مگر نینا کو اس سب کے ساتھ تنقید، طنز اور تضحیک کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ فیس بک اور ٹویٹر پر نینا کے بارے میں انتہائی متعصّبانہ کمنٹس کیے گئے۔ اسے ''مس دہشت گرد'' کا نام دیا گیا۔ اسے مبارک باد کہنے کے بجائے ''مبارک ہو القاعدہ'' کے جملے کسے گئے۔ واضح رہے کہ نینا پہلی بھارتی خاتون ہیں جسے مس امریکہ ہونے کا اعزاز ملا۔ تعصب کا شکار امریکیوں کی لاعلمی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو مسلمان سمجھ بیٹھے اور اس کی تمام تر جنسی بے باکی اور عریانی کے، اس کا تعلق القاعدہ سے جوڑ دیا۔ اسے کہتے ہیں تعصب میں اندھا ہو جانا۔

حقیقی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف انتہا پسندی کا شور مچانے اور نعرے لگانے والے عیسائی رہنما خود سب سے بڑے انتہا پسند ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں سے جو امتیازی سلوک ہو رہا ہے وہ کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ محمد اور احمد ناموں کے حامل مسلمانوں پر ویزہ اور ملازمت کی پابندی لگانا، نئے نئے سخت امیگریشن قوانین بنانا، سکینگ کے ذریعے مسلمان خواتین و مردوں کی تلاشی لینا۔ انٹرنیٹ پر ''الفرقان'' کے نام سے جعلی

قرآن مجید پیش کرنا کس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے؟ کیا یہ سب انتہا پسندی اور دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا یہ سب اسلام فوبیا میں مبتلا ہونے کی علامات نہیں؟

اسلام فوبیا کا شکار ہونے والوں کا عظیم امریکی مسلمان باکسر محمد علی کلے کے بارے میں معاندانہ رویہ ملاحظہ کیجیے۔ محمد علی کی زندگی کا ایک اہم موڑ 1967ء میں آیا جب انہوں نے امریکی فوج میں جبری خدمات انجام دینے سے انکار کیا۔ اس زمانے میں امریکہ ویت نام کی بے مقصد جنگ میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے تمام وسائل جنگ میں جھونک دیئے تھے۔ لڑاکا فوجیوں کی قلت ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے فوج میں بھرتی کا قانون رائج کیا گیا جس کے تحت نوجوانوں کا فوج میں بھرتی کر کے انہیں ویت نام کی جنگ میں حصہ لینے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ محمد علی کا ویت نام کی جنگ میں حصہ لینے سے انکار، دراصل امریکی نسل پرستی کے خلاف بھرپور احتجاج کے علاوہ دیت نامی عوام سے اظہار یک جہتی کی مؤثر دلیل تھی۔ محمد علی کا کہنا تھا، ''مجھے کہا جا رہا ہے کہ میں امریکہ سے دس ہزار میل دور ویت نام جا کر وہاں کے لوگوں پر بم اور گولیاں برساؤں، جنہیں میں جانتا نہیں جن سے میری کوئی دشمنی نہیں، جب کہ میرے اپنے علاقے لوئی ویل میں سیاہ فاموں کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا ہے۔ انہیں بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں۔ میں اپنے مذہب، اپنے آپ اور اپنے لوگوں کو بدنام نہیں کروں گا۔ میں ان لوگوں کو غلام بنانے میں مدد نہیں کروں گا، جو آزادی، انصاف اور مساوات کے لیے لڑ رہے ہیں''۔ محمد علی نے اپنے اس تاریخی بیان میں یہ بھی کہا ''میں جیل جانے سے نہیں ڈرتا، ہم گزشتہ چار سو سال سے جیل میں ہیں''۔ اس انکار کی پاداش میں محمد علی سے اُن کے تمام اعزازات چھین لیے گئے۔ انہیں عالمی ٹائٹل سے محروم کر دیا گیا۔ ان کا باکسنگ لائسنس منسوخ کر دیا گیا۔ عدالت کی جانب سے انہیں چار سال کی سزا بھی سنائی گئی۔

گذشتہ سال محمد علی کلے کا بیٹا بھی ٹرمپ کی مسلم دشمن پالیسی کا شکار ہوا۔ جمیکا سے واپسی پر فلوریڈا امریکی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر محمد علی جونیئر کی سیاہ فام مسلمان کی حیثیت سے شناخت کے بعد کسٹم اور امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کے افسران نے انہیں مشتبہ قرار دے کر الگ کمرے میں بند کر دیا جہاں متعدد افسران نے محمد علی جونیئر سے بے سروپا تفتیش کا آغاز کیا، جو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ محمد علی جونیئر کی جانب سے یہ بتانے پر کہ وہ شہرہ آفاق امریکی باکسر محمد علی کے صاحبزادے ہیں تو ان سے ان کے مذہب اور عقائد کے حوالے سے سوالات کا آغاز

کر دیا گیا۔علی جونیئر سے 300 سے زیادہ سوالات کیے گئے۔ان سے یہ بھی پوچھا گیا کہ کیا وہ دہشت گردی پر یقین رکھتے ہیں اور کیا امریکی مسلمان اور بالخصوص سیاہ فام مسلمان امریکہ کے وفادار ہیں یا نہیں؟ امیگریشن افسران نے ان سے پوچھا کہ تم نے مسلمانوں والا نام کیوں رکھا، کیا تم مسلمان ہو؟ امریکی جریدے میامی نیو ٹائم کے مطابق جب تفتیشی افسران کو علی جونیئر نے بتایا کہ وہ پیدائشی امریکی مسلمان اور امریکی پاسپورٹ ہولڈر ہیں، ان کے خلاف امریکہ میں کوئی بھی کریمنل ریکارڈ یا عدالتوں میں کوئی مقدمہ زیر سماعت نہیں ہے تو امیگریشن افسران نے ان سے مزید سخت رویہ اپنایا اور ان کو بتایا کہ انہیں صدر ٹرمپ کی جانب سے دی جانے والی ہدایات کے مطابق ہر مشتبہ اور مسلمان مسافر سے سختی سے چیکنگ کے احکامات ملے ہیں، جن پر وہ عمل درآمد کر رہے ہیں۔ بعد ازاں رہائی کے بعد امریکی امیگریشن کے دفتر کے باہر علی جونیئر کی والدہ خلیلہ علی نے امریکی حکام کے متعصّبانہ اور ظالمانہ رویے کی تصدیق کی اور بتایا کہ امیگریشن حکام ان کو بھی گرفتار کر رہے تھے لیکن ان کے احتجاج اور پرس میں موجود ان کی اور ان کے مرحوم شوہر باکسر محمد علی کے ساتھ ان کی تصویر دیکھ کر انہیں گرفتار نہیں کیا، لیکن ان کو الگ کمرے میں تنہا بٹھایا گیا۔ جہاں ان کو علم نہیں تھا کہ ان کے بیٹے علی جونیئر کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔مرحوم باکسر محمد علی کی بیوہ خلیلہ نے بتایا کہ ان کو یقین نہیں آ رہا ہے کہ ان کے امریکی پاسپورٹ ہولڈر مسلمان گھرانے کے ساتھ کس طرح کا ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔

جناب سید عاصم محمود اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

لیجنڈ باکسر، عزم و ہمت کے پیکر، انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف شمشیر برہنہ، غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور دردمند دل رکھنے والے محمد علی پارکنسنز کی بیماری کا 32 سال تک مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد 5 جون 2016ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ پوری دنیا میں اُن کی رحلت کی خبر کو انتہائی دکھ اور افسوس کے عالم میں سنا گیا اور جگہ جگہ غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔دنیا بھر کی اہم شخصیات اور ہزاروں مداحوں نے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ترکی کے صدر طیب اردگان اور اردن کے شاہ عبداللہ کے علاوہ امریکہ میں پاکستانی سفیر عباس جیلانی نے پاکستان کی نمائندگی کی۔طیب اردگان تو تدفین میں بھی شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ امریکی بدسلوکی کی بنا پر ان کے سفر آخرت میں شرکت کے بغیر واپس چلے گئے۔دراصل طیب اردگان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ تعزیتی تقریب میں محمد علی کو خراج

تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن انہیں اس کی اجازت نہ دی گئی جبکہ اسی تقریب میں سابق امریکی صدر بل کلنٹن، باکسروں حتیٰ کہ ہالی وڈ کے اداکاروں تک نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ترک صدر کی یہ بھی خواہش تھی کہ محمد علی کی میت پر غلافِ کعبہ کا ٹکڑا رکھنے اور ترکی میں اسلامک امور کی باڈی کے سربراہ کو محمد علی کی میت پر کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے کی اجازت دی جائے لیکن اس کی اجازت بھی نہ ملی۔اس بدسلوکی پر بددل ہو کر طیب اردگان اپنا دورہ مختصر کر کے تدفین میں شرکت کیے بغیر ترکی واپس چلے گئے۔اس رویے سے امریکہ کی عالم اسلام سے نفرت عیاں ہوگئی۔

1908ء میں امریکی سیاہ فام باکسر جیک جانسن ایک سفید فام باکسر کو ہرا کر ہیوی ویٹ چمپئن بنا تو گویا امریکہ میں زلزلہ آگیا۔سفید فاموں کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ ایک ''غلام'' اتنی بڑی جسارت کرے گا۔انہوں نے ایسی سبکی محسوس کی کہ ایک سابق ہیوی ویٹ چمپئن سفید فام باکسر جیمز جیفریز ریٹائرمنٹ سے نکل کر صرف اس لیے رنگ میں واپس چلا آیا تاکہ جیک جانسن کو ہرا کر جیتنے کی ''سزا'' دے سکے۔جیک جانسن اپنے شباب پر تھا۔اس نے جیک کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔جیک کی شکست نے سفید فاموں کو مزید برواختہ کر ڈالا۔انہوں نے کئی شہروں میں سیاہ فاموں پر حملے کیے اور انہیں مارا پیٹا۔یہ تب امریکہ میں ہونے والے سخت ترین نسلی فسادات تھے۔امریکہ میں سفید فاموں کی کوشش رہتی تھی کہ کسی بھی شعبے میں سیاہ فام نمایاں نہ ہونے پائیں مگر سیاہ فام کھلاڑی اپنی طاقت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر صف اوّل پر آہی جاتے۔

محمد علی سیاہ فام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔پھر ربع صدی قبل جب انہوں نے جنم لیا تو تب بھی امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا تھا۔دکانوں اور ہوٹلوں میں اکثر یہ لکھا ملتا ''یہاں نگرز (سیاہ فاموں کے لیے تضحیک آمیز اصلاح) اور کتوں کا داخلہ منع ہے''۔امریکی معاشرے میں سیاہ فاموں کو قدم قدم پر ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی۔محمد علی ایک عیسائی لڑکے کی حیثیت سے اسی نفرت انگیز ماحول میں پلے بڑھے۔گورے لڑکے ان کا مذاق اڑاتے اور کوشش کرتے کہ علی کو کسی طرح ذلیل کیا جائے۔تلخ تجربات نے انہیں لڑکپن میں درشت مزاج اور سفید فام طبقے کا دشمن بنا دیا۔سفید فام طبقے کے ظلم واستحصال کا مقابلہ کرنے کی خاطر ہی علی نے باکسنگ سیکھی اور کھیل میں ایسا کمال حاصل کیا کہ انہیں عظیم

ترین باکسر کہا جانے لگا۔

ملک وقوم کی خاطر طلائی تمغہ جیت کر کاسیس کلے کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اب سفید فام اُسے عزت و احترام سے دیکھیں گے۔ مگر ایک تلخ تجربے نے احساس سرشاری کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی۔ ہوا یہ کہ کلے اپنے ایک دوست کے ساتھ شہر کے معروف ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ جب وہ میز پر بیٹھ چکے تو ایک سفید فام بیرا ان کے قریب آ کر رعونت سے بولا ''ہم نگرز کو کھانا سرو نہیں کرتے''۔ اس تلخ واقعے نے نہ صرف نوجوان کلے کے تن بدن میں آگ لگا دی بلکہ امریکہ کا متناقص چہرہ بھی نمایاں کر دیا۔ کلے کو احساس ہوا کہ وہ ایسی قوم کے لیے دن رات طلائی تمغہ جیتنے کی خاطر تگ و دو میں رہے جو ان کی عزت نہیں کرتی۔

1964ء میں کاسیس کلے کے محمد علی بننے کی خبر سفید فام امریکیوں پر بم بن کر گری۔ اُدھر اس خبر نے محمد علی کو عالم اسلام میں متعارف کرا دیا۔ اب سفید فام طبقہ چاہتا تھا کہ ہر قیمت پر اس نومسلم منہ پھٹ باکسر کو ذلیل کیا جائے۔ چنانچہ امیر سفید فاموں نے دوبارہ سونی لسٹن کو علی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب یہ طاقتور سفید فام اکثریت اور کمزور سیاہ فام اقلیت کے مابین زبردست مقابلہ بن گیا۔ 1965ء میں تب دنیائے باکسنگ کے مشہور ترین باکسر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ تتلی کی طرح تھرکتے علی نے پہلے راؤنڈ میں شہد کی مکھی کے مانند حریف کو ایسا مکا مارا کہ وہ لڑکھڑا کر گرا اور پھر اُٹھ نہ سکا۔ اس زبردست فتح نے سفید فام دشمنوں کے دلوں پر علی کی دھاک بٹھا دی۔ تاہم علی کو خبر نہ تھی کہ ابھی انہیں اپنے ایک بڑے دشمن ......امریکی حکومت سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔

سونی لسٹن کی شکست پر سفید فام طبقہ بہت تلملایا۔ اس نے پھر اپنے طاقتور امیدوار فلائڈ پیٹرسن، ہنری کوپر اور ارنی ٹیرل وغیرہ رنگ میں اتارے مگر کوئی بھی محمد علی کو شکست نہ دے سکا۔ علی نے غصے میں کئی حریفوں کو مار مار کر زخمی کر ڈالا۔ وہ انہیں ''انکل ٹام'' کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ غرض علی نے اپنے زبانی حملوں اور پے در پے فتوحات سے امریکی سفید فام اسٹیبلشمنٹ کو چراغ پا کر دیا۔ تبھی اس نے علی کو ایک پوچ اور گھٹیا سازش کا نشانہ بنا ڈالا۔ سفید فام طبقہ اب ہر قیمت پر چاہتا تھا کہ محمد علی گھٹنے ٹیک دے۔

امریکہ کے ہر شہر میں ڈرافٹ بورڈ نامی ادارے فوج میں بھرتی کی خاطر امریکی

نوجوانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ عام طور پر کھلاڑی اس انتخاب سے مبرا ہوتے ہیں۔ لاؤز ویل شہر کے ڈرافٹ بورڈ میں تمام ارکان سفید فام تھے۔ انہوں نے محمد علی کو سبق سکھانے کے لیے ایک چال چلتے ہوئے ڈرافٹ بورڈ کے قوانین میں ترمیم کر ڈالی تاکہ امریکی فوج میں شمولیت کے لیے محمد علی کا انتخاب بھی کیا جا سکے۔ ڈرافٹ بورڈ دراصل ویت نام جانے والی فوج میں علی کو شامل کرنا چاہتا تھا۔ محمد علی کو ڈرافٹ بورڈ کے قوانین میں تبدیلی کا علم صحافیوں سے ہوا۔ جب انہوں نے علی کا ردعمل جاننا چاہا تو وہ بولے ''بھئی ویت نامیوں سے تو میری کوئی لڑائی نہیں...... میں پھر ان پر گولی کیوں چلاؤں؟ انہوں نے مجھے کبھی نگر نہیں کہا''۔

تھوڑے ہی عرصے بعد امریکی فوج نے محمد علی کو بلوا بھیجا۔ 28 اپریل 1967ء کو علی امریکی فوج کے انڈکشن سینٹر واقع ہوسٹن شہر میں داخل ہوئے اور فوجی افسروں کو بتایا کہ وہ امریکی فوج کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔ انہوں نے وجہ یہ بتائی کہ دین اسلام انہیں ویت نامیوں کے خلاف لڑنے سے روکتا ہے کیونکہ وہ ان پر حملہ آور نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محمد علی کو ملک و قوم کی خاطر سینے پر میڈل سجانے کا کوئی شوق نہ تھا کیونکہ انہیں اس کے بدلے ہمیشہ سفید فاموں سے ذلت و رسوائی ہی ملی تھی۔

امریکی فوج میں شامل ہونے سے انکار نے محمد علی کو ان لاکھوں سیاہ فاموں ہی نہیں سفید فاموں کا بھی ہیرو بنا دیا جو ویت نام جنگ کو غیر قانونی سمجھتے تھے۔ تب ان میں یہ نعرہ بہت مقبول ہوا ''اگر وہ نہیں جائے گا تو ہم بھی نہیں جائیں گے''۔ اب علی معمولی انسان نہیں رہے تھے بلکہ عالمی ہیوی ویٹ چمپئن تھے۔ لہٰذا ان کے انکار نے جنگ مخالف امریکیوں میں نیا جوش و ولولہ بھر دیا۔ آج کے واشنگٹن یونیورسٹی میں امریکی تہذیب کے پروفیسر جیرالڈ ارلی (Gerald Early) تب طالب علم تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جب علی نے امریکی حکومت کا حکم ماننے سے انکار کیا تو مجھے فخر سے بھی زیادہ عظیم جذبہ محسوس ہوا۔ یوں لگا سیاہ فام لڑکا ہونے...... ایک انسان ہونے کا احترام مجھے مل گیا۔ اس دن میں دیر تک اپنے کمرے میں روتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا علی، میری اور مجھ سمیت تمام سیاہ فاموں کی قسمت پر چھائے تاریک بادل چھٹ رہے ہیں''۔ لیکن سفید فاموں کی اکثریت نے محمد علی کو ''غدار'' اور ''ضمیر فروش'' جیسے القابات سے نوازا۔ چنانچہ سفید فام حکمران طبقے نے اس چلبلے سیاہ فام باکسر کو گستاخی کے جرم میں سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

سرکش علی کو باکسنگ مقابلوں سے روک کر امریکی حکومت نے پہلا وار کیا۔ ہر امریکی ریاست باکسنگ کمیشن رکھتی ہے۔ یہ کمیشن پھر مل کر ایک قومی ادارہ تشکیل دیتے ہیں۔ 28 اپریل کو علی نے دلیرانہ فیصلہ کیا تو اسی دن شام کو ریاست نیویارک کے باکسنگ کمیشن نے ان کا لائسنس معطل کیا اور ہیوی ویٹ چمپئن ہونے کا اعزاز بھی چھین لیا۔ اگلے دو تین دن میں تمام ریاستوں نے یہی عمل دہرایا۔ چنانچہ اپنے دور کے عظیم ترین باکسر کو اپنے ہی وطن میں باکسنگ کھیلنے سے روک دیا گیا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟

20 جون 1967ء کو لاؤز ویل ڈرافٹ بورڈ کے سفید فام ارکان نے ایک اجلاس بلوایا۔ اس میں حکم عدولی پر محمد علی کو پانچ سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ نیز پانچ ہزار ڈالر کا جرمانہ بھی کیا۔ محمد علی نے اعلان کیا کہ وہ پانچ سال کی قید کاٹنے کو تیار ہیں مگر امریکی فوج میں شامل ہو کر ویت نام ہرگز نہیں جائیں گے"۔ (ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور جولائی 2016ء)

یہاں محمد علی کلے کی اسلام سے بے پناہ محبت وعقیدت پر مبنی ایک انتہائی ایمان پرور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب محمد علی کلے کو "واک آف فیم" میں ان کے نام کا ستارہ نصب کرنے کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ واضح رہے کہ محمد علی نے ایک ایسی پیشکش کو مسترد کیا تھا جسے دنیا کا ہر اداکار، گلوکار اور ایتھلیٹ اپنے لیے اعزاز سمجھتا اور اس کا خواب دیکھتا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ "آپ نے وال آف فیم میں اپنے نام کا ستارہ نصب کرنے کی پیش کش کیوں مسترد کی" تو انہوں نے جواب دیا کہ "میرے نام میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا نام بھی شامل ہے اور یہ ناممکن ہے کہ لوگوں کو اس نام پر چلنے کی اجازت دی جائے"۔ پھر انہوں نے کہا کہ "میں صرف ایک صورت میں یہ اعزاز قبول کر سکتا ہوں کہ آپ یہ ستارہ فرش کے بجائے دیوار پر نصب کروا دیں، تاکہ لوگ اس پر چلنے کے بجائے اسے دیکھ سکیں"۔ اور بعد میں ایسا ہی ہوا کہ انتظامیہ ان کے نام کا ستارہ "واک آف فیم" کی دیوار پر نصب کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ اب محمد علی کے نام کا ستارہ واحد ہے، جو دیوار پر نصب ہے، جبکہ باقی تمام افراد کے ستارے فرش پر موجود ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی نہ صرف عظیم ترین ہیوی ویٹ چمپئن تھا، بلکہ وہ انسانیت کا سفیر اور سچا مسلمان بھی تھا جو کماحقہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتا اور اس کی تبلیغ بھی کرتا تھا۔

کئی یورپین ممالک بالخصوص برطانیہ میں اسلام فوبیا کا شکار زیادہ تر مسلم خواتین ہو

رہی ہیں جو اپنے لباس اور حجاب کی وجہ سے اسلام مخالف انتہا پسندوں کے حملوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ ٹیسڈ یونیورسٹی کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے حملوں کا نشانہ بننے والوں میں سے 54 فیصد خواتین ہوتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر پولیس کو شکایت بھی نہیں کرتیں۔ یہ رپورٹ ایسے موقع پر سامنے آئی جب 31 برس کی سعودی طالبہ ناہید المانیا جو اپنی کلاس پڑھنے کے لیے یونیورسٹی آف ایسکس جارہی تھی، اسے چاقو کے سولہ وار کر کے قتل کیا گیا۔ ناہید المانیا حجاب میں تھی اور پولیس نے شبہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو مسلمان ہونے کی وجہ سے مذہبی نفرت کا نشانہ بنایا گیا۔ پی ایچ ڈی کرنے کی خواہشمند ناہید یونیورسٹی سے انگریزی کا شارٹ کورس کر رہی تھی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ان کی تفتیش کا مرکزی رخ یہ نکتہ ہے کہ ناہید کو مسلمان ہونے اور اسکارف لینے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔ دوسروں کو رواداری، برداشت، احترام آدمیت اور وسعت نظری کا درس دینے اور مسلمانوں پر تنگ نظری، تعصب اور انتہاء پسندی کے الزامات لگانے والے مغربی حلقوں کا اپنا حال کیا ہے؟ یہ اس رپورٹ سے بالکل واضح اور عیاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب خود اپنے معاشرے میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے سخت بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں پر روا رکھے جانے والے تمام تر مظالم کے باوجود اسلام، یورپ اور امریکہ کے انتہائی ترقی یافتہ سمجھے جانے والے معاشروں میں تیزی سے پھیل رہا ہے جو اسلام کی ارفع روحانی و اخلاقی تعلیمات کی صداقت وحقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مغرب دلیل کے میدان میں شکست کے بعد فسطائی اقدامات کے ذریعے اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے جس میں یقیناً اسے ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑے گا۔

یورپ اور امریکہ میں مقیم متعدد عرب طلباء کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے معلوم ہوا کہ کلیساؤں کی عیسائی تنظیموں نے باقاعدہ ایسے اوباش گروہ بنائے ہوئے ہیں جن کے ذریعے مسلمان طلباء پر حملے کرائے جاتے ہیں، حملہ آوروں کے جائے وقوعہ سے چلے جانے کے کچھ دیر بعد یہ لوگ آجاتے ہیں، متاثرہ مسلمان کو طبی امداد دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اس کی قربت حاصل کرتے ہیں پھر اسی تعلق کو بنیاد بنا کر وہ اسے عیسائیت کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنوری 2015ء میں امریکی اخبار میامی ہیرالڈ نے اوہائیو کی جیل میں ہونے والے ایک تعصب پر مبنی واقعے کی اشاعت کی جس کے مطابق ایک مسلمان خاتون سکینہ مجید کو جیل کے دوران چرچ میں عبادت کرنے اور عیسائی سروس

میں شرکت پر مجبور کیا گیا۔ خاتون کا کہنا تھا کہ نہ صرف یہ کہ انہیں اسلام کے حوالے سے نازیبا اور گستاخانہ الفاظ سننے پر مجبور کیا جاتا بلکہ قید تنہائی کی دھمکی بھی دی جاتی۔ یہ ایک بڑی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ امریکی جیلوں میں کئی لوگ اپنے ناکردہ جرائم کا اعتراف کر کے قید رہتے ہیں۔ ایسے کئی افراد کی داستانیں منظر عام پر آئی ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان کو قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا دی گئی۔ جب اسے 15 برس کی قید کاٹنے کے بعد ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر رہا کیا گیا تو ایک صحافی کے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ اس نے اس ناکردہ جرم کا اقرار اس لیے کیا تھا، کیونکہ اسے چند خطرناک قیدیوں کے ساتھ بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔

''خاموش تیاری'' کے عنوان سے جناب ڈاکٹر عامر لیاقت حسین لکھتے ہیں:

''اگر اب بھی کوئی اس گمان میں مبتلا ہے کہ ''تہذیبوں کے تصادم کا خدشہ'' ایک افسانوی خیال یا خوف زدہ تصورات کی بے جا زیادتی ہے تو پھر اُسے مغربی تعصب پر از سر نو تحقیق کرنا چاہیے...... اُسے جرمنی، فرانس، برطانیہ، سویڈن اور آسٹریا کے بعض تعلیمی اداروں کی صورتحال سے باخبر ہونا چاہیے جہاں مسلمان طلبہ و طالبات کو ذہنی اور جسمانی اذیت کا نشانہ بنا کر انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ یا تو وہ اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں یا پھر ہمیشہ کے لیے اُن کے تعلیمی اداروں اور ملک کو خیر باد کہہ دیں...... اور صرف یہی نہیں بلکہ اسکول و کالجوں سے پرے پورے یورپ میں بعض مقامات پر مسلمانوں کی جان و مال پر باقاعدگی کے ساتھ حملے کیے جا رہے ہیں...... جس سے نفرت کی جانی چاہیے اسے پچکارا جا رہا ہے اور جو رنج و غم میں مبتلا ہیں اُن پر مزید ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں...... خود برطانوی جریدے ''اِنڈے پینڈنٹ'' نے اعتراف کیا ہے کہ برطانوی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان بچوں کے ساتھ زبانی ہی نہیں بلکہ جسمانی حملوں میں بھی یکا یک ریکارڈ اضافہ ہوا ہے اور اِس میں صرف بعض غیر مسلم طلباء کا ہی نفرت انگیز رویہ شامل نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی مسلمان بچوں کے ساتھ بغض و عداوت کے اس عمل میں برابر کے شریک ہیں......

''اسلاموفوبیا'' کے لاعلاج مرض میں گرفتار ''مہذب یورپی معاشرے'' کے بعض افراد ''شاغلے ہیڈو'' جیسے گھٹیا جریدے کے ساتھ اظہار یکجہتی میں جس تیزی سے تباہی کی جانب دوڑ رہے ہیں، انہیں اس کا خود بھی اندازہ نہیں...... 40 چوروں کے جمع ہونے پر ''علی بابا'' کو کل کوئی فکر لاحق تھی اور نہ اب کوئی پریشانی ہے...... ہمارے اعتقاد اور ایمان کے خزانے کو ان

کے ''اجداد'' کبھی لوٹ نہ سکے بلکہ جو بھی لوٹنے کھسوٹنے آیا، وہ اپنا کفر اُلٹا کر اسلام کی آغوش میں پناہ گزین ہوا...... یہ حیرت کی بات نہیں اگر بعض برطانوی اسکولوں کے کچھ اساتذہ گستاخانہ خاکوں کی ٹی شرٹس پہن کر بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں تو شاید یہ ان کے خمیر اور ضمیر کا ایسا سفلی تقاضہ ہے جسے ابلیس نے چھو کر اندھا کر دیا ہے...... مغربی یارک نیو آکسفورڈ اور مشرقی سسکس کے بیشتر اسکولوں میں اگر اساتذہ کی شہ پر کوئی غیر مسلم طالبعلم اُٹھ کر کسی مسلمان طالبعلم کے رخسار پر تھپڑ جڑ دیتا ہے تو یہ دانتوں میں انگلیاں داب لینے کی بات نہیں کیونکہ کیچڑ نے ہمیشہ پانی کا سہارا لے کر اپنی بدصورتی اور غلاظت کا دفاع کیا ہے...... یہ اپنی ''وقتی تہذیب'' کو پانی کی طرح ظاہری رکھ رکھاؤ کا حصہ بنا کر منافقوں کی طرح جیتے ہیں اور اگر کسی کا پاؤں اِن کی اندرونی کیچڑ پر پڑ جائے تو یہ ستمگر چھینٹے اُڑانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتے...... مسیحی تعلیمات کے مطابق اللہ کے نبی مسیح اللہ نے تو ایک گال کے بعد دوسرا گال آگے بڑھانے کو کہا تھا تاکہ تھپڑ مارنے والے کو مایوسی نہ ہو مگر برطانیہ میں تو یسوع مسیح کے بعض پیروکار مسلمانوں کے گالوں پر طمانچے رسید کر رہے ہیں...... معلمین کی موجودگی میں بعض اپنے ساتھی طالب علموں کو دہشت گرد اور متعصّبانہ انداز میں ''پاکی'' کہہ کر اُن کی عزت نفس پر رکیک حملے کر رہے ہیں...... اسی طرح فرانس میں مسلمان شہریوں اور مساجد پر حملوں کی تعداد اگر 145 ہو چکی ہے اور ان کارروائیوں میں ایک مسلمان شہید بھی ہو چکا ہے تو اس پر بھی کسی کو متعجب ہونے کی ضرورت نہیں...... یہ تو ایک ''بڑی جنگ'' کی مشقیں کی جا رہی ہیں، مغرب زدہ دنیا پرست مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے انہیں آخری موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت چھوڑ کر اُن ممالک اور اُن میں رائج نظریات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں جہاں نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں معاذ اللہ گستاخی کو جینے کا کلیہ سمجھا جاتا ہے...... اجی! ہم ایسے کلیے پر ہزار بار کلی کرتے ہیں اور ایسے مسلمانوں سے بھی پناہ مانگتے ہیں جو منطق اور Logics کی وادیوں میں بھٹک کر اپنے ''یقین'' کا بیدردی سے شکار کر رہے ہیں اور جن کی خوشامدی اداؤں نے ایمانی فضاؤں کو اِس حد تک آلودہ کر دیا ہے کہ قریب بیٹھ کر سانس لینا بھی دشوار ہے......!'' (روزنامہ جنگ لاہور، 26 جنوری 2015ء)

مختلف یورپی ممالک میں عیسائی انتہا پسند مسلمانوں کو پکڑ کر ان کے سروں کو مونڈنے کے بعد ان پر صلیب کے نشان پرنٹ کر دیتے ہیں۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ مسلمان

مرد وخواتین اور مساجد پر ہونے والے درجنوں حملوں کے باوجود سکیورٹی اداروں نے اب تک کسی ایک بھی ملزم کو گرفتار نہیں کیا۔ مسلمان مخالف انتہا پسند تنظیم پیگیڈا ''پیٹریاٹک یورپینز اگینسٹ اسلامائزیشن'' کی سرگرمیاں مسلمانوں کے لیے تشویش ناک حد تک خطرناک ثابت ہو رہی ہیں۔ آئے دن مختلف مظاہروں میں قرآن مجید سے عیسائی یہودی مخالف آیات حذف کرنے اور مسلمانوں کو یورپ سے بے دخل کرنے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ شر پسند تنظیم کی شروعات سماجی رابطوں کی ویب سائٹ فیس بک کے ایک پیج سے ہوئی۔ یہ پیج 41 سالہ گرافک ڈیزائنر لٹز بخمین نے شروع کیا تھا، لٹز بخمین ایک متشدد عیسائی اور اسلام دشمن شخص ہے۔ اسے ماضی میں منشیات فروشی کے جرم میں دو سال قید کی سزا بھی ہو چکی ہے۔

مغربی ممالک ''اسلام فوبیا'' میں بری طرح مبتلا ہو چکے ہیں اور وہ اپنے اقدامات کے ذریعے پوری دنیا کے مسلمانوں کو نفرت اور عناد کا پیغام دے رہے ہیں۔ عالمی طاقتوں کی استعماری پالیسیوں کے نتیجے میں کرہ ارض پر جنگوں اور تہذیبوں کے تصادم کے خطرات پہلے ہی محسوس کیے جا رہے ہیں۔ آزادیٔ اظہار کے خود ساختہ نظریے کے تحفظ کے نام پر مغرب دنیا کو مزید تباہی اور فساد کی طرف دھکیل رہا ہے۔ حالانکہ آزادیٔ اظہار کا مغرب کا فلسفہ بجائے خود زبردست تضادات کا شاہکار ہے۔ اس نظریے کے تحت دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے ایمان اور عقیدے پر براہ راست حملہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن مٹھی بھر صہیونی لابی کے مظالم کا تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی تاریخ کی سب سے عظیم ہستی کی ذات والا صفات پر کیچڑ اچھالنے کی ''اجازت'' ہے جبکہ ہولوکاسٹ کے تاریخی افسانے پر سوالات اٹھانا بھی جرم ہے۔ پھر خود مغربی مفکرین آزادیٔ اظہار کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ اس کا مطلب دوسروں کی جانب سے توہین یا دل آزاری کرنا یا کسی کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنا نہیں ہے۔ اس کے باوجود مغربی ممالک کی جانب سے توہین رسالت پر مبنی غلیظ خاکوں کی اشاعت یا دل آزار فلم کو ''آزادی اظہار کا حق'' قرار دے کر اس کا دفاع کرنا نہایت شرمناک امر ہے۔

امریکہ اور مغربی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تعصب کے رجحانات ابھر رہے ہیں، ایک مخصوص طبقہ مسلمانوں کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انسانی حقوق کے علمبردار یہ ممالک اس کا نوٹس لیتے اور اس کے تدارک کے لیے مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے اقدامات کیے جاتے لیکن اس کے برعکس ایسے

واقعات کی ظاہراً حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور کسی بھی انسانی حقوق کی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اس پر آواز بلند نہیں کی گئی۔ اسلام سے تعصب کے واقعات ان ممالک میں ہو رہے ہیں جو روایتی طور پر انسانی حقوق اور انسان پرستی کے چیمپئن بن رہے ہیں۔ امریکہ میں ریپبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ (Donald Trump) اپنی اسلام دشمنی میں تمام سرحدیں پار کر گئے۔ 24 اکتوبر 2015ء کو انہوں نے اسلام مخالف بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں امریکی صدر بن گیا تو پورے امریکہ میں مساجد بند کرا دوں گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں امریکی صدر مسلمان نہیں ہونا چاہیے۔ مزید کہا کہ وہ امریکہ کے مسلمان شہریوں کا Database بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس طرح ہٹلر نے جرمنی کے یہودی شہریوں کے کوائف تیار کروائے، تاکہ ان کی نسل کشی میں وقت ضائع نہ ہو۔ 13 دسمبر 2015ء میں انہوں نے مسلمانوں کے امریکہ میں داخلے پر مکمل پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی سخت نگرانی کرنے کی بات کی۔ اس موقع پر ڈونلڈ ٹرمپ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ برسر اقتدار آ گئے تو امریکہ سے مسلمانوں کو ملک بدر کر دیں گے۔ 10 جنوری 2016ء کو ڈونلڈ ٹرمپ نے جنوبی کیرولینا میں اپنی انتخابی ریلی کے دوران ایک مسلمان خاتون کو سیکورٹی اہلکاروں کے ذریعے باہر نکال دیا جبکہ ریلی میں شریک لوگوں نے خاتون کے ساتھ نہایت نازیبا اور غیر مناسب سلوک کیا۔ دوسری طرف 18 دسمبر 2015ء کو روسی صدر پیوٹن نے مسلمانوں کے خلاف اپنے تعصب کا اظہار کرتے ہوئے ڈونلڈ ٹرمپ کے اسلام دشمن بیانات کو سراہتے ہوئے اسے زبردست ذہین اور متاثر کن شخصیت قرار دیا۔

ریپبلکن پارٹی کے صدارتی امیدواروں میں مقبولیت کے لحاظ سے سیاہ فام بن کارسن (Ben Carson) دوسرے نمبر پر تھے۔ وہ نسلی پہلو سے خود اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ مسلمان دشمنی میں سفید فام امیدواروں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے تو یہ انتہائی بیان دیا کہ امریکی آئین میں یہ بھی شامل کیا جائے کہ کوئی مسلمان امریکہ کا صدر نہیں بن سکتا۔ سانحہ پیرس کے بعد شامی پناہ گزینوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مزید اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مہاجرین ایسے ہی ہیں جیسے گلی میں کوئی باؤلا کتا آ جائے اور کوئی ایسے باولے کتے کو اپنے گھر یا گلی میں گھسنے نہیں دیتا۔ امریکی صدارتی امیدوار کے اِس اشتعال انگیز بیان نے پناہ گزینوں پر قیامت ڈھا دی۔ مشرقِ وسطیٰ

اور شمالی افریقا کے اسلامی ممالک بالخصوص شام و عراق سے یورپ جانے والے پناہ گزینوں نے یورپی اداروں کی جانب سے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھنے کا انکشاف کیا۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق یورپ کے حکومتی اداروں، انسانی حقوق کی رکھوالی کرنے والی سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں اور امدادی کارکنوں نے شام سے آنے والی پناہ گزین خواتین کا جینا حرام کر دیا ہے۔ وقفے وقفے سے پناہ گزین کیمپوں میں مختلف بہانوں سے آنے والے اوباش مرد، عرب خواتین کو نہ صرف ہوس سے بھری ہوئی بھوکی نظروں سے گھورتے بلکہ وہ خواتین کو چھیڑنے اور انہیں ہراساں کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ خواتین کی پرائیویسی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں آنے والی اکثر خواتین اور لڑکیاں عیاش اور آوارہ امدادی رضا کاروں کے ہاتھوں ہراسیت کا نشانہ بنی ہیں۔ مزاحمت کرنے پر کئی خواتین کو تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ 18 دسمبر 2015ء کو اسکاٹ لینڈ میں چند شر پسندوں نے اس کمیونٹی سنٹر کو آگ لگا دی جو مسجد کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور جہاں شامی پناہ گزینوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس طرح فرانس میں بھی انتہا پسندوں نے فرانس حملوں سے مشتعل ہو کر پناہ گزینوں کے کیمپوں کو آگ لگائی اور کریکر پھینک کر انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا۔ ریپبلکن پارٹی میں تیسرے مقبول ترین امیدوار مارکو بوبیو (Marco Bobio) تھے۔ وہ تو جوش خطابت میں یہاں تک بڑھ گئے کہ انہوں نے کہا کہ نہ صرف مذہبی مراکز کو بلکہ ہر اس جگہ (کیفے، ہوٹل وغیرہ) کو بند کر دینا چاہیے جہاں دہشت گردی کی سازش بن سکتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے کاروباروں پر بھی پابندی لگا دینی چاہیے۔ ایک اور صدارتی امیدوار کا کہنا تھا کہ حکومت کو ایسا محکمہ قائم کرنا چاہیے جو اس امر کو یقینی بنائے کہ امریکہ میں ہر شہری عیسائی اور یہودی اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کا پابند ہو۔ جون 2015ء میں امریکی صدارت کے لیے اپنی امیدواری کا اعلان کرتے ہوئے ری پبلکن سینیٹر لنڈ سے گراہم نے کہا کہ اسلام اور اس کے ماننے والے امریکہ اور اس کی طرز زندگی کے دشمن ہیں۔ اور ان کے خاتمہ کے لیے وہ جنگ اور دیگر تمام ذرائع استعمال کر کے انہیں شکست دیں گے۔ سینیٹر لنڈ سے گراہم کا مسلمانوں کے خلاف بیان امریکہ کے مسلمانوں کے لیے توجہ اور تشویش کا باعث بن گیا۔ گو کہ یہ بیان مسلم دنیا کے لیے بھی توجہ اور تشویش کا باعث ہونا چاہیے تھا مگر مسلم دنیا کے حکمران تو اپنے عوام کے مسائل سے لاتعلق ہو کر خود آپس ہی میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ سینیٹر گراہم نے ''ریڈیکل اسلام''

مذہب اسلام، اور عام انسان کے ''اسلام'' کے مابین کوئی فرق بھی بیان نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ '' کیسے مسلمانوں کو قابل قبول سمجھتے ہیں؟ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے ملک (امریکہ) کے بارے میں کبھی اتنا فکر مند نہیں ہوا جتنا کہ آج اسلام کے ہاتھوں فکر مند ہوں۔

معروف صحافی جناب عمر ابراہیم اپنے گرانقدر مضمون ''مغربی ہیروز اور مغربی اسلام'' میں لکھتے ہیں: ''دو مقدمات ہیں...... ایک عماد الدین سید کا، دوسرا برینڈن اسٹینٹن کا۔ ایک مصری طالب علم ہے، دوسرا امریکی بلاگر ہے۔ دونوں نے ایک سے جذبات کا اظہار کیا۔ ایک سا بیانیہ، ایک سے احساسات سامنے آئے۔ مگر ایک سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا، امریکہ سے نکالا گیا جبکہ دوسرا سوشل میڈیا پر ہیرو بن گیا۔ دونوں نے سچ کہا، مگر ایک کا سچ سزا وار ٹھہرا، دوسرے کے سچ پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ ایک سے عمل پر دو انتہائی مختلف ردعمل سامنے آئے۔ ایک سے سچ پر دو انتہائی مختلف رویے پیدا ہوئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ فرق کیسے آیا؟

یہ عماد الدین سید اور برینڈن اسٹینٹن کے کردار یا ساکھ کا مسئلہ ہے؟ یا دونوں کی نیت اور عمل کا فرق ہے؟ نسلوں اور قومیتوں کا اختلاف ہے؟ نہیں...... دونوں کی نیت، احساس اور تاثر میں کچھ کھوٹ نہیں۔ مسئلہ ہے اسلام اور مسلمانوں کے ''جملہ حقوق'' کا۔ مغرب یہ ''جملہ حقوق'' چھین لینا چاہتا ہے۔ کیوں اور کیسے؟ جاننا ہوگا۔

23 سالہ مصری طالب علم عماد الدین سید نے فیس بک پر ایک مضمون لکھا، جو ڈونلڈ ٹرمپ کے اسلام دشمن رویے کا ردعمل تھا۔ عماد الدین نے لکھا کہ اگر اُسے اس 'شخص' کے قتل پر عمر قید دے دی جائے تو بخوشی قبول ہوگی، یقیناً اس حرکت پر دنیا اُس کی شکر گزار ہوگی۔ عماد الدین ستمبر 2015ء سے لاس اینجلس کی یونیورسل ایئر اکیڈمی میں زیر تعلیم تھا۔ جہاں سیکرٹ سروس ایجنٹس نے عماد الدین سید سے دو گھنٹے پوچھ گچھ کی اور کسی عسکری گروہ سے وابستگی جوڑنے کی بھرپور تگ و دو کی۔ 5 فروری کو سیکرٹ سروس والے پھر عماد کے گھر آ دھمکے، ذاتی اشیاء کی جانچ پڑتال کی، گاڑی اور لیپ ٹاپ کا معائنہ کیا پھر اکیڈمی کے منتظم سے کہہ دیا گیا کہ عماد الدین کا ویزہ ختم کر دیا گیا ہے، اسے اب امریکہ چھوڑنا ہوگا۔ 12 فروری کو عماد الدین اکیڈمی میں طلب کیا گیا، جہاں پہلے سے موجود سیکرٹ ایجنٹس اور امیگریشن عملہ نے اسے دھر لیا۔ الزام یہ لگایا کہ امریکہ میں داخلے کی شرائط کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ عماد کی وکیل ہانی بشریٰ نے اس واقعہ کو زیادتی قرار دیا، قانون کے منافی ٹھہرایا۔ بالآخر عماد الدین سید کو امریکہ

چھوڑنے پر ہی آمادہ ہونا پڑا۔

مقبول فیس بک پیج ''ہیومیز ایف نیو یارک'' کے خالق، معروف صحافی اور بلاگر برینڈن اسٹینٹن نے ری پبلکن صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ کو کھلا خط لکھا، یہ خط سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا۔ گیارہ لاکھ سے زائد مرتبہ شیئر کیا گیا۔ بائیس لاکھ سے زائد بار لائیک کیا گیا۔ اس خط سے برینڈن اسٹینٹن کا پیج لاکھوں افراد کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ستر ہزار سے زائد بار تبصرے ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ لاکھوں 'فالوورز' والی ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار ہلیری کلنٹن نے جھٹ پٹ یہ خط شیئر کیا۔ ذرائع ابلاغ میں اس خط نے طوفان اُٹھا دیا۔ اسٹینٹن نے خط میں لکھا تھا کہ ڈونلڈ ٹرمپ ایک خطرناک انسان ہے! لاکھوں امریکیوں کی طرح اسے بھی یہ احساس ہوا کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی مخالفت نہ صرف سیاسی فیصلہ بلکہ اخلاقی ذمے داری بھی ہونی چاہیے...... ڈونلڈ ٹرمپ نسلی منافرت پر مبنی تصاویر ٹوئیٹ کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، تشدد پر اکساتا ہے اور فسادیوں سے قانونی مدد کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ خنزیر کے خون میں ڈوبی گولیوں سے مسلمانوں کے قتل عام کی کہانیاں خوش ہو کر سناتا ہے۔ مہاجرین کو سانپ کہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام مغرب سے نفرت کرتا ہے۔ برینڈن اسٹینٹن بطور صحافی تسلیم کرتا ہے کہ پاکستان سمیت کئی مسلمان ملکوں میں لوگوں کے انٹرویو اور ملاقاتوں میں اُسے نفرت کا کوئی پیغام نہیں ملا اور تصدیق کرتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ خود نفرت سے بھرا انسان ہے، اقتدار کا بھوکا خطرناک شخص ہے۔ یہاں تحقیقاتی ادارے اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ کی تحقیق کا ذکر برمحل ہوگا۔ یہ تحقیق کہتی ہے کہ اگر امریکی ارب پتی ڈونلڈ ٹرمپ صدر بن گیا تو یہ دنیا کو درپیش دس بڑے خطرات میں سے ایک خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہ عالمی معیشت میں بے چینی اور امریکہ میں سیاسی اور سیکورٹی کے خطرات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

مذکورہ کردار، واقعات اور تحقیقات یہاں ہرگز ڈونلڈ ٹرمپ کی کردار کشی یا عماد الدین سید کی تعریف و توصیف میں نہیں۔ یہاں یہ موضوع ہی نہیں ہے۔ موضوع ہے وہ ردعمل، جو انتہائی مخالف سمتوں میں جاتا نظر آیا۔ ایک مسلمان نوجوان نے اسلام دشمن جذبات کی مذمت کی تو آزادئ اظہارِ رائے، تعلیم کی آزادی، اور ہر حق سے محروم کر دیا گیا جبکہ دوسرا ہیرو بنا دیا گیا۔ نیو یارک ٹائمز کے رپورٹر Ruth La Fera نے برینڈن اسٹینٹن کی تحسین میں طویل مضمون باندھا۔ اس خط کو فیس بک کی تاریخ میں سب سے زیادہ شیئر کی جانے والی

پوسٹ میں شمار کیا۔ 'یاہوٗ' کی گلوبل اینکر پرسن Katie Couric نے بریڈن اسٹینٹن کا خصوصی انٹرویو کیا۔ غرض بریڈن اسٹینٹن امریکی میڈیا اور سوشل ویب سائٹس پر 'ہیروٗ' بن کر سامنے آیا۔ مگر عمادالدین کے احساسات قابلِ مذمت قرار پائے۔ پھر وہی سوال سامنے آ گیا کہ کیوں؟ کچھ ایسے ہی دیگر مغربی ہیرو ہیروئنز آئے دن نظر آتے ہیں۔ مسلمان پناہ گزین خیموں میں ہمدردی کا ڈراما رچاتی انجلینا جولی اور شکیرا نمایاں مثالیں ہیں۔ بعض مواقع پر پوپ فرانسس تک مسلمانوں کے دفاع میں ہیرو لگنے لگتے ہیں۔ فیس بک مالک مارک زکر برگ حال ہی میں مسلمانوں کے مسیحا بن کر سامنے آئے تھے۔ یہ سب دانستہ نا دانستہ 'ہیروز' مغرب میں بڑے محبوب ہیں۔ ہلیری کلنٹن ہیں جو ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار ہیں، ڈونلڈ ٹرمپ کی مخالفت میں مسلمانوں سے بڑی محبت جتا رہی ہیں۔ یہ 'ہیروز' اور 'ہیومنسٹ' کہلاتے ہیں۔ کیوں؟ چونکہ اسلامی تہذیب کی علمی اور عسکری شکست ممکن نہیں۔ واحد صورت یہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے جملہ ''حقوق'' غصب کر لیے جائیں۔ اسلام جو کچھ ہو، مغرب کی ''بائی پراڈکٹ'' ہو۔ مسلمانوں کا کوئی ہیرو ہو تو وہ مغرب کی پراڈکٹ ہو۔ کوئی غیر منظور شدہ شخص ڈونلڈ ٹرمپ کے خلاف ہیرو بن ہی نہیں سکتا۔ البتہ بارک اوباما اور ہلیری کلنٹن مسلمانوں کے ہمدرد اور ہیرو بن سکتے ہیں۔ جبکہ مسلمان بستیوں پر بمباری ان سب ہی کی مستقل پالیسی ہے۔ یہ سب اسلام دشمنی میں ایک ہیں، کوئی کسی سے کم نہیں۔

مغرب کی اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کا ''غیر منظور شدہ'' ترجمان یا ہیرو ہرگز قبول نہیں، وہ چاہتا ہے کہ اسلام اور مسلمان دونوں مغربی تہذیب ہی کے مرہون منت ہوں، مغربی تہذیب کی ''بائی پراڈکٹ'' ہوں۔ مغرب چاہتا ہے اسلام اُن کا، مسلمان اُن کا، اور مسیحا بھی اُن کا ہی ہو۔ وہ چاہتے ہیں اسلام مغرب کی 'بائی پراڈکٹ' ہی کی واحد صورت میں باقی رہ جائے۔ وہ چاہتے ہیں اسلام اور مسلمان اپنے حقوق اور اپنے 'مسیحا' کے لیے مغرب سے ہی رجوع کریں۔ انہیں عمادالدین سید کسی صورت قبول نہیں، انہیں بریڈن اسٹینٹن بہرصورت منظور ہے۔ سارا تصادم نظریاتی قیادت کا ہے، اس سے دست برداری مغرب کو منظور نہیں۔ یہ اسلامی تہذیب سے ہو نہیں سکتا، چاہے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند ہی لا کر کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اسلام انسان کی امامت سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ حق پوری طرح چھا نہ جائے اور باطل یکسر مٹ نہ جائے''۔ (ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل یکم اپریل 2016ء)

جون 2015ء میں فرانسیسی وزیر داخلہ کے ایک بیان کے مطابق گزشتہ تین برسوں کے دوران پیرس حکومت نے چالیس مسلمان اماموں کو فرانس سے بیدخل کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مختلف مساجد سے تعلق رکھنے والے یہ امام توہین آمیز خاکوں کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ فرانس کے وزیر داخلہ برنار کازینیو (Bernard Cazeneuve) کا کہنا تھا کہ ان کی حکومت نے سارے فرانس میں مسلمان مبلغین اور مساجد میں نماز پڑھانے والے اماموں پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ پیرس حملوں کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسرائیلی ادارے مسلمان مخالف رجحان عام کرنے، ان کے خلاف نفرت اور تعصب کی فضا کو ترتیب دیتے رہے۔ جس کا مقصد لوگوں کو مسلمانوں پر حملوں اور مسلمان تاجروں کے بائیکاٹ پر اکسانا تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں سیکورٹی اداروں نے 10 ہزار سے زائد مسلمانوں کے نام مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل کر دیئے۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کا رویہ اس اسلامی سوچ اور فکر و عمل کی نشاندہی کرتا ہے کہ ظلم و زیادتی کسی عیسائی پر ہو یا یہودی پر، ہندو پر ہو یا مسلمان پر، اس کی بلا امتیاز مذمت کرنا اور جس حد تک ممکن ہو روکنا، اسلامی تعلیمات کا لازمی حصہ ہے۔ اس کے برعکس دہشت گردی کا الزام لگا کر اسلام کو بدنام کرنے والا مغربی میڈیا، برما اور وسطی افریقا میں مسلمانوں کے بہیمانہ قتل عام اور خود نائیجیریا کے عیسائی علاقوں میں مسلمانوں پر ہونے والے ظالمانہ تشدد پر خاموش ہے۔ برما میں بدھسٹوں اور وسطی افریقا میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ مسلمانوں پر ہولناک تشدد کر کے مارا گیا۔ مگر بین الاقوامی برادری اور عالمی میڈیا کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اسلامی دہشت گرد کی اصطلاح استعمال کرنے والا مغربی میڈیا بدھسٹ دہشت گرد، ہندو دہشت گرد اور عیسائی دہشت گرد کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا جبکہ مسلمانوں کے حق میں کچھ لکھنا، بولنا تو یورپ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی میڈیا ''اسلامی دہشت گردی'' کا پورے زور سے شور مچاتا ہے۔ قلم آج دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مگر مسلمان اس سے محروم ہیں۔ میڈیا مغرب کے قبضے میں ہے، جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں مسلمان تنظیمیں و تحریکیں اس میڈیا کے منفی پروپیگنڈے کا ہدف ہیں۔

2015ء میں برطانیہ میں جہاں اسلام قبول کرنے کے رجحان میں اضافے کا

رجحان رہا، وہیں ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ مملکت میں مسلمانوں سے نفرت کے رجحان میں بھی 4 گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ستمبر 2015ء میں برطانوی پولیس کی جانب سے جاری کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق لندن میں گزشتہ برس مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جرائم میں 70 فیصد اضافہ ہوا اور برطانوی مسلمانوں نے اس صورتحال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ان جرائم کو مسلمانوں کے خلاف موجودہ عالمی فضا کو قرار دیا۔ان کا کہنا تھا کہ نسلی نفرت کا نشانہ سب سے زیادہ مسلمان خواتین کو بنایا جاتا ہے۔میٹرو پولیٹن پولیس کی جانب سے جاری کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق جولائی 2014ء سے جولائی 2015ء کے دوران مسلمانوں کے خلاف مذہبی نفرت کی بنیادوں پر 816 جرائم ریکارڈ کیے گئے جبکہ اس سے پچھلے سال یہ تعدد 478 تھی۔اس طرح ایک برس میں ان کی تعداد 70 فیصد بڑھ گئی ہے۔ان جرائم کی مانیٹرنگ کرنے والی تنظیم ٹل ماما (Tell Mama) کا کہنا تھا کہ مذہبی بنیادوں پر نفرت کرنے والے زیادہ تر ان مسلمان خواتین کو نشانہ بناتے ہیں جنہوں نے سکارف، برقع یا نقاب پہن رکھے ہوتے ہیں۔گروپ کا کہنا تھا کہ لندن میں نقاب اور برقع پہننے والی عورتوں کے خلاف انتہائی جارحانہ اقدامات دیکھنے میں آئے ہیں۔میٹرو پولیٹن پولیس کا کہنا تھا کہ مذہبی بنیادوں پر ان افراد کو جارحیت اور نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جو واقعات پولیس میں رپورٹ کیے گئے ہیں ان میں جسمانی حملوں سے انتہائی تشدد تک کے واقعات شامل ہیں۔

اسلام فوبیا کا جنون داڑھی اور حجاب تک محدود نہیں ہے، مساجد، مقابر اور دیگر اسلامی ادارے بھی اس کی زد میں ہیں۔ابھی حال میں 13 دسمبر 2009ء کو جنوبی فرانس میں واقع کاسترے (Castres) کی مسجد کی سخت بے حرمتی کی گئی، دیواروں پر جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں مسلم مخالف نعرے لکھے گئے اور دروازہ پر خنزیر کی ٹانگیں لٹکا دی گئیں، پیرس میں بھی ایک مسجد کو نقصان پہنچایا گیا، حالیہ ایام میں مساجد کی بے جا اور ناوقت تلاشیوں کے واقعات بھی کافی تعداد اور متعدد ممالک مثلاً امریکہ، ہندوستان، چین اور برطانیہ میں دیکھنے میں آئے ہیں۔کئی یورپی ممالک میں مسلمانوں کی قبروں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔فرانس کے صرف ایک شہر آرا (Arras) میں 148 مسلم قبروں کی بے حرمتی کی گئی، جن میں سے کچھ قبروں کے کتبے پر خنزیر کا سر لٹکا کر اسلام و مسلم مخالف نعرے لکھے گئے، لندن کے چارلٹن (Charlton) قبرستان میں مسلمانوں کی قبروں کو نقصان پہنچایا گیا، اسپین کے شہر سیوطا

(Ceuta) کی ایک مسجد میں آتش زنی کی گئی۔ 6 جولائی 2009ء کو اسکاٹ لینڈ میں واقع اسلامک ریلیف کی گلاسگو برانچ کو نذر آتش کیا گیا، اسلاموفوبیا کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر اردن کی حکومت نے بین الاقوامی برادری سے اپیل کی تھی کہ اس خطرہ کے فروغ کو روکنے کی تدبیر کی جائے، لیکن یہ اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

مغربی میڈیا کے اندھے بہرے ذہنوں نے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بندھی ٹکی (Steriotype) تصویر قائم کر رکھی ہے، اسلام وحشیانہ ہے، غیر منطقی ہے، جنس گزیدہ ہے، پر تشدد ہے، جامد ہے، ترقی کا دشمن ہے...... مسلمان اپنے مذہب کے اندھے معتقد (Fanatics) ہیں، ''اسلامی دہشت گرد'' ہیں، ان کے پاس ''اسلامی ایٹم بم'' ہے وغیرہ وغیرہ۔ میڈیا کے اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اس پروپیگنڈے پر ایمان لے آیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے بڑے سے بڑے عالم کو تو خاطر میں نہیں لاتا لیکن مسلمان نام رکھنے والا کوئی معمولی تعلیم یافتہ شخص بھی اسلام کے خلاف بکواس کر دے تو وہ یا وہ گوئی میڈیا کے لیے آسمانی صحیفہ بن جاتی ہے۔ میڈیا نے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگوں کو جو سر پر بٹھا رکھا ہے، اس کی وجہ اسلاموفوبیا کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس فوبیا کی جھلک ڈنمارک کے روزنامہ جیلانڈز پوسٹن (Jyllands Poston) کے بدنام زمانہ اہانتی کارٹونوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں نے ان کارٹونوں کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج کیا اور ہر قابل ذکر اتھارٹی کے سامنے اپنا کیس پیش کیا لیکن ہر جگہ آزادئ اظہار کے حق کا اندھا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا، کسی نے بھی یہ خیال نہیں کیا کہ آزادئ مذہب اور تکریم انسانی کا حق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

سید عبدالودود شاہ اپنے گرانقدر مضمون ''مغربی میڈیا کی اسلام اور مسلم مخالف مہم، حیران کن حقائق'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ ''امریکہ میں 6 کارپوریشنز ہیں جو میڈیا کے 90 فی صد حصے کو کنٹرول کرتی ہیں، ان میں جنرل الیکٹرک، ڈزنی، نیوز کارپ، سی بی ایس، وائیکام اور ٹائم وارنر وغیرہ شامل ہیں۔ سی این این، ایچ بی او، فوکس، این بی سی، وال اسٹریٹ جرنل، اے بی سی اور نیو یارک پوسٹ ایسے چند ادارے ہیں جو ان مذکورہ بالا 6 کارپوریشنز کی ملکیت ہیں۔ یہ وہ عوامی ذرائع ابلاغ ہیں جن کو عام طور پر ''مین اسٹریم میڈیا'' سمجھا اور شمار کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اس ''مین اسٹریم میڈیا'' کی کیا اہمیت اور کیا کردار ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذریعے دہشت گردی کی ''فروخت''

ہوتی ہے اور یہ ''فروخت'' اس وقت بڑھتی ہے، جب کسی دہشت گردی میں مسلمان ملوث ہوں۔ یہ ''مین اسٹریم میڈیا'' اس معاملے کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے لیکن ادھر کسی مسلمان کے کسی دہشت گردی میں ملوث ہونے کا معاملہ سامنے آیا، اُدھر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کا طوفان اُٹھا دیا بلکہ یہ پورے کا پورا ''مین اسٹریم میڈیا'' دنیا بھر کے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا پھٹ پڑنے والا ''آتش فشاں'' بن جاتا ہے، ہر خبر ''بریکنگ نیوز'' بن جاتی ہے اور ہر بریکنگ نیوز کی تان مسلمانوں کے دہشت گرد ہونے اور اسلام کے دہشت گردی کا مذہب ہونے پر ٹوٹتی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ میڈیا دہشت گردی کے خلاف اپنا منہ بند رکھے لیکن یہ تو ہونا چاہیے کہ دہشت گردی کے ہر واقعے کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف استعمال کرنے اور ان کے خلاف ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ ایف بی آئی نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ 1980ء تا 2005ء امریکہ میں دہشت گردی کے کل واقعات میں سے صرف 6 فی صد واقعات میں مسلم انتہا پسند ملوث تھے جب کہ 94 فی صد واقعات غیر مسلم گروپوں کے ''کارنامے'' تھے۔ ایف بی آئی کی یہ گواہی تمام تر اسلام اور مسلمان مخالف پروپیگنڈا کا کافی جواب ہے''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 28 دسمبر 2015ء)

اسلاموفوبیا میں مبتلا ہونے کے فیشن کی حوصلہ شکنی کی غرض سے اسلامی حقوق انسانی کمیشن نے ایک سالانہ ایوارڈ جاری کیا ہے: ''سالِ رواں کا اسلامو فوب'' (Islamophob of the Year) برطانوی صحافی پولی ٹائن بی، ڈینیل پائپس اور امریکی اٹارنی جنزل جان ایش کرافٹ اس ایوارڈ کے لیے نامزد کیے جا چکے ہیں، ایش کرافٹ نے برسرعام یہ انکشاف کیا تھا: ''اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں خدا آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کو اس کی خاطر مرنے کے لیے بھیجیں، کرسچینٹی ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں خدا آپ کے بیٹوں کو خود ان کی خاطر مرنے کے لیے بھیجتا ہے''۔ امریکی مصنف اسٹیفن شوارتز نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے: ''اسلاموفوبیا پورے کے پورے اسلام کو مسترد کرنے، اس کی تاریخ کو انتہا پسندانہ قرار دینے، اعتدال پسند مسلم اکثریت کے وجود کا انکار کرنے، اسلام کو پوری دنیا کے لیے مسئلہ قرار دینے، جن تنازعات میں مسلمانوں کا کچھ بھی تعلق ہو، ان میں مسلمانوں کو لازماً ناحق ثابت کرنے اور مسلمانوں سے یہ اصرار کرنے سے مملو ہے کہ وہ اپنے مذہب میں تبدیلیاں کریں یعنی کل ملا کر یہ اسلام کے خلاف ایک جنگ ہے''۔ کیا آزادئ ضمیر

کے حق کا یہی معنی و مطلب ہے؟ اب اسلام دشمن طاقتوں نے مسلمانوں کے خلاف ہر سال 12 دسمبر کو ''انٹرنیشنل ڈے آف اسلاموفوبیا'' منانے کا اعلان کیا ہے۔ اعلان کیا گیا کہ اس روز مسلمانوں سے نفرت اور ان کے عقائد سے بیزاری کا اظہار کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہر بڑے شہر میں اسلام کے خلاف احتجاج کیا جائے گا اور پمفلٹ تقسیم کیے جائیں گے۔

اسلام کو ایک تسلسل کے ساتھ مغربی میڈیا، یہودی دانشوروں اور عیسائی مفکروں نے ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کیا جس کی تعلیمات فرسودہ، انسان کی فطری آزادی کو سلب کرنے والا، ترقی کا مخالف اور صدیوں پیچھے پہنچانے والا ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ متمدن زمانہ کے ساتھ نہیں چل سکتا، رجعت پسندی، بنیاد پرستی، فرسودہ خیالات کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کی شبیہہ کو بگاڑنے میں مغربی میڈیا نے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ طبعی طور پر اہل مغرب نے اسلام کو اسی تصور کے ساتھ تسلیم کر لیا اور اس کا لاشعوری خوف ان کے ذہن پر جم گیا۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی آبادی مغربی ثقافت کے لیے خطرہ ہے تو اپنے وجود کی بقا کا احساس اسلام کے خلاف جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں میناروں کو پوری تہذب کے لیے زبردست خطرہ بنا کر نسل پرستوں نے مساجد کے میناروں پر پابندی کا قانون بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ایسے جنونی افراد کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بولنے لکھنے یا اس کی اہانت و تذلیل کر کے ایک طرح کا نفسیاتی اور ذہنی سکون ملتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنا اور قرآن کریم کو دہشت گردی پیدا کرنے والی تعلیمات دینے والی کتاب کے طور پر پیش کرنا اسی لذت کے لیے ہے کہ جب مسلمان کرب و اضطراب میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان عناصر کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے خوفناک و خطرناک دشمن کو سبق سکھا رہے ہیں۔

صلیبی اور صہیونی عناصر نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے ذریعہ اپنے دو ہدف حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک مسلمانوں کو تنہائی اور احساس کمتری میں مبتلا کر کے اسلامی تعلیمات سے دور کرنا، اور دوسرے اہل یورپ کو اسلام اور مسلمانوں سے جنون و دیوانگی کی حد تک متنفر کرنا، تاکہ وہ اسلام کا مطالعہ نہ کریں ورنہ یقینی طور پر اس سے متاثر ہوں گے۔ نرسری اسکولوں کالجوں اور گرجا گھروں میں عیسائی بچوں اور نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی اسی نہج پر ذہن سازی اور تربیت کی جاتی ہے جس کا اعتراف اکثر نو مسلم یورپین اور امریکن شہریوں

نے کیا ہے کہ ہم کو اسلام سے ڈرایا جاتا تھا۔

چونکہ یورپین تہذیب کی اساس، دین و مذہب سے آزاد مادہ پرستی پر ہے اور یہ ایک طرح کا ردعمل ہے، کیوں کہ صدیوں تک یورپ نے کلیسائی نظام کی چیرہ دستی، انتہا پسندی کا سامنا کیا ہے۔ یورپ کا نظام حکومت کلیسا کے تابع تھا۔ اصل حکمرانی پادریوں کی تھی اور اہل یورپ مذہب کے نام پر اپنے مذہبی پیشواؤں کی تنگ نظری سے اتنے روٹھ چکے تھے کہ ان سے آزاد ہونے کے لیے بے چین تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ نے کلیسا کے تسلط سے نجات حاصل کی تو طبعی طور پر تمام مذہبی اخلاقی قدروں اور حدوں سے اس نے اپنے کو آزاد کر لیا، مذہب کو ترقی کا دشمن تصور کر لیا، یہاں تک کہ وہ انسانی حدیں بس ضد اور مخالفت میں پار کر گیا، آج جو یورپین تہذیب ہے، اسی آزاد مزاجی کا شاخسانہ ہے، عریانیت، فحاشی، بے شرمی، مرد و زن کا اختلاط، شراب نوشی، مادہ پرستی اس کی بنیاد ہے۔ مغربی تہذیب کسی روحانی و اخلاقی قدر و قید کو تسلیم نہیں کرتی، ہر فرد اپنی ذات میں آزاد ہے، اس کو حق ہے کہ جیسے چاہے زندگی گزارے، مذہب اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغرب ہندومت اور بدھ مت کو تو کسی حد تک برداشت کر لیتا ہے گو وہ اپنے سوا کسی تہذیب اور ثقافت کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا، لیکن اسلام سے جو بغض و عناد ہے اور مغرب کی اس سے جو عداوت ہے، وہ کسی دوسری تہذیب یا مذہب سے نہیں ہے۔ اسلام سے اس کی دشمنی اور اس کا بغض اس کی گھٹی میں پڑا ہے، حالانکہ اسلام، بدھ مت اور ہندومت کے فلسفہ کے مقابلہ میں مغربی اور عیسائی و یہودی اقدار Values کے قریب تر ہے کیونکہ اسلامی اقدار یورپی مغربی فکر کو پریشان اور ڈسٹرب کر دیتی ہے اور اس کا سبب جذباتی تعصب ہے۔ اسلام کی اقدار یورپی اور مغربی اقدار سے اتنی قریب ہے کہ وہ ان کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے، بطور خاص یورپ اور امریکی سماجی و روحانی زندگی کے لیے۔ اسی لیے مغرب اسلام سے لرزہ براندام ہے، جب کہ ہندو اور بت پرست تہذیبوں اور دیگر اقدار کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لاتا، نہ اسے اپنا حریف یا مدمقابل سمجھتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس کے لیے ہمیں بہت پیچھے جا کر مغرب اور دنیائے اسلام کے مابین تعلقات کی جانچ کرنی ہوگی۔ بالکل ابتدائی دور کے تعلقات اور ان کے درمیان تصادم کا جائزہ لینا ہوگا۔ مغربی ذہن آج اسلام کے بارے میں جو سوچتا ہے اور اس کا جو رویہ ہے، اس فکر و طرز عمل کی جڑیں بہت گہری

ہیں، یعنی یہ فکر و عمل صلیبی جنگوں میں پیوست ہے اور ان مذہبی جنگوں سے جڑا ہے جنہیں انگلش میں Crusades کہتے ہیں، یعنی صلیبی جنگیں، یقیناً یہ بات حیرت انگیز اور چونکا دینے والی ہے کہ کیا آج سے ہزار سال پہلے یعنی پہلی ملینیم میں واقع ہونے والی تہذیبی جنگوں کا اثر اکیسویں صدی میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، خاص طور پر اہل مغرب پر۔ ضرور امر واقعہ ایسا ہی ہے، جس طرح ایک فرد پر اس کے بچپن کے واقعات جوانی ہی نہیں، کہولت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح قوموں کے حال پر ماضی کے ان جنگوں کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں اور نفسیات کے مطابق یہ ایک معقول اور استدلالی حقیقت ہے کیونکہ صلیبی جنگوں سے فوراً پہلے کی صدی یعنی عیسائی کلینڈر کے پہلے ہزار سال کو صحیح معنوں میں ہم مغربی تہذیب کا بچپن کہہ سکتے ہیں۔

یہ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ مغربی تہذیب زمانہ قدیم سے جس طرح اسلام دشمنی کی بنیاد پر قائم تھی، آج بھی مغربی ذہن پر اسی طرح قائم ہے، جب کہ مذہب کی گرفت مغرب پر آج کے زمانہ میں ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ یہ بات اس لیے حیرت انگیز نہیں کہ ایک فرد پر بچپن میں ہونے والے مذہبی اثرات تو ختم ہو جاتے ہیں لیکن بعض مخصوص جذبات جو ان عقائد سے متعلق ہیں، غیر استدلالی طور پر آخر تک قائم رہتے ہیں اور مغربی تہذیب کے ساتھ اسلام کے تعلق سے یہی معاملہ آج بھی در پیش ہے اور اسلام کے تعلق سے اس کے تمام رد عمل اسی سخت جان نفرت کے سبب ہے جو مغرب کو اسلام دشمنی یا خوف اسلام سے نجات نہیں پانے دے رہا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں ابھی اسلام ابھرا ہی تھا کہ عیسائی عفریت جو مختلف فرقوں میں بٹا ہوا تھا، اسلام کے خلاف متحد ہو گیا تا کہ اسے نگل جائے۔ عیسائیت نے ہمیشہ اسلام اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کو مخالف عیسیٰ علیہ السلام کے روپ میں دیکھا اور دکھایا، حالانکہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت محمد ﷺ سے کسی طرح کم حیثیت سے پیش نہیں کیا، بلکہ جو معجزے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں، قرآن میں اتنے معجزے حضرت محمد ﷺ کے بھی نہیں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر احترام سے کرنے کی تاکید قرآن وسنت میں ملتی ہے، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین اپنے لٹریچر میں حضرت محمد ﷺ کی نعوذ باللہ توہین کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں خواندہ اور ان پڑھ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ چودہ صدیاں گزر گئیں لیکن آج تک کسی مسلمان نے کسی مقدس کتاب کی بے حرمتی نہیں کی۔ کبھی کسی جاہل نادان نے بھی کسی نبی یا رسول کی گستاخی کا اقدام نہیں کیا۔ اُن پر بہت سے سخت ادوار بھی آئے

اور گزر گئے۔ لیکن ان کے ایمان نے ایسی کوئی ہرزہ رسائی گوارا نہ کی۔ کیونکہ اُنہیں مدنی تاجدار پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف سے یہ تربیت ملی کہ کسی بھی نبی کی شان مت گھٹاؤ۔ بلکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تمام انبیا کرام علیہم السلام معصوم ہیں، گناہوں سے پاک ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات سے نوازا۔ ان کے معجزات کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ مسجدوں میں سینکڑوں خطبے دوسرے نبیوں کی شان بیان کرنے پر ہوتے ہیں۔ مسلمان بچے بچپن ہی سے حضرت مریم علیہا السلام کی پاکیزگی کی شان کو مسجدوں میں سنتے ہیں اور یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن پاک کی انیسویں سورت کا نام مریم ہے۔ اس سورۃ میں جس طرح حضرت مریم کی پاکیزگی بیان کی گئی، تورات اور انجیل میں بھی اتنے زور سے حضرت مریم کا دفاع موجود نہیں بلکہ اُن کی اپنی مذہبی کتابوں میں تحریف کی وجہ سے دوسرے نبیوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ اہل سلام کے نزدیک وہ بھی گستاخی ہے۔ جبکہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے ساتھ دیگر تمام الہامی مذہبوں کو اپنے ایمان کا حصہ جانتے ہیں۔ اور ہم اپنے نبی کی تعریف بھی خوب بیان کرتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے ایمان کو مزید مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کبھی گستاخی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اُن کے ہاں ایسی سوچ کا خواب میں آ جانا بھی محال ہے۔ انسانی تاریخ مسلمانوں کے ہاتھوں ایسی کوئی گستاخی ثابت نہیں کرسکتی۔ ان کی گواہی ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی شخص نے ایسی گستاخانہ جسارت کی تو پھر وہ زمین کے اوپر نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے چاہے اس کا کوئی بھی مذہب یا عقیدہ تھا۔ گستاخانہ حرکت کے بعد گستاخ قرار پایا اور اپنے انجام کو پہنچا۔

اب یہ کیسے ممکن ہے مسلمانوں کی ایمان کی جان نبی آخرالزمان ﷺ کی ذات پر کوئی شقی القلب حرف اُٹھائے اور ان کی غیرتِ ایمانی کو جوش نہ آئے۔ دراصل تمام مسلمان ایک قوم ہیں۔ امتِ واحدہ ہیں۔ فکری طور پر ایک اُمت ہیں۔ وہ جنوبی ایشیا کے ہوں، مشرقِ وسطیٰ کے، وسطِ ایشیائی ریاستوں کے ہوں، جنوب مشرق اور مشرقِ بعید کے یا چین وروس کے، آسٹریلیا وانٹارکٹیکا کے، یا پھر ساحلِ نیل کی پٹی کے، افریقہ کے ہوں یا یورپ کے، امریکہ کے ہوں یا کینیڈا کے، وہ آپس میں ایک جسم کے مانند ہیں۔ ان کے ایمان کی روح رحمۃ للعلمین کا عشق ہے۔ ان کے دل مکے اور مدینے کے نام سے دھڑکتے ہیں۔ ان میں کوئی معمولی کوتاہی یا عصیاں ہو تو ہو لیکن مدنی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کمی نہیں۔ وہ سراپا محبت قوم ہیں۔ ان کا دین امن کا سب سے بڑا علَم بردار بھی ہے۔ اور اس کا عملی نمونہ بھی صرف مسلمان قوم نے

دکھایا۔آؤ کبھی دیکھو! اُس عظیم فاتح مکہ ﷺ کا فاتحانہ انداز یعنی وہ شفقت سے فرما دینا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء.

اپنی زندگی کے بدترین دشمنوں کو عام معافی کا اعلان!

اور اس پر عمل بھی!

اپنی بیٹی کے قاتل کو بھی معافی!

اے دنیا میں امن کے جھنڈے اٹھانے والو!

لے کر آؤ اپنی تاریخ سے ایسی کوئی مثال!

کھلا چیلنج ہے۔

پہلے کوئی ایک مغربی ملک پاکستان کے اسلامی قوانین خصوصاً قانون توہین رسالت ﷺ پر اعتراض کرتا تھا اور اس کو ختم کرانے کی جسارت کرتا تھا۔ اس کے لیے وہ پاکستان میں موجود اپنے ایجنٹوں اور اپنی تنخواہ دار این جی اوز کے ذریعے ماحول بناتا اور اس کے لیے فضا ہموار کرتا تھا، لیکن اس بار یہ کام اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی سے لیا گیا، جس نے توہین مذہب اور مذہب تبدیل کرنے کے خلاف قوانین ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ مذہبی عقائد یا شخصیات کی توہین روکنے یا پھر کسی مذہب یا عقیدے کو رد کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے بنائے جانے والے قوانین خطرناک ہیں۔ یہ سفارش اقوام متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق میں پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں کی گئی۔ رپورٹ میں اقوام متحدہ کے ایلچی بائزبیلی فیلڈ کا کہنا تھا کہ ایسے قوانین ریاستوں کو آزادی اظہار پر پابندی لگانے اور اقلیتوں کے حقوق سلب کرنے کی طاقت اور موقع دیتے ہیں۔ دنیا میں مذہبی اقلیتوں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سامنا رہا ہے، جن میں آزادی سے اپنے مرضی کے مذہب کے چناؤ کی مخالفت بھی شامل ہے، اس استحصال کے ذمہ دار ریاستی اور غیر ریاستی عناصر رہے ہیں۔

عرب کی ایک مشہور ضرب المثل ہے

"انف فی لاماء واست فی السماء"

''ناک تو پانی میں لگ رہا ہے اور سرین آسمان پر ہے''۔

یہ ضرب المثل اس وقت بولتے ہیں جب کہ بہت ہی حقیر ترین شخص کسی بڑی شخصیت پر غصے اور ناراضگی کا اظہار کرے۔ یقین جانیے! اگر توہین رسالت ﷺ کے مرتکب

اور ان کی پیٹھ ٹھونکنے والے سیاہ باطن گوروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ دماغی سوچ کے اعتبار سے بالکل اسی مقام پر ہوں گے جہاں وہ بھنگی تھا۔

یورپ کے یہ ''بھنگی'' جنہوں نے اپنے کردار سے انسان تو انسان، حیوانوں کو شرما دیا ہے۔ وہ سرور کائنات فخر موجودات، امام الانبیاء ﷺ سے خفا ہیں، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ان کوڑ دماغوں کی گندی ذہنیت کے مطابق زندگی کا نقشہ کیوں نہیں سکھایا۔ وہ اس لیے آقائے دو جہاں ﷺ سے ناراض بیٹھے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت کو منسوخ کیوں قرار دے دیا، انہوں نے اپنی امت کو عریانی اور فحاشی کے بجائے حیاء اور عفت کا درس کیوں دیا۔ انہوں نے اپنے نام لیواؤں کو بے غیرتی کی زندگی گزارنے کی اجازت دینے کے بجائے بدر واحد اور حنین وتبوک جیسی معرکہ آرائیوں کا کیوں حکم دیا، انہوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید ایسا اکسیر نسخہ کیوں دیا جس کی وجہ سے یہ تمام نظریوں اور اِزموں سے محفوظ ہو گئے......غرضیکہ اس طرح کی باتوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ خفا ہیں۔

ستمبر 2013ء میں پاکستان کو سیکولر ملک بنانے اور شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے ہوئے نام نہاد یورپی دانشوروں کا ایجنڈا سامنے آیا۔ برسلز میں کام کرنے والے یورپی ملکوں کے ادارے انٹرنیشنل کرائسس گروپ (آئی سی جی) (International Crisis Group) نے آئین سے اسلامی احکامات پر مبنی شقیں ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ آئی سی جی کی ایشیا رپورٹ نمبر 249 کا مسودہ جاری کیا جس میں پاکستانی پارلیمان کو ''بااختیار'' بنانے کے نام پر نئی آئینی ترامیم کی تجاویز پیش کی گئیں اور حکومت سے کہا کہ پاکستانی پارلیمنٹ پر یہ پابندی ختم کی جائے کہ وہ خلاف اسلام قانون وضع نہیں کرسکتی، اس ضمن میں آئین کا آرٹیکل 227 کالعدم قرار دینے پر زور دیا گیا۔

المیہ یہ ہے کہ پاکستان ایسی اسلامی نظریاتی مملکت میں بیشتر انگریزی اخبارات و رسائل اسلام اور نظریۂ پاکستان کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ آج تک ان کے خلاف حکومت یا کسی ادارہ نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ لوگ مغرب میں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی غیر معمولی پذیرائی دیکھ کر ایسے مضامین لکھتے ہیں اور اس کی آڑ میں بے پناہ مراعات حاصل کرتے ہیں۔ صد حیف کہ ایسے لوگ صحافت کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود نے 1952ء میں اپنی جماعت کو ہدایت کی تھی کہ پولیس، ریلوے،

فنانس، اکاؤنٹس، کسٹمز، انجینئرنگ وغیرہ تمام محکموں میں ہمارے آدمیوں کو جانا چاہیے۔ اس تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے 10 فروری 2006ء کو لندن کی قادیانی عبادت گاہ میں قادیانی جماعت کے پانچویں خلیفہ مرزا مسرور نے دنیا بھر کے قادیانیوں کو ہدایت کی کہ وہ صحافت کا شعبہ اپنائیں۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں انگریزی صحافت میں زیادہ تر قادیانیوں کا غلبہ ہے جو اسلام اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو منہدم کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جب کسی نہ کسی انگریزی اخبار میں قادیانیوں کو تمام سیاسی جماعتوں کی طرف سے متفقہ طور پر پارلیمنٹ سے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے والی منظور شدہ آئینی ترمیم واپس لینے، قانون ناموس رسالت ﷺ اور حدود قوانین ختم کرنے، آئین سے قراردادِ مقاصد کو کالعدم قرار دینے، پاکستان کو ایک سیکولر مملکت بنانے، اس کے نام سے اسلامی جمہوریہ کے الفاظ حذف کرنے، ناچ گانے کو سرکاری سرپرستی دینے، دینی مدارس پر پابندی لگانے، اسرائیل کو تسلیم کرنے، ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو بدنام کرنے، غدار پاکستان ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی کو قومی ہیرو قرار دینے، تعلیمی نصاب سے اسلامیات کا مضمون ختم کرنے، بسنت اور ویلنٹائن ڈے قومی سطح پر منانے، میراتھن ریس کو قومی کھیل قرار دینے، نیوائیر نائٹ کو ثقافت قرار دینے، اپریل فول کو تفریح قرار دینے، سکولوں میں فیشن شو کرنے، گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والے لڑکے لڑکی کو قانونی تحفظ دینے، اسقاطِ حمل کی اجازت دینے، کنڈوم کلچر کو فروغ دینے، ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو "Love Child" کہنے، شریعت اسلامیہ کو ناقابل عمل قرار دلوانے، ہم جنس پرستی کو انسانی حق قرار دینے، طوائفوں کو جنسی ورکر قرار دینے، مشترکہ خاندانی نظام کو سبوتاژ کرنے، شراب اور جوئے سے پابندی ہٹانے، عارضی شادی کی اجازت دینے، بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی ہٹانے، آئین پاکستان سے اسلامی دفعات ختم کرنے، صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ختم کرنے، مردوں کی دوسری شادی پر پابندی لگانے، پاک بھارت کرنسی ایک کرنے، ایٹمی پروگرام ختم کرنے یا پاک فوج کے موٹو جہاد، تنظیم، اتحاد کو تبدیل کرنے کے بارے میں کوئی نہ کوئی سٹوری یا مضمون شائع نہ ہوا ہو۔

آزادی اظہار رائے کے ناجائز استعمال کی مثال ایک نجی ٹی وی چینل پر نشر ہونے والے ڈرامہ سیریل ''میرا سلطان'' سے دی جا سکتی ہے۔ اس ڈرامہ میں خلافت عثمانیہ کے

دسویں حکمران ''سلطان سلیمان اعظم'' کی زندگی کے متعلق حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ سلطان سلیمان نے اپنی وفات تک تقریباً نصف صدی انتہائی شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا دور نہ صرف عثمانی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے۔ سلمان اعظم کا دور عثمانی سلطنت کی توسیع وفتوحات کا دور تھا۔ اس نے اپنے وقت کی بڑی طاقتوں سے صف آرائی کی اور کامیاب رہا۔ جہاں تک سلیمانِ اعظم کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے، اس کی صفات اس کی عظمت اس کی دلیل ہیں۔ اس کی دانشمندی، منصف مزاجی، فیاضی، نرم دلی اور خوش اخلاقی ضرب المثل تھی۔ اس کی خدا داد ذہنی صلاحیتیں، اس کے کردار کی تکمیل تھیں۔ ایڈورڈ کریسی نے سلیمان کے کردار کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے: ''بطور ایک انسان وہ پرجوش اور مخلص تھا اور ہوس پرستی سے باعزت طور پر پاک تھا، جس نے اس کی قوم کے بہت سے لوگوں کو بدنام کر رکھا تھا۔ اس کی شاندار جرأت، فوجی ذہانت، اس کی اعلیٰ مہم جوئی، جوش و ولولہ، اس کی جانب سے علم وفن کی حوصلہ افزائی، فتوحات اور دانشمندی پر مبنی قانون سازی کو یاد رکھنا چاہیے''۔ ایورسلے تحریر کرتا ہے: ''اس کی ذاتی زندگی میں کوئی تعیش نہ تھا''۔ ماہر ترکیات ڈاکٹر عزیر لکھتے ہیں: ''اس کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی۔ وہ اپنے رحم وکرم کے لیے خاص طور پر مشہور تھا۔ انصاف اس کا مخصوص شیوہ تھا اور اس کی عدالت میں نسل، رنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی۔ رعایا کی فلاح و بہبود اس کا مطمحِ نظر تھا''۔ سلطان سلیمانِ اعظم، حکومت کے فرمانروا کی حیثیت سے بھی اور اپنے کردار کے لحاظ سے بھی، آنے والے حکمرانوں کے لیے عمدہ مثال چھوڑ کر گیا۔ بعض غیر مسلم مؤرخین نے اپنی کتب میں لکھا کہ سلطان سلمان کا زیادہ وقت محل کی بجائے گھوڑے کی پیٹھ پر گزرا ہے۔ عیاشی میں وقت گزارنے والے حکمران سلطنت کی حدیں بڑھاتے نہیں گھٹا دیتے ہیں لیکن افسوس! سلطنت عثمانیہ اور ملت اسلامیہ کے اس عظیم ہیرو کی کردار کشی کی گئی۔

ہمارے ہاں بعض سیکولر سیاسی راہنما، ٹی وی اینکر اور کالم نگار بھی گاہے بگاہے نہ صرف خود شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے بلکہ کھلم کھلا گستاخانِ رسول کی حمایت اور تائید بھی کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں کہیں بھی توہین رسالت کا کوئی واقعہ ہو، یہ سیکولر فاشسٹ فوراً امریکہ کے اشارے پر مسلمانوں پر سیاسی اور نفسیاتی دباؤ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں برداشت اور رواداری کا درس دیتے ہیں۔ انہیں آزادئ اظہار کے نئے معنی ومفہوم سمجھاتے ہیں۔ احتجاج

اور مظاہروں کو تشدد پسندی کا نام دیتے ہیں۔ ان کی جسارت دیکھیے کہ یہ بدذات لوگ توہین رسالتؐ کے لیے **Trivia** کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا معنی ہے معمولی معاملات، ادنیٰ چیز، غیر اہم، ہیچ، پوچ، یعنی ان سیکولر حضرات کے نزدیک ناموس رسالت ﷺ ایک غیر اہم اور ادنیٰ چیز ہے جسے مسلمانوں کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ ان ملعونوں نے میڈیا پر اب اسلامی اقدار، تہذیبی روایات اور دینی تعلیمات کے خلاف باقاعدہ جارحانہ یلغار کا آغاز کر دیا ہے۔ اسلام کے خلاف ان کے ذہنوں میں کدورت، تعصب، بغض دعناد اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ دلیل و برہان سے بات کرنے کے بجائے ریٹنگ کے چکر میں وہ اسلام کے خلاف ہمیشہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ یورپی معاشرے کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ان کی رواداری، آزادیٔ اظہار، احترام انسانیت اور ترقی یافتہ مہذب ہونے کے گیت گاتے رہتے ہیں۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آزادیٔ اظہار کا یہ مطلب ہے کہ ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی حضرت محمد ﷺ کی شان میں توہین کر کے زمین پر فساد پھیلایا جائے؟

پاکستان میں قومی اسمبلی سے اگرچہ سائبر کرائم کی روک تھام کے لیے بل منظور کیا جا چکا ہے جس کے مطابق پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) اسلامی اقدار، قومی تشخص، ملکی سیکورٹی اور دفاع کے خلاف مواد بند کرنے کی پابند ہوگی اور اس کے تحت تین ماہ سے 14 سال قید اور پچاس ہزار سے لے کر پانچ کروڑ تک جرمانے کی سزا کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ مذہبی منافرت اور ملکی مفاد کے خلاف کوئی مواد شائع کرنے اور خوف و ہراس پھیلانے والے کو پانچ کروڑ تک جرمانہ اور 14 سال کے لیے سلاخوں کے پیچھے بھیجا جا سکتا ہے۔ اس قانون سازی کے اجرا سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان میں سائبر کرائم میں خاطر خواہ کمی آتی، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے، کیونکہ ہمارے یہاں قوانین بن تو جاتے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ سوشل میڈیا کا سب سے بڑا خطرناک پہلو یہ ہے کہ قانون کی کمزوری کی وجہ سے اسے ملحدین اور اسلام دشمن عناصر کی جانب سے شعائر اسلام، ناموس رسالت ﷺ کی توہین اور مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں تشکیک میں مبتلا کرنے کے لیے بلا روک ٹوک استعمال کیا جا رہا ہے۔ ذرائع کے مطابق ملحدین نے الحاد کی تبلیغ کے لیے مسلم دنیا کے لیے خصوصی انٹرنیٹ گروپس تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اس قسم کی الحادی فکر رکھنے والے گروپس کی تعداد سو سے زائد ہے جن میں اکثر کا تعلق ''فیس بک'' ہے۔

یہ لوگ آزادی اظہار رائے کے نام پر اپنے مقاصد کے لیے کام کررہے ہیں۔ ان کی بلاگنگ کا مقصد شعائر اسلام کا مضحکہ اُڑانا یا کم از کم ان کے بارے میں شکوک پھیلانا ہے۔ انتہائی تشویش ناک بات یہ ہے کہ پاکستان کی نیٹ دنیا میں اکثر اسلام کے مسلمہ اصول وارکان کے خلاف شکوک وشبہات پھیلانے والے لوگوں کے نام بدستور مسلمانوں والے ہیں اور خود اللہ کی شان میں گستاخی، اس کے کلام پر اعتراضات کی بھرمار، رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کا مضحکہ اُڑانا، جنت دوزخ اور دوسرے عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلا کر علوم دین سے ناواقف مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کے لیے کوشاں ہیں۔

''نام نہاد آزادی رائے کا فتنہ'' کے نام سے معروف کالم نگار جناب انصار عباسی لکھتے ہیں: آزادی رائے کا مطلب اگر مادر پدر آزادی ہے تو میں اسے نہیں مانتا اور اسی لیے صحافت میں ہوتے ہوئے بھی اس کی ہمیشہ مخالفت کی۔ اگر آزادی رائے کا مطلب کوئی یہ لیتا ہے کہ کوئی بھی اُٹھ کر گستاخی تک کرنے کا ارتکاب کرسکتا ہے تو میری نظر میں اس سے بڑا کوئی فتنہ ہو نہیں ہوسکتا کیونکہ الفاظ اور قلم کے غلط استعمال کی کاٹ تلوار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور یہ تکلیف اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب آزادی رائے کے اس فتنہ کا نشانہ کوئی خاص مذہب اور اُس کے ماننے والے ہوں۔ اسی آزادی رائے کے فتنہ کو استعمال کرتے ہوئے مغربی میڈیا نے اسلام مخالف فلمیں بنائیں اور گستاخانہ مواد بارہا شائع کیا جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کی۔ اسی نام نہاد آزادی رائے کے فتنہ کے نتیجے میں دنیا میں کئی جگہ انتشار اور فساد پھیلا لیکن مغرب ہے کہ آزادی رائے کے اس فتنہ پر بند باندھنے کے لیے تیار نہیں اور اس کی وجہ اسلامی دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان سمیت دوسرے اسلامی ممالک اس مسئلہ کو اقوام متحدہ سمیت دنیا بھر کے مختلف فارمز پر اُٹھاتے تاکہ ایک ایسے فتنہ کو ختم کیا جاسکے جو نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بنتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے نفرتیں بڑھتی ہیں، احتجاج ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں اب تک بڑی تعداد میں انسانی جانوں کا بھی ضیاع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان ممالک کے میڈیا، دانشوروں، سول سوسائٹی وغیرہ پر بھی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام مخالف اس فتنہ کو نہ صرف رد کریں بلکہ مغرب کو بھی باور کرائیں کہ اس سے انسانیت کی کسی قسم کی کوئی خدمت نہیں ہو رہی بلکہ اس کی وجہ سے معاشرہ میں نفرتیں پیدا ہوتی ہیں اور انسان دشمنی کے

رجحانات بڑھتے ہیں۔اس فتنہ کے خاتمہ کے سلسلے میں اسلام کی تعلیمات بہترین حل پیش کرتی ہیں اور وہ یہ کہ کسی کے مذہب کو برا مت کہو اور مذاق مت اُڑاؤ۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے مغرب کے نام نہاد آزادی رائے کے فتنہ کو پاکستان میں بھی رواج دینے کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس سلسلے میں ہمارا اپنا میڈیا، اہل دانش، سول سوسائٹی اور سیاست میں موجود ایک طبقہ اس مہم جوئی میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ایسا کرنا نہ صرف ہمارے آئین وقانون کے خلاف ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے بھی منافی ہے''۔

(روزنامہ جنگ لاہور، 16 جنوری 2016ء)

ناموس رسالت ﷺ کے حوالے سے سیکولر حضرات نے اصل حقائق کو نظر انداز کر کے تشریح وتفسیر میں تاویلات وتلبیسات کا سہارا لے کر بلاشبہ ایک خطرناک غلطی کا ارتکاب کیا ہے، جو عنداللہ عتاب وعذاب کا باعث بن سکتا ہے۔

بقول شخصے: ''ہمارے ملک کے دانشور اور لبرل طبقہ، اسلام کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح یورپ کے لبرل فاشسٹ، عیسائی مذہب کو دیکھتے تھے۔ان لوگوں نے ترقی کی راہ میں مذہب کو رکاوٹ قرار دیا، جب اہل یورپ نے مذہب کی جکڑ بندیوں سے نجات حاصل کی تو مادی اعتبار سے یورپ نے یقیناً ترقی کی، ہمارے لبرل مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کو ملکی معاملات سے بے دخل کر دو۔ مذہب کو نجی اور ذاتی معاملہ قرار دو، تب جا کر کامیابی ممکن ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے، کیونکہ لبرل مسلمان مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ان کے پاس دلیل عیسائی مذہب ہے جو ریاستی معاملات میں مکمل طور پر ناکام ہوا۔جبکہ اسلام کے بارے میں ان کا مطالعہ نہیں ہے یا پھر مغرب کی اندھی تقلید ہے۔عیسائیت اس لیے ناکام ہوئی کہ پادری منصب داروں نے خود ساختہ نظریات کو وحی الٰہی قرار دیا۔ پھر اس کو لوگوں پر مسلط کیا۔غیر خدائی نظام کا ناکام ہونا ظاہر ہے لیکن اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔اسلام ایک نجی اور ذاتی معاملہ نہیں، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ صرف عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہیں ہے۔اسلام میں ہر شعبے کے اصول مقرر ہیں۔ سیاست، معیشت اور معاشرت وغیرہ ہر شعبے کے لیے روشن اصول مقرر ہیں''۔

محمد فاروق ناطق اپنے مضمون ''لبرل ازم: دہریت سے سفاکیت تک'' میں لکھتے ہیں: ''لبرل ازم'' کو ہر اس خیال، نظریے، عقیدے اور عمل سے دشمنی ہے جو نفس انسانی

کی بے لگام آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔ لفظ 'لبرل' انگریزی کے لفظ 'لبرٹی' (Liberty: یعنی مطلق آزادی وخودمختاری) اور لاطینی لفظ 'لائبر' (آزاد وخودمختار) سے ماخوذ ہے۔ اب یہ لفظ ایک مستقل اصطلاح کی حیثیت سے خدا اورنفس مذہب سے مطلق آزادی کی علامت بن چکا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں لبرل ازم کے سرخیل، ملحد اور دہریے (atheist یا agnostic) ہیں۔ لبرل ازم اصل میں الحاد اور دہریت کا مقصد ہے بلکہ اب تو خود ایک دین ہے اور ایک لبرل شخص ممکنہ طور پر (Potentially) ایک ملحد اور 'دہریہ' ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خدا اور مذہب سے آزادی اور مذہب میں قطع و برید کی خواہش پہلے عملی اور بالآخر نظری طور پر خدا کے انکار ہی پر منتج ہوتی ہے۔ کوئی سرکاری مذہب نہ رکھنے والے ممالک میں دہریہ کہلانے والے افراد کی تعداد میں پچھلے چند برسوں میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکا میں ان کی تعداد 5 فیصد ہے۔ گیلپ انٹرنیشنل کے سروے کے مطابق دنیا کے 65 ممالک کے 11 فیصد افراد نے دہریت کو اختیار کیا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ لبرل لوگ جس مذہب سے متعلق ہوتے ہیں، سب سے پہلے اسی کی بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔ اس کے شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس دین کے علم برداروں کی تضحیک اور کئی صورتوں میں ریاستی طاقت اور وسائل کے بل پر ان کے قتل تک کے درپے ہوتے ہیں۔

جب ایک لبرل یا دہریہ فرد یہ کہتا ہے کہ: ''مذہب انسان کی آزادی کو ختم یا محدود کر دیتا ہے''، تو دراصل وہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ 'خدا' انسانوں کا خود سے گھڑا ہوا ایک خیالی وجود ہے اور اس خیالی وجود نے انسانوں کی آزادی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اس قید یا یرغمالی کیفیت سے خود کو اور دوسرے انسانوں کو نکالنے کے لیے یہ لبرل خواتین و حضرات کوشش کر رہے ہیں۔

اب آپ لبرل کہلانے والے ملکوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پچھلے تقریباً 200 برس سے دنیا کو ایک جنگل بنا رکھا ہے۔ اپنے قومی اور گروہی مفادات کے حصول کے لیے یورپ کے ممالک اور امریکہ نے نہایت سفاکی سے جتنی بڑی تعداد میں انسانوں کو قتل کیا ہے، وہ پوری انسانی تاریخ میں قتل ہونے والے انسانوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ یورپی اقوام نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے وسائل پر قبضے کے لیے کیے گئے حملوں کے دوران بلامبالغہ کروڑوں لوگوں کو قتل کیا۔ فرانس نے 1830-1847ء کے

دوران انسانوں سمیت ہراس چیز کو الجزائر میں تباہ کر دیا جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ لاکھوں خواتین کی آبروریزی کی گئی اور لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا گیا۔ امریکیوں نے (جو اصلاً یورپ سے نقل مکانی کر کے گئے ہوئے لوگ ہیں) براعظم امریکہ کے اصل باشندوں ریڈ انڈین کے قتل عام سے آغاز کیا اور لاکھوں مقامی لوگوں کا نام ونشان مٹا دیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں طاقت کے بے دریغ استعمال سے ثابت ہوا کہ لبرل لوگ اپنے تحفظ کے لیے اقدام کرتے وقت کسی بھی خونخوار حیوان ہی کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ 1945ء میں امریکی ایٹمی حملوں کے نتیجے میں جاپان کے دوشہروں ہیروشیما اور ناگا ساکی میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگ مارے گئے، لاکھوں زخمی اور تابکاری اثرات سے بیمار ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم (1914-1918ء) کے دوران پونے دو کروڑ اور دوسری جنگ عظیم (1939-1945ء) کی آگ میں انہی لبرل قوموں نے 6 تا 8 کروڑ لوگ ہلاک کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کے قوانین موجود ہونے کے باوجود امریکہ نے ویت نام پر حملہ کیا اور 20 سالہ جنگ (یکم نومبر 1955ء تا 30 اپریل 1975ء) میں 20 لاکھ سے زیادہ انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ سابق سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے نتیجے میں 15 لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ عراق اور امریکی حملے کے نتیجے میں اب تک 5 لاکھ اور شام کی جنگ میں تقریباً 2 لاکھ سے زیادہ انسان مارے جا چکے ہیں...... کیا گزشتہ 200 برس کی تاریخ سے یہ سبق حاصل نہیں ہوتا کہ جب انسان خدا فراموش ہو جائے اور مذہب کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو اس کا رویہ ایک وحشی حیوان کا سا ہو جاتا ہے؟

مقام حیرت ہے کہ پچھلے 200 برس میں اتنا ظلم ڈھانے کے بعد بھی یہ لوگ انسانیت کے قائد کہلانے کے دعوے دار ہیں، اور دنیا کو ایک نئی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں، اور اپنے مخالفین کو 'بنیاد پرست'، 'انتہا پسند' اور 'دہشت گرد' کے القاب سے نوازتے ہیں!

لبرل ازم کے علم بردار عموماً مذہبی شعائر اور بالخصوص رسول کریم ﷺ کی توہین کے لیے اپنی وضع کردہ 'آزادی رائے' کو آڑ بناتے ہیں۔ دوسری طرف لبرل حکومتیں توہین عدالت پر تو سزا دیتی ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کی توہین پر خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ کیا یہ دہرا معیار نہیں؟ کیا یہ مبنی بر انصاف ہے؟'' (ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور جولائی 2016ء)

اسلام بیزار بے دین سیکولر حضرات اسلامی تعلیمات کی تضحیک کا کوئی موقع ہاتھ سے

جانے نہیں دیتے۔ اپریل 2013ء میں غیر ملکی فنڈز سے چلنے والے ادارے جناح انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں شرکاء نے آئین سے قرارداد مقاصد ختم کرنے، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور شراب پر پابندی کے فیصلے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ شراب پر پابندی بلا جواز ہے۔ اس اعلیٰ سطحی تقریب کے شرکا کی اکثریت غیر مسلموں خصوصاً قادیانیوں پر مشتمل تھی اور اس میں نظریہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا بری طرح مذاق اڑایا گیا۔ اس تقریب میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں انتہائی گھٹیا شراب فروخت کی جارہی ہے، شراب پر سے پابندی ختم کر کے معیاری شراب عام فروخت کی جائے۔ اس تقریب میں راجہ داہر کی تعریفوں کے پل باندھے گئے۔ حالانکہ راجہ داہر...... وہ بدفطرت آدمی تھی جس نے اپنی بہن سے ''شادی'' کی تھی مگر یہی راجہ داہر سیکولرز اور لبرلز کا ہیرو ہے۔ محترم عبداللہ طارق سہیل کے الفاظ میں تکلیف اس بات کی ہے کہ اگر قرار دادِ مقاصد کے مطابق اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تمام اسلامی احکامات صحیح معنوں میں نافذ ہو گئے تو پھر ان کے یہ جام و مینا کے بے ہودہ شغل کیسے چلیں گے۔

''لبرل ازم کے خواب'' کے عنوان سے جناب منیر احمد خلیلی لکھتے ہیں:

''لبرل ازم کا تصور فرد کی آزادی سے چلا تھا لیکن آگے چل کر اس کے ڈانڈے سیکولرازم کے فلسفے کے ساتھ مل گئے۔ یہی نہیں بلکہ انسانی حقوق کے گرد گھومتا اور نسلی، صنفی اور طبقاتی یکسانیت و مساوات سے ہوتا ہوا یہ تصور سیاست و ریاست کے امور کو مذہب کے اثر سے محفوظ رکھنے پر جا ٹھہرا۔ ہمارے ملک میں بھی لبرل، سیکولر اور لبرل اسلامسٹ گروہ ریاست پاکستان کو اسی تصور کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ملکی امور کو اسی مغربی پیمانے سے ناپنے اور اسی کے سانچے میں ڈھالنے پر مصر ہیں۔ لبرل ازم سے ان کی مراد یہ ہے کہ ریاست جمہوریہ ہوسکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریہ نہیں ہوسکتی۔ ریاست کو نسلی، صنفی اور طبقاتی امتیازات ہی سے پاک نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں اسلام کو بحیثیت مذہب تفوق کا حق ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک ڈونلڈ ٹرمپ اور اس سے قبل کئی امریکی صدور کا بائبل کے نسخے پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانا قابل اعتراض نہیں، لیکن اگر کہیں کوئی پاکستانی صدر یا وزیر اعظم یا سپریم و ہائی کورٹ کا چیف جسٹس یا افواج پاکستان کے سربراہ ہاتھ میں قرآن لے کر اپنے منصب کا حلف اٹھا لیں تو اس کو یہ ریاست میں مذہب کی مداخلت سمجھتے ہیں۔ ٹرمپ صدارت کا حلف اٹھانے

سے قبل اگر چرچ گیا تو یہ حرج کی بات نہیں لیکن مملکت پاکستان کے جن عہدوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے کوئی منصبی حلف سے پہلے مسجد میں جا کر دو نفل پڑھ لے تو یہ اس کی پرلے درجے کی بنیاد پرستی تصور ہو گی۔ ان لوگوں کو قرار داد مقاصد کے متن سے بھی سخت خلجان محسوس ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لبرل ازم کو ریاست کے قوانین کی پابندی گوارا ہے لیکن اسے مذہب کی پابندی منظور نہیں ہے۔

ہم برطانیہ اور امریکہ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ رومن کیتھولک عقیدے سے جدائی کے باوجود اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ملک کبھی غیر مذہبی ملک نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے رومن کیتھولک عقیدے سے علیحدگی اختیار کی لیکن مذہب سے رشتہ نہیں توڑا۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ ریاست و معاشرت اور معیشت و تمدن میں مذہب کو دخل دینے سے روک دیا۔ امریکہ کے موجودہ اور تمام سابق صدور کے عقائد کو دیکھیں تو عیسائیت کے دوسرے فرقوں کے ماننے والے تو ملتے ہیں لیکن رومن کیتھولک عقیدہ رکھنے والا صرف ایک جان ایف کینیڈی منتخب ہو سکا تھا۔ یہ حقیقت میں یہودیت کا رومن کیتھولک عقیدے سے ایک انتقام تھا کہ اسے تو عیسائی دنیا میں عضو معطل بنا دیا گیا لیکن ان ملکوں کی ہمہ جہتی پالیسیاں **Zionized Christianity** کے تابع کر دی گئیں۔ اس سے مراد صیہونی عیسائیت ہے۔ اب بھلے ڈونلڈ ٹرمپ بائبل کی تلاوت اور چرچ کی زیارت کرتے رہیں، وہ ملکی اور عالمی سطح پر جو پالیسیاں بنائیں گے، وہ اسی صیہونی عیسائیت کے تقاضوں کے مطابق ہوں گی۔ عیسائیت کے 'تطہیر پسند' **(Puritans)** تصور اور صیہونی عیسائیت میں گہری قربتیں ہیں۔

سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے تمام جدید نظریات کی آبیاری بھی صیہونیوں نے کی تھی اور اس فصل کا بڑا حاصل یہودیوں ہی کے آنگن میں پڑا تھا۔ لبرل ازم کا پودا انہی کے گملے میں اُگا تھا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ مغرب کی عیسائی دنیا کو لبرل ازم کے پیچھے لگا تو دیا مگر یہودی خود لبرل نہیں بنے۔ وہ آج بھی اپنی مذہبی روایات اور تلمودی تعلیمات کے بڑی حد تک پابند ہیں۔ معروف مگر سستی سی مثال کے مطابق یہودیوں نے دنیا کو ٹرک کی اس بتی کے پیچھے لگا دیا جس پر بڑے بڑے دلکش انداز میں 'لبرل ازم' لکھا ہوا ہے، لیکن وہ خود اس ٹرک میں سوار نہیں ہوئے۔

ہمارے ہاں لبرل ازم کے کچھ شیدائی اس کی تائید اپنے مذہبی مصادر سے نکالنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سیکولر ہوں یا لبرل اسلامسٹ، تاریخ کے ان ابواب سے یا تو قطعی طور پر ناواقف ہیں یا پھر ان فلسفوں کا جادو اُن کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ لبرل اسلامسٹ دانشور یا تو کمال کی سادگی سے یا پھر زبردست ہوشیاری کے ساتھ لبرل ازم اور اسلام میں مشترک قدریں اور یکساں روایات ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے ہیں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ جس شجر کا نام لبرل ازم ہے اور جس کے ساتھ ''مادر پدر آزادی' کا پھل لگتا ہے، اس کی سرزمین اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام آزادی عمل و اظہار کو پروان چڑھنے سے نہیں روکتا لیکن یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کی جڑیں اسلام کے بنیادی اصولوں کی زمین میں پیوست رہیں۔ اسلام میں ایسی حریت افکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی:

چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد''

(پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی 16 فروری 2017ء)

آزادی اظہار رائے، رواداری اور عدم برداشت کا درس دینے والے میڈیا کے مخصوص لبرل فاشسٹوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ آئے دن مختلف ٹی وی چینلز پر اپنے مخالفین کے لیے منحوس، بے غیرت، مکار، جھوٹے، ناسور، فتنہ، ڈھیٹ، احسان فراموش ایسے غیر پارلیمانی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بدتمیزی اور گالی گلوچ ان کا شعار ہے۔ اور اگر کوئی ادارہ یا عدالت ایسی واہیات گفتگو روک دینے کا حکم دے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ ہماری آزادی اظہار رائے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ پوچھا جانا چاہیے کہ گالی گلوچ کرنا یا بے ہودہ گفتگو کرنا کون سا اظہار رائے ہے؟ بدکلامی اور لعنت ملامت نہ کرنے سے کون سے حقوق غصب ہوتے ہیں؟ دراصل یہی لبرل فاشزم ہے جس کا شکار یہ لوگ ہیں۔

جناب وقاص سعد صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''لبرل فاشزم (Liberal Fascism) کی اصطلاح تو سائنس فکشن کے بانی ایچ جی ویلز (H.G. Wells) نے 1932ء میں متعارف کروائی، لیکن لبرل فاشزم کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے والا 43 سالہ امریکی مصنف جان گولڈ برگ (Jonah Goldberg) ہے۔ امریکی جریدے نیشنل ریویو آن لائن کا ایڈیٹر گولڈ برگ قدامت پسند یہودی ہے۔ اس کی کتاب ''لبرل فاشزم'' 8 جنوری 2008ء کو منظر عام پر آئی جس کے بعد

سے اب تک اس کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں کیا جا رہا ہے۔ ''نیو یارک ٹائمز'' کے مطابق 2008ء میں امریکہ میں یہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب تھی، مصنف نے امریکہ اور یورپ کی حکمران اشرافیہ جو خود کو انسانی حقوق کا علم بردار اور تہذیب یافتہ کہتی ہے، کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر اُن کے باطن کو دنیا کے سامنے عیاں کر دیا ہے۔

ان لبرل دانشوروں کا عجیب فلسفہ ہے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر جوڑے کی شادی ہو جائے تو پیدا ہونے والا بچہ حرام، اس پر تنقید و تشنیع کے تیر برسائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی تو وہ میچور ہی نہیں ہوئے۔ اور اگر بغیر نکاح کم عمری میں کوئی ماں باپ بن جائے تو وہ عالمی ریکارڈ ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولویوں کی پیدا کردہ اس گھٹن اور حبس زدہ فضا میں اگر کسی ایسے جوڑے نے ''تفریح'' کر لی تو ملاں اس سے یہ تفریح بھی چھیننا چاہتا ہے۔ مزید ہذیان بکا جاتا ہے کہ مولویوں کے 8، 8 بچے ہیں، اگر ان ''معصوموں'' کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو ہی گیا تو کیا حرج ہے۔ یہ ہے وہ آزادی جس کے لیے ہمارا لبرل دانشور ہلکان ہو رہا ہے۔

لنڈے کے انگریز جس مغربی معاشرے کو آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ اس کا اصل چہرہ بھی دیکھ لیں۔ فحش انڈسٹری کی آمدنی،= ہر سال 70 ارب ڈالر جو کہ 15 ارب ڈالر امریکہ سے کمائے جاتے ہیں، اور سالانہ 20 ارب ڈالر فحش فلموں کی فروخت سے حاصل ہوتے ہیں۔ 8 ارب ڈالر فحش رسالے اور میگزین بیچ کر حاصل کیے جاتے ہیں، انٹرنیٹ پر فحش سائٹس سے 3 ارب ڈالر کمائے جاتے ہیں۔ 13 سال سے کم عمر بچیوں کی تصاویر اور فلموں سے 3 ارب ڈالر امریکہ کی آمدنی کا حصہ ہے۔ اس وقت تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ فحش سائٹس اور دوسرے پیجز وغیرہ کی تعداد 3 کروڑ 75 لاکھ ہے۔ امریکہ کی 13 سال سے کم عمر لڑکیوں کی تعداد 4 لاکھ سے زائد ہے جو اس مکروہ دھندے میں ہیں۔ امریکہ میں ہر سال 10 لاکھ کے قریب بچے شادی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے اکثریت کو سماجی اداروں کو دے دیا جاتا ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ ہے وہ آزادی جس کی حفاظت امریکہ کر رہا ہے اور جس کے نفاذ کے لیے وہ ہمارے ہاں کوشاں ہے؟'' (ماہنامہ الحرمین کراچی، اپریل 2015ء)

بقول انصار عباسی ''اگر آپ اسلام کو بُرا بھلا کہیں اور اسلامی شعائر کا مذاق اڑائیں۔ اگر آپ پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اگر آپ اس ملک کی نظریاتی اساس کو رد کر کے پاکستان ہندوستان بھائی بھائی کا نعرہ لگائیں اور اگر آپ پاکستان کی فوج کو گالیاں دیں اور ایک نئے ٹرینڈ کے مطابق پاکستان کی آزاد عدلیہ کو بھی لتاڑیں تو دنیا بھر میں آپ کی واہ واہ ہوگی۔ بہتر سے بہترین انٹرنیشنل ایوارڈز سے آپ کو نوازا جائے گا اور پاکستان میں رہنے والا ایک مخصوص لبرل اور سیکولر طبقہ آپ کو ہیرو کی طرح دنیا بھر کے سامنے پیش کرے گا۔ کوئی اگر ان کی اسلام دشمنی، پاکستان دشمنی یا فوج اور عدلیہ کے متعلق ہرزہ سرائی پر بات کرے تو ایک دم پھدک کر چیخنے لگتے ہیں کہ اعتراض کرنے والوں نے ان کی جان کو خطرے میں ڈال دیا۔ خود تو پاکستان کو توڑنے تک کی عالمی کوششوں کا حصہ بن جائیں گے مگر ان کی اس ضمیر فروشی پر کوئی بات کرے تو کہتے ہیں ظلم ہو گیا۔ اسلام کو بدنام کریں گے مگر جب کوئی اسلام کا حوالہ دے کر ان کو غلط ثابت کرے تو کہتے ہیں کہ اسلام پر بات نہ کریں۔ اپنی نام نہاد روشن خیالی اور مغرب کی بے حیائی کو ترقی تصور کرنے والے اسلام کو ریاستی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی امور سے الگ تھلگ رکھنے کا ہمیں سبق پڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ سیاست میں اسلام کو مت لائیں۔''

امریکی ڈالروں اور ویزوں سے ''فیض یاب'' ہونے والے یہ سیکولر، دہریے، بے دین اور مذہب بیزار آئے روز اپنے کالموں اور پروگراموں کے ذریعے معاشرے میں فکری انتشار، علمی کثافت اور ذہنی ژولیدگی پھیلاتے رہتے ہیں۔ اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے خلاف ان کے زہریلے تجزیے ان کے باؤلے پن اور گندی ذہنیت کا بین ثبوت ہیں۔ وہ پاکستان کے ساتھ لفظ ''اسلامی جمہوریہ'' سے شدید چڑ کھاتے ہیں۔ بے غیرت بریگیڈ کا یہ ہراول دستہ ہر متفقہ اور اجماعی مسئلہ میں شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ انجمن غلامانِ امریکہ کے ان عہدیداروں کا کہنا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اللہ اکبر کا نعرہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ (نعوذ باللہ)!

''روزنامہ اسلام کراچی'' اپنے اداریہ ''اقلیتوں کا تحفظ ناگزیر، مگر ....!'' میں لکھتا ہے: ''درحقیقت حالیہ امریکی اقدام وطن عزیز میں تحفظ ختم ناموس رسالت ایکٹ کی تنسیخ یا ترمیم اور قادیانی مذہب کے پیروکاروں جنہیں آئین پاکستان متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے چکا ہے، کو پھر سے مسلم برادری کا حصہ باور کرانے کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قادیانیت فرنگی استعمار کا خود کاشتہ پودا ہے، جس کا اسلام اور مسلمانوں سے دور کا

بھی واسطہ نہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے غیر منقسم برصغیر میں برطانوی سامراج کی اطاعت گزاری، وفا شعاری اور مسلمانوں کو اس سے وابستہ رکھنے میں نہایت گھناؤنا کردار ادا کیا، جبکہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک قادیانیوں نے ہر موقع پر پاکستان دشمنی کا ثبوت پیش کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ دستورِ مملکت میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے باوجود ان کے اقلیتی حقوق کے تحفظ کی ضمانت موجود ہے، لیکن قادیانیوں نے اسلامی شعار و علامات کو اپنے من گھڑت مذہب کی ترویج و تبلیغ کے لیے استعمال کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو باقاعدہ 1984ء میں امتناع قادیانیت آرڈیننس منظور کیا گیا۔ جس کے بعد سے قادیانی لابی دنیا بھر میں اپنی مظلومیت اور پاکستان میں اپنے استحصال کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔ طاغوتی قوتوں کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستانی عوام کی غالب اکثریت عقیدہ ختم نبوت پر ایمان و یقین رکھتی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ مملکت خداداد کا نظریاتی و اسلامی پہلو عالمی طاقتوں کی نگاہ میں کانٹا بن کر چبھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو سیکولر ریاست قرار دلوانے کے لیے ہمہ جہت سازشوں کے جال پھیلائے جا رہے ہیں۔ یہ حساس صورت حال ملک کے سنجیدہ و فہمیدہ طبقات کے لیے گہرے غور و خوض کی متقاضی ہے''۔ (روزنامہ اسلام کراچی 17 اکتوبر 2015ء)

فاشسٹ لبرل وہ ہے جو معاشرے میں بے ہودگی پھیلائے، اسلامی اصولوں پر ناراضی کا اظہار کرے۔ جس کے نزدیک دلیل مفروضہ ہو، وہ جو مغرب کی ہر بات کو بلاوجہ سر آنکھوں پر رکھے، طنز اور مذاق کی آڑ میں انسانی جذبات کو مجروح کرے اور بعد میں معصوم ہونے کا رنڈی رونا روئے۔ آئے دن یہ لبرل محمد بن قاسم کے خلاف زہر اگلتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت سے باخبر کٹھ پتلیوں کو اتنا دور جانے کی ضرورت نہیں، محمد بن قاسم پر تنقید کی پشت پناہی ان کے آقا انگریز سامراج ہی کر رہے ہیں کیونکہ جو کرتوت وہ انڈیا میں کر کے گئے ہیں ان کی کوشش ہے کہ اس پر پردہ پڑا رہے۔ اقتصادی مورخین کے مطابق انڈیا میں انگریزوں کے آنے سے پہلے دنیا کی اکانومی (جی ڈی پی) میں انڈیا 32 فیصد حصص رکھتا تھا جبکہ اس وقت پورے یورپ کے ممالک کی شرح حصص 23 فیصد تھی اور جب برطانیہ انڈیا چھوڑ کر گیا تو انڈیا کی شراکت صرف 3 فیصد رہ گئی تھی، انڈیا کے پہلے وزیر اعظم نہرو نے اس وقت ایک سروے کروایا تو پتا چلا کہ 50 فیصد غربت برطانوی کنٹرول کے تحت علاقوں میں بلند شرح پر تھی۔ یاد

رہے برطانیہ نے ساٹھ فیصد انڈیا پر براہ راست حکومت کی اور چالیس فیصد بالواسطہ طور پر ان شہزادوں اور مہاراجوں کے ذریعے جو برطانوی پالیسیوں کی پیروی کرتے تھے۔

William Digby برطانوی تاریخ دان کہتے ہیں کہ انڈیا سے لوٹی ہوئی دولت جس کو Venture Capital کہتے ہیں، اس کے بغیر (Industrial Revolution) صنعتی انقلاب ہو ہی نہیں سکتا تھا، مورخین کے اندازے کے مطابق 200 سالہ برطانوی حکومت نے ایک کھرب ڈالر کی رقم انڈیا سے لوٹ کر لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جو سونا، ہیرے اور خام مال برطانیہ منتقل کیا گیا تھا، اس کا حساب لگانا ممکن نہیں۔ 1769ء سے لے کر 1944ء تک انڈیا کے ہر دوسرے علاقے میں 5،4 سال کے وقفے میں قحط پڑتا تھا۔ اس قحط کی وجہ سے 85 ملین افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہماری لوٹی ہوئی دولت سے آج انگریز ترقی یافتہ اور ہم ترقی پذیر۔ برصغیر میں غربت کی بنیاد رکھنے والے یہ انگریز ہی تھے، جس کا خمیازہ انڈیا اور پاکستان کے عوام آج بھی بھگت رہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری سول سوسائٹی، این جی اوز اور دیگر فارن ایڈ فنڈڈ ادارے جو حقوق انسانی، آزادی اظہار اور رواداری کے فروغ کے لیے جلسے اور جلوس نکالتی ہیں، کسی غیر مسلم کی نکسیر بھی پھوٹ جائے تو یہ تنظیمیں ہاہاکار مچا دیتی ہیں۔ لیکن ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی دل آزاری اور توہین رسالت ﷺ کے واقعات پر انہیں سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے؟ ان واقعات سے مکمل چشم پوشی اور سکوت کس ایجنڈے کی نشاندہی کرتا ہے؟ سیکولر میڈیا کی خاموشی کس سازش کی چغلی کھا رہی ہے؟ ظاہر ہے، یہودیوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے مال بٹورنے والے اپنے سرپرستوں اور آقاؤں کے خلاف یہ کیسے بول سکتے ہیں؟ مغرب کے ان پرستاروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''سورج'' ہمیشہ ''مغرب'' میں غروب ہوتا ہے۔

درس دیتا ہے، ہم کو ہر شام کا سورج
مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

فاشسٹ سیکولر وہ طبقہ ہے جو مسلمانوں کی صفوں میں ہوتے ہوئے ان کے خلاف اپنی توانائیاں صرف کرنے کو سرمایہ افتخار سمجھے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کو صبر، تحمل، رواداری اور برداشت کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مجال ہے کہ انہوں نے کبھی گستاخانِ رسولؐ یا ان کے سرپرستوں کے خلاف کبھی کوئی جملہ کہا ہو۔ ہمارے ہاں گستاخ رسول کے سر کی جب قیمت لگائی

جاتی ہے تو اس پر وہ ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں۔ اسے عدم برداشت کا نام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن جب امریکہ ہمارے ہاں مذہبی راہنماؤں کے سر کی قیمت مقرر کرتا ہے تو سب کے لبوں پر مہر سکوت ثبت ہو جاتی ہے۔ (کاش! انہیں تب کوئی کہے: ''بول'' کہ لب آزاد ہیں تیرے)!

ہمارے ہاں جو سیکولر دانشور، ٹی وی اینکر اور کالم نگار آزادیٔ اظہار کی آڑ میں توہین رسالتؐ کا ارتکاب کرنے والوں کے ردعمل میں مسلمانوں کو برداشت، تحمل، وسعت نظری، آزادی اظہار اور رواداری کا درس دیتے ہیں، ان سے پوچھنا چاہیے کہ روزمرہ زندگی میں خود ان کا اپنا طرز عمل کیا ہے؟ وہ اکثر اوقات اپنے نقطہ نظر سے اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں پر اس قدر برہم ہو جاتے ہیں کہ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ پوچھنا چاہیے کہ اگر ان کے نزدیک آزادی اظہار کی اتنی اہمیت ہے تو وہ مسلمانوں کو اپنے موقف کے اظہار کی آزادی دینے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ یہ لوگ مدرسے کے خلاف، پردے کے خلاف، داڑھی کے خلاف، شریعت کے خلاف...... یہ روشن خیال ہیں یا تنگ نظر؟ یہ امریکی گماشتے اور سامراج کے زلہ ربا مسلمانوں کو یہ درس دیتے نہیں تھکتے کہ ہمیں یورپ کے ''مذہب'' آزادی اظہار کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ پاکستان میں آزادی اظہار پر پابندی ہے، اس لیے یہ ترقی نہیں کر سکا۔ آزادی اظہار کے ان نام نہاد علمبرداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود یورپ میں بھی آزادی اظہار بے لگام اور مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب ان کے اپنے مفادات پر زد پڑتی ہے تو قانون حرکت میں آ جاتا ہے اور جب اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل مقصود ہو تو قانون پھر خواب خرگوش کی نیند سو جاتا ہے۔ المیہ یہ نہیں کہ ہم اچھے سائنس دان پیدا نہیں کر سکے بلکہ المیہ تو یہ ہے کہ پرلے درجے کے گھامڑ لوگ ہمارے دانشور، ادیب، شاعر، مفکر، تجزیہ نگار اور اینکر کہلانے لگے۔

برطانوی دستور کی رو سے ملکہ برطانیہ (یا شاہ برطانیہ) کا نہ صرف عیسائی ہونا بلکہ اینگلیکن چرچ سے وابستہ پروٹسٹنٹ ہونا ضروری ہے؟ اس کے برعکس اگر پاکستان کے دستور میں صرف یہ قرار دیا جائے کہ صدر کا مسلمان ہونا ضروری ہے تو اس پر ہمارے سیکولر حضرات آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جنھیں دستور پاکستان میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے پر اعتراض ہے انھیں برطانوی دستور میں اینگلیکن چرچ سے وابستگی رکھنے والے پروٹسٹنٹ عیسائی کی بات پر کبھی اعتراض نہیں رہا۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں سیکولر انتہا پسندوں کے قلم اسلامی تعلیمات کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور وہ ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں بیٹھ کر خاک اڑاتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ اعتدال پسند کہلواتے ہیں۔لیکن اگر کوئی اسلام پسند دلیل اور منطق کی بنیاد پر ان کی کسی رائے سے اختلاف کر دے تو فوراً اس پر انتہا پسندی کا الزام لگا کر اسے قابل گردن زنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین کو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے ناآشنا قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن حیف! خود انہیں آداب طہارت تک معلوم نہیں۔ وہ اس پر بھی شرمندہ رہتے ہیں کہ ان کے ماں باپ نے ان کی مرضی کے بغیر ان کے ''ختنے'' کیوں کروائے؟

یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ سرزمین پاکستان اسلام بیزار اور پاکستان دشمن این جی اوز کے لیے شروع ہی سے زرخیز اور ثمر ریز ثابت ہوئی ہے۔مقتدر طبقات کی اغراض پرستیوں اور نااہلیوں نے انہیں ہمیشہ ''فری ہینڈ'' فراہم کیا کہ وہ اس ملک کی سلامتی و استحکام کا دامن جس طرح چاہیں، چاک کریں۔ یہاں انہیں خصوصی اجازت رہی ہے کہ وہ جب اور جس طرح چاہیں، اپنے غیرملکی آقاؤں کے عزائم کی تکمیل کریں۔لطف کی بات یہ ہے کہ ہر حکومت نے خواہ وہ سیکولر ہو یا اس نے اپنے چہرے پر اسلام دوستی کا ماسک چڑھا رکھا ہو، ان اسلام دشمنوں اور وطن فروشوں کے خلاف کارروائی کرنے کے بجائے ہمیشہ ان کی سرپرستی کی، ان کے ناپاک مقاصد و عزائم کی آبیاری کی، انہیں معززین قوم قرار دے کر ''وی آئی پی'' کی حیثیت سے نوازا۔جبکہ دوسری طرف ان کے خلاف آواز بلند کرنے والے محبان وطن کو حکومت کی طرف سے نہ صرف سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ان کا تمسخر بھی اڑایا جاتا رہا۔

یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہماری نظریاتی سرحدیں بھی ہیں۔ ملک بھر میں ڈینگی مچھروں کی طرح پھیلی ہوئی ہماری این جی اوز مغرب کے اشارے پر مسلسل ہماری نظریاتی سرحدوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ان کا ایجنڈہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بھی المیہ ہے کہ ملحد، سیکولر اور اسلام بیزار عناصر ہی ہماری تعلیمی اور معاشی پالیسیاں بناتے اور ہمارے معاشرتی مقاصد کا تعین کرتے ہیں۔اس طرح وہ ہمیں فکری غلامی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے قانون اور آئین میں دراندازی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ عالمی طاقتیں، مغربی ممالک اور ان کے تابع مہمل وہ مالیاتی وخیراتی ادارے، ان این جی اوز کو جو فنڈز دیتے ہیں، وہ محض خیرات یا امداد نہیں ہوتی بلکہ یہ ان کی جانب سے اپنے

مذموم ایجنڈے کی تکمیل کے لیے دی جانے والی ''پیشگی اجرت'' ہوتی ہے۔ یوں یہ این جی اوز اجرتی قاتلوں، پیشہ ور تخریب کاروں اور کرائے کے گوریلوں کا کردار ادا کرتی ہیں۔ عالمی سامراج، مغربی ممالک اور صیہونی مالیاتی اداروں کو اپنی ترجیحات، مفاد اور خواہشیں بہر طور عزیز ہیں جس کی تکمیل وہ اپنی پسندیدہ این جی اوز کے ذریعے ہر حال میں کرواتی ہیں۔

اپریل 2004ء کو ایک درندہ صفت انسان شفقت چوکیدار نے ایک معصوم بچے عمیر کو تاوان کی خاطر نہایت بہیمانہ انداز میں قتل کیا۔ ملزم گرفتار ہوا، مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ الزام ثابت ہونے پر ملزم کو سزائے موت کی سزا سنائی گئی۔ ملزم نے اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کی جو مسترد ہوگئی۔ آخر کار صدر پاکستان کو رحم کی اپیل کی گئی۔ اس موقع پر اچانک تمام فارن فنڈڈ این جی اوز ملزم شفقت کو بچانے کے لیے اکٹھی ہوگئیں۔ یہ ایک المناک داستان ہے جسے پڑھنے کے لیے چیتے کا جگر چاہیے۔ آیئے! یہ داستان مختلف کالم نگاروں کی تحریروں سے ملاحظہ کرتے ہیں۔

معروف کالم نگار جناب شکیل انجم اپنے مضمون ''معصوم کون تھا، شفقت یا عمیر؟'' کے عنوان سے لکھتے ہیں: ''اپریل کا معتدل موسم تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ موسم میں ہلکی ہلکی خنکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ کئی بچے اپنے گھروں کے باہر کھیل رہے تھے کہ سات سالہ عمیر بھی اچھلتا کودتا ہوا آنے والی قیامت سے بے خبر اپنے گھر سے نکلا اور اپنے کمسن دوستوں کی طرف بڑھا تو بلڈنگ کے چوکیدار نے انتہائی اپنائیت سے روکا اور کہنے لگا کہ اس کے گھر خرگوش کا بچہ ہے۔ خرگوش کے بچے کا سن کر وہ چوکیدار کے ساتھ چل پڑا کیونکہ وہ پہلے ہی چوکیدار سے خاصا مانوس تھا۔ کیونکہ یہ چوکیدار کافی عرصے سے اس بلڈنگ میں چوکیدارا کر رہا تھا۔ یونیورسٹی روڈ پر چاندنی سنیما کے قریب ندیم آرکیڈ کراچی کا یہ چوکیدار شفقت حسین تھا جو سات سالہ عمیر کو ورغلا کر اسی بلڈنگ میں واقع اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں کوئی خرگوش موجود نہیں تھا۔ ابتداء میں شفقت نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ حیلے بہانوں سے بچے کو بہلانے کی کوشش کی لیکن کچھ دیر میں ہی وہ اس کمرے سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں ماں کو پکارنا شروع کیا تو شفقت کے اندر کا درندہ جاگ اٹھا تھا۔ اس نے پہلے تو سخت لہجے میں خاموش کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بچہ تھا مزید خوفزدہ ہوگیا اور رونے لگا تو اس نے اسے انتہائی تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور اور ایک اندھیرے کمرے میں پھینک دیا۔ عمیر کا نحیف وجود اس طاقتور

شیطان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ نڈھال ہو گیا۔ وہ اس قدر بربریت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مرحلے پر شفقت نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے ختم کرنے کے لیے اس درندے کو زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ اس نے پہلے اس کا گلہ دبایا پھر سر پر لکڑی سے وار کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا۔ اس درندہ صفت نوجوان نے اس معصوم بچے کی لاش پلاسٹک بیگ میں ڈالی اور اسے کوٹھری میں پھینک دیا۔

تفتیش کاروں کا کہنا ہے کہ 12 اپریل 2004ء کو چوکیدار شفقت حسین نے عمیر کو اغوا اور قتل کے دو روز بعد مقتول بچے کے والد محمد حنیف کو ٹیلی فون کیا اور گمنام اغوا کار کے طور پر 5 لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ تاوان ادا نہ کرنے کی صورت میں بچے کی بوری بند لاش وصول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ 13 اپریل کو بھی اس نے اپنا مطالبہ اسی دھمکی کے ساتھ دہرایا۔ تاہم بارگیننگ کے نتیجے میں اس نے تاوان کی رقم کم کر کے 4 لاکھ کر دی۔ اغوا کار نے ٹال مٹول کے لیے حنیف کو منگھو پیر روڈ پر بلوایا لیکن نہ تو بچے سے بات کرائی اور نہ ہی خود سامنے آیا۔ 25 اپریل کو اغوا کار شفقت حسین نے ندیم آرکیڈ میں بجلی کے میٹروں کے نیچے لکڑی کا ایک باکس نصب کیا اور مغوی کے والد کو ہدایت کی کہ تاوان کی رقم اس باکس میں ڈال دے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ان کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ ان کا لخت جگر اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب ان کی ترجیحات تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ اب وہ اغوا کار کی تلاش میں تھے۔ 26 اپریل کو اغوا کار نے پھر فون کیا اور اپنی دھمکی کو دہرایا کہ اگر لکڑی کے باکس میں تاوان کی رقم نہ رکھی تو اپنے بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ادھر تحقیقاتی ادارے اور پولیس اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ وقفے وقفے سے 20 مئی تک چلتا رہا۔ عمیر کو قتل ہوئے چالیس روز بیت چکے تھے۔ جب 20 مئی کو عمیر کی والدہ ریحانہ کا اچانک اغوا کار شفقت سے اس کے کمرے کے سامنے آمنا سامنا ہوا تو شفقت انہیں دیکھ کر چھپ گیا۔ یہ وہ گھڑی تھی جب انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اغوا کار شفقت ہی ہے۔ تاہم شفقت نے اس رات بچے کی پلاسٹک بیگ میں بند لاش عمارت کے قریب گٹر میں پھینک دی۔

قصہ مختصر کہ شفقت پکڑا گیا اور انسداد دہشتگردی کی عدالت نے ٹھوس شواہد کی بنیاد پر اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا اور اپیلیں مسترد ہونے کے بعد 19 مارچ 2015ء کو اسے پھانسی دینے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ لیکن اس کہانی نے اس وقت نیا رخ اختیار کر لیا جب بعض

NGO's نے جعلی دستاویزات کی بنیاد پر اس مجرم کو ''کمسن'' قرار دیتے ہوئے سزائے موت کے فیصلے کو چیلنج کر دیا اور پاکستان کی عدالتوں اور ان کے فیصلوں کی تضحیک کی۔ یہ انسانی شکل میں اس درندے کی کہانی ہے جسے NGO's کے ایک ٹولے نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے ''معصوم'' قرار دے کر اس کی حمایت میں ملک گیر مہم چلائی۔ اس ''معصوم'' کی درندگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک سات سالہ بچے کو سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا اس کے باوجود ورثاء سے تاوان کی رقم کا مطالبہ کرتا رہا اور 40 روز بعد اس بچے کی لاش گٹر میں پھینک دی۔ ان NGO's نے اس درندے کی حمایت میں ملک گیر مہم چلانے سے قبل اپنے اس ''معصوم'' سے دریافت نہیں کیا کہ اس نے عمیر کو کس گناہ کی سزا دی۔ کم سن بچے کے اس سفاک قاتل کے حق میں آواز اُٹھانے والی NGO's میں سے کسی کا بچہ اگر اسی انداز سے اغوا کر کے قتل کر دیا جائے تو ان کا رویہ اس قاتل کے لیے کیا ہوگا؟ کیا ان کا ضمیر تب بھی سویا رہے گا جب وہ خود اس کیفیت کا شکار ہوں گے۔ کیا غیر ملکی فنڈنگ کے حصول کے لیے گمراہ کن رویوں کے تحت سچ کو جھٹلاتی رہیں گی اور کیا ان خود ساختہ اور مخرب الاخلاق اصولوں کے تحت وہ اپنے بچوں کو بھی اسی انداز میں درندگی کا شکار ہونے کی اجازت دیتی رہیں گے؟؟ ایسی NGO's کو اس ملک میں کام کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جو اپنے انداز میں دہشت گردی کو تقویت دینے کے لیے ان کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کے لیے کام کرتی ہوں۔ جن کے نزدیک بچوں کا قتل جائز ہو۔ ایسی NGO's کے لیے چبھتا ہوا سوال ہے کہ کیا وہ ایسے دہشت گردوں اور خودکش بمباروں کی حمایت بھی کریں گے جن کی عمریں 18 سال سے کم ہیں اور تمام تر شواہد کے ساتھ پکڑے جا چکے ہیں اور سزا پاتے ہیں''۔ (روزنامہ جنگ، لاہور 25 اپریل 2015ء)

معروف صحافی جناب عابد محمود عزام اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''واضح رہے کہ شفقت حسین کی سزائے موت پر عملدرآمد کے لیے رواں سال 14 جنوری (2015ء) کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اور اس سزا کے خلاف اس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی تھیں، لیکن انسانی حقوق کی مقامی اور بین الاقوامی تنظیموں اور یورپی یونین کے دباؤ پر پھانسی روکنا پڑی، ان کا موقف تھا کہ جس وقت اس جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا، اس وقت شفقت حسین کی عمر لگ بھگ 14 سال تھی۔ دوسری مرتبہ سزا پر عملدرآمد کے لیے 19 مارچ کی تاریخ مقرر

کی گئی مگر انسانی حقوق کے کارکنوں کے احتجاج کے بعد پہلے اس سزا کو 72 گھنٹوں اور پھر 30 دنوں کے لیے مؤخر کیا گیا۔ اس دوران وفاقی وزیر داخلہ چودھری نثار نے بھی اس معاملے کا نوٹس لیا اور شفقت حسین کی عمر کے تعین کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سزا کے وقت اس کی عمر 23 برس تھی۔ تیسری مرتبہ اس کے ڈیتھ وارنٹ 24 اپریل کو جاری کیے گئے، مگر اس کے وکلا نے تحقیقاتی کمیٹی کی تحقیقات پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے سپریم کورٹ میں شفقت حسین کی عمر کی عدالتی تحقیقات کرانے کی درخواست دی جو مسترد کر دی گئی۔

گزشتہ روز شفقت حسین کی پھانسی کو چوتھی بار ملتوی کیا گیا ہے۔ سزائے موت کو عملدرآمد سے چند گھنٹے قبل روکے جانے نے تمام متعلقہ حلقوں بشمول ملزم کے اپنے وکیل تک کو حیرت زدہ کر دیا، جو سپریم کورٹ کے سامنے اس غیر یقینی کے ساتھ پیش ہوئے کہ ان کا مؤکل تاحال زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ایوان صدر کے ذرائع تک بھی چوتھی بار شفقت حسین کی سزائے موت ملتوی کیے جانے کے حوالے سے مکمل طور پر لاعلم ہیں۔ ایوان صدر کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے مطابق اس حوالے سے وزیر اعظم آفس کی جانب سے کوئی سمری ارسال نہیں کی گئی اور نہ ہی صدر ممنون حسین نے اس طرح کے کسی حکم کی منظوری دی۔ آئین کے مطابق سزائے موت کے کسی بھی قیدی کو پھانسی ملتوی کرنے کا اختیار صرف صدر کے پاس ہے اور وہ عام طور پر اس طرح کے فیصلے وزارت داخلہ کی جانب سے بھجوائی گئی سمری اور وزیر اعظم کے مشورے سے کرتے ہیں۔ صدارتی ترجمان کا کہنا تھا کہ صدر نے پھانسی کو ملتوی کرنے کے حوالے سے کسی قسم کے احکامات جاری نہیں کیے، تاہم ان کا دعویٰ تھا کہ یہ احکامات سندھ کے وزیر اعلیٰ کی جانب سے پیر کو کراچی میں یورپی یونین کے پانچ رکنی وفد سے ملاقات کے بعد جاری ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ یورپی یونین کا وفد سزا کو رکوانا چاہتا تھا۔ دوسری جانب سپریم کورٹ نے سزائے موت کے مجرم شفقت حسین کی عمر کے تعین کے لیے کی جانے والی جوڈیشل کمیشن کی اپیل مسترد کر دی ہے۔ چیف جسٹس ناصر الملک نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ شفقت حسین کا معاملہ عدالتوں سے بڑی حد تک کلیئر ہو چکا ہے اور شفقت حسین کی عمر کا تعین متعلقہ اتھارٹی ہی دوبارہ کروا سکتی ہیں، جبکہ ہم کسی ادارے کے کام میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے۔ رحم کی اپیل منظور یا مسترد کرنا صدر کا صوابدیدی اختیار ہے اور عدالت صدر کے ان اختیارات پر بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ حکومت کو یورپی

یونین اور اقوام متحدہ کے دباؤ میں آ کر کوئی بھی پھانسی نہیں روکنی چاہیے، جب کوئی یورپی ملک ہمیں اپنے معاملات میں مداخلت کا اختیار نہیں دیتا تو ہمارے معاملات میں مداخلت کیوں کی جاتی ہے''۔ (روزنامہ اسلام، کراچی 11 جون 2015ء)

معروف کالم نگار اور بلاگر ''جویریہ صدیق'' اپنے مضمون ''سیو دی شفقت اور سائبر کرائم'' میں لکھتی ہیں۔

''سوشل میڈیا پر اکثر بے تکے ٹرینڈز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کو بنانے والوں میں سے اکثر سیاسی جماعتوں کے پے رول پر ہیں جن کا کام ہی صبح سے شام تک مدمقابل افراد پر کیچڑ اچھالنا ہے۔ اس طرح سوشل میڈیا پر ایک اور طبقہ بھی ہے جو ان سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے جن کا کام ہر وقت وطن عزیز کو بدنام کرنا ہے۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہوا کہ نام نہاد لبرلز کی جانب سے ٹوئٹر پر ایک ٹرینڈ چلا'' سیو دی شفقت''۔ شفقت کشمیر سے تعلق رکھنے والا جوان کراچی میں محنت مزدوری کی غرض سے آیا۔ اس نے کچھ عرصے بعد ایک معصوم بچے کو اغوا برائے تاوان کے لیے اٹھا لیا اور بعد ازاں قتل کر دیا۔ اب لبرلز نے یہ شور مچا دیا کہ شفقت تو صرف 14 برس کا تھا، اس پر پولیس نے تشدد کر کے بیان لیا اور ایک 14 سال کے بچے کو سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ ان کو شروع کرنے والوں نے پاکستان کی عدلیہ پر بھی انگلیاں اٹھائیں، اکیسویں آئینی ترمیم پر اعتراض کیا اور یہ منظّم پروپیگنڈہ شروع ہو گیا کہ پاکستان میں تو سفاک لوگ بستے ہیں جو 14 سال کے بچوں کو بھی پھانسیاں دے رہے ہیں۔ شفقت کے بچپن کی ایک تصویر بھی کچھ این جی اوز کے ملازمین اپ لوڈ کرتے رہے اور پاکستان کے خلاف دہائیاں دیتے رہے۔ عالمی میڈیا اور مغربی ممالک بھی پاکستان سے سوال کرنے لگے، یہاں تک کہ معاملہ اقوام متحدہ تک بھی پہنچ گیا۔ سماجی تنظیموں اور این جی اوز نے حکومت پر دباؤ جاری رکھا اور سوشل میڈیا نے اس میں کلیدی کردار ادا کیا۔

پھانسی سے ٹھیک ایک دن پہلے سوشل میڈیا پر ایک برتھ سرٹیفکیٹ پھیلا دیا گیا جو ٹاؤن کمیٹی کیل کشمیر کی طرف سے جاری ہوا جس کے مطابق شفقت حسین کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر 1991 ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ 22 دسمبر 2014 کو جاری ہوا، جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ 1991 میں پیدا ہونے والے بچے کا سرٹیفکیٹ 2014ء میں کیوں جاری ہوا تو شفقت کے ساتھ کھڑی این جی اوز کے مطابق علاقہ ہی اتنا پسماندہ ہے کہ یہاں روایت ہی نہیں کاغذ

بنائے جائیں۔چلیں مان لیتے ہیں لیکن اگر سرٹیفکیٹ غور سے دیکھا جائے تو جس نے بھی جلد بازی میں یہ بنایا، اس نے گورنمنٹ کے مخف میں جی کے بجائے ڈی لکھ دیا۔ٹاؤن کے اسپیلنگ بھی غلط ہیں۔پھر بھی پروپیگنڈا اتنا زیادہ تھا کہ صدر پاکستان نے شفقت حسین کی پھانسی موخر کر کے اس کی عمر کے تعین کی جانچ کے لیے کہا۔وزیر داخلہ نے بھی کہا کہ یہ انسانی جان کا معاملہ ہے، اس پر سیاست اور بیان بازی سے گریز کیا جائے۔انہوں نے کہا نہ ہی شفقت کے والد کا کارڈ ملا نا ہی والدہ کا، صرف ایک بھائی کا کارڈ ملا جس کی عمر **44** سال ہے۔تاہم ایف آئی اے کی ٹیم نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور اس کے نتیجے میں یہ بات عیاں ہوگئی کہ شفقت کو جس وقت پولیس نے حراست میں لیا تھا، وہ نا بالغ نہیں تھا، اس کی عمر **23** سال تھی۔اب کہاں **14** سال اور کہاں **23** سال۔رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے **2014** میں جاری ہونے والا سرٹیفکیٹ بھی آزاد کشمیر میں متعلقہ حکام نے کینسل کر دیا ہے کیونکہ اس میں فراہم کردہ معلومات درست نہیں تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ دس سال سے اس مقدمے میں مجرم کے وکیل نے کبھی عمر کا معاملہ عدالت میں نہیں اٹھایا تو اچانک سے این جی اوز نے کس کے ایما پر یہ معاملہ اٹھایا اور پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کیا۔اس کے پیچھے کیا مقصد تھا؟ کیا کچھ این جی اوز ملک میں پھانسی کی سزا دوبارہ سے بحال ہونے پر خوش نہیں تھیں یا اس بات پر فنڈ مہیا ہوئے تھے کہ شفقت کو بنیاد بنا کر اکیسویں ترمیم کو متنازع بنایا جائے۔

رپورٹ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اگر جرم کے وقت شفقت کی عمر ساڑھے بارہ سال تھی تو جس جگہ وہ ملازمت کر رہا تھا کیا اسے تین سال پہلے نو سال کی عمر میں چوکیدار کی نوکری دے دی گی تھی۔کیا ایسا ممکن ہے کوئی نو سال کے بچے کو چوکیدار کی نوکری پر رکھے گا؟ شفقت کو جس وقت نوکری پر رکھا گیا تو وہ بالغ تھا۔اس کے ساتھ **1994** میں اسکول کے ریکارڈ کے مطابق شفقت حسین کلاس فور میں تھا، اب کیسے ممکن ہے کوئی **1991** میں پیدا ہو اور **1994** میں وہ درجہ چہارم میں پہنچ جائے۔رپورٹ کے مطابق شفقت حسین کیس کو بنیاد بنا کر ایسا تاثر دیا کہ پاکستان میں کم عمروں کے لیے انصاف کی کوئی جگہ ہی نہیں۔پاکستان کی عدلیہ پر سوال اٹھانے والے اس پانچ سال کے بچے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جس کو شفقت نے لالچ کی وجہ سے مار ڈالا تھا۔میرا سوال صرف ان این جی اوز اور خود ساختہ مغرب نواز لبرلز سے ہے۔کیا وہ اب معافی مانگیں گے جس طرح انہوں نے غیر ملکی اخبارات ویب

سائٹس پر آرٹیکلز لکھ کر اور ٹوئٹر پر ٹوئٹس کر کے ملک کا نام دنیا بھر میں بدنام کیا، سوشل میڈیا پر لوگوں کو گمراہ کیا؟'' (ٹی وی چینل ''جیو'' کی ویب سائٹ کا بلاگ، 22 اپریل 2015ء)

ابن تیمیہؒ نے کیا خوب بات کہی: ''جسے روم و فارس کے فلسفہ وحکمت کی لت لگ جائے، کتاب اور سنت میں اس کا حصہ کم ہو جاتا ہے''۔ آج کی بعض شکست خوردہ سیکولر فاشسٹ شخصیات کو دیکھیں، تو واقعی آپ کو یہ سچ لگے گا۔ جو شخص اسلام کے خلاف نازیبا کلمات ادا کرے، مسلمانوں کو گالیاں دے، ان کو دہشت گرد ثابت کرے، اسلام کو دہشت گردی کا مذہب قرار دے، زیادہ فحش وعریاں لٹریچر لکھے، شراب پیئے اور اپنے آپ کو جتنا بڑا سیکولر ثابت کرے، وہ اتنے ہی بڑے اعزاز کا مستحق ہوتا ہے۔ ایسے خود ساختہ دانشوروں کی خوب پذیرائی ہوتی ہے، ان پر انعام واکرام کی بارش کی جاتی ہے، انہیں ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے، اندرون وبیرون ملک کے سفر کرائے جاتے ہیں اور میڈیا میں یہ تشہیر کی جاتی ہے کہ یہی حضرات ہیں اصلی وحقیقی دانشور، یہی ہیں انسانی حقوق کے محافظ اور یہی ہیں آزادی اظہار رائے کے علمبردار۔

ان سیکولر فاشسٹوں کا کہنا ہے کہ ہمیں قائداعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کا پاکستان چاہیے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ اگر قائداعظم محمد علی جناحؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ آج ہمارے درمیان موجود ہوتے تو کیا وہ توہین رسالتﷺ کا ارتکاب کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے؟ حضرت قائداعظمؒ نے تو خود غازی علم الدین شہیدؒ کا مقدمہ لڑا اور علامہ اقبالؒ نے غازیؒ کے جنازہ پر ایک تاریخی جملہ کہا تھا ''اسیں گلاں کر دے رہ گئے، تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا!!!'' شہید ناموس رسالت ﷺ غازی عبدالرشیدؒ کی شہادت پر حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ اے مرد مسلماں! تجھے کیا یاد نہیں؟
حرف **لا تدع مع اللہ الٰھاً** آخر

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فروری 1948ء میں کہا تھا: ''پاکستان کا دستور ابھی بننا

ہے اور یہ پاکستان کی دستورساز اسمبلی بنائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل و ہیت کیا ہوگی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا''۔ 21 نومبر 1945ء کو سرحد مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ وہ مسلمان ایسے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطہ حیات، اپنے تہذیبی ارتقا، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کرسکیں''۔ 24 نومبر 1945ء کو قائداعظم نے سرحد مسلم لیگ کانفرنس سے دوبارہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں''۔

یاد رہے کہ قیام پاکستان سے قبل حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 101 مرتبہ اور قیام پاکستان کے بعد 14 مرتبہ ایسے ہی خیالات کا برملا اعلان کیا۔ پوچھنا چاہیے کہ کیا ان نظریات کا حامل کوئی سیکولر ہوسکتا ہے؟

کبھی کسی نے سنا کہ ''انڈیا'' میں گاندھی کے خلاف کوئی بولا ہو یا کسی نے لکھا ہو؟ یا ''امریکہ'' میں ابراہم لنکن کے خلاف کوئی بولا ہو؟ یا ''برطانیہ'' میں ملکہ کے خلاف الٹا سیدھا بولتا ہو؟ یا ''ایران'' میں خمینی کے خلاف پروپیگنڈہ کرے؟ یا ''چین'' میں ماؤزے تنگ کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی ہو؟ لیکن ''پاکستان'' میں الگ ہی حساب ہے جس کتے بلے کا جی چاہے اٹھ کر قائداعظمؒ کو الٹا سیدھا کہنے لگتا ہے، اور کبھی علامہ اقبالؒ کے خلاف بیہودہ گوئی شروع کر دیتا ہے۔

ریاست اور مذہب کبھی الگ تھے ہی نہیں، آج بھی بیشتر ممالک میں مذہبی و آئینی شقیں موجود ہیں۔ جس طرح پاکستان کے آئین میں ہیں۔ آج بھی Church Act آئین کا حصہ، تو پھر اسلامی ریاستوں میں اسلامی ایکٹ ہونے سے امریکہ اور یورپ کو کیا تکلیف ہے۔ مذہب انسانوں کے ہوتے ہیں اور ریاست بھی انسانوں کی ہی ہوتی ہے۔ جہاں 95 فیصد ایک ہی مذہب کے پیروکار ہوں، وہاں ریاستی قوانین میں بھی مذہب کا رنگ ضرور نظر آئے گا۔ ہمارے 0.1 فیصد لبرل فسادیوں کی مذہب سے تمام تر دشمنی فقط ایک آئینی شق کے لیے ہے کہ انہیں اسلام کی تضحیک کی آزادی ہونی چاہیے۔

آخر میں ایک ضروری بات کہ امریکہ بلکہ پوری دنیا کی معیشت کا انحصار مسلم ممالک

پر ہے۔ اگر آج مسلم ممالک امریکہ کی تیل پر سے اجارہ داری ختم کردیں اور اس کی تمام مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کردیں تو ''آزادی اظہار'' کے علمبردار امریکہ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مغرب نے تو اپنے خبث باطن کا ثبوت دے دیا ہے، اب مسلمان ملکوں کے جذبہ ایمانی کی آزمائش کا وقت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سپین میں مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں پے در پے توہین رسالت ﷺ کے واقعات پر مسلمانوں نے اپنا ردعمل ظاہر کرنا چھوڑ دیا تھا جن کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ اس خطہ سرزمین پر حکمرانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ 1933ء میں کانگریس کے ایک لیڈر پانیکر (Panikkar) نے ایک کمیشن قائم کر کے سپین بھیجا تھا کہ وہ ان حالات اور واقعات کا مطالعہ کر سکے جن کی وجہ سے سات سو سال تک اندلس پر شان وشوکت سے حکومت کرنے کے باوجود سپین سے مسلمانوں کا بیج تک ختم ہو گیا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں توہین رسالت ﷺ کے واقعات پر ماضی کے برعکس مسلمانوں کی بے حسی، بے حمیتی اور غیرت وحمیت کے فقدان کو ان کے زوال کا خصوصی سبب قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں اب مغرب پوری دنیا میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت توہین رسالت ﷺ کے واقعات دہرا رہا ہے۔

سلطان عبدالحمید نے اپنی حکومت کے آخری ایام میں بھی اسلام کے دفاع سے نہ ہٹنے کا فیصلہ برقرار رکھا تھا۔ فرانسیسی مصنف والٹیئر کی تصنیفات کی بنیاد پر فرانس اور برطانیہ میں ایک سٹیج ڈرامہ کھیل کے لیے پیش ہوا جس کا عنوان تھا ''محمد............؟'' جس میں نبی اکرم ﷺ کے کردار پر حضرت زینبؓ و زیدؓ کے نکاح کے ذریعے گرد اڑائی گئی۔ جب خلیفہ کو اس ''سٹیج ڈرامہ'' کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرانس میں اپنے سفیر کے ذریعے فرانسیسی حکومت کو کھیل جاری رکھنے کی صورت میں سنگین ردعمل کی تنبیہ کی۔ فرانس نے فوراً ''سٹیج ڈرامہ'' روک دیا اور یہ گروہ انگلینڈ چلا گیا۔ جب یہی وارننگ انگلینڈ پہنچی تو جواز تراشا گیا کہ ٹکٹیں فروخت کر دی گئی ہیں اور اب ''سٹیج شو'' پر پابندی شہریوں کی آزادی پر قدغن لگانے اور آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔ اس پر سلطان عبدالحمید نے دوٹوک الفاظ میں یہ فرمان جاری کر دیا: ''میں اسلامی امہ کے نام ایک فرمان جاری کردوں گا کہ برطانیہ ہمارے پیارے رسول کریم ﷺ کی توہین کر رہا ہے، لہٰذا میں برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کرتا ہوں۔'' اس الٹی

میٹم پر ''اظہار رائے کی آزادی'' کے سب دعوے بھلا دیے گئے اور فی الفور ''سٹیج ڈرامہ'' روک دیا گیا۔شاید مسلمانوں کے پاس اس طرح کی آزمائش میں سرخرو ہونے کا یہ واحد حل ہے!!

اپنے مالک سے تعلق کی نئی راہیں بھی ڈھونڈ
صرف سجدوں ہی سے روشن اپنی پیشانی نہ کر

ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچیرے بھائی تھے۔ وہ توریت اور انجیل کے زبردست ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے نامور عالم اور بزرگ تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا اور پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ گھر تشریف لائے اور اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جنہوں نے یہ سارا ماجرا سن کر کہا تھا کہ آپ نبی آخرالزماں ہیں جن کا انتظار کیا جارہا ہے۔آپ کے پاس آنے والا فرشتہ وہی ہے جو دیگر انبیا پر خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کی شان میں کئی اشعار کہے، ان میں ایک بہت ہی فکر انگیز اور خوبصورت ہے

بان محمدا سیسود فینا
ویخصم من یکون له حجیجا

ترجمہ: ''حضرت محمد ﷺ ہم میں عنقریب سردار ہو جائیں گے اور ان کی جانب سے جو شخص کسی سے بحث کرے گا، وہی غالب رہے گا''۔

یعنی جو مسلمان حضور علیہ الصلوٰہ والسلام کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے گستاخان رسول اوران کے حامیوں سے بحث و مباحثہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ عزت اور طاقت عطا فرمائیں گے۔ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھری مجلس میں صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہوکر اپنی خواہش کا اظہار فرمایا:''مخالف شعرا کی ہرزہ سرائیاں حد سے بڑھتی جارہی ہیں تم لوگوں نے تلوار سے تو میری مدد کی ہے، کیا کوئی ایسا بھی ہے جو زبان سے میری مدد کرے''۔ اس موقع پر حضرت حسان بن ثابتؓ اٹھے اور کہنے لگے، یا رسول اللہ ﷺ اس خدمت کے لیے یہ ناچیز حاضر ہے چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کی عزت و ناموس کا تحفظ اپنی زبان وقلم سے کیا۔اس پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو بے شمار دعائیں دیں۔ یہ فیض آج بھی گنبد خضریٰ سے جاری و ساری ہے بشرطیکہ کوئی خود کو اس کا اہل ثابت

کرے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اخلاص اور نیک نیتی سے حضور نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں آئے اور اپنے لیے روز محشر شفاعت محمدی ﷺ کا سامان پیدا کرے۔ ورنہ یاد رکھیے! جو مالک ارض و سما ابرہہ کی ناقابل تسخیر فوج سے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے ابابیلوں کا معمولی لشکر بھیج کر اُسے کھائے ہوئے بھوسے میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ اپنے محبوب نبی ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ اس نے تو خود اپنے محبوب سے فرمایا ہے: ترجمہ: ''آپ کا استہزا کرنے والوں کے لیے ہم کافی ہیں''۔ (الحجر:95) **اللھم صلی علیٰ محمد خاتم النبیین و خاتم المرسلین.**

اوّلین مجاہدِ تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ

شہیدوں کے سردار

سیّد الشہدا، سیّدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی مستند سیرت وفضائل
اور شجاعت وشہادت پر مبنی ایک ایمان پرور اور ایقان افروز تالیف

محمد متین خالد

- ایسے تاجدار اقلیم شہادت کی لازوال اور جگر فگار داستان جنھوں نے حب رسول ﷺ کو تابندہ تر اور ناموس رسالت ﷺ کو پائندہ تر بنا کر ملت بیضا کو ایک نیا اوج کمال بخشا۔
- ایسے خوش قسمت جنھیں حضور پر نور نبی محتشم ﷺ کے پیارے چچا، رضاعی بھائی اور حبیبِ لبیب ہونے کا منفرد و یگانہ اور یکتا و اعلیٰ اعزاز حاصل ہے۔
- ایسے پیکر شجاعت جن کی حضور خاتم النبیین ﷺ سے محبت وعقیدت دین اسلام کی طرف اولین راہنمائی اور جنھیں سابقون الاولون کے قافلے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔
- ایسے خوش نصیب جنھیں حضور نبی الملاحم ﷺ نے سید الشہدا، اسد اللہ، اسد الرسول، فاعل الخیرات اور کاشف الکربات ایسے معزز ترین اور صد آفرین القابات وخطابات سے سرفراز فرمایا۔
- ایسے شجیع وجری اور بہادر ودلاور جنھوں نے دین اسلام کی سربلندی وسرفرازی کی خاطر میدانِ کارزار میں دیوانہ وار جان نچھاور کر کے اسے وقار واعتبار کی ثروت بخشی اور یوں تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہوگئے۔
- ایسے عظیم المرتبت مجاہد جنھوں نے اپنے پاکیزہ لہو سے جبل احد پر لا الہ الا اللّٰہ کا نقش دوام ثبت کیا۔
- ایسی نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت جن کی عظیم الشان قربانی وایثار سے چمنستان اسلام گلزار وگلنار بنا ہوا ہے۔
- ایسے بطل جلیل جن کی سرفروشی وجانثاری اور بہادری وحق گوئی کے حیرت انگیز کارنامے صفحات دہر پر زریں حروف سے رقم اور محبت رسول ﷺ کے انمول نقوش سے معمور ہیں۔
- ایسے ضیغم اسلام جن کے وجد آفریں تذکرہ کے بغیر تاریخ اسلام نامکمل رہے گی۔
- ایسے بے مثال ہیرو جن کا دشمنانِ اسلام کے انبوہ میں بے خوفی وبے باکی کے عالم میں بانگ دہل قبول اسلام کا واقعہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے نہایت فخر وانبساط کا باعث ہے۔
- ایسے شہید محبت جن کا نام ہونٹوں پر آتے ہی دل ودماغ میں ناقابل تسخیر جرات وشجاعت کے چراغ جھلملانے لگتے اور آنکھیں اُن کے احترام میں جھک جاتی ہیں۔
- ایسے پاکباز اور اسلامی تاریخ کے روشن ستارے جو آج بھی روحانی طور پر مدینہ طیبہ کے والی اور حاکم ہیں۔

معروف صحافی وکالم نگار جناب منصور اصغر راجہ، صاحب علم ودانش حضرت مولانا محمد رضوان عزیز، اُردو ادب کے مایہ ناز نثر نگار جناب پروفیسر تفاخر محمود گوندل، درویش صفت شخصیت جناب محمد جاوید چودھری، آسمان علم وادب کے درخشندہ ستارے جناب محمد حامد سراج، اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ جناب اوریا مقبول جان کی محبت وعقیدت میں ڈوبی اور کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی گرانقدر تقاریظ کے ساتھ۔

ایک ایسی کتاب جس کا مطالعہ آپ کے ایمان وایقان کو ایک نئی جلا بخشے گا اور آپ کے فکر وخیال میں ایک ولولہ تازہ پیدا کرے گا۔

کارکنانِ تحفظِ ختم نبوّت کے لیے ایک گرانقدر تحفہ

تحفظِ ختمِ نبوّت اہمیت اور فضیلت

دینی غیرت وحمیّت پر مبنی ایک فِکر انگیز دستاویز

محمد متین خالد

ایک ایسی تاریخی وتحقیقی کتاب

- جو جنگ یمامہ سے لے کر آج تک (14 صدیوں پر مشتمل) دینی غیرت وحمیّت اور ایمانی جرأت وبسالت سے لبریز ولولہ انگیز حقائق وواقعات سے مزین ہے۔
- جو ''ختم نبوّت زندہ باد'' کا ورد کرنے والے کفن بردوش مجاہدوں کی زندہ وجاوید روداد اور چشم کشا مشاہدات وتجربات پر مبنی ہے۔
- جس میں ''شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ'' کے ماہتابی اور آفتابی کرداروں کا روشن تذکرہ ہے۔
- جو قلم کی سیاہی سے نہیں، دلی سوز وگداز اور خونِ جگر سے لکھی گئی ہے۔
- جس کے مطالعہ سے خون رگوں میں جوش مارتا اور قاری تاریخ کے جھروکوں سے ہر واقعہ اپنی پرُنم آنکھوں سے براہ راست دیکھتا ہے۔
- جس کا ہر لفظ پاکیزہ، ایمان پرور، پرسوز اور باطل شکن ہے۔
- جس کے مطالعہ سے ہر مسلمان کے روح وقلب میں محبتِ رسول ﷺ کے خوابیدہ جذبات واحساسات اجاگر ہو جاتے ہیں۔
- جس میں ''غدارانِ ختم نبوت'' کا عبرتناک انجام، ہر قادیانی نواز کے لیے عبرت ونصیحت کا سبق لیے ہوئے ہے۔
- جو قادیانی اور قادیانی نوازوں کی آنکھوں کا آشوب اور ان کے حلق میں چبھتا کانٹا ہے۔
- جس کا مطالعہ کارکنان ختم نبوت کے ایمان وایقان کو ایک نئی زندگی بخشتا ہے اور وہ ایک نئے ولولے اور تازہ جذبے کے ساتھ اس محاذ پر برسرپیکار رہتے ہیں۔

آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والی یہ کتاب ہر مسلمان کے لیے ایک گرانقدر تحفہ ہے......
اسے پڑھیے......سمجھیے......اور اس کی روشنی کو پھیلایئے......شفاعتِ محمدی ﷺ آپ کی منتظر ہے!

کارکنانِ تحفظِ ختم نبوّت کے لیے خصوصی رعایت | ہر اچھے بک سٹال پر دستیاب ہے

حضورنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پر قربان ہوجانے والے خوش نصیبوں کا ایمان افروز تذکرہ

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

محمد متین خالد

شہدائے جنگ یمامہ	غازی علم دین شہیدؒ	غازی حاجی محمد مانکؒ
غازی میاں محمد شہیدؒ	غازی عبداللہ شہیدؒ	غازی فاروق احمد
غازی احمد دین شہیدؒ	غازی زاہد حسینؒ	غازی عامر عبدالرحمٰن چیمہؒ
شہدائے تحریک ختم نبوت 1953ء	غازی عبدالقیوم شہیدؒ	غازی مرید حسین شہیدؒ
غازی عبدالرشید شہیدؒ	غازی منظور حسین شہیدؒ	غازی محمد صدیق شہیدؒ
غازی عبدالمنانؒ	غازی بابو معراج دین شہیدؒ	غازی محمد عمران وحید

اس کے علاوہ تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر اور بہت سے دوسرے اہم مقالات

- ظلمت دہر میں ''چراغ اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کی اجلی اور کومل لوؤں سے اجالا کرنے والے ضوریز وضیابار ماہتابی و آفتابی کرداروں کا روشن تذکرہ
- تھانوں کی تنگ و تاریک حوالاتوں، پھانسی گھاٹوں کی بے نور فضاؤں اور جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں ''آبروئے ما زنام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم است'' کا ورد کرنے والے کفن بردوش مجاہدوں کی زندہ جاوید روداد اور انوکھے مشاہدات
- ایک ایسی کتاب جس کا ایک ایک لفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہونے والے بدطینت انسان نما ابلیسوں کے ایوانوں کے لیے برق قضا کی حیثیت رکھتا ہے۔
- یہ کتاب محض ایک کتاب نہیں .... خواجہ بطحا صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر کٹ مرنے والوں اور دشمنان رسالت مآب کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کرنے والی پاکیزہ ہستیوں کا مختصر مگر مبسوط انسائیکلوپیڈیا ہے۔

اپنی نوعیت کی منفرد کتاب جس کا مطالعہ آپ کے جذبہ ایمانی کو ایک نیا ولولہ عطا کرے گا

ناموسِ رسالت ﷺ
مغرب اور آزادئ اظہار

محمد متین خالد

اِسلام اور ناموسِ رسالت ﷺ کے خلاف مغرب کے تعصب، دوہرے معیار اور بھیانک سازشوں پر مبنی تحقیقی دستاویز

ناقابلِ تردید حقائق، تہلکہ خیز واقعات، ہوش رُبا انکشافات

ایک منفرد اور اچھوتے موضوع پر لکھی جانے والی شاہکار کتاب جو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے:

- انسانی آزادی، انسانی حقوق اور آزادی اظہار کے نام نہاد علمبرداروں کے مکروہ چہروں کی نقاب کشائی۔
- بے لگام آزادی اظہار کے خبط میں مبتلا مغرب کی اسلام کے خلاف ناپاک سازشوں کے زہریلے واقعات۔
- دلائل و براہین اور حقائق و انصاف کے میدان میں مغرب کی علمی و اخلاقی شکست کی سبق آموز کہانی۔
- اخلاق، مساوات اور رواداری کا درس دینے والے مغربی تھنک ٹینکس کی ہٹ دھرمی، تنگ نظری، رعونت، عدم برداشت اور دشنام طرازیوں کے قابل شرم نمونے۔
- دین اسلام کے دنیا بھر میں غیر معمولی پھیلاؤ سے کلیسا کی پریشانی اور بدحواسی کے قابل دید مناظر۔

ایک ایسی کتاب جو مسلمانوں کی بے حسی اور بے بسی کا نوحہ کرتے ہوئے، ان کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے، ان کی دینی غیرت وحمیّت کو جگاتے ہوئے، انہیں احساس ندامت کے ساتھ رلاتے ہوئے اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کا فریضہ یاد دلاتے ہوئے ایک ولولہ تازہ اور ضرب کلیمی عطا کرتی ہے۔

پڑھیے اور تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے لیے آگے بڑھیے۔ شفاعت رسول ﷺ آپ کی منتظر ہے۔

Rs.800/-

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔

37223584، 37232336، 37352332

www.ilmoirfanpublishers.com

ilmoirfanpublishers@hotmail.com

www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers